خوبصورت



بشریٰ رحم

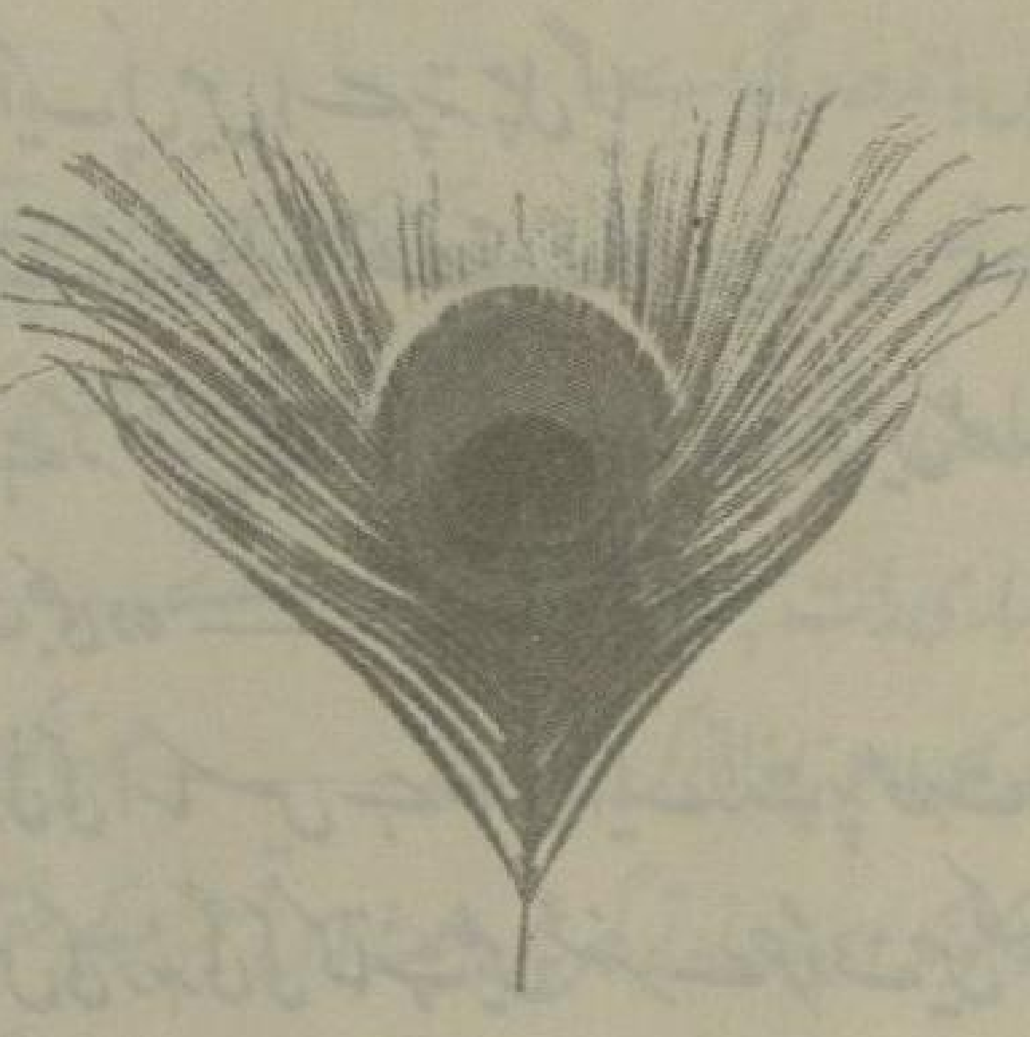
اپنی پیاری بہن

بیگم فرحت شجاع الرحمٰن

کے نام!

جمالِ ہم نشین در من اثر کرد
وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

(شیخ سعدیؒ)



کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے نا؟ کہ ہاتھ سے قیمتی گلدان گر کر ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔

رملی نے گھونگھٹ کیا ہٹایا۔ اس کے خوابوں کا گلدان چھنک سے ٹوٹا اور پاؤں میں گر کر کرچی کرچی ہو گیا اور جو ـــــ مارے گھبراہٹ کے آدمی ان کرچیوں پر پاؤں رکھ دے تو تلوے بھی لہولہان ہو جاتے ہیں

پر قیمتی گلدان کے غم میں اپنا لہو سستا لگتا ہے۔

رملی نے اپنی ہتھیلیوں کو دیکھا جو مہندی کے گہرے عنابی رنگ میں ڈوبی لال گلال ہو رہی تھیں، یہ مہندی نہیں۔ سچ مچ کا لہو ہے۔ اس نے سوچا۔

پھر اس نے چاہا۔ کھرچ کر سارا رنگ اتار دے اور اپنی ہتھیلیاں صاف ستھری کر لے۔ سفید سفید..... گوری گوری..... جیسے شادی سے ایک دن پہلے تک ہوا کرتی تھیں۔

در اصل وہ مہندی کے رنگ کو نہیں کھرچنا چاہتی تھی بلکہ اپنی زندگی کے کورے کاغذ پر لگی ہوئی تقدیر کی مہر مٹانا چاہتی تھی۔ ایک دم سے ـــــ

مگر تقدیر کی مہر حساب کا سوال تو ہوتی نہیں کہ ذرا سی غلطی پر ربڑ اٹھا کر مٹا دیا جائے۔ تقدیر بہت سوچ سمجھ کر مہر لگاتی ہے۔ پھر دنیا میں کوئی ہاتھ اس مہر کو مٹا نہیں سکتے۔ اپنے نفس پر جبر کیا ہوتا ہے؟

گھڑی کے ایک پل میں اسے پتہ چل گیا
جذبات چھپانے کا سلیقہ آتے آتے آتا ہے۔۔۔۔۔۔

یہ کیا مذاق ہے کہ تقدیر چاہتی ہے۔ ایک ہی رات میں عورت تجربات کے پل صراط سے گزر جائے اور رات بھی وہ ـــــــ

جو پوری جوانی کی اساس ہے۔ اس ایک رات پہ عورت اپنا حسن اور جوانی لٹا دیتی ہے۔ یہی ایک رات اس کی زندگی کی کتاب میں سنہرے حروف میں لکھی رہ جاتی ہے۔ باقی سب کچھ وقت کے ساتھ ساتھ دھندلا جاتا ہے۔

افوہ!

اسے سب شاعروں اور ادیبوں پر بے تحاشا غصہ آیا۔ جو اس رات کے حق میں رطب اللسان ہیں ـــــــ

اس کی زندگی کی یہ بدصورت ترین اور بھیانک ترین رات بن گئی تھی۔

اس نے معاذ کا چہرہ دیکھتے ہی آنکھیں تو بند کر لی تھیں مگر دل کی چیخوں پر ہاتھ نہیں رکھ سکی تھی۔ دل برابر واویلا کر رہا تھا اور کان باہر کی آوازیں سننے سے عاری ہو گئے تھے۔ پتہ نہیں معاذ نے کیا کچھ کیا ہو گا؟ ـــــــ معاملات تک پہنچتے پہنچتے اس نے کس طرح راہ ہموار کی ہو گی؟ ـــــــ اس کے تن پر تو صرف زیوروں کا بوجھ رہ گیا تھا۔ ایک ایک گہنا لوہے کا بن گیا اور لوہا بھی ایسا جو آگ میں تپ رہا ہو۔ جان کنی کے عالم میں ہی پہلی رات گزر گئی۔

صبح بے حد مکروہ تھی۔ معاذ کے چہرے کی طرح ـــــــ

صبح اٹھتے ہی نظر بھی تو اس کے چہرے پر پڑی تھی۔ وہ اس کے قریب بے سُدھ سو رہا تھا۔ کیسے سو رہا تھا، اس نے غور نہیں کیا ـــــــ اس کی نظر تو چہرے میں اُلجھ گئی تھی۔

یا اللہ یہ بدصورت انسان میری قسمت میں لکھ دیا گیا ہے؟ تیری اتنی بڑی اور اتنی خوبصورت دنیا میں کیا میرے لیے یہی مرد تھا ـــــــ؟ میں نے کیا قصور کیا تھا کہ مجھے

سیاہ رات کے آنچل میں باندھ دیا گیا ہے۔

سونیا نے رخصتی سے ذرا پہلے اس کے کان میں آ کر کہا تھا:

"اری ذرا دل کڑا کر کے اپنے دولہا کو دیکھنا۔ ایسا نہ ہو کہ خوف کے مارے بیہوش ہو جائے اور اس کی ساری رات پنکھا جھلنے میں بیت جائے ——"

اس نے سمجھا سونیا مذاق کر رہی ہے —— سونیا کو مبالغہ آمیز مذاق کرنے کی ہمیشہ سے عادت تھی۔ کیونکہ اس نے تو گھر میں ہمیشہ اس قسم کے فقرے سُنے تھے:

"رملیٰ جیسی حسین لڑکی کے لیے دولہا کہاں سے آئے گا؟"

"اسے ایسا شخص تو ہو جو اس کے قریب بیٹھا اچھا لگے۔"

اسے اپنے بہن بھائیوں اور والدین سے یہی توقع تھی کہ کسی ایسے شخص سے اس کا بیاہ رچائیں گے جو نہ صرف اس کے پاس بیٹھا ہوا اچھا لگے بلکہ اس کے دِل کو بھی اچھا لگے۔ ویسے تو ہر خُوبصُورت لڑکی کے لاشعُور میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کا دولہا اس سے زیادہ خُوبصُورت نہ ہو تاکہ زندگی بھر وہی حاوی رہے مگر ایسے مکروہ صُورت دولہا کی تمنا کون کر سکتا ہے جیسا معاذ تھا۔

چلو جی۔ رنگ تو برداشت ہو جاتا ہے۔ ویسے بھی مرد تو سانولے سلونے ہی اچھے لگتے ہیں۔ معاذ کا رنگ سانولا نہیں سیاہی مائل تھا اور رملیٰ کے قریب بیٹھا ہوا ایک دم کالا لگتا تھا۔ صرف رنگ کی بات نہیں تھی۔ اس کے چہرے پر چیچک کے داغ بھی تھے —— جیسے سیاہ مٹی کے اوپر بارش کے قطرے گرے ہوں۔ رملیٰ کو اُبکائی آ گئی۔ کیسی جاہل اور گنوار ماں کا بیٹا تھا۔ ایسے زمانے میں جب کہ طبّی امداد کے مرکز چھوٹے چھوٹے سے قصبے میں بھی کُھل گئے ہیں۔ اس کی ماں نے بچپن میں اسے چیچک کا ٹیکہ نہیں لگوایا تھا اور اسے دیکھو۔ چیچک جیسے موذی مرض کے وار سے بچ گیا۔

وہ نفاست سے پلی ہُوئی لڑکی ——

اپنی چار بہنوں میں سب سے چھوٹی تھی اور سب سے لاڈلی بھی تھی۔

تین بہنوں کی بہت پہلے شادی ہوگئی تھی۔ درمیان میں دو بھائی تھے وہ بھی بیاہے گئے تھے۔

وہ بی۔اے کر کے گھر بیٹھی تھی۔ سب بہنوں میں حسین تھی۔ اپنا بہت خیال رکھتی تھی۔ چہرہ ہمیشہ بیسن سے دھوتی۔ رات کو کریم کی جگہ دُودھ کی بالائی چہرے اور گردن پر لگاتی تھی۔ ہاتھوں پر کئی قسم کے لوشن استعمال کرتی۔ نتیجتہً اس کے ہاتھ چہرے سے بھی زیادہ خُوب صُورت ہو گئے تھے۔

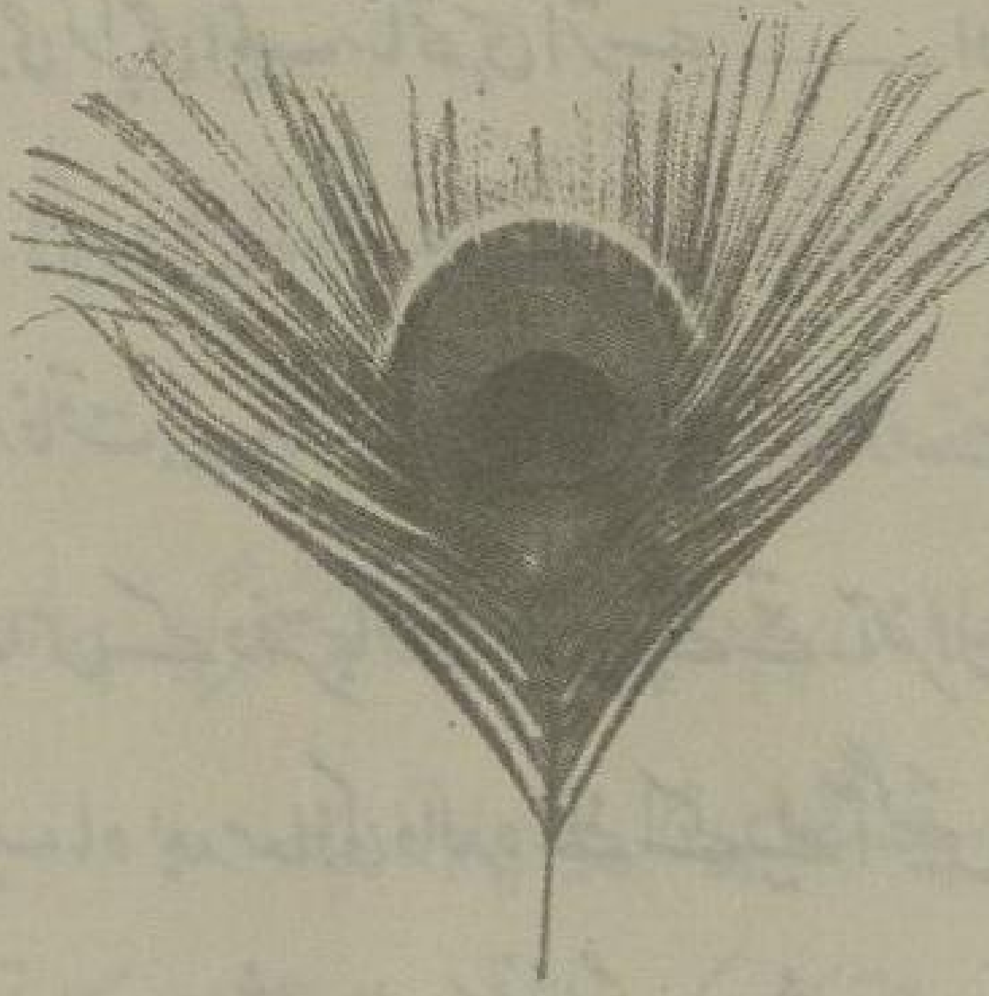
ذرا کی ذرا بازار سے ہوکر آتی تو چہرے پر فوراً ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارتی تاکہ بازار کا گند اگر وا چہرے کے مساموں سے نکل جائے اور آنکھیں بھی صاف ہوجائیں۔ لمبی پلکوں پر کیسٹر آئل لگایا کرتی۔ ہونٹ ٹماٹر سے صاف کرتی۔ نہاتے وقت پانی میں خوشبو ملا لیتی..... بہت پیار تھا اسے اپنے وجود اور اپنے چہرے سے ـــــــ اور اپنا اس طرح خیال رکھتی جس طرح گلاب کے پودے کا خیال رکھتے ہیں ـــــــ اس تر و تازہ گلاب کے لیے وہ کسی پر کشش آفاقی شہزادے کا انتظار کر رہی تھی جس کے شبستان میں وہ اپنے تن کا فانوس روشن کرنا چاہتی تھی۔ اس نے اگلے زمانے کی شہزادیوں کے قصّے سُن رکھے تھے کہ کس طرح جری اور جیالے شہزادے ان کے حُسن کی دھوم سُن کر ان کے دربار میں حاضر ہوتے تھے پھر شہزادی کی کڑی شرطیں پوری کر کے اس کے حق دار بن بیٹھتے تھے۔

لیکن رملی نے تو کوئی کڑی شرط نہ رکھی تھی۔

اسے تو بس اپنے خوابوں کا شہزادہ درکار تھا جسے دیکھ کر آنکھوں کو ٹھنڈک اور کلیجے کو تسکین پہنچے۔

پر ابا جان نے یہ کیا کیا ـــــــ؟

اندھیرا کنواں لا کے اس کے گلے میں لٹکا دیا۔



اباجی دبئی سے واپس آئے تو معاذ کی تعریفیں کرتے نہ تھکتے تھے۔ نیکی، شرافت اور لیاقت کا ہر تصور معاذ کے ساتھ باندھ رہے تھے۔ اُٹھتے بیٹھتے وہ اس کا یوں ذکر کرتے، جیسے بھیڑیوں کی نگری میں اُنھوں نے پہلا انسان دیکھا ہے۔ ہُوا یوں تھا کہ اباجی نے دبئی سے لے کر لاہور تک کا سفر معاذ کے ساتھ کیا تھا۔ معاذ سرکاری طور پر دو سال کے لیے یورپ گیا ہُوا تھا اور اب اپنی ذہانت کے سرٹیفکیٹ لے کر واپس آ رہا تھا اور اباجی دبئی سے اپنا کاروباری ٹرپ لگا کے واپس آ رہے تھے۔ رملی کے بڑے بھائی کا دبئی میں ایک بہت بڑا جنرل اسٹور تھا۔ دُوسرے بھائی کا اسٹور شارجہ میں تھا اور اباجی دونوں بیٹوں کی سرپرستی کرنے کے لیے مسلسل سفر میں رہتے تھے۔ اباجی اس عمر میں سفر کرتے نہیں تھکتے تھے۔ خوب گھُومنے پھرنے کے رسیا تھے —— بھانت بھانت کے لوگوں سے ملتے —— اور ہر زمین کی خُوشبو سُونگھتے —— اباجی بڑے مردم شناس تھے۔ ان کی آنکھوں میں ایک پیمانہ فٹ تھا۔ دیکھتے ہی انسان کو پہچان لیتے —— ایک دم سے پسند کرتے یا ناپسند کرتے۔ خاندان والوں کو ان کی یہ عادت پسند نہیں تھی۔ اسی لیے امی جان مصلحت کی ایک ایسی چادر بن گئی تھیں جو وقت بے وقت اباجی پر تن جاتی ——

معاذ اور اباجی کراچی ایک ساتھ ہی اُترے ـــــ اور لاہور کیلیے ایک ہی فلائٹ پکڑی ـــــ

اس ذراسی رفاقت میں اباجی نے گویا معاذ کے سارے محاسن دیکھ لیے۔ لاہور آنے کے بعد بھی اسے اس کے دفتر جاکر کئی بار مل چکے تھے۔ آخر ان کے گھر سے انس کا اثر کچھ نہ کچھ تو ادھر بھی ہونا تھا۔ ایک ماہ بعد معاذ کی والدہ ملنے کے لیے آگئیں۔ بس ایسی تھیں جیسی گاؤں کی سیدھی سادھی عورتیں ہوتی ہیں۔ نہ شہر والوں کا ساحلیہ، نہ شہر والوں کی سی مکّار ادائیں۔ اور پھر دو چار ملاقاتوں کے بعد وہ حرفِ مدعا زبان پر لے آئیں۔ یعنی انھوں نے معاذ کے لیے رملیٰ کو مانگ لیا۔ رملیٰ کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اسے جو بھی دیکھتا تھا، طلب کرلیتا تھا۔ بڑی آپا کے دیور نے دیکھا تو رشتہ مانگ لیا۔ منجھلی آپا کی جٹھانی کو پسند آگئی۔ وہ اپنے بھائی کے لیے مانگنے چل دیں۔ چھوٹی آپا کی خالہ ساس کا دل اس پر ریجھ گیا اور اپنے بیٹے کے کوائف گنوانے لگیں۔ رشتے داروں کے علاوہ محلے کے لوگ بھی اسے پسند کرتے تھے۔ ایک تو اس کی صورت میں ملاحت تھی، اس پر عادتیں بہت اچھی، بہت دھیمی اور میٹھی طبیعت تھی۔ ہر وقت مسکراتی رہتی ـــــ ہر ایک سے خوش اخلاقی سے پیش آتی۔ اور پھر ان کا خاندان بھی تو بڑا وضعدار تھا۔ اباجی بڑے دیندار اور متقی بزرگ تھے۔ ان کے خاندان کی کوئی بات کبھی باہر نہ نکلی تھی۔ بڑی تینوں لڑکیاں جن گھروں میں گئی تھیں، وہ ان کے گُن گاتے تھے۔ بھابیاں دونوں غیر ہی تھیں مگر خاندان میں یوں رچ بس گئی تھیں جیسے گھی میں شکر ـــــ بڑے دونوں بھائی گو دوسرے ملکوں میں کاروبار کرتے تھے مگر اباجی کو اپنا قبلہ و کعبہ سمجھتے تھے اور امی ـــــ تو چاٹی کے اندر گھومنے والی مدھانی تھیں۔ جتنا گھماؤ، مکھن اتنا زیادہ نکلے ـــــ ان کا گھرانہ لڑائی جھگڑے اور باہمی تنازعوں کے الفاظ سے آشنا نہیں تھا۔ اس لیے سب کے چہروں پر طمانیت

کا ایک نُور برستا تھا۔

جو بھی اُن کے گھر میں آتا۔ پورے گھرانے کا مدّاح ہو جاتا۔

رملی کو معاذ کا رشتہ مانگنے پر تعجب نہیں ہُوا تھا۔

اُس کو معلوم تھا اس پر چودھویں کا رُوپ آ کر ٹھہر گیا ہے اور وہ ستاروں سے گُندھی ہُوئی لڑی ہے جسے ہر کوئی اپنے گلے میں ڈال لینا چاہتا ہے۔

لیکن وہ یہ ضرور سوچتی کہ وہ کون خوش قسمت ہوگا، جس کو وہ اپنا تن من سونپ سکے گی کیونکہ اس کے پاس رُوپ کا اتنا بڑا خزانہ تھا کہ وہ دنیا کی امیر ترین عورت تھی اور عمر کے اس دہانے پر کھڑی تھی جہاں بے شمار ہاتھ آگے بڑھتے ہیں پھر ایک تنومند اور خوب صورت ہاتھ لپک کر پکڑ لیتا ہے اور وہی زندگی کا ساتھی بھی بن جاتا ہے۔

ابا جی نے تو سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

معاذ کی امّی کو صاف کہہ دیا :

"معاذ جیسے لڑکے کے لیے انکار کر کے میں کفرانِ نعمت نہیں کر سکتا۔ رملی آپ کی بیٹی ہے۔ جس دن دل چاہے لے جائیے۔"

اُنھوں نے منگنی کی انگوٹھی پہنانا چاہی تو ابا جی بولے :

"انگوٹھیاں پہنانا دنیاداری کی رسم ہے۔ ہماری زبان پر اعتبار کیجیے۔ اور جب مناسب لگے شادی کی تاریخ رکھ لیجیے۔"

معاذ کی ایک ہی بڑی بہن تھی جو بیاہ کر امریکہ چلی گئی تھی۔ اب ماں کو بیٹے کی شادی کا بڑا ارمان تھا۔ اس لیے اس نے اپنی بیٹی کو خط لکھ کر اس کے آنے کی بابت دریافت کر لیا اور پھر تین مہینے کے بعد کی تاریخ شادی کے لیے مانگ لی۔

دونوں گھروں میں شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔

پہلے تو رملیٰ کا بڑا دل مچلا کہ وہ اپنے ہونے والے دولہا کو دیکھے ——— نہیں ——— بلکہ اس کا دل چاہتا کہ وہ اپنا آپ اُس کو دِکھائے۔ اُس کے اِحساس کے پر جلائے۔ دیکھے تو وہ بِسمل کیسے ہوتا ہے ——— !

مگر پھر اُس نے سوچا ——— کوئی بات نہیں۔ یہ قیامت کا نظارہ اُسی رات سہی ———

ہاں! البتہ اپنے دولہا کی ایک جھلک دیکھنے کو دل بڑا مچلتا۔ اباجی اور سارے گھر والے اسے مل چکے تھے اور اس کی تعریفیں کرتے نہ تھکتے تھے۔ پتہ نہیں اس میں کیا بات تھی ———؟

لیکن عجیب بات یہ ہوئی کہ کسی نے رملیٰ سے اس کا عندیہ نہیں مانگا اور نہ ہی اسے لڑکا دکھانے کی ضرورت محسُوس کی۔

ہاں ایک رات اس نے امّی اور اباجی کو باتیں کرتے سُن لیا تھا۔ پتہ نہیں امّی نے کیا کہا تھا جس کے جواب میں اباّجی بولے :

"مرد کا حُسن اس کا کردار اور کیریئر ہوتا ہے۔ ایک شریف النفس اور اچھے مرتبے والا مرد ایک ہزار حسین اور بیکار نوجوانوں سے بہتر ہوتا ہے۔ اور تم جانتی ہو اس عمر میں معاذ جس پوسٹ پر ہے اس تک پہنچنے کے لیے ساری عُمر ناک رگڑنی پڑتی ہے۔ اس میں اور آگے بڑھنے کی صلاحیت ہے۔ دیکھنا تو ایک دن کتنا بڑا اور مفید آدمی بن جائے گا۔"

"ہاں ———" امّی کی آواز بہت آہستہ تھی :

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ حسن مرد کا ہو یا عورت کا۔ چند دن کی خوشبو کی طرح ہوتا ہے

عورت میں بھی اگر شرم وحیا اور اطاعت ووفا نہ ہو تو کیسی بھی حسین عورت کیوں نہ ہو، مرد کا دل اس سے متنفّر ہو جاتا ہے۔"

"تم بالکل ٹھیک کہتی ہو۔" اباّجی مسکرائے :

"اپنی بچیوں کو بھی سکھاؤ۔"

"اللہ ان کو اپنی امان میں رکھے۔ اب تک تو بڑی لڑکیوں کی طرف سے کوئی شکایت نہیں آئی۔"

"تو تسلّی رکھو۔ انشاء اللہ چھوٹی بھی نبھائے گی۔"

رملیٰ کا دل دھڑک اُٹھا۔

"ہماری بیٹیاں ماشاء اللہ سمجھ دار ہیں۔" اباّجی پھر بولے "ان میں اتنا شعُور ہے کہ اِنسان کے اندر کا حُسن تلاش کر سکیں۔"

"رملیٰ ذرا لاڈلی ہے نا؟"

"کوئی بات نہیں۔ لاڈ تو صرف ماں باپ کے گھر ہوتا ہے۔" اباّجی نے کہا : "اپنے گھر جاتے ہی یہ بھی سیانی ہو جائے گی۔"

"میری رملیٰ بڑی ذہین بچّی ہے اور مجھے امّید ہے وہ سب سے زیادہ خوش رہے گی۔" اباجی بولتے گئے۔

"معاذ میں ظاہری حُسن نہیں ہے مگر وہ باطنی حُسن سے مالامال ہے۔ دیکھنا تو دونوں تمھیں کس قدر خوش نظر آئیں گے۔"

رملیٰ کا دل جیسے کسی نے مٹّھی میں لے لیا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ اس کا ہونے والا شوہر خوبصُورت نہیں ہے۔

کچھ دِن اُس کا دل بُجھا بُجھا رہا۔ بیاہ کے نام پہ جو دل میں ہلچل مچی ہُوئی تھی، وہ ہونا بند ہوگئی تھی۔ شادی کے دن قریب آرہے تھے اور وہ بھانت بھانت کے وہم وگمان میں اسیر ہوگئی تھی۔ اتفاق ہی کی بات ہے۔ ایک روز معاذ گھر آیا تھا اور کافی دیر بیٹھا رہا مگر اس روز وہ اپنی سہیلی کی سالگرہ پارٹی میں گئی ہُوئی تھی اور رات کو واپس لوٹی۔ کاش گھر میں ہوتی تو اپنے تجسّس کی پیاس بُجھا لیتی۔

پھر لرز کر سوچتی کہ دیکھنے سے کیا فائدہ ہوتا ــــــ؟

انکار کرنے کی تو اس میں ہمّت نہیں تھی۔ اس دن ابّا جی کتنے وثوق سے کہہ رہے تھے کہ "ہماری لڑکیوں میں لچک ہے۔ ہر قسم کے حالات میں نباہ کر لیتی ہیں۔"

اس نے یہ معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا۔ جب بھی بازار جاتی سب مردوں کو بڑے غور سے دیکھتی۔ جو ذرا کم شکل ہوتے، ان کو تو کئی بار دیکھتی اور سوچتی کیا اُس کا دولہا ایسا ہوگا ــــــ؟

یا ویسا ہوگا ــــــ؟

اور پھر یہ سوچ کر دل کو تسلّی دے لیتی کہ لوگ کہتے ہیں مرد کو زیادہ خُوب صُورت نہیں ہونا چاہیے۔ اگر خوبصورت عورت کے ساتھ مرد بھی خوبصورت ہو تو لوگ مرد کو زیادہ دیکھنے لگتے ہیں۔ عورت کا حُسن اُس وقت نمایاں ہوتا ہے جب اس کے پہلو میں عام سی شکل وصورت کا مرد جا رہا ہو۔ اس بات پر اُسے اطمینان سا ہوگیا کہ وہ اپنے شوہر سے ہر حال میں زیادہ خوب صورت ہے۔

سانولا ہوگا ــــــ کالا ہوگا ــــــ آنکھیں چھوٹی ہوں گی یا ناک چپٹی ہوگی۔

...... بس اس سے آگے وہ بدصورتی کا کوئی معیار قائم نہ رکھ سکتی۔ پھر ایک سانولا سلونا سا..... من موہنا آدمی اس نے تصوّر میں بسا لیا تھا۔

مگر شادی کی رات جب پچھلے پہر کی نشے میں جھومتی ہُوئی گھڑیوں پر زینہ زینہ قدم

دھڑکتے چپکے سے وہ اس کمرے میں آگیا ـــــــ اور اُس نے گھونگھٹ ہٹایا..... تو رملٰی نے سر جُھکا لیا۔ معاذ نے اُس کی ٹھوڑی کو پکڑ کر اُس کا چہرہ اٹھانا چاہا تو کئی دِنوں کا تجسّس جاگ اُٹھا۔ رملٰی نے بے اختیار ہو کر آنکھیں کھول دیں...... کھولتے ہی یوُں آنکھیں بند کر لیں جیسے انجانے میں کوئی بھیانک دیو دیکھ لیا ہو۔ سر جُھکتا گیا۔ دل بیٹھتا گیا..
....حتّٰی کہ رنج اور صدمے سے اس کی آنکھوں میں آنسوُ آ گئے۔

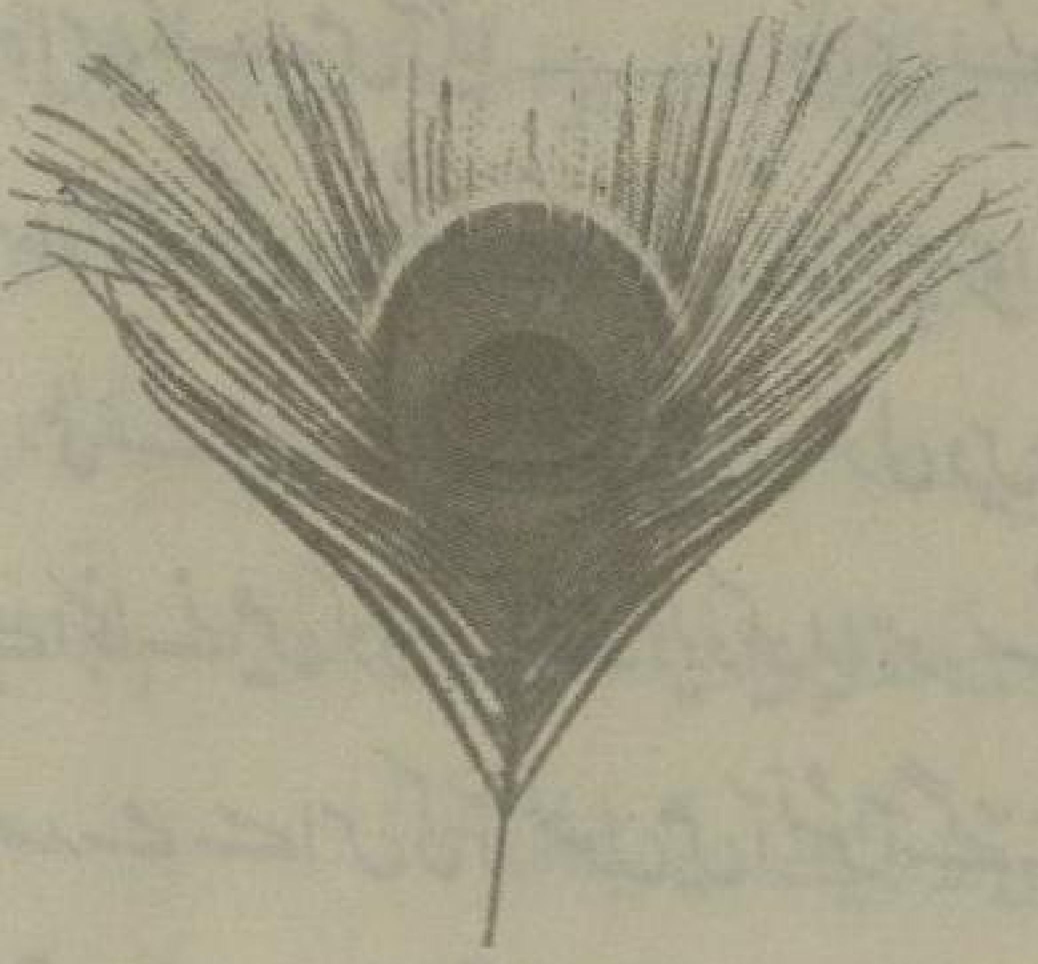
وہ مُسکرا رہا تھا۔

تلے کی اچکن اور سفید عمامے میں اس کا کالا رنگ اور بھی دمک رہا تھا اور سفید سفید دانت واقعی دیو کے دانتوں کی طرح چمک رہے تھے اور سیاہ چہرے پر کالی کالی کٹوریاں سی دُور دُور بکھری ہوئی تھیں۔ اسے بے اختیار ابکائیاں آنے لگیں۔

اس کے بعد وہ کچھ بھی نہ دیکھ سکی۔

آنکھیں کھولنے کو دل ہی نہیں چاہا۔

اس رات کو وہ اپنی کھلی آنکھوں سے نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔



لڑکی جوان ہوتی ہے تو سارے خواب ایک ہی آدمی کے ساتھ وابستہ کر لیتی ہے۔ اپنی خوبصورت جوانی کا آخری موتی بھی اس پر سے وار دینا چاہتی ہے۔ کیا کیا نہیں سوچتی اس رات کے بارے میں ؟

پر کبھی ایسا ہُوا ہے ——— ؟ کہ سیج اسے پھانسی کا تختہ لگی ہو۔ پہلی رات کی سرگوشیاں خنجر اور بھالے بن کر لگتی رہی ہوں اور سُہاگ کا سنگم اسے موت کی آخری سیڑھی لگا ہو۔

ایسا ہی ہوا ——— ؟

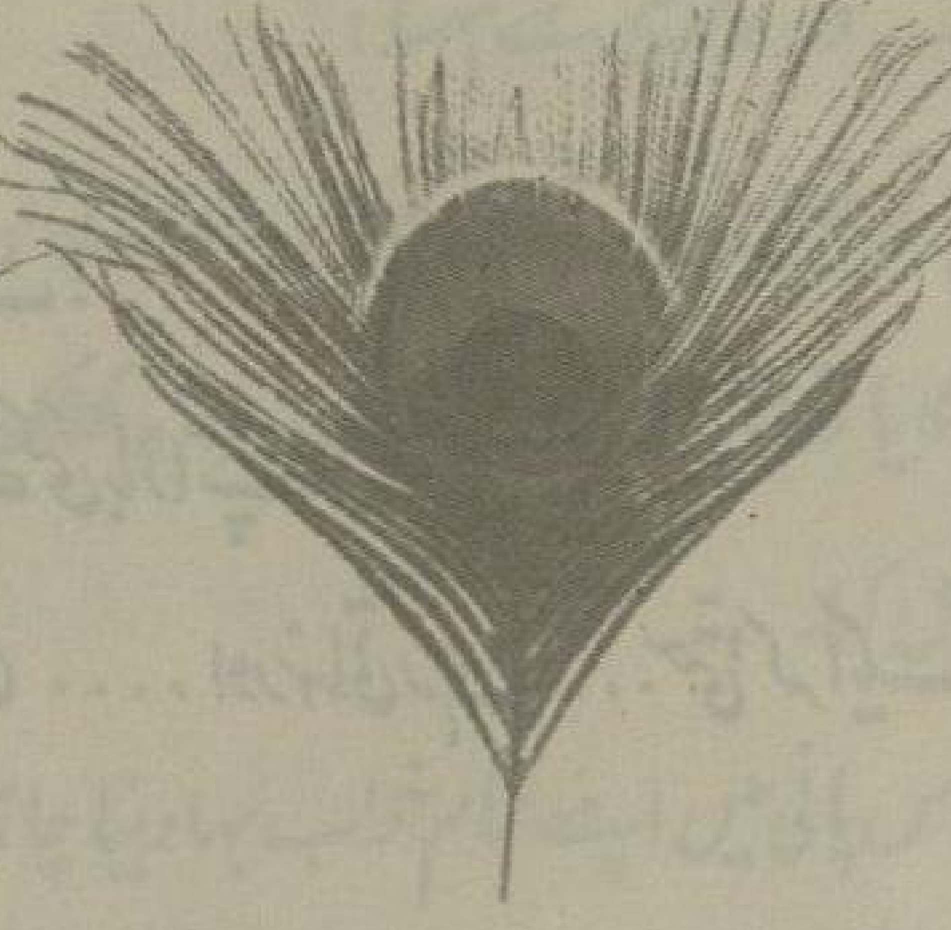
ایسا ہونا تھا۔

اپنا آپ اس ایک رات کے حوالے کرتے ہوئے وہ رُوحانی کرب سے گزری۔

اپنے روئیں روئیں کی آہ و بکا سُنی۔ مگر کچھ بھی نہ کر سکی۔

یہ ظُلم والدین نے تقدیر کے پردے میں کیا تھا ———

وہ کِسے دوش دیتی ——— ؟



صبح خلافِ توقع اس کی نیند جلد کھُل گئی۔ پہلو میں بے خبر سوئے ہوئے معاذ کو دیکھا تو مُنہ سے بے اِختیار معاذ اللہ نکل گیا۔ صبح کو وہ کچھ اور بھی کریہہ نظر آرہا تھا۔ بستر سے نکل گئی۔ دوڑ کر غسل خانے میں گھُس گئی۔ اندر سے کنڈی لگائی اور پانی کے سارے نل کھول دیے۔ پانی شور مچاتا ہوا فرش پر گرنے لگا۔ بعض اوقات پانی کا بے ضرر شور کتنا اچھا لگتا ہے۔ اس کا جی چاہ رہا تھا۔ اس شور کے ساتھ مل کر وہ بھی چیخے چلاّئے۔ حتّٰی کہ دل کا سارا غُبار نکل جائے۔ اُس نے بال کھولے اور جلدی سے چھوں چھوں کرتے نل کے نیچے بیٹھ گئی۔

تیز تیز بہتا پانی بدن پر گرا تو یوں لگا جیسے یہ بھی ہتھوڑے برسا رہا ہے۔ آنکھوں سے نیر بہنے لگے۔

پتہ نہیں اسے رونا کیوں آرہا تھا۔

آخر ہر لڑکی کو اس کی مرضی کا شوہر تو نہیں ملتا۔

مگر یہ کیسا احساسِ زیاں تھا ——— ؟

جیسے مدّتوں سے ایک قیمتی شے سنبھال کر رکھی ہوئی تھی۔ آج اچانک کہیں گر کر

کھو گئی ——

بے وقوف!

اس نے کئی بار اپنے دل کو سمجھایا۔

روتی رہی .... اور نہاتی رہی.... حتیٰ کہ ایک گھنٹہ گزر گیا۔ پھر دروازے پہ ہلکی سی تھاپ پڑی۔

اسے یوں لگا معاذ اُٹھ گیا ہے۔ آخری بار اس نے بدن پر صابن لگایا۔ کئی بار وہ پہلے بھی صابن لگا چکی تھی۔ پتہ نہیں کیا دھونا چاہتی تھی۔ اچھی طرح نل کے نیچے بیٹھ کر پانی بہایا۔ اور پھر سارے نلکے بند کر دیے۔ ایک دم غسل خانے میں سناٹا چھا گیا۔ معاذ کو پتہ چل گیا کہ وہ باہر آ رہی ہے۔ جسم خشک کیا تو یاد آیا۔ اُس نے جلدی میں نئے کپڑے تو غسل خانے میں رکھے نہیں تھے۔ اسی لیے وہی رات والا ڈریسنگ گاؤن پہن لیا۔ گیلے بالوں کو تولیے سے خشک کرتی باہر نکل آئی۔ سامنے ہی معاذ چائے کا ٹرے سامنے رکھے بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی معاذ نے اخبار پھینک دیا اور کھڑا ہو گیا۔

رملیٰ نے نظریں چُرا کر اپنا آپ بچا کر نکل جانا چاہا مگر وہ اس کے بالکل قریب آ گیا۔ دونوں ہاتھوں سے رملیٰ کی کمر تھام لی۔ اس کے ہاتھ بے حد گرم تھے اور رملیٰ ٹھنڈی برف ہو رہی تھی۔ شاید زیادہ دیر تک پانی میں بیٹھی رہی تھی۔

"اتنی دیر لگا دی تم نے۔ میں تو گھبرا گیا تھا۔" اُس نے رملیٰ کے گیلے بال چوم کر کہا ——

"آپ کا خیال تھا میں پانی میں ڈوب گئی ہوں.....؟"

(کاش ڈوب جاتی)

"نہیں" ——— وہ مدہوشی سے ہنسا :

"میں نے سوچا تم خوابوں میں ڈوب گئی ہو۔ نہاتے نہاتے سو گئی ہو..... رات میں نے تمھیں بہت جگایا تھا نا؟ اسی خوف سے دروازہ کھٹکھٹا دیا ———

رملیٰ نے کچھ نہیں کہا۔

کہنا چاہتی تھی۔ اس پانی میں اپنے تمام خواب بہا دینا چاہتی تھی۔ اس لیے تیز و تند دھاروں کے آگے بیٹھی رہی....

وہ خاموشی سے آئینے کے آگے کھڑی ہو گئی۔

تولیہ اُٹھایا بال خشک کرنے کے لیے تو معاذ نے اس کے ہاتھ سے تولیہ لے لیا اور دھیرے دھیرے اس کے بال خشک کرنے لگا۔ وہ اتنے پیار سے رملیٰ کے بال سہلا رہا تھا کہ رملیٰ کے دل میں گدگدی سی ہو رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ معاذ کے ہاتھ سے تولیہ چھین کر دھکا دے دے۔ مگر سُن کھڑی رہی۔ نگاہ اُٹھا کے شیشے کی جانب نہیں دیکھا... مبادا معاذ کے چہرے پر نظر پڑ جائے اور وہ اس کے ماتھے پر ناگواری کی لہر دیکھ لے۔

معاذ نے جب اس کے بال خشک کر دیے تو کنگھا اُٹھا کر بولا :

"سُلجھا دوں بال ——— ؟"

"نہیں ———" نیچی نظروں سے ہی رملیٰ نے کنگھا اس کے ہاتھ سے لے لیا اور بولی :

"آپ میرے بال توڑ دیں گے ——— !"

"نہیں توڑوں گا۔" معاذ نے آہستہ سے اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا اور نرم سا دباؤ ڈال کر بولا :

"اتنے خُوب صُورت بال ہیں تمھارے ـــــ انھیں بھلا کون کافر توڑ سکتا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے میں تمھیں تم سے چھین لُوں۔ آخر تمھاری کسی چیز پر تمھارا ابھی قبضہ کیوں ہو؟"

معاذ نے یہ کہہ کر آنکھیں بند کرلیں گویا اس کی معطّر خوشبو میں کھو جانا چاہتا ہو....

یہی الفاظ..... بالکل یہی الفاظ...... رملی نے ہمیشہ سننے کی تمنّا کی تھی۔ دیوانے کو والہانہ پن کی سٹیج پر لاکر اس کا سودائی پن چاہا تھا

کئی سالوں سے ان سیاہ بالوں کو آنولے اور سیکا کائی سے دھو رہی تھی.....

اس سیاہ ریشمی جال میں اپنے شہزادے کے چہرے کو پھنسانا چاہا تھا۔

اب وہ خود ان بالوں پر اپنا چہرہ رگڑ رہا تھا۔ کیسا پاگل لگ رہا تھا ـــــ کتنا بُرا لگ رہا تھا ـــــ

تمھیں زور سے نہیں پکڑتا۔ تُم ٹوٹ جاؤ گی..... کیسی نازک ہو تم..... جیسے کانچ کی بنی ہو..... بھئی اِتنی نازک لڑکیاں کہاں پہ بنتی ہیں ـــــ؟ اپنے ملک میں رہ کے پتہ بھی نہیں چلا ـــــ اس نے رملی کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

ایسی خُوب صُورت اُنگلیاں..... ایسا رُوپ..... پھر اتنا حجاب......

سب ہی کہتے تھے۔ لڑکی بہت شرمیلی ہے۔ مگر مجھے یقین نہ آتا تھا۔ اس زمانے میں ــــ؟

اس نے رملی کا چہرہ اٹھانا چاہا تو اس نے ٹھوڑی سینے کے ساتھ لگالی۔ وہ زور سے ہنس پڑا ـــــ

"کبھی زبردستی نہیں کروں گا۔ ڈر لگتا ہے ـــــ ٹوٹ جاؤ گی تم ـــــ ہوں۔"

(اور رات تم نے کیا کیا تھا، بد صُورت بھیڑیئے)

رملیٰ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ دل چاہا دھکا دے کر اسے دُور گرا دے اور یہاں سے دُور نکل جائے ..... معاذ کے کالے کالے ہاتھ اس کے گرد لوہے کی زنجیر کی طرح کانپ رہے تھے۔ وہ پاگلوں کی طرح اسے تک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی وحشت سے رملیٰ کو ڈر آ رہا تھا ——

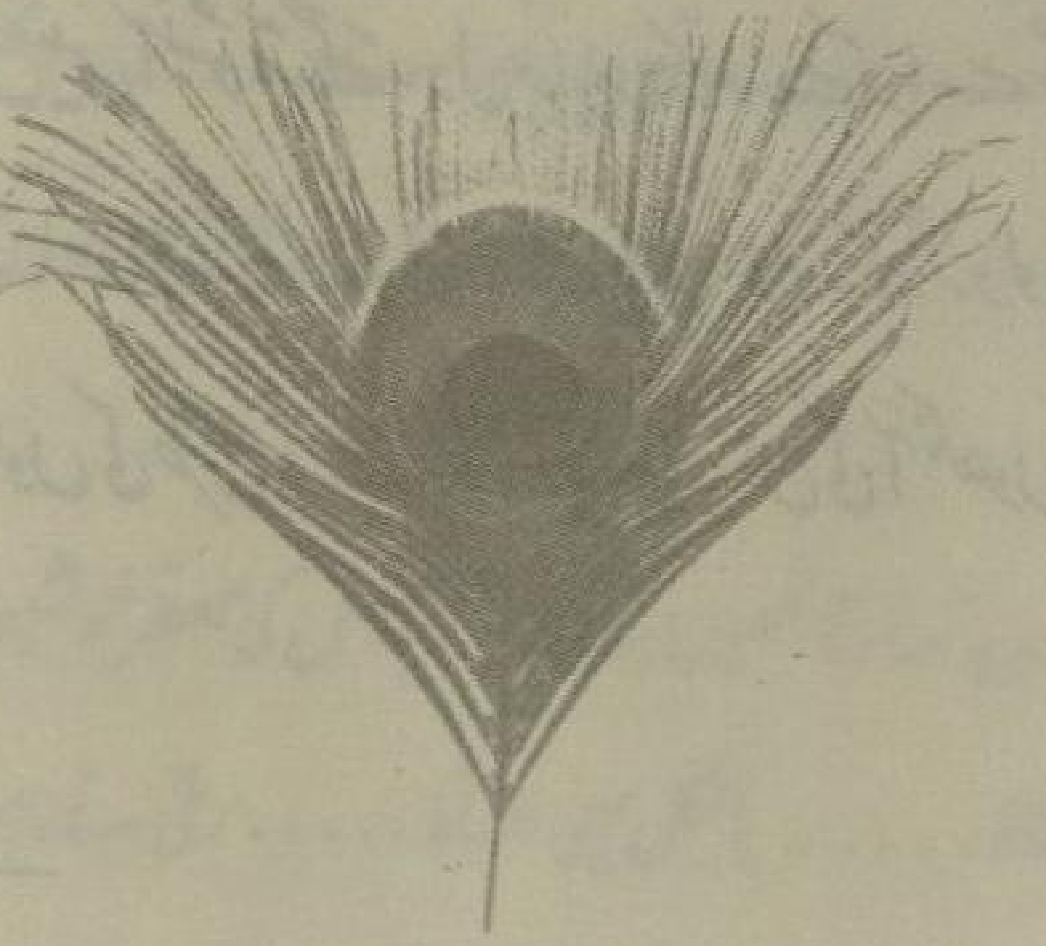
کاش ——

کاش —— اے کاش۔ اس نے سوچا ——

یہ میرا پسندیدہ شہزادہ ہوتا تب ..... تب میں اس کے ہاتھوں میں موم کی طرح گھل اُٹھتی ..... ریت کی طرح بکھر جاتی ——

تب اس نے دل ہی دل میں —— مر جانے کی تمنّا کی ——

تب وہ بے بسی کی سب سے خُوب صُورت تصویر بن گئی ——



ایک مہینہ گزر گیا ——

معاذ کی امّی بہت اچھی تھیں۔ دُلہن کو دیکھ کر جیتی تھیں۔ رملیٰ اپنے کڑھتے دِل کو مناتی، ان کے پاس جا کر بیٹھ جاتی۔ ان کے چھوٹے چھوٹے کام کرنے لگتی اور اُن سے گھنٹوں معاذ کی بچپن کی باتیں سُنتی۔ معاذ جس سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ جس کے قریب آتے ہی اسے اُبکائیاں آنے لگتیں۔ جسے نظر بھر کر دیکھنے کا اس میں حوصلہ نہیں تھا۔ جس کی ہر بات کا جواب وہ یوں دیتی جیسے آنکھیں بند کر کے گلے میں کوئی چیخ دبانا چاہتی ہو۔ ایک مہینے کی گُھٹن اس کے چہرے سے نمایاں ہو رہی تھی۔ چہرہ اتر گیا تھا جیسے چاند کسی ندی میں اُتر جائے۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے تھے۔ کچھ کھانے پینے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ سارا دن تو وہ اپنی ساس کے ساتھ گزار دیتی۔ شام کو اکثر ملنے جلنے والے آجاتے مگر رات کے وہ چند پہر —— جو اسے معاذ کے ساتھ تنہائی میں گزارنے پڑتے، سُولی پر لٹکا دیتے ——

روز رات کو اپنے بستر پر گرتے ھی مر جاتی اور ہر صبح اسے دُنیا والوں کو جی کر دکھانا ہوتا۔ اس کی چُپ چُپ کیفیت —— اس کی کھوئی کھوئی ہیئت اور اس کی زرد زرد رنگت کو اس کی ساس پہچاننے کی کوشش کرتی۔ سنگھار سے عاری چہرہ دیکھ کر بڑی محبت سے سنگھار کی

اہمیت پر لیکچر دیتی۔

سیانی تھی ——

جانتی تھی۔ شادی کے بعد جلدی جلدی نئے موڑ آتے ہیں۔ دُلہنوں نے کئی بھید چرائے ہوتے ہیں۔ جانے یہ اس کی طبیعت کا کون سا موڑ ہے —— !

آ گیا سامنے یہ موڑ —— جب ایک روز مچھلی تلنے کے دوران رملیٰ بے اختیار ابکائیاں کرنے لگی۔ وہ تو ڈر گئی۔ ایک دم کہ جو نفرت اس نے دل میں چھپا کے رکھی ہے۔ غالباً ظاہر ہونے لگی ہے۔ مگر معاذ کی امّی نے مسکرا کر معاملہ سنبھال لیا۔

"گھبراؤ نہیں —— ایسا ہی ہوتا ہے۔"

پھر وہ خود ہی شرما گئیں۔

دُوسری بار سکنجبین کا گلاس تھامے اس کے کمرے میں آئیں اور کہنے لگیں :

"اِس میں مَیں نے نمک بھی ملا دیا ہے۔ گھونٹ گھونٹ کر کے پیو۔ اچھا لگے گا۔"

"جب اُلٹیاں زیادہ آئیں تو نمک اور پانی کا استعمال زیادہ کر دیتے ہیں۔"

اسے سکنجبین اتنا اچھا لگا کہ گھونٹ گھونٹ پینے کی بجائے غٹ غٹ کر کے پی گئی۔

کیسا مزہ آیا —— کتنا سکون ملا —— !

پر کیا فائدہ —— ؟

دو منٹ بعد سارا سکنجبین پھر باہر —— !

شام تک رو رو کر اس کا بُرا حال ہو گیا تھا۔ جب معاذ دفتر سے گھر آیا تو اس کی ماں نے فوراً لیڈی ڈاکٹر لانے کو کہا۔ تب رملیٰ کی سمجھ میں کچھ کچھ آنے لگا۔

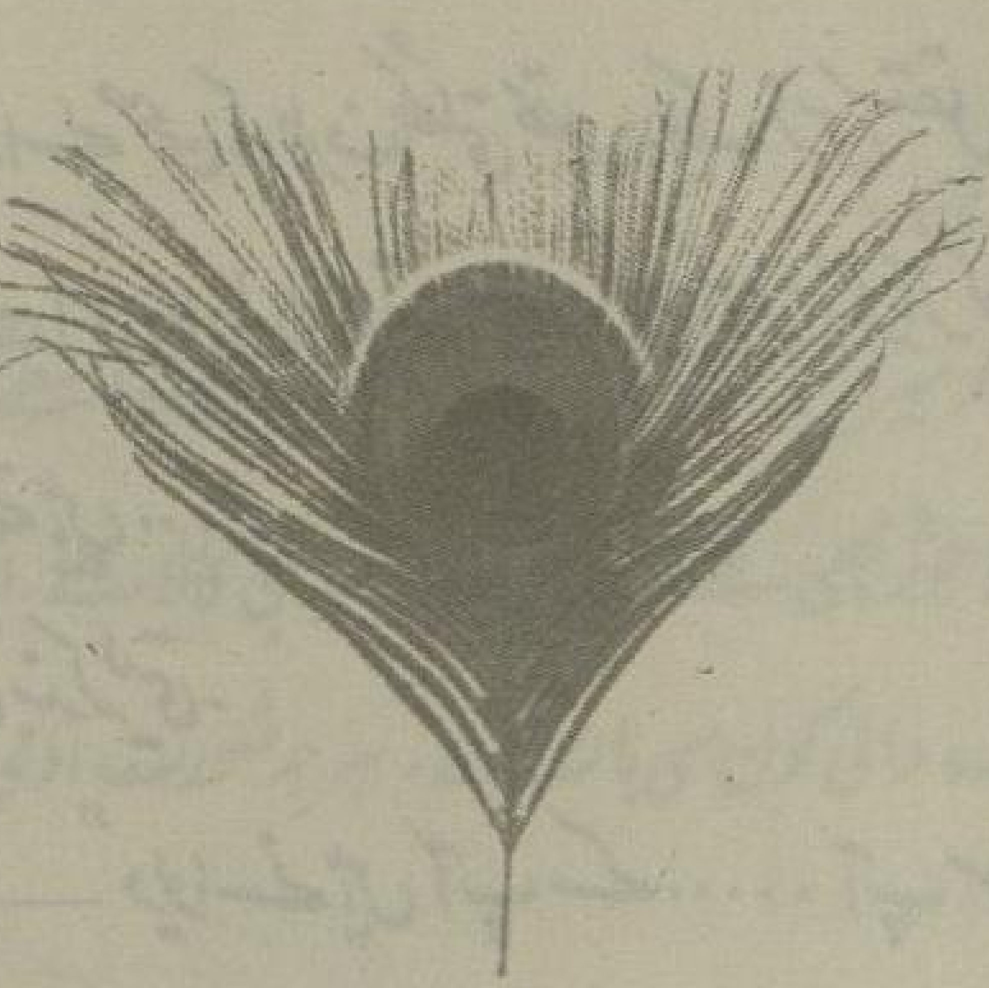
لیڈی ڈاکٹر نے مُسکرا کر تائید کی تو رملیٰ نے بے بسی سے آنکھیں جُھکا دیں۔ اسی

وقت معاذ کے اندھیرے چہرے پر ایک چمکدار ستارہ طلوع ہوا۔ اور بے جی تو بسم اللہ، بسم اللہ کا وِرد کرنے لگیں۔

رملیٰ کی تو جان پر بن رہی تھی۔ سارا پنجرہی گویا الٹ پلٹ ہوگیا تھا۔ مگر سوچ رہی تھی یہ کیسے لوگ ہیں۔

یہ کیا بیماری ہے ــــــ؟

وہ تو صبح سے ھلکان ہوگئی۔ ایک قطرہ پانی کا اندر نہ ٹھہرا اور لوگ آس پاس خوشی سے پھُولے نہیں سماتے ..... اسے بیمار دیکھ کر مسرُور ہورہے ہیں... واہ میرے مولیٰ تیری دُنیا کے رنگ عجب ہیں۔



اس میں شک نہیں کہ اس کی طبیعت اُلٹ گئی تھی مگر پتہ نہیں کیا ہوا کہ بستر پر گری تو یوں لگا اب کبھی نہ اُٹھ سکے گی۔ وہ چیخیں جو گلے میں دبائی تھیں، کسی اور صورت میں نکل رہی تھیں۔ جذبات کی گھٹن نے بھی راہ دیکھ لی تھی۔ کچھ کھایا پیا اندر ٹھہرتا نہیں تھا۔ ایسا لگتا تھا اس کا سارا سسٹم اس سے باغی ہو گیا ہے یا اس کی بے زبانی کے بدلے لے رہا ہے۔

نتیجتہً ایک ہفتے کے اندر اندر اسے ڈی ہائیڈریشن ہو گیا۔ ڈاکٹر نے فوراً ہسپتال میں داخلے کا مشورہ دیا۔ وہ ہسپتال پہنچا دی گئی۔ اسے کچھ ہوش نہ رہا —— آنکھیں بند تھیں اور جسم بے جان۔

صرف چند آوازیں سُن رہی تھی —— اگر وہ اسے ہسپتال میں لے جانے کی بجائے مقتل میں بھی لے جاتے تو اسے کوئی دُکھ نہ ہوتا۔ وہ تو جی جان سے گزر جانا چاہتی تھی۔ اور اس پر یہ غم —— کہ خوابوں کے بند جھروکے پر —— ایک نیا وجود دستک دے رہا تھا

ہسپتال میں اس کی بے حد دیکھ بھال کی گئی ——

ایک ہفتے میں ہی اس کی طبیعت سنبھل گئی۔ مگر ڈاکٹروں کے کہنے پر اسے مزید دو ماہ ہسپتال میں ہی رہنا پڑا۔ معاذ نے پرائیویٹ وارڈ میں ایک خوبصورت کمرہ لے دیا تھا'

جس کی کھڑکیاں پھولوں والے صحن کی طرف کھلتی تھیں۔ ایک نرس مستقل طور پر اس کے پاس موجود رہتی تھی جو ہمہ وقت اس کا دل بہلاتی رہتی اور کبھی کبھی مسکرا کر کہتی ..... آپ کے شوہر آپ کو بہت چاہتے ہیں ..."

رملی آنکھیں بند کر لیتی۔

پھر کہتی ـــــ "دیوانے ہیں آپ کے ..... آپ سوئی رہتی ہیں وہ دیوانوں کی طرح آپ کو دیکھتے رہتے ہیں"۔

"اگر میں کہوں، جگا دوں" ـــــ؟ تو کہتے ہیں:

"نہیں۔ اسے سونے دو۔ یہ بہت نازک ہے"۔

یہ سُن کر رملی بے اختیار رونے لگتی۔

اس کے خوابوں کی نزاکت ٹوٹ گئی تھی

کون جانے وہ کتنی سخت جان ہو گئی تھی۔

"آپ کو بھی ان سے اتنا ہی پیار ہے؟"

تو رملی کا دل مٹھی میں آ جاتا ـــــ اسے ایسا لگتا جیسے نرس اس کا مذاق اُڑا رہی ہے اور صاف کہہ رہی ہے کہ تم جیسی سُندر ناری پر اس کا مرمٹنا کوئی عجیب بات نہیں مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ تم بھی اس کریہہ المنظر آدمی سے پیار کرتی ہو۔ اسے اپنا دین دھرم سمجھ بیٹھی ہو۔ کیا تمھیں کوئی اور نہ ملا تھا پیار کرنے کو ـــــ سر پر سجانے کو ـــــ کیا تمھارے والدین کی نزدیک کی نظر کمزور تھی ـــــ

"آپ پر رشک آتا ہے ـــــ"

بالآخر نرس کہتی تو وہ حیرت اور غصّے سے نرس کی جانب دیکھنے لگتی۔ اس کا دل

چاہتا وہ نرس سے کہے :

"تم لے لو میرا شوہر ـــــ خدا کے واسطے کہیں لے جاؤ اسے ـــــ تمھارے ساتھ اس کا جوڑ بھی ہے۔ تم بھی کالی ہو۔ یہ بھی کالا ہے۔ ایک ساتھ رہتے ہوئے اچھے لگو گے اور شک والی کون سی بات ہے۔ ہر بدصورت آدمی اپنی خوبصورت بیوی کو چاہتا ہے ـــــ

اور اس کے پاس چاہنے کے علاوہ کون سا راستہ ہے؟

مگر رملیٰ یہ سب سوچ کر بے زاری سے منہ پھیر لیتی۔

"جب وہ آتے ہیں تو آپ ان سے باتیں کیوں نہیں کرتیں؟"

نرس مسکراتی ہوئی پھر گفتگو کا آغاز کر دیتی :

"وہ کچھ شرمندہ شرمندہ اُداس اُداس لگتے ہیں۔"

(اسے شرمندہ اور اُداس لگنا چاہیے)

"دیکھیں نا ـــــ؟" نرس اس کے قریب بیٹھ کر اس کے بال درست کرنے لگتی ـــــ" ایسا تو ہوتا ہی ہے۔ شادی کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ بچہ ہو۔ جن عورتوں کا شادی کے بعد بچہ نہیں ہو جاتا۔ وہ بھی پریشان رہتی ہیں۔ میں تو دن رات یہی تماشا ہسپتال میں دیکھتی ہوں اور اللہ کی قدرت پہ حیران ہوتی ہوں اور جس کو فوراً بچہ ٹھہر جائے وہ بھی آپ کی طرح ہلکان سی ہو جاتی ہے۔ مگر آپ ایسا کریں کہ ایک بچہ پیدا کرنے کے بعد دو چار سال آرام کریں۔ بچہ تو والدین کی محبت کو مضبوط کرتا ہے۔"

رملیٰ کھینچ کر ایک لمبی آہ خارج کرتی۔

"آپ بہت حسین ہیں۔" نرس آہستہ سے کہتی " ایک بچہ پیدا کرنے سے

ذرا سا بھی فرق نہیں پڑے گا۔"

پھر ہسپتال کی چیدہ چیدہ خبریں سنانے کے بعد کہتی :

"آج شام جب آپ کے شوہر آئیں نا ؟ تو ان سے ہنس ہنس کر باتیں کیجیے۔ بہت پریشان لگتے ہیں وہ ———"

اس پر رملیٰ کرب سے مسکراتی

"اسی لیے ان کے آنے پر میں جان بوجھ کر باہر چلی جاتی ہوں۔"

رملیٰ جانتی تھی۔

معاذ کے آتے ہی نرس کوئی بہانہ کر کے باہر ضرور نکل جاتی اور اس کے جانے سے پانچ منٹ پہلے آ جاتی تھی۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ کس موڈ میں جا رہا ہے۔ باقی جتنے بھی وزیٹر آتے ان کے پاس بیٹھی رہتی۔ ان کی تواضع کرتی۔ انھیں پھل اور مٹھائی پیش کرتی۔

وہ ہسپتال میں کیا آئی تھی، مہربانوں اور عزیزوں کا تانتا بندھا رہتا۔ کوئی شام ایسی نہ جاتی جب کوئی اسے پوچھنے نہ آتا۔ پہلا ایک ہفتہ امی جان اس کے ساتھ رہی تھیں۔ پھر ابا جی کو ہائی بلڈ پریشر کی تکلیف ہو گئی تھی تو انھیں گھر جانا پڑا تھا۔ دوسرا ایک ہفتہ معاذ کی بے جی اس کے پاس رہتی تھیں۔ تیسرا ہفتہ بڑی آپا جان جن کا نام طوبیٰ تھا، انھوں نے اس کے ساتھ گزارا۔ پھر خضریٰ آپا آ گئی تھیں۔ کسریٰ آپا جن سے اس کی بڑی دوستی تھی، وہ آ کر نہ رہ سکتی تھیں کہ خود اسی عالم میں تھیں۔

کئی سسرالی رشتے دار مزاج پرسی کو آ چکے تھے۔ سب ہی خوب ہنس ہنس کر اسے تسلی دیتے اور زندگی کے نئے تجربوں کے بارے میں بتایا کرتے۔

یوں شام اچھی خاصی گزر جاتی۔

معاذ روز شام کو آتا تھا۔ خوب صورت پھول لے کر —— اور آتے ہی تازہ پھول کمرے میں سجا دیتا۔ اکثر اس کی موجودگی میں بھی لوگ آتے رہتے اور وہ ہنس ہنس کر ان کی پذیرائی کرتا رہتا۔ گپ لگتی رہتی۔

اور جو کبھی اس کا کوئی جگری یار آ کر شرارت سے کہتا :

"یار کیا کر دیا اس لڑکی کو —— !"

تو رملیٰ کا کلیجہ کٹ جاتا —— افسوس —— ایک انتہائی ناپسندیدہ شخص کے ہاتھوں وہ اس حال کو پہنچ گئی تھی۔

کبھی کبھی جب معاذ اکیلا ہوتا تو بڑی آہستگی سے بستر پر بیٹھ جاتا۔ اس کے ٹھنڈے ہاتھ تھام لیتا اور کہتا :

"رملیٰ —— آئی ایم سوری جان ——"

اس کی آواز بے تاب جذبوں سے بوجھل ہوتی۔ اس کے لہجے میں عشق کا رس ہوتا اس کے ہاتھوں کی ایک ایک پور بولتی —— ایک گرم، تیز اور شدید ہوا اس کی سانسوں سے پھوٹنے لگتی —— ایسی ہوا جو شرم و حیا —— انا و خودداری کے ننھے ننھے پودے اکھیڑ کر رکھ دیتی ہے —— جو پاگل آندھیوں کا پیش خیمہ بن جاتی ہے —— جس میں دو متوالے سمٹ کر ایک بگولہ بن جاتے ہیں —— مگر رملیٰ آنکھیں بند کر لیتی —— پھر اپنا بازو اپنے پھڑکتے پپوٹوں پر رکھ لیتی —— اور زار و قطار رونا شروع کر دیتی ——

کتنا پیارا انداز تھا اس کے اعترافِ جنوں کا —— کتنی تپش تھی اس کی دھیمی دھیمی بوجھل بوجھل، گیلی گیلی آواز میں..... کتنی گرمی تھی اس کے احساس میں ——؟

مگر کاش یہ اس کا پسندیدہ آدمی ہوتا۔ اس کے خیالی شہزادے کے رُوپ میں یوں خجل سا سامنے آ بیٹھتا ——— تو وہ مچل کر اس کی گود میں مُنہ چھپا لیتی اور کہتی ——— یہ کیا کر رہے ہو پاگل آدمی ——— دیوانے ———

مجھے توڑ دو .... پھوڑ دو ..... عورت اپنے محبوب کے ہاتھوں ٹوٹنا پھوٹنا چاہتی ہے۔ بکھرنا۔ بگڑنا چاہتی ہے ——— منتشر ہونا چاہتی ھے ——— مٹ مٹ کے بننا چاہتی ہے ——— خِرد کی ہر دیوار جنون کی ضرب سے توڑ دو ——— اور جذبے کا ہر وار مجھ پر آزماؤ.... میں سخت زمین ہوں .... مجھ سے نرمی نہیں برتو ——— آگ جلاؤ مجھ پر ——— اور پھر ہل چلاؤ مجھ پر ——— تاکہ میں تمھیں نئی فصل دے سکوں ....."

مگر وہ کچھ نہیں کہتی تھی ..... بس روتی رہتی۔

معاذ جانتا تھا کہ وہ رو رہی ہوگی۔

اس لیے اس کا بازُو نہیں ہٹاتا تھا۔ وہ اس کی گم صم آنکھوں میں آنسُو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ جب آنسُوؤں کی پہلی بوچھاڑ شیشے کی گولیوں کی طرح اس کے چہرے پر اِدھر اُدھر بکھر جاتی تو وہ خود بازو ہٹا کے آنکھیں صاف کر لیتی۔

"اب تم ٹھیک ہو جان ———؟"

وہ آہستہ سے پوچھتا جیسے تازہ پھُولوں کو سُونگھ رہا ہو۔

"جی ———" وہ بھی رندھے ہوئے گلے سے آواز کھینچ کر نکالتی۔

"بالکل ٹھیک ہو ———؟"

"جی ———"

"خوش ہو ———؟"

"جی ــــــ"

"بہادر منو ــــــ" وہ اس کے گال تھپتھپاتا۔

تو وہ آنکھیں موند کر مسکرانے کی کوشش کرتی۔

(بہادر ہی تو بن کر جی رہی ہوں)

"دیکھو! میں وعدہ کرتا ہوں تمھیں بار بار نہیں توڑوں گا.... نہیں پھوڑوں گا..."

اس پر رملی پھر رونے لگتی۔

بچہ تو اللہ کی طرف سے ایک نعمت ہوتا ہے اس لیے میں بچہ ضائع کروانے کے حق میں نہیں ہوں۔ یہ تکلیف سہہ لو تم .... آئندہ ... آئندہ ....

رملی ذرا کی ذرا پلکوں کا جھروکا وا کر کے اس کے چہرے کی طرف دیکھتی ..... اور ہمہ تن گوش ہو جاتی ــــــ

"آئندہ جب تک تم نہ کہو گی ... جب تک اجازت نہ دو گی .....بس ایک بچہ کافی ہوتا ہے نا ــــــ؟"

وہ اس سے یوں پوچھتا جیسے وہ بڑی تجربہ کار ہو۔ تو وہ منہ دوسری طرف پھیر لیتی۔

معاذ سمجھتا وہ شرما گئی ہے۔

پھر پوچھتا:

"میں جاؤں اب ــــــ"

وہ کبھی نہیں کہتی تھی "تم نہ جاؤ۔ میرے سرہانے بیٹھو۔ میرے چہرے پر پھول مارو۔"

رملی ہمیشہ چاہتی تھی۔ معاذ چلا جائے۔ کہیں اس کے چہرے پر لکھی نفرت پڑھ

نہ لے۔ ڈرتی تھی۔

اور پھر وہ اس کی پیشانی چُوم کر چلا جاتا۔ کیسے گرم گرم ہونٹ لگتے اس کے.....

جیسے زندگی کی حرارت اُنڈیل رہے ہوں۔

لیکن کاش یہ ہونٹ خوب صورت بھی ہوتے!

معاذ نے کئی بار اس سے پوچھا تھا کہ وہ رات کو اس کے پاس ٹھہر جائے۔

مگر رملیٰ نے ہمیشہ سختی سے منع کر دیا تھا اور اس کی مخالفت تو بے جی نے بھی کی تھی۔ دانا تھیں۔ جانتی تھیں۔ نیا ولولہ ہے۔ رات کو اس کا ٹھہرنا ٹھیک نہیں۔

معاذ چلا جاتا تو رملیٰ اپنے کمرے کی چھت کو تکا کرتی۔ دل کی طرح کمرہ بھی خالی خالی لگتا۔ وہ کتنا اپنے دل کو مناتی —— جھکاتی —— مگر وہ تو معاذ سے دُور... اور دُور بھاگ جانا چاہتا....

کبھی کبھی رملیٰ کا جی چاہتا کہ وہ مر جائے ——

ایک روز اس نے نرس کو قریب بُلا کر پوچھا:

"سِسٹر! اس بیماری میں لوگ مر بھی جاتے ہیں؟"

"کس بیماری میں ——؟" نرس نے پوچھا۔

"یہی جو مجھے ہے؟"

اس پر نرس قہقہہ لگا کر ہنسی اور بولی:

"ارے یہ کوئی بیماری ہے۔ PREGNANCY کوئی بیماری نہیں ہوتی۔ یہ تو انسانی METBOLISM میں ایک تبدیلی ہے اور تبدیلی کے کچھ ردِ عمل ہوتے ہیں جو طبیعت کی خرابی کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں اور یہ علامتیں عارضی ہوتی ہیں۔ دنیا کی لاکھوں کروڑوں عورتیں روزانہ

ان تجربوں سے گزرتی ہیں۔"

"پھر میں بستر پر کیوں پڑ گئی ہوں۔"

"بعض عورتوں کو پہلی مرتبہ ذرا زیادہ تکلیف ہو جاتی ہے۔ اگر معدہ کھانے پینے کی چیزیں قبول نہ کرے یا اُلٹیاں آنے لگیں تو ظاہر ہے جسم کا پانی اور طاقت ضائع ہونے لگتے ہیں مگر فوراً ہی طبّی امداد پہنچانے سے عورتیں بالکل ٹھیک ہو جاتی ہیں۔ اب دیکھیں نا؟ آپ پہلے سے کتنی بہتر ہیں۔ چہرہ بھی کتنا بارونق ہو گیا ہے۔ کھا پی بھی رہی ہیں۔ خوراک ہضم ہو رہی ہے۔ اگلے مہینے انشاء اللہ بالکل نارمل ہو جائیں گی۔"

"تمہیں یقین ہے سسٹر ـــــ؟"

"ہاں ہاں ـــــ عام طور پر شروع کے تین مہینے طبیعت زیادہ خراب رہتی ہے۔ رفتہ رفتہ سب ٹھیک ہو جاتا ہے اور اگر کسی کو پورے نو مہینے ایسی تکلیف رہے تو بچّے کی پیدائش کے بعد فوراً ٹھیک ہو جاتی ہے۔ مگر اب تو حیرت انگیز دوائیاں ایجاد ہو چکی ہیں۔"

"تو اس کا مطلب ہے میرے مرنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔" غیر ارادی طور پر رملی کے مُنہ سے نکل گیا۔

اس پر نرس دوبارہ ھنسنے لگی۔

"آپ کو یہ وھم کیوں ہو گیا ھے۔ بی بی آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔"

پھر وہ اس کے قریب بیٹھ کر اچھی اچھی باتیں کرنے لگی۔ رملی نے ذرا بھی دلچسپی نہیں لی تو وہ بولی :

"جب پہلی بار بچّہ پیدا ہونے والا ہو تو بعض عورتیں وھم میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ یہ بھی ایک قدرتی بات ہے۔ ان پر قنوطیت چھا جاتی ہے اور رات کو بھیانک اور بے معنی

خواب آنے لگتے ہیں مگر یہ قنوطیت بھی ایک قدرتی سا عمل ہے۔ آپ تو پڑھی لکھی ہیں۔
آپ کو صورتِ حال کا اچھی طرح علم ہونا چاہیے۔ آجکل آپ اچھی اچھی کتابیں پڑھا کریں۔
پیاری پیاری باتیں سوچا کریں۔ آپ کی منفی سوچ کا اثر آپ کے بچے کی ذہنی نشوونما پر پڑ سکتا ہے۔
اور نہیں تو آپ اپنے بچے کی صورت کو تصور میں لانے کی کوشش کریں۔"

اُونہہ

رملی نے کروٹ بدل لی۔

اُونہہ ـــــ پتہ نہیں کس کی شکل کا بچہ ہوگا۔ اگر ہو بہو اپنے باپ پر ہوا تو....
افوہ ـــــ پھر وہ کیسے برداشت کر سکے گی اس بچے کو ـــــ کتنی کراہیت محسوس ہو گی
اسے۔ اپنے بچے سے ـــــ شوہر کی نفرت تو چپ کے پردے میں چھپ گئی ہے۔
بچے کی نفرت کیسے چھپے گی ـــــ؟ کیا اپنے بچے کا گلا اپنے ہاتھوں سے گھونٹا جا سکے گا؟
اور شومئ قسمت سے اگر وہ لڑکی ہوئی تو ـــــــــــ؟

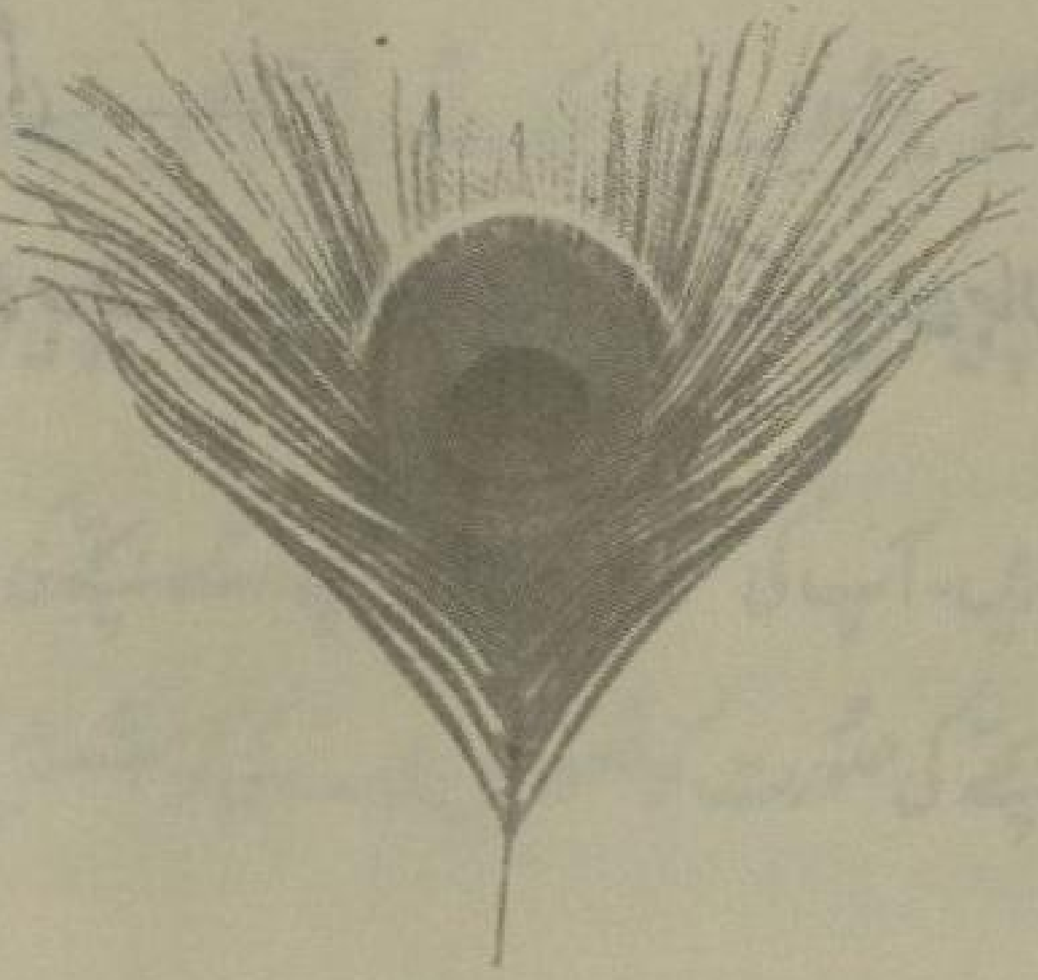
پھر کتنی دیر تک لیٹی وہ زندگی اور موت کے بارے میں سوچتی رہی.... اس طرح
بھری بہار میں حُسن کی چادر اوڑھ کر اس کو مر جانا بہت دلکش اور بہت رومانٹک لگ رہا تھا...
لوگ کس قدر افسوس کریں گے ـــــ کہیں گے اس بے چاری نے دُنیا میں
کچھ نہ دیکھا..... افسوس صد افسوس.....

مگر پھر اپنی سوچ پر اُسے خود ہی بے تحاشا رونا آنے لگا۔

کہ یہ اُس کے جینے کے دِن تھے۔ اُسے زندگی سے پیار تھا۔ اُس نے کسی کا کیا
بگاڑا تھا۔ مگر افسوس۔ اگر وہ مر گئی تو اُس کی قیمتی زندگی ضائع ہو جائے گی۔ کس کے کارن

جائے گی یہ زندگی ——— ؟

کیا وہ صرف ایک بدصورت انسان کے کارن جان سے کھیل جائے گی ؟



ایک دن بعد اسے ہسپتال سے چھٹی ملنے والی تھی۔ اس شام بے جی پہلے آ گئی تھیں۔ اُنھوں نے آتے ہی اُس کی پیشانی چومی اور کہنے لگیں :

"دوہٹی ! کل تمھیں چھٹی ملنے والی ہے۔ لاؤ تمھارا فالتو سامان سمیٹ دوں بلکہ غیر ضروری چیزیں آج ہی گھر لے جاؤں ـــــ"

بے جی رملیٰ کو ہمیشہ دوہٹی (دولہن) ہی کہتی تھیں۔ اس کا نام نہیں لیتی تھیں اور جب وہ اُسے دوہٹی کہتیں تو رملیٰ کے دل پر آرے چلنے لگتے۔ اُس نے کبھی ذہنی طور پر اپنے آپ کو دولہن محسوس نہیں کیا تھا۔ اُسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ ابھی تک سبز غلافوں میں چھپی بند کلی ہے۔ کوئی شے ہے جو اُسے گلاب نہیں بننے دے رہی ـــــ کوئی کالا پردہ ہے جو اُس کی چاند چاند زندگی کے آگے آ گیا ہے ـــــ

دولہن ارمانوں سے لدی ہوئی ایک پالکی ہوتی ہے ـــــ یا ـــــ مدھرا کا ایسا جام ـــــ جو مسکرائے تو چھلکتا ہے۔ گنگنائے تو چھلکتا ہے ـــــ ٹھنکے تو چھلکتا ہے ـــــ ڈگمگائے تو چھلکتا ہے ـــــ غرض اُٹھتے بیٹھتے چھلکتا ہے ـــــ مگر وہ تو سیپی میں بند ہوئی پڑی تھی ـــــ

کم نصیبی یہ تھی۔ قدرت اس پر اپنا عمل پھونک رہی تھی ــــــ

بے جی ہر روز گھر سے اس کے لیے مزے دار کھانے اور تازہ پھل بھیجا کرتی تھیں۔ اُس کے کمرے میں کھانے پینے کی اتنی چیزیں اور اتنے برتن اکٹھے ہو گئے تھے کہ کمرہ اچھا خاصا ڈائننگ رُوم بن گیا تھا۔ وہ اُٹھ کر یہ سب چیزیں سمیٹنے لگیں تو رملیٰ نے آہستہ سے اُن کا بازو پکڑ لیا اور بولی :

"بے جی! میں کچھ دنوں کے لیے اپنی امّی کے ہاں چلی جاؤں ــــــ ؟"

بے جی نے اپنی زمانہ شناس نظریں اُٹھا کر رملیٰ کے چہرے کو غور سے دیکھا اور پھر مسکرا دی۔ وہ بھی یہی چاہتی تھیں کہ کچھ دن رملیٰ معاذ سے دُور ہی رہے۔

"ہاں ..... ہاں ....." پیار سے انھوں نے رملیٰ کا نازک ہاتھ تھام لیا اور کہنے لگیں "جاؤ کچھ دن اپنی امّی کے ہاں رہ آؤ ..... اور دیکھو! وہاں آرام کرنا۔ بدپرہیزی نہ کرنا ــــــ"

"نہیں کروں گی بے جی ــــــ" رملیٰ اس اجازت سے کھِل اُٹھی۔

"تھوڑے دن اور تکلیف کے ہیں اور آجکل گرمی بھی زیادہ ہے۔ انشاء اللہ دو مہینے بعد ایسی کوئی تکلیف نہیں رہے گی" ــــــ

"ٹھیک ہے بے جی۔" رملیٰ انکساری سے بولی "امّی کو آج فون کر دیجیے گا۔ آ کر مجھے لے جائیں" ــــــ

"کر دوں گی ....." پھر اُس کے کپڑے سمیٹتے ہوئے بولیں :

"یہ میلے کپڑے سارے مجھے دے دے۔ میں دُھلوا کر تجھے بھیج دوں گی۔ اور گھر سے جو نیا سامان منگوانا ہو، وہ بھی بتا دے۔ کل معاذ کے ہاتھ بھیج دوں گی۔"

جونہی بے جی نے معاذ کا نام لیا۔ وہ دروازہ کھول کے اندر داخل ہُوا۔ رملیٰ کے چہرے پر بشاشت دیکھ کر کھل اُٹھا۔

"رملیٰ کو چُھٹی مِل گئی بے جی ——— ؟"

"ہاں ——— کل صبح ——— مگر رملیٰ پہلے اپنی امی کے گھر جائے گی۔"

معاذ کا چہرہ پہلے بجھا ——— پھر جلنے لگا۔ گھوم کر رملیٰ کی طرف مُڑ گیا۔ وہ نظریں جھکائے کھڑی تھی۔ اسے بہت غور سے دیکھ کر بولا :

"جیسے رملیٰ کی خوشی ———"

رملیٰ نے اسی لمحے سوچا ——— "کاش تمھاری صورت بھی اِتنی اچھی ہوتی جتنا اچھا تمھارا دل ہے۔"

"آج امّی جان تمھیں دیکھنے آئیں گی ؟"

"پتہ نہیں۔" رملیٰ نے بہت آہستہ سے کہا۔

"میں جا کے فون کر دوں گی۔" بے جی نے سارے برتن اکٹھے کر لیے تھے اور جانے کو تیار ہو گئی تھیں۔

نہیں . . . . بے جی میں کل صبح دفتر سے جلدی آجاؤں گا اور خُود ھی رملیٰ کو چھوڑ آؤں گا۔ بہر حال اِطلاع تو انھیں دینی پڑے گی نا ؟

"ہاں . . . . ."

"اچھا بیٹا مجھے نیچے تلک چھوڑ آؤ۔ پھر تم وو ھٹی کے پاس بیٹھنا۔"

معاذ نے آگے بڑھ کر کپڑوں والا اٹیچی اور برتنوں والی ٹوکری اُٹھالی۔ بے جی نے خالی فلاسک ہاتھ میں پکڑ لی۔ آگے بڑھ کر رملیٰ کی پیشانی کو بوسہ دیا اور جاتے جاتے بھی فالتو

چیزیں اُٹھاتی گئیں۔

رملیٰ ان کے بوڑھے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ بے جی ضعیف تھیں۔ ساٹھ سال کی عمر ہو گی۔ سر کے سارے بال سفید تھے مگر جسمانی طور پر تنو مند تھیں۔ ان کے بوڑھے ہاتھ دیکھنے میں بڑے پُر اعتماد اور مضبوط نظر آتے۔ کام کرتے وقت ذرا نہیں کانپتے تھے بے جی نے رملیٰ کو خود بتایا تھا کہ وہ تیس سال کی عمر میں بیوہ ہو گئی تھیں۔ ان کا شوہر زمینوں کے بٹوارے میں مارا گیا تھا۔ اس وقت ان کے دو بچے تھے۔ منزہ اور معاذ —— پھر دُشمنیوں کے یہ چکر بڑھتے ہی رہے۔ انھوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ حتّیٰ کہ راتوں کو بندوق کندھے سے لگا کر کھیتوں کی حفاظت کی۔ دونوں بچّوں کو اعلیٰ تعلیم دلوانے کے لیے شہر آ گئیں۔ شہر میں رہنے کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی۔ کبھی زمینوں کی آمدنی سے گزارا ہو جاتا اور کبھی کسی کڑے وقت میں کوئی قطعۂ زمین بیچ دیا کرتیں۔ یہ کوٹھی جو انھوں نے چھاؤنی میں خریدی تھی، بڑی کشادہ اور آرام دہ تھی۔ گو پُرانے طرز کی تھی۔ اس کو رفتہ رفتہ جدید ڈیزائن میں ڈھال لیا تھا۔ یہیں دونوں بچّوں کو رکھ کر پڑھایا۔ منزہ نے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کر کے پہلے ہسپتال میں ملازمت کر لی تھی۔ پھر اپنے ایک ہم پیشہ سے شادی کر کے یو۔ ایس۔ اے چلی گئی تھی۔ معاذ کو اُنھوں نے سی اے کرایا تھا۔ دو سال کے لیے یورپ گیا تھا اور اب سیّد گروپ آف کمپنیز کا فنانشل ایڈوائزر ہو گیا تھا۔ اپنی نیک نامی، ذہانت اور قابلیت کی وجہ سے تعلیم ختم کرتے ہی ملک میں اسے مُلازمت مِل گئی تھی۔ بے جی خوش رہتی تھیں۔ کبھی کسی کو بُرا نہیں کہتی تھیں۔ ہمیشہ کہتی تھیں کہ خُوش اخلاقی سے دُشمن بھی موم ہو جاتے ہیں اور ہمّت کرنے سے ہر مشکل حل ہو جاتی ہے۔ ان کی ساری زندگی ہمّت و جُرأت کی بے مثال کہانی تھی۔ معاذ اُن کا ادب ہی نہیں کرتا تھا ان سے عشق بھی کرتا تھا۔ سارا گھر ان کی مرضی پر چھوڑا ہُوا تھا مگر کسی کو بھی جبر یا گھُٹن کا احساس

نہیں ہوتا تھا۔ رمّی نے بہت کوشش کی کہ وہ معاذ کی ماں سے بھی نفرت کرے۔ لیکن بے جی اِتنی میٹھی، اِتنی ٹھنڈی اور اِتنی پُر مغز تھیں کہ وہ ان سے نفرت کرنے کا کوئی جواز پیدا نہ کر سکی۔

نہ تو وہ کبھی فالتو بات کرتیں، نہ اپنی زندگی کا ایک پل بھی ضائع کرتیں۔ پانچ وقت کی نمازوں کے علاوہ رات کو تہجد کے لیے بھی اُٹھا کرتیں۔ اُنھوں نے شہر والے گھر میں بھی بھینس رکھ چھوڑی تھی۔ کہتی تھیں زمینداروں سے دیسی گھی اور خالص دُودھ کی لت چھُوٹتی نہیں۔ علی الصُبح بھینس کا دُودھ خود نکالتیں۔ البتہ شام کو ملازم دوہ کر لاتا تھا کیونکہ اس وقت وہ مغرب کی نماز پڑھا کرتیں۔

"بے جی ـــــ آپ آرام بھی کیا کریں۔"

"آرام ـــــ" وہ اپنی سُکڑی ہُوئی آنکھیں پُوری کھول کر رمّی کی طرف دیکھتیں۔ "آرام کیا ہوتا ھے دوھٹی ـــــ مجھے ہمیشہ کام میں آرام اور سُکھ مِلا ہے۔ دیکھونا! تم کوئی بھی مشین خرید لو، کتنی بھی قیمتی کیوں نہ ہو، اگر اسے اِستعمال نہیں کرو گی، باندھ کے رکھ چھوڑو گی تو کیا اسے زنگ نہیں لگ جائے گا۔ پڑی پڑی بیکار ہو جائے گی۔ یہی حال اِنسانی جسم کی مشینری کا ھے۔ اگر بستر پر بیٹھ کر کھانے لگ گئی تو چربی چڑھ جائے گی۔ وزن بڑھ جائے گا۔ یہ عُمر عارضوں کی عُمر ھے۔ میرا بلڈ پریشر لو رھتا ھے۔ جنھوں نے زندگی بھر صبر کی سِل سینے پر رکھی ہو، آخری عمر میں اُن کا بلڈ پریشر لو ہو جاتا ھے۔ کام میں لگی رہوں تو سب بھُول جاتی ہوں ورنہ بس ڈاکٹروں کے چکر میں پڑی رہوں گی۔ جب تک دم ہے کام کروں گی..... اللہ اسی طرح چلتے ہاتھ پاؤں کے ساتھ اُٹھالے تو بہت اچھّا ہے۔ کبھی دھرتی پہ بوجھ نہ بنائے خُدا.... یہاں سے جاتے ھی آرام کا وقت شروع ہو جائے گا...... ہاں قبر میں تو قیامت تک آرام ھی کرنا ھے۔"

پھر تھوڑی دیر چُپ رہ کر بولیں :

"تم ھی نے سنبھالنا ھے یہ گھر —— یہ بکھیڑے —— عورت بیچاری کی تو ساری زندگی یہی سوچتے گزر جاتی ھے کہ آج کیا پکے گا۔ وھی ایک سے کام —— وُھی صدیوں پُرانے بکھیڑے ..... تھوڑے دن عیش کر لو، ہنس کھیل لو۔..... ابھی میں کر سکتی ہُوں پھر سنبھالتی رہنا اپنا گھر گرہستی ..."

"میرا یہ مطلب نہیں تھا بے جی۔" رملی شرمندہ سی ہو گئی۔

"ارے میں جانتی ہُوں تمھارا کیا مطلب تھا ؟ میں بھی ایسی تھی۔ تمھاری طرح... شروع شروع میں شادی اور بچّوں سے ھمیشہ متنفر رھتی تھی۔ معاذ کے ابّا جی کو بچّوں کا بہت شوق تھا۔ دو بچّے اُوپر تلے ہو گئے تو میں چلّانے لگی۔ اللہ کا نیک بندہ چُپ کر گیا۔ پھر نہیں کہا مُجھے اور بچّے چاھئیں —— ھائے کیا معلوم تھا اتنا ذرا سا ساتھ ہے.....

یہ کہتے کہتے بے جی کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ انھوں نے چھُری ہاتھ سے رکھ دی اور دوپٹے کے کونے سے اپنی گیلی آنکھیں صاف کر کے بولیں :

مُجھے گھر کے کاموں سے چڑ تھی۔ پھر ایسا بوجھ آ پڑا کہ گھرداری کے علاوہ زمینداری بھی کرنا پڑی اور وہ جو نسل در نسل مقدمات چل رہے تھے، ان کو بھی بُھگتنا پڑا.... خیر جانے دو .... میں کیا پُرانے قِصّے لے بیٹھی۔

ہاں ! ایک بات ضرُور کہُوں گی۔ بڑی آن سے زندگی بتائی ہے میں نے —— کِسی عزیز رشتے دار کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ اللہ نے مجھے اس خودداری اور صبر کا اجر بھی دیا ہے۔ سلامت رہیں میرے بچّے۔ میرے اِشارے کو حُکم مانتے ہیں۔

پھر وہ اس کی طرف دیکھ کر بولیں :

"تم کیا سر جھاڑ مُنہ پھاڑ بنی بیٹھی ہو۔ اُٹھو.... اُٹھ کر ہاتھ مُنہ دھولو۔ کپڑے بدلو۔ سنگھار کرو۔ معاذ کے آنے کا وقت ہو گیا ہے۔"

رملیٰ ان کے آگے بحث اور جرح نہیں کرتی تھی۔ وہ جان گئی تھی کہ ایک زمانے سے ٹکرانے والی یہ عورت بڑی مُحترم ہے۔ مگر بے جی کے لیے یہ احترام ـــــ معاذ کے لیے محبت کا کوئی نرم گوشہ تو پیدا نہیں کر سکا۔ وہ اُٹھ کر جانے لگی تو اسے دیکھ کر کھل اُٹھیں :

"سدا سہاگن رہو۔ جُگ جُگ خوشیاں دیکھو ـــــ اپنے شوہر کی چھاؤں میں پھلو پھُولو ـــــ اللہ تمھیں گرم ہوا سے محفُوظ رکھے۔

وہ اندر چلی گئی۔ مگر بے جی کی دُعائیں اس کا پیچھا کرتی رہیں۔ گھڑی بھر کو ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے آگے رُک کر اُس نے اپنا سراپا دیکھا اور دل میں سوچا :

بے جی اسے دُعائیں دے رہی تھیں یا اپنے بیٹے کو۔

کِتنا خُوبصُورت انداز تھا بیٹے کو دُعا دینے کا۔

آخر اس بیٹے کے سوا ان کے پاس کیا تھا ـــــ ؟

ایک مکرُوہ صُورت ـــــ بدزیب اور بھدّا بیٹا ـــــ اُن کی کُل کائنات تھا۔ جس کے لیے وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کے چاند ایسی دُلہن لائی تھیں۔ مائیں خود غرض ہوتی ہیں۔ انھیں اپنے بیٹے کی صورت تو نظر ہی نہیں آئی۔ اگر وہ کسی معمولی شکل وصورت کی لڑکی سے معاذ کی شادی کر دیتیں تو بھی کام چل جاتا۔ معاذ کے ساتھ بیٹھی ہُوئی ایک ایورج لڑکی بھی خوبصورت لگ سکتی تھی۔ یہ ظلم انھوں نے رملیٰ کے ساتھ کیوں کیا ـــــ ؟

لیکن رملیٰ بی! تم بھُول رہی ہو۔

یہ ظلم تمھارے ساتھ بے جی نے نہیں، تقدیر نے کیا ہے۔

تو کیا کروں ــــــ؟

اس نے سنگھار کرتے کرتے سوچا ــــــ کس طرح اپنے دل کو مناؤں ــــــ

کس طرح اپنے جذبات سے ہاتھاپائی کروں۔

وہ قریب آتا ہے تو نفرت کی ایک گھٹا سارے اعصاب پر چھا جاتی ہے....

بے جی اپنے وجود کی خوشبو چھوڑ کر معاذ کے ساتھ باہر نکل گئیں تو رملی نے ہسپتال کی کھڑکی میں کھڑے ہو کر باہر کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔

دنیا کا وھی چلن رہتا ہے ــــــ

زندگیاں بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں ــــــ

پتہ نہیں اس کی زندگی کا کیا انجام ہوگا ــــــ

امی جان کے گھر آ کے رملی کو بڑا سکون ملا۔ ماں کا گھر ہی ایسا ہوتا ہے۔ عورت جس عمر میں بھی ـــــ جن حالات میں بھی ماں کے گھر آتی ہے۔ بے فکری کے احساس سے چور ہو جاتی ہے۔ مگر رملی تو محض معاذ سے دور رہنے کیلئے آئی تھی اور اب اس کے میکے رہنے پر کسی کو اعتراض بھی نہ تھا۔ اس کی کوکھ بوجھل تھی۔ شادی کا موتی کوکھ کی سیپ میں اتر جائے تو دنیا والے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ ان کے خیال میں بات بن جاتی ہے۔

یوں بھی رملی دو مہینے ہسپتال میں رہ کر آئی تھی۔ سب جانتے تھے۔ پریشانی کاٹ چکی ہے اس لیے اسے اب آرام کی ضرورت ہے۔ ایسے میں امی جان بھی یہی سوچ رہی تھیں کہ کچھ دن ادھر رہ لے لیکن اب تو اسے یہاں آئے بھی ایک مہینہ ہو گیا تھا۔ مگر وہ جانے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

یوں معاذ تقریباً ہر روز شام کو اسے دیکھنے آتا تھا۔ تین چار مرتبہ بے جی بھی آئی تھیں۔ اسے خوش و خرم دیکھ کر کھل اٹھی تھیں۔

اگر کسی روز معاذ نہ آسکتا تو فون کر کے اس کی خیریت دریافت کر لیتا۔ اس روز وہ اپنی کسی سہیلی کے ساتھ فلم دیکھنے چلی جاتی۔ ویسے سارا دن لیٹی کتابیں اور رسالے پڑھا کرتی۔ کتابیں پڑھنا اس کی پرانی ہابی تھی۔ لیکن اب بس اتنا فرق پڑ گیا تھا کہ کوئی رومانٹک دل لوٹ لینے والی کہانی پڑھ کر وہ خواب نہیں دیکھتی تھی۔ بلکہ تکیہ منہ پر رکھ کر رونے لگتی۔

شام کو معاذ کے آنے سے پہلے جان بوجھ کر آ کے ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ جاتی تاکہ معاذ کو تنہائی میں ملنے کا موقع نہ مل سکے۔

معاذ وہیں بیٹھا رہتا۔ کبھی کبھی ساری بہنیں آجاتیں۔ بہنوئی بھی آجاتے۔ بہنیں معاذ سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگتیں۔ چھوٹے بچے ارد گرد شور مچاتے رہتے۔ معاذ ہنس ہنس کر سب سے باتیں کرتا رہتا۔ اس کے

پاس دینا جہان کی اتنی معلومات تھیں اور وہ جدید ٹیکنالوجی کے بارے میں اسقدر جانتا تھا کہ ادھر کوئی شخص بات شروع کرتا اور ادھر یہ فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیتا۔ اس لیے گھر کے سب لوگ اس کی ذہانت سے متاثر نظر آتے تھے۔

رملی دل ہی دل میں کڑھتی رہتی .... اور کہتی کاش یہ لوگ جان سکیں۔ زندگی ذہانت یا فصاحت و بلاغت کے ساتھ نہیں گزر سکتی۔ زندگی کے کچھ اور تقاضے بھی ہیں۔ محفل میں بیٹھا ہوا معاذ اسے ہر شخص سے کم تر لگتا۔ چپکے چپکے وہ ہر آئے گئے سے اس کا موازنہ کرتی رہتی اور جب دل میں برچھی اتر جاتی تو منہ پھیر کر ٹیلی ویژن دیکھنے لگتی۔ ایسا نہیں کہ ـــــ وہ اس کے ساتھ بداخلاقی سے پیش آتی تھی بس ذرا لیئے دیئے میں رہتی جیسے گھر والے روایتی شرم و حیا پر محمول کر رہے تھے۔ ویسے جب وہ کھانا کھا کے جانے لگتا تو وہ اسے باہر تک چھوڑنے جاتی۔ خدا حافظ کہہ کر اندر آجاتی۔

اس روز جب وہ اسے باہر چھوڑنے جا رہی تھی تو لابی میں پہنچتے پہنچتے وہ بالکل اکیلی رہ گئی شاید امی جان کا فون آگیا تھا۔ اور اباجی خبرنامہ سننے کو بیٹھ رہ گئے تھے۔ باہر نکل کر اس نے دیکھا۔ وہ معاذ کے ساتھ بالکل اکیلی کھڑی تھی۔ اسے خوف آنے لگا...... اپنے شوہر کے ساتھ تنہا رہ جانے پر اس کا دل دھڑکا ـــــ اسی وقت معاذ نے آگے بڑھ کر اسکی کمر میں ہاتھ ڈال دیا اور محبت بھرے لہجے میں بولا۔

"گھر کب چلو گی رملی ـــــ؟"

اس کے چھونے سے رملی یوں تڑپ کر الگ ہوئی جیسے اسے بچھو نے کاٹ لیا ہو۔ پھر اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا کہ اندر سے تو کوئی نہیں آ رہا تھا۔ یوں اس کی بات بن گئی۔ معاذ نے سمجھا میکے کی وجہ سے جھجک ہی ہے۔

مگر رملی نے جب اپنا آپ چھڑا لیا۔ تو اسے یوں محسوس ہوا اس کی کمر کے ارد گرد الاؤ سے سلگ رہے ہیں۔ پتہ نہیں معاذ کے ہاتھ ہمیشہ اتنے گرم کیوں ہوتے تھے۔ جیسے اس کے ہاتھوں میں انگیٹھیاں جل رہی ہوں۔

"تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔" معاذ نے پھر پوچھا۔

اب تمھارے بغیر وہاں نہیں رہا جاتا۔ کب چلو گی ـــــ؟ اب تو تمھاری طبیعت بالکل ٹھیک ہو گئی ہے۔

(طبیعت ٹھیک ہے۔ دل ٹھیک نہیں ہے۔)

مگر اپنی آوازوں سے بچنے کے لیے بولی۔

"جب آپ کہیں ...."

"ابھی چلو ــــــــــــــ"

"ابھی ــــــــــــ"، رملی نے پھر اندر مڑ کر دیکھا اور ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی۔

"ابھی ٹھیک نہیں لگتا..... سب لوگ .... کیا کہیں گے ــــ؟"

"اچھا...." وہ ہنس کر موٹر میں جا بیٹھا۔ "سب لوگ بھلا کیا کہیں گے؟ ــــ مگر خیر تم قرینے سے جانا چاہتی ہو تو اسی طرح سہی ــــــ کل شام کو میں تمہیں لے جاؤں گا۔"

رملی نے صرف اثبات میں سر ہلایا۔

وہ رملی کیطرف والہانہ انداز سے دیکھکر بولا۔

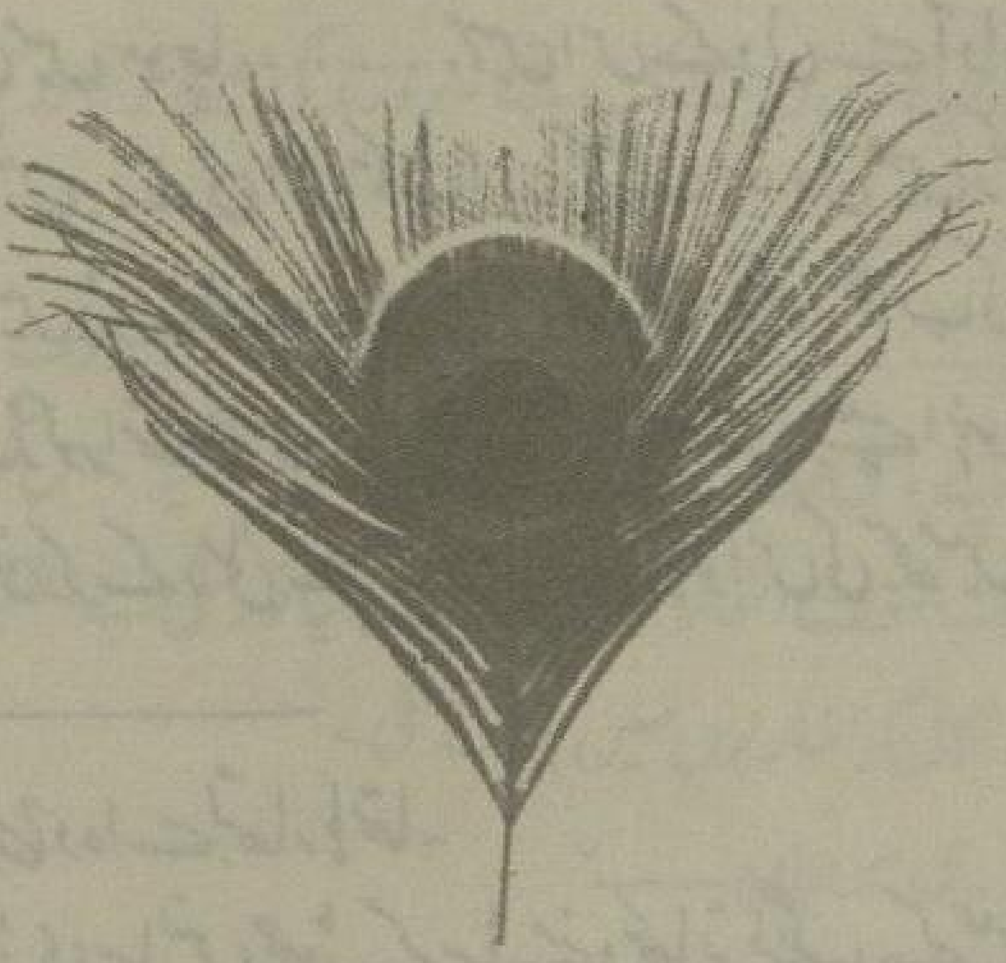
"ایک پہاڑ سی رات اور سہی ــــــ تمہارے بغیر گذار لوں گا۔"

بات خوبصورت تھی۔ رملی نے نظر اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھنا چاہا تو سیاہ رنگ میں صرف اس کے چمکتے ہوئے دانت نظر آ رہے تھے۔

افوہ!

رملی کا جی پھر الٹ پلٹ ہونے لگا۔ پھر ابکائی کی سی کیفیت پیدا ہوئی.......

اس کے جانے کے بعد ــــ اندر جانے کی بجائے وہ وہیں بام کے گملوں کے پاس بیٹھ گئی۔



پھر رات آگئی تھی۔ وہی رات جس سے رملی کو خوف آتا تھا۔ اسے یوں لگتا تھا۔ رات ایک لمبے دانتوں والی سیاہ جادوگرنی ہے جو اپنے ہاتھوں کی جگہ برچھیاں اور بھالے لٹکائے آتی ہے اور اس کے احساس کی ایک ایک قبا چاک کر ڈالتی ہے۔ اسے نوچتی کھسوٹتی ہے۔ زخمی کر دیتی ہے۔

کپڑے بدل کر وہ اپنے بستر پر بیٹھ گئی۔

آج شام معاذ اس کو لے آیا تھا۔ بے جی نے اس کے لیے مزید کھانے پکائے تھے۔ کچھ دوست بھی آگئے تھے۔ دس بجے تک کھانے کی میز پر گپ شپ ہوتی رہی تھی۔ اب معاذ کچھ مہمانوں کو چھوڑنے گیا تھا اور وہ تھکاوٹ کا عذر کر کے اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ اس کا سوٹ کیس ابھی تک سامنے کونے میں پڑا تھا۔ اور اس کے اوپر اس کا وینٹی بوکس VANITY BOX رکھا تھا۔ یہاں آنے سے پہلے اس نے گلابی رنگ کا موتیوں کی جھالروں والا سوٹ پہنا تھا اور قرینے سے میک اپ بھی کیا تھا۔ وہ جانتی تھی بے جی اس کی سُونی صورت پسند نہیں کرتی تھیں۔ اور اب سونے کا لباس تبدیل کر کے اپنے بستر پر آبیٹھی تھی۔

اس کا بیڈ روم بیحد صاف تھا۔ ہر شے چمچما رہی تھی۔ حتیٰ کہ ڈریسنگ ٹیبل کی ایک ایک شیشی چمک رہی تھی۔ اسے اچھی طرح یاد تھا جس روز وہ ہسپتال گئی تھی۔ یہاں کی ہر چیز بکھری ہوئی تھی۔ یوں بھی ڈریسنگ ٹیبل کو قرینے سے سجانے کی اسے عادت نہیں تھی۔ اب تو شیشہ نگینے کیطرح چمک رہا تھا۔ الماری کھول کر دیکھی تو سب کپڑے سلیقے سے لگے تھے۔ اسے کپڑوں کو الماریوں میں تہہ لگا کے قرینے سے رکھنے کی عادت نہ تھی۔ اسی بات پر وہ امی سے کئی بار ڈانٹ کھا چکی تھی۔ کپڑوں کے گولے بنا کر اندر گھساتی رہتی اور ایک دن جب کوئی خاص کپڑا ڈھونڈنے کے لیے اندر ہاتھ ڈالتی تو سارے گولے نیچے گرنے شروع ہو جاتے...... مگر اب اس کی الماری کے ہر خانے میں کپڑے بڑی خوبصورتی سے لگے تھے۔

کیا یہ سب بے جی نے کیا ہے؟

اس نے دل میں سوچا۔ . . . . نہیں اس کے دل سے آواز آئی۔ بے جی کبھی کپڑوں کی الماریوں کو ہاتھ نہیں لگاتیں۔ بے جی ابھی تک اپنے کپڑے صندوق میں رکھتی تھیں۔ شاید یہ کام معاذ کا تھا۔ معاذ ہی نے کمرے میں بڑے خوبصورت پھول سجائے تھے۔ گلاب کی کچھ پتیاں اس کے تکیے پر بکھری تھیں۔ اس نے بیڈ کور اٹھایا تو وہ یوں ٹیڑھی میڑھی ہوئیں جیسے انہوں نے انگڑائی لیکر سانس لی ہو۔ پتیوں کی ترتیب پر غور کر کے رملیٰ نے انہیں دیکھنا چاہا تو اس کی سمجھ میں صاف آگیا۔ گلاب کی پتیوں سے تکیے پر رملیٰ لکھا تھا ——

کس کس طرح وہ اسے لبھا رہا تھا۔

اس نے ٹھنڈی سانس چھوڑ کے سامنے دیکھا تو پلنگ کے عین سامنے دیوار پر ایک خوبصورت گول مٹول بچے کی تصویر لٹک رہی تھی۔ یہ تصویر کمرے میں اضافہ تھی اور تصویر بھی بالکل پلنگ کے سامنے لگائی تھی۔ تاکہ اٹھتے بیٹھتے اس پر نظر پڑتی رہے۔ اسے بھی معلوم ہوگا کہ ان دنوں میں عورت جس کو زیادہ دیکھتی ہے۔ بچے کی شبیہہ اسی پر چلی جاتی ہے۔ جس کے بارے میں زیادہ سوچتی ہے۔ بچہ اس کا عکس بن جاتا ہے۔ رملیٰ کو جھرجھری آگئی۔ . . . .

وہ سارا دن تو معاذ کے بارے میں سوچتی تھی۔ مگر یہ سوچ منفی انداز کی تھی۔ جس میں نفرت کے سوا کچھ نہ تھا۔

رملیٰ کو معاذ پر ترس آیا جس نے ایک حسین ترین بچے کی تصویر لا کر سامنے لٹکا دی تھی۔ چاہتا ہوگا اس کا بچہ خوبصورت ہو۔ اس کی طرح مکروہ صورت نہ ہو —— اسی خوف سے تو رملیٰ نے کبھی معاذ کا چہرہ غور سے نہیں دیکھا تھا۔ ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالتی اور چرا لیتی۔

کبھی کبھی وہ سوچتی اگر اس کے لڑکی پیدا ہوگئی اور اس کی ساری صورت معاذ پر چلی گئی تو کیا ہوگا ——؟ نہیں نہیں . . . . . وہ لرز جاتی۔ اگر لڑکی کی صورت معاذ پر چلی گئی تو وہ راتوں رات اس کا گلا گھونٹ دے گی۔

مگر کیا ایسا ممکن ہو سکے گا ——؟

رملیٰ کی نظریں بے تابانہ سارے کمرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔

پورے کمرے کا ماحول بڑا پر اسرار اور رومانٹک ہو رہا تھا۔ ہر شے صاف ستھری تھی۔ پھولوں کی ہلکی ہلکی خوشبو جذبات کو چھیڑ رہی تھی ——

اور دگر دکتنا حسن تھا ——؟

خاص طور پر بستر ——

اس پر گلابی رنگ کی پرنٹڈ ریشمی چادر بچھی تھی۔ جس پر جا بجا دل بنا تھا جن میں ایک تیر پیوست

تھا ـــــــ معاذ کے خیالات رومانٹک تھے ۔ وہ زندگی میں خوبصورتیاں پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا ــــــــــ

مگر کاش ــــــ اے کاش وہ خود بھی اتنا خوبصورت ہوتا ــــــــ؟

وہ بیٹھی اپنے باغی جذبوں سے لڑ رہی تھی کہ معاذ آ گیا ۔ اس کو دیکھتے ہی رملی پر گھبراہٹ طاری ہو گئی ۔ وہ سلیپنگ سوٹ اٹھا کر غسل خانے میں گیا تو رملی بے اختیار اٹھ کر اپنے سوٹ کیس کے پاس جا بیٹھی اور کپڑے نکال کر الماریوں میں جمانے لگی ۔

"یہ کیا کر رہی ہو جان ـــــ"

معاذ نے آ کر اس کا بازو پکڑ لیا ۔

"تم یہ مشقت نہ کرو ۔ صبح میں لٹکا دوں گا ۔"

"مگر یہ مشقت نہیں ہے ۔ میرا کام ہے ۔"

"اجی نہیں ــــــ اس نے رملی کو پکڑ کر بستر پر بٹھا دیا ۔ تم کام اس وقت کیا کرو جب میں گھر پر نہیں ہوتا ۔"

رملی خاموش ہو گئی ۔

"معاذ نے اس کے کپڑے دوبارہ وہیں رکھ دیئے ۔

رملی کا دل ڈوبنے لگا ۔ وہ خاموشی سے بستر پر دراز ہو گئی ۔ اور سوچنے لگی قید کی اس رات سے کیسے بچا جائے ۔؟ پورے تین مہینے وہ معاذ سے دور رہی تھی اور تین مہینے عافیت سے گذر گئے تھے ۔ مگر آج کی رات سے اسے پھر ڈر آ رہا تھا ۔

اپنے تھوڑے سے کام ختم کر کے معاذ اس کے پاس آ گیا ۔ مسکرا کر اسے دیکھا اور پھر پلنگ پر بیٹھ گیا ۔

رملی نے آنکھیں موند لیں ۔

اذیت کا وہی لمحہ اس کے قریب آ کھڑا ہوا تھا ۔ پچھلی ایک سو پچاس راتوں سے وہ اس لمحے سے تھرتھرا رہی تھی ۔

اس کو معلوم تھا ۔ یہ لمحہ تقدیر کا پرتو ہے ۔ اس کو مغلوب کر لے گا ۔ اس کو مغلوب کر لیگا ۔ اپنے سارے وجود کو خالی کر کے ذرا سی دیر کو احساس کے برزخ میں رکنا پڑے گا ۔ اپنے من کو اپنے تن سے جدا کرنا پڑے گا ۔ دو حصوں میں بٹ جانا پڑے گا ۔ تن کسی ناپسندیدہ شخص کے حوالے کرنا ہی جی جان سے گزر جانا ہے ۔ پہلے بھی کئی مرتبہ اس نے اپنے تن کی گٹھڑی خالی کر دی تھی ۔ روح اور احساس کو نکال کر خالی خول معاذ کے حوالے کر دیا تھا ۔ خالی خول میں جب تخلیق کا موتی ڈال کر معاذ نے اس کے تن

کو بوجھل کر دیا تو اسے اپنے وجود سے بھی گھن آنے لگی۔ توبہ توبہ ــــــ کسی ایسے شخص کی محبت کا بار اٹھانا جس سے تم نفرت کرتے ہو۔ اس کی خلوت کا امین بن جانا جسے دیکھنے کو دل نہ چاہے......
نیند میں تو ایک روح اپنے آپ نکل جاتی ہے۔ مگر جاگتے میں اپنی روح کا نکالنا کس قدر کٹھن کام ہے۔

ان جانگسل لمحوں سے پہلے بھی کئی بار گذری تھی۔
مگر آج پھر ــــــ
جب معاذ اس کے قریب لیٹا تو اس نے کہا۔
"پلیز بتی بجھا دیں"۔
"بجھا دوں گا بتی۔ پہلے تم سے کچھ باتیں تو کر لوں ــــــ اتنے دنوں کے بعد آئی ہو"۔
"نہیں نہیں" وہ تلخی سے بولی۔
"پہلے بتی بجھا دیں۔ مجھے روشنی اچھی نہیں لگتی"۔
"عجیب بات ہے"۔ معاذ نے اٹھ کر بتی بجھا دی۔
پھر آ کر لیٹ گیا۔
اور مدھ بھری آواز میں بولا۔
"اتنی خوبصورت لڑکی کی خلوت میسر ہو اور آدمی اس کی صورت دیکھنے سے محروم رہے۔ یہ ظلم تم کیوں کرتی ہو"؟
رملی خاموش رہی۔
"میں تمہارے ساتھ باتیں کرتے وقت تمہاری صورت دیکھنا چاہتا ہوں"۔
"مجھے اندھیرے میں باتیں کرنا اچھا لگتا ہے۔"
رملی نے اپنا بازو آنکھوں سے ہٹا کر جواب دیا۔
"مگر تم اندھیرے میں بھی کب باتیں کرتی ہو؟ تم تو گم صم ہو جاتی ہو۔
رملی چپ ہو گئی۔
"سو گئی ہو ــــــ؟"
نہیں تو........
"پھر کیا بات ہے ــــــ؟"
"سن رہی ہوں۔ مجھے سننا اچھا لگتا ہے"۔
"سننے والے بھی ہنکارہ بھرتے ہیں۔

"آپ سنائیں نا؟ ———

معاذ نے اس کی طرف منہ موڑ لیا۔

رملی کا دم سینے میں گھٹنے لگا۔

اس کا بازو مضبوط تھا۔ فولاد کی طرح ——— ہاتھ گرم تھا آگ کی طرح ——— سانس خوشبودار تھی سوندھی مٹی کیطرح ——— اس کے اندر سے ایک تڑپا دینے والی آنچ آرہی تھی ——— مگر رملی کا ہاتھ اس کے چہرے سے چھو گیا۔۔۔۔۔۔۔ وہی گڑھے ———۔۔۔ وہی اونچا نیچا چہرہ۔۔۔۔۔۔۔ ننھی ننھی کالی کالی کٹوریاں۔۔۔۔۔۔۔

رملی کا تن مردہ ہو گیا۔۔۔۔۔۔

اسے یوں لگا۔ ڈریکولا رفتہ رفتہ اس کے قریب آرہا ہے۔۔۔۔۔۔ اپنے لمبے دانت اس نے اس کی گردن میں گاڑ دیئے ہیں۔۔۔۔۔۔ اور اس کا لہو پی رہا ہے۔۔۔۔۔۔۔

وہ اب مری کہ ——— تب مری ———



صبح اٹھی تو یوں لگا پیاس کے صحرا میں وہ تنہا کھڑی ہے۔

پانی، پانی، پانی ——

جذبات کے تپتے الاؤ محبت کا پانی مانگ رہے ہیں۔ چاروں طرف سوکھی ریت کے بگولے ہیں۔ اور دور کھردرا آسمان —— ایسے میں ایک مکروہ صورت آدمی پانی کا پیالہ لیکر کبھی ادھر سے نکل آتا ہے۔ کبھی ادھر سے ——

اتنی شدید پیاس کے باوجود کہ خواہشوں کے کنول ہونٹوں کیطرح مرجھائے جا رہے ہیں اس بدبودار آدمی سے پانی لیکر پینے کو دل نہیں چاہتا ——

اور اسی بدبودار آدمی نے اس کی رضا و رغبت دیکھے بغیر اس کے تن کو اپنے رشتے میں باندھ لیا تھا۔ انسانی رشتوں کی جڑ اس کے اندر پروان چڑھ رہی تھی . . . . اسے اپنے پھولے ہوئے جسم سے گھن آنے لگی۔ جس مرد کو عورت پیار نہ کر سکے اس کے بچّے کا بوجھ کیونکر برداشت کر سکتی ہے اور پھر اس کے بچّے کو کیسے پال سکتی ہے؟ ——

جس کی صورت دیکھنے کو دل نہ چاہے —— اس کی تنہائیوں کی امانت اٹھائے پھرنا اور صبح کے وقت اپنی پیاسی روح کو تڑپتا اور کلھستا دیکھنا —— اور دنیا کو ہنس ہنس کر دکھانا۔

اس سے بڑی بددیانتی اور کیا ہوگی؟

ہسپتال سے آنے کے بعد آج پھر اسکی طبیعت کسلمند سی ہو گئی تھی۔ اس لیے وہ نہا دھو کر صاف ستھرے کپڑے پہن کر باہر آ گئی۔ معاذ تو صبح آٹھ بجے ہی دفتر چلا گیا تھا۔

بے جی نے اسے دیکھکر اپنی عینک اتاری اور بولیں۔

"ووہٹی ناشتے میں کیا لوگی ——؟"

"جی نہیں چاہ رہا بے جی ـــــ" یہ کہہ کر وہ دھپ سے کرسی پر بیٹھ گئی اور تازہ اخبار ہاتھ میں پکڑ لیا۔ بے جی فرش پر بیٹھی میلی نواڑ کے گولے بنا رہی تھیں۔ اس کو وہیں چھوڑا۔ اٹھ کر نل پر ہاتھ دھوئے پھر رملی کے قریب ہی کرسی پر آکر بیٹھ گئیں اور کہنے لگیں۔

"زردسی رنگت ہو رہی ہے تیری ـــــ ویسے تو ان دنوں میں رنگ زرد ہو ہی جاتا ہے مگر تو کچھ کھاتی بھی تو نہیں ـــــ؟"

"کھاتی تو ہوں بے جی"

کیا کھاتی ہے؟ رات میں نے دیکھ لیا تھا۔ پودینے کی چٹنی سے ذرا سی روٹی کھائی تھی۔

"بے جی مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا۔"

ہاں میں جانتی ہوں۔ پتہ نہیں یہ موئی طبیعت کب سنبھلے گی۔ طاقت کی گولیاں کھا رہی ہو نا؟ ـــــ

"جی ہاں"۔

"اب خیر سے پانچواں لگا ہے۔ طبیعت ٹھیک ہو جانی چاہیئے"۔

رملی چپ رہی۔

"ایسا کر ٹھنڈا دودھ پی لو"۔

"پی لوں گی بے جی"۔

"میں لا دیتی ہوں"۔

"آپ بیٹھیں ـــ" رملی کھڑی ہو گئی۔ میں خود ہی فریج میں سے لے آؤں گی۔

ارے نہیں تم بیٹھو۔ اخبار دیکھو۔" بے جی جلدی سے کھڑی ہو گئیں۔

اُف کتنی چاق و چوبند ہیں۔ رملی نے سوچا ـــــ جب کہ کاہلی کے مارے اس کا اٹھنا محال ہے۔ یہ اگلے وقتوں کے لوگ بھی کتنے برکتوں والے ہوتے ہیں۔

بے جی ٹھنڈے ٹھار دودھ کا گلاس لے آئیں۔ ساتھ ایک سیب بھی اٹھا لائیں۔

"خالی معدے دودھ نہ پیو۔ اس طرح پیٹ میں نفخ پیدا ہوتی ہے۔"

"تو پہلے یہ سیب کھا لو"۔

رملی نے دونوں چیزیں پکڑ لیں۔

"چھری نہیں لائی میں ـــــ دانتوں سے کاٹ کر کھاؤ۔ یہ موئی نئی نسل ہر کام میں چھری کانٹا استعمال کرنے لگی ہے۔ اسی لیے تو سب کے دانت کمزور ہو گئے ہیں۔ تم سیب دانتوں سے کاٹ کاٹ کر کھایا کرو۔ تمہارے دانت بہت خوبصورت ہیں۔ ان کی حفاظت کیا کرو۔ دیکھو ـــــ مجھے دیکھو

میرے دانت اب تک محفوظ ہیں ۔ اور مضبوط ہیں"۔

یہ کس طرح ہوا بے جی ــــ رملی نے سیب میں دانت گاڑ کے پوچھا ۔

"باسی روٹی کھانے سے ــــ"

"جی ــــ"

ہاں ہاں ــــ میں صبح کا ناشتہ ہمیشہ باسی روٹی سے کرتی ہوں ۔ باسی روٹی کو بہت چبانا پڑتا ہے ۔ چبانے سے دانتوں اور مسوڑھوں کی ورزش ہوتی رہتی ہے ۔ میں صبح کو تھوڑا سا مکھن اور باسی روٹی کھاتی ہوں اس کے بعد دودھ یا چھاچھ پی لیتی ہوں ۔ سارا دن کچھ کھانے کی حاجت نہیں رہتی ۔ ہاں بڑھاپا ہے اگر درمیان میں کمزوری محسوس ہو تو کوئی پھل وغیرہ یا بسکٹ لے لیتی ہوں ۔ کھانا صرف شام کو کھاتی ہوں ۔ رات کا کھانا دیر سے نہیں کھانا چاہیئے ۔ کھانا سونے سے پہلے ہضم ہو جانا چاہیئے ۔ بس یہ ہے میری صحت کا راز ــــ"

"بے جی ــــ باسی روٹی کے علاوہ اور کون سی چیزیں دانتوں کو مضبوط کرتی ہیں"۔

بے جی نے رملی کے دانتوں کی تعریف کی تو اسے واقعی اپنے دانتوں کی بقاء کا خیال آ گیا ۔

"سخت چیزیں کھانی چاہییں ۔ مثلاً گنا ، گنڈیریاں ، چنے ، مکئی کا بھٹہ ــــ"

رملی ہنسنے لگی ۔

"یہ چیزیں تو ہر کوئی کھاتا ہے بے جی ۔"

"ہر کوئی نہیں کھاتا دوہتی ــــ!"

بے جی پھر اٹھ کر نواڑ کے پاس جا بیٹھیں ۔

آج کل کے بچے ڈبل روٹی سے ناشتہ کرتے ہیں ۔ پراٹھا اور دہی پسند نہیں کرتے ــــ رات کی روٹی کھانا تو معیوب سمجھا جاتا ہے ۔ حالانکہ حکماء کہتے ہیں ۔ باسی روٹی معدے کو معتدل کر دیتی ہے اور گنڈیریاں ، چنے کون پسند کرتے ہیں ۔ بچے تو چیونگم چاکلیٹ ، ٹافیاں گولیاں پسند کرتے ہیں ۔"

اس پر رملی پھر ہنسنے لگی ۔

چاکلیٹ اور چیونگم اس کی بھی کمزوری تھی ۔

پورا سیب کھا چکنے کے بعد اس نے دودھ کا گلاس اٹھا لیا اور گھونٹ گھونٹ پینے لگی ۔

بے جی نے احتیاطاً دودھ میں ایک چمچ روح افزا کا ڈال دیا تھا جس سے دودھ کا ذائقہ بہت اچھا ہو گیا تھا ۔

بے جی کتنی عقلمند ہیں ۔ وہ دل میں سوچنے لگی ۔ یہ سارے گُر جانتی ہیں ۔

"بے جی ـــــ" وہ کرسی گھسیٹ کر ان کے قریب چلی گئی۔

"یہ کیا کر رہی ہیں آپ ـــــ؟"

"دور بیٹھو دوہٹی" ـــــ انہوں نے ہاتھ سے اس کو روکا۔

"یہ میلی نواڑ ہے۔ کہیں اس کی بھڑاس سے تمھیں چھینکیں نہ آنے لگیں۔ میں نے سارے پلنگ ادھڑوا لیے ہیں۔ سردی شروع ہونے والی ہے۔ موسم بدلنے سے پہلے پہلے سارے نواڑ دھلوا کے پلنگ بھرے بنوالوں گی۔ مجھے میلے بستر اور میلی مسہریاں پسند نہیں ہیں۔"

رملیٰ نے نظر اٹھا کر دیکھا تو دھوپ میں چار پانچ مسہریوں کے کٹہرے ایک دوسرے میں پھنسے کھڑے تھے۔ انہیں غور سے دیکھنے لگی تو دور ایک جھولا نما چیز بھی نظر آئی۔

وہ کیا ہے بے جی ـــــ؟ اس نے بے اختیار پوچھ لیا۔

تو بے جی مسکرانے لگیں۔

ابھی تجھے دکھانا نہیں چاہتی تھی۔ مگر اب تو نے پوچھ ہی لیا ہے۔ تو بتائے دیتی ہوں ـــ یہ میرے معاذ کا جھولا ہے۔

"معاذ کا جھولا ہے ـــــ؟"

رملیٰ نے حیرت سے دہرایا۔ "اور آپ نے ابھی تک سنبھال کر رکھا ہوا ہے"۔

"کیا صدیاں گذر گئی ہیں دوہٹی ـــــ؟" بے جی نے مڑ کر رملیٰ کے حیران چہرے کو دیکھا۔

خیر سے میرا معاذ ابھی تیس برس کا ہے۔ تیس برس تو خواب کیطرح گذر گئے۔ اس جھولے میں وہ صرف ایک سال ہی سویا تھا۔ جب چلنے لگا تو اس کے قریب بھی نہیں جاتا تھا۔ ایاز صاحب نے یہ جھولا بڑے ارمانوں سے بنوا کر دیا تھا۔ مستری کو بلوا کر گھر میں بٹھالیا تھا۔ ساگوان کی لکڑی منگوا کر دی تھی۔ سارے جھولے پر چاندی کے گھونگھرو لگوائے تھے۔ خالص ریشم کی ڈوریاں لگوائیں۔

رملیٰ اٹھ کر اس جھولے کے پاس چلی گئی۔ چاندی کے گھونگھرو کالے ہو چکے تھے اور ریشم کی ڈوریاں اپنی اصلی رنگت کھو چکی تھیں۔

جھولا ویسے بہت خوبصورت تھا۔ گو رنگ و روغن اکھڑا ہوا تھا۔ وہ رملیٰ ہاتھ سے چھو کر اسے ہلانے لگی اور تصور میں ایک چھوٹے بچے کو اس میں جھولتا دیکھنے لگی۔ اسی وقت اسے خیال آیا کہ جب معاذ پیدا ہوا ہو گا تو یقیناً اور بچوں کی طرح خوبصورت اور صحت مند ہو گا۔ سب اسے چمکارتے ہوں گے۔ پیار کرتے ہوں گے۔ اس کا دل چاہا وہ بے جی سے پوچھے۔

بے جی معاذ کو چیچک کب نکلی تھی ـــــ؟ اس کا رنگ کالا کیسے ہو گیا؟

کیا اس جھولے میں پڑے پڑے یا ـــــــــــ

لیکن بے جی خود ہی اس کے قریب آگئیں اور وہ ایسا بے ہودہ سوال کرنے سے بچ گئی۔
بے جی کی بوڑھی آنکھوں میں ایک انوکھی چمک پیدا ہوئی اور چہرے کی ہر لکیر مسکرانے لگی۔
وہ ایک میلا کپڑا اٹھا کر جھولا جھاڑنے لگیں۔ . . . . جھاڑتے ہوئے بولیں۔
یہ جھولا میں نے سنبھال کر رکھ لیا تھا۔ اور سوچا تھا معاذ کے بچّے کو دوں گی۔ اللہ کا شکر ہے اس نے یہ دن دکھایا۔ اب میرا پوتا خیر سے اس جھولے میں جھولے گا۔ آج میں نے اسے اسٹور سے نکلوایا ہے۔ ملازم کسی مستری کو بلانے گیا ہے وہ اس کی مرمّت کر کے اس پر نیا رنگ و روغن کرے گا۔ ننھے ڈوریاں ڈالے گا اور چاندی کے گھونگھرو بھی پالش کروائے جائیں گے۔ پھر میں اپنے پوتے کے لیے نیا اور خوبصورت بستر بنواؤں گی اور اس کی پیدائش تک اس جھولے کو اپنے کمرے میں رکھ چھوڑوں گی۔ . . . . .
"دوہتی" ـــــ ایکدم لہجہ بدل کر بولیں! "میں اپنے پوتے کو اپنے کمرے میں سلاؤں گی۔ کیا خبر وہ رات کو روتا رہے اور تم اٹھ ہی نہ سکو۔"
اس پر رملی کو پھر بے تحاشہ ہنسی آگئی۔ اسے بے جی بالکل شیخ چلّی نظر آنے لگیں۔ لیکن ہنس کر کہنے لگی۔
"بے جی ـــــ آپ اتنے وثوق سے پوتا پوتا کہہ رہی ہیں۔ اگر پوتی ہوگئی تو ـــــ؟"
تو کیا ہے ـــــ مجھے پوتی سات لڑکوں کے برابر ہوگی۔ میری بھی تو پہلوٹھی کی لڑکی ہی ہوئی تھی۔ مگر . . . . اس کا چہرہ غور سے دیکھ کر بولیں۔
تیرا چہرہ اور قرائن کہہ رہے ہیں کہ انشاء اللہ تیرے لڑکا ہوگا۔ ایسا چاند سا ـــــ میرے معاذ جیسا ـــــ
کھڑے کھڑے رملی کے دل میں ٹیس اٹھی۔
ہر عورت اپنے بچے کو چاند سا کہتی ہے۔ پتہ نہیں اس کا بچّہ کیسا ہوگا؟ جس کے لیے اس کے دل میں ابھی تک کوئی نرم گرم گوشہ نہیں بن سکا تھا۔ ایسے لگتا تھا اس کا دل مر گیا ہے۔ اور کبھی وہ دل میں دعا کرتی کاش ڈلیوری کے وقت وہ مرجائے۔ پتہ نہیں زندہ رہنے کی خواہش معدوم کیوں ہوتی جارہی تھی اس کے اندر ـــــ
رات کو بھی اکثر بھیانک خواب دیکھتی ـــــ اور ڈر کر اٹھ جاتی۔
دھیرے دھیرے اندر کی جانب کھسکنے لگی تو بے جی نے پوچھا ـــــ "کہاں جارہی ہو دوہتی ـــــ؟"
وہ جواب دینے کی بجائے وہیں کرسی پر بیٹھ گئی۔ ٹانگوں میں سے جان نکلی جارہی تھی۔
"بے جی ـــــ" تھوڑی دیر بعد رملی نے زور لگا کر کہا۔

کبھی کبھی میں سوچتی ہوں۔ پتہ نہیں میں اتنی اچھی ماں بن سکوں گی یا نہیں جتنی اچھی ماں آپ ہیں........

"لے اور سُن ——"

بے جی پلٹ کر بولیں۔

"نیکوں کی اولاد نیک ہوتی ہے جس دن میں نے تیری ماں کو دیکھا تھا۔ بسم اللہ کہا تھا اور تیرا باپ —— واہ واہ —— سبحان اللہ —— اللہ کا نیک بندہ ہے۔ میں نے تو گھر آتے ہی معاذ سے کہہ دیا تھا اللہ نے بڑے بھلے مانس لوگوں سے ملا دیا ہے اور ایک لڑکی بھی ان کی ہے چاند سی —— میں تو جھولی پھیلا دوں گی ان کے آگے —— معاذ نے مجھے منع کیا۔ بولا ماں اس طرح ٹھیک نہیں لگتا۔ چند دن کی تو ملاقات ہے۔ حاجی صاحب کیا سوچیں گے۔ ؟ اور جو میں اس کی سنتی تو تو آج یہاں ہوتی ؟ —— وہ بیٹی یاد رکھنا۔! والدین کو دیکھ کر لڑکی یا لڑکے کا رشتہ طے کرنا چاہیئے۔ لڑکی کے اندر اس کی ماں بولتی ہے۔ اچھے گھرانوں کی لڑکیاں ہر قسم کے حالات میں گذارا کر لیتی ہیں۔ کوئی بات اپنی منشا کے خلاف بھی ہو جائے تو پی جاتی ہیں۔ زمانے کو تماشا نہیں دکھاتیں —— میں نے اللہ سے جیسا گھرانہ مانگا تھا۔ اللہ نے مجھے ویسا دے دیا۔"

رملی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

(ماں باپ کی لاج نبھاؤں یا اپنے دل کی سنوں۔)

"میں تو دن رات تیرے والدین کو دعائیں دیتی ہوں۔ جنھوں نے تیری جیسی نیک سیرت لڑکی ہمیں دے دی ——"

رملی کھڑی ہو گئی۔

"تم بھی انشاءاللہ ویسی ہی ماں بنو گی۔ ابھی تو خود بچی ہو"۔

رملی نے اپنے آنسو پلکوں پر روک کے اور کانپتی آواز میں صرف اتنا کہا۔

"بے جی —— میرے خیال میں آپ خود ایک آئیڈیل ماں ہیں۔ اللہ ایسی ماں ہر ایک کو دے۔"

اور پھر ہولے ہولے قدم دھرتی اپنے کمرے میں آ گئی۔ گیلے بال خشک ہو گئے تھے۔ ان کو چھو کر جو شیشے سے آنکھ ملائی تو پلکوں میں پھنسے ہوئے کئی آنسو ادھر ادھر لڑھک گئے........

ابا جی نے کہا تھا۔

"ہماری لڑکیوں میں لچک ہے۔ ہر قسم کے حالات میں ڈھل جاتی ہیں۔

بے جی کہتی ہیں۔

"تو نیکوں کی اولاد ہے۔ تیری تربیت میں کھوٹ نہیں۔۔۔۔۔"

دل کہتا ہے۔ بھاگ جا یہاں سے ـــــ بھاگ جا ـــــ ایک زندگی اور وہ بھی اتنی قیمتی ـــــ ایک دل اور اس کو یوں ساری عمر تڑپتا دیکھوں گی۔۔۔۔۔۔۔۔ اور زندگی کی انمول راتیں ـــــ ایک کالے دیو کی نذر کرتی رہوں گی۔

اف خدایا!

وہ بے جان ہو کر اپنے بستر پر گر گئی۔



اس روز صبح ہی صبح امی کا فون آ گیا۔ انہوں نے بتایا کہ کسریٰ باجی کے میاں کا راولپنڈی ٹرانسفر ہو گیا ہے۔ پرسوں وہ لوگ جا رہے ہیں اور کل امی جان نے سارے خاندان کو بلایا ہے کھانے پر تم بے جی اور معاذ بھی آ جانا ـــــــــــ

رملیٰ نے یہ سنتے ہی بے جی کو بتا دیا۔ معاذ اس وقت دفتر گیا ہوا تھا۔ بے جی خوش دلی سے بولیں۔

ضرور چلوں گی"۔

پھر تھوڑی دیر ٹھہر کر جیسے انہیں کچھ یاد آ گیا۔ کہنے لگیں۔

"دو ہٹی: تم تو جانتی ہو۔ میں رات کا کھانا تو شام کے چھ بجے ہی کھا لیتی ہوں۔ دیر سے کھانا کھاؤں تو مجھ سے عشاء کی نماز نہیں پڑھی جاتی۔ اور دعوتوں میں لوگ عام طور پر دیر سے کھانا کھاتے ہیں"۔

"ہاں میں جانتی ہوں رملیٰ نے مسکرا کر کہا"۔

"بس مجھے وہاں کھانا کھانے پر مجبور نہ کرنا۔ ویسے میرا دل بہت چاہ رہا ہے جانے کو ـــــ اس بہانے تمھاری امی اور بہنوں سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ کسریٰ تو ویسے بھی مجھے بہت اچھی لگتی ہے"۔

ہاں کسریٰ باجی ہر ایک کو اچھی لگتی تھیں۔

کسریٰ باجی رملیٰ سے تین سال بڑی تھیں اور دو سال پہلے ان کی شادی ہوئی تھی۔ پہلے سال ایک بیٹی ہوئی تھی اور ان دنوں پھر امید سے تھیں۔ بیزار تھیں اور حد درجہ تنگ ـــــ ان کے شوہر اتنے ہی رنگین مزاج اور زندہ دل تھے۔ آج یہاں تو کل وہاں انہیں گھومنے پھرنے میں

بہت مزہ آتا تھا۔ بینک میں ملازم تھے۔ نام تھا شاندار جمال اور دیکھنے میں بڑی شاندار پرسنلٹی رکھتے تھے۔ کسریٰ باجی اپنی سب بہنوں میں کم رو تھیں۔ بڑی دونوں بہنیں طوبیٰ آپا اور خضرا آپا بہت حسین تھیں ان دونوں کے شوہر بس مناسب ہی تھے اپنی خوش اخلاقی اور سلیقہ مندی کی وجہ سے وہ دونوں اپنے اپنے گھر میں خوش تھیں۔ دونوں کے شوہر کاروباری تھے۔ کسریٰ باجی کا قد بھی چھوٹا تھا۔ اور رنگ بھی سانولا تھا۔ سب کہتے تھے یہ اپنی ایک پھوپھی پہ چلی گئی ہے۔

مگر صورت سے کچھو باجی نے جو مار کھائی تھی اسے مزاج میں پورا کر دکھایا تھا۔ ایسی خوش مزاج، شیریں گفتار اور سگھڑ ہنر مند تھیں کہ راہ جاتوں کا دل موہ لیتیں۔ سب کہتے تھے اپنی اچھی عادتوں کی وجہ سے کچھو باجی اپنے گھر میں راج کریں گی۔ انہیں لوگوں کو دیوانہ بنانا آتا ہے۔ اور واقعی انہیں ایسا خوبرو بانکا چھبیلا دولہا ملا تھا سب دیکھ کر دنگ رہ گئے تھے۔

رملیٰ کو خاص طور پر شان بھائی بہت پسند آئے تھے۔ واہ واہ —— کیا قد و قامت تھی جیسے کھجور کا سیدھا سالم اور سدا بہار درخت ——

کھلاڑیوں جیسی چوڑی چھاتی —— صاف رنگت اور خوبصورت بال —— بالکل کسی انگریزی فلم کے ہیرو لگتے۔ اور پھر ایسے شگفتہ مزاج کہ ہنسا ہنسا کر پیٹ میں بل ڈال دیتے۔ رملیٰ اور شان بھائی کی بڑی جلدی دوستی ہو گئی تھی۔ اسے تنگ بھی بہت کرتے اور پیار بھی بہت کرتے۔

پیار تو رملیٰ کو کچھو باجی بھی بہت کرتی تھیں۔ شادی سے پہلے بھی دونوں ایک جان دو قالب تھیں۔ کیونکہ دونوں کا فرق بہت کم تھا۔ اور بڑی دونوں بہنوں کی شادی کے بعد دونوں کو اکھٹے رہنے کا بہت موقع ملا تھا۔ ان کی شادی ہو گئی تو بھی ذرا ذرا سی بات لیکر رملیٰ کچھو باجی کے ہاں دوڑ پڑتی —— مگر اب کچھو باجی اپنی مصیبتوں میں پڑ گئی تھیں اور وہ ان کا مذاق اڑاتے اڑاتے خود پھنس گئی تھی۔

کئی دنوں سے سوچ رہی تھی کچھو باجی کے ہاں جاتے اور دل کا بوجھ ہلکا کر کے آئے مگر ان کی ٹرانسفر کی خبر سنی تو آزردہ ہو گئی۔ بڑی دونوں بہنیں اسی شہر میں رہتی تھیں اور ظاہر ہے کچھو باجی خود کتنی سوگوار ہوں گی ——؟

رملیٰ اندر آ کر اپنے کپڑوں کی الماری کھول کر کھڑی ہو گئی یہ دیکھنے کے لیے کہ رات کو کون سے کپڑے پہن کر جائیگی۔ ساتھ ہی ساتھ سوچ رہی تھی اے کاش معاذ اس کے ساتھ نہ جائے وہاں سارا خاندان اکٹھا ہو گا۔ جب لوگ اسے معاذ کے ساتھ دیکھتے تو اسے بہت شرم آتی جی چاہتا زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔

اس کے بعض رشتہ دار جن کو وہ گھاس نہیں ڈالتی تھی بڑی طنزیہ نظروں سے دیکھتے

تھے اور بات کرتے وقت کوئی کچوکا لگا دیتے تھے۔ وہ اندر ہی اندر ٹوٹ پھوٹ کر رہ جاتی ——
شام کو معاذ آیا تو رملیٰ نے آہستہ سے امی جان کا پیغام دے دیا۔ خوش ہو کر بولا۔
"ضرور چلیں گے۔ یسریٰ باجی تو میری فیورٹ سالی ہے۔ ان سے ملنے جاؤں گا۔"
کتنے بجے چلیں گے؟"
"میں ذرا چائے پی لوں۔ اور نہا دھو کر کپڑے بدل لوں"۔
(اونہہ........ رملیٰ نے اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا کر کہا۔ جیسے کپڑے بدل کر اور نہا دھو کر تمہارا روپ ہی بدل جائے گا)
"اتنی دیر میں تم تو تیار ہو جاؤ اور کیا بے جی بھی جا رہی ہیں۔؟"
"جی ہاں —— امی نے کہا تھا انہیں ضرور لائیں اور وہ بھی جانا چاہتی ہیں"۔
"کیا وہ اتنی دیر بیٹھ سکیں گی!" ——
"کیوں نہیں بیٹھیں گی........ وہ تو اپنی خوشی سے جا رہی ہیں"۔
"تو ٹھیک ہے۔ مجھے چائے دے کر تم جاؤ۔ تیاری شروع کرو۔"
معاذ باہر نکل کر برآمدے میں بیٹھ گیا۔
بے جی پہلے ہی سفید چکن کی قمیض، سفید سلک کی شلوار اور ملتانی کشیدے کا سفید دوپٹہ اوڑھے ٹرالی پر چائے کا سامان لگائے بیٹھی تھیں۔ معاذ تھوڑی دیر کے لیے وہاں بیٹھ گیا۔ بے جی کے ساتھ گپ شپ لگائی۔ پھر چائے پی کر اندر آ گیا۔ دیکھا تو رملیٰ تیار ہو چکی تھی۔ میکے جانا ہو تو یہ لڑکیاں کتنی جلدی تیار ہوتی ہیں معاذ نے اس کی طرف دیکھ کر سوچا۔
آج اس نے گلابی رنگ کی پرنٹڈ ساڑھی پہنی تھی۔ اور اس کو اپنے پیٹ کے ارد گرد اس طرح لپیٹا تھا کہ پیٹ نمایاں نہ ہو —— لیکن پیٹ پھر بھی چغلی کھا رہا تھا۔ آجکل اسے کوئی قمیض پوری نہ آتی تھی۔ —— ساڑھی کو یوں لپیٹنے سے اس کے بھرے بھرے کولھے نمایاں ہو گئے تھے۔ چہرے پر ایک آسمانی چھب تھی۔ جو تخلیق کے ان لمحوں میں عورت کا مقدر بن جاتی ہے۔ آنکھیں چمک رہی تھیں مگر ہونٹوں پر سوز تھا۔
ٹہری ٹہری —— اداس اداس —— گم صم —— بیزار سی —— اکھڑی ہوئی مگر سنوری ہوئی —— وہ عجیب طرح خوبصورت لگ رہی تھی۔
معاذ اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا اور حیرت سے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے بولا۔
"میک اپ نہیں کرو گی ——؟"
رملیٰ نے منہ پھیر کر کہا۔

"اچھا نہیں لگتا......"

"کیا میں یا میک اَپ ____؟"

رملی لرز گئی۔ اس نے آنکھیں جھکالیں۔ کہیں آنکھیں تو سارا راز فاش نہیں کر رہیں۔

"مجھے آجکل خوشبو اچھی نہیں لگتی۔ ....لپ اسٹک کی خوشبو، پاؤڈر کی خوشبو یا......ٹوتھ پیسٹ وغیرہ کی خوشبو ...... کولون...... پرفیوم....ہر چیز......"

"ہر چیز میں کہیں میں تو شامل نہیں ____" معاذ شوخی سے اس کے رخسار چھو کر بولا...."

رملی ایک دم خاموش ہو گئی۔

وہ اور قریب آیا تو وہ پیچھے ہٹ گئی۔

"میں بھی برا لگتا ہوں......؟"

"نہیں"....وہ گھبرا کر جلدی سے بولی...."مگر یہ خوشبو.....جو آپ لگاتے ہیں......یہ سگریٹ کی خوشبو، آفٹر شیو کی خوشبو......بس ہر قسم کی خوشبو سے وحشت ہوتی ہے۔

"تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا مجھے ____" معاذ پیار سے بولا "یہ تو ایک قدرتی تبدیلی ہے آج سے میں خوشبو لگانا بند کر دوں گا......"

"نہیں نہیں آپ سب کچھ کریں گے مگر مجھے ____________

پھر وہ کہتے کہتے رک گئی۔

یہ کیا کہنے چلی تھی وہ ____......

"مگر مجھے ہاتھ نہ لگائیں بس ____________" معاذ نے فقرہ پورا کر دیا اور پھر زور زور سے ہنسنے لگا۔ (کیسا واہیات لگ رہا تھا ہنستا ہوا)

"بھئی کیوں ہاتھ نہ لگاؤں ____؟"

وہ آگے بڑھ آیا اور اس کا بازو تھام لیا......

"اس قدر خوبصورت ہو رہی ہو تم آجکل ______ کہ جی چاہتا ہے تم پر سے قربان ہو جاؤں ____________"

(کاش ہو جاؤ)

اس قدر روپ ہے تم پر آجکل کہ نظر بھر کر نہیں دیکھتا۔ کہیں میری نظر نہ لگ جائے......

(کہیں نظر بٹو کی بھی نظر لگی ہے)

"جانتی ہو تم پر میرے بچے کا روپ آرہا ہے......"

رملیٰ کا جی چاہا کھلکھلا کر ہنس دے.... بھلا ایک بدصورت آدمی کے بچے کا روپ اتنا نکھرا ہوا کیسے ہو سکتا ہے۔؟

معاذ اسے شرماتا دیکھ کر ذرا شوخ ہونا چاہتا تھا۔ اس پر رملیٰ نے جلدی سے کہا۔

"سات بج گئے ہیں ذرا جلدی کریں، پلیز"

"اوہ سات بج گئے ——" یہ کہہ کر معاذ نے رملیٰ کو چھوڑا اور غسل خانے کیطرف رخ کیا۔

اور رملیٰ اپنے دل میں کروٹیں لینے والی نفرت اور چہرے سے ظاہر ہونے والی اذیت کو جیسے تھپکیاں دے دے کر سلانے لگی اور اس کے ساتھ امی کے ہاں جانے پر اپنے دل اور دماغ کو راضی کرنے لگی۔



رملی اپنے منہ پر تکیہ رکھے یوں لیٹی تھی ۔ جیسے آنکھوں کے گرد ہر روشنی بجھا کر وہ اندھیروں میں مُنہ چھپا لینا چاہتی ہو ۔

شادی شدہ زندگی کی سب راتیں اپنے اختیار میں نہیں ہوتیں لیکن جب ان میں اپنی رضا اور خوشی شامل نہ ہو تو یہ راتیں قبر کی راتیں بن جاتی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آہ ——————

"رات کیا آتی ہے مجھ پر کہ عذاب آتا ہے"

وہ لیٹی ہوئی یہی سوچ رہی تھی۔ کبھی کبھی کوئی بے اختیار سا آنسو لڑھک کر کان کی کٹوری میں آجاتا تھا کان ذرا سا ٹیڑھا کر کے جیسے وہ نکال دیتی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ پیٹ پر رکھے ہوئے تھے اپنے پیٹ کا ابھار اور سختی صاف محسوس ہو رہی تھی۔ اور کبھی کبھی ہاتھ کے دباؤ کے نیچے ذرا سی جنبش ہوتی تھی تو وہ چونک جاتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ڈر جاتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

یہ جنبش ——————

یہ جنبش ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اس کے خون کی شریانوں میں نہ رم جھم کا سماں پیدا کرتی نہ اس کے احساس پر پھولوں اور کلیوں کی بارش ہونے لگتی ۔ اس وقت وہ تصور میں اپنے بچے کو مجسم کرنا چاہتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ایسا نہیں کہ اس نے نومولود دیکھے نہیں تھے ۔ اپنی تین بہنوں اور دو بھائیوں کے بچے دیکھے تھے ۔ ان کو اٹھایا تھا ۔ ان کو کھلایا تھا ۔ اس نے بچوں سے بیزاری کا اظہار کبھی نہیں کیا تھا ۔

بلکہ خوشبودار، چمکیلے..... لچکیلے بچے اسے اچھے لگتے تھے۔ مگر پتہ نہیں کیوں اس کا اپنا بچہ اس کے تصور کے بازوؤں میں نہیں آتا تھا۔ بچے کی شبیہہ دیکھنے کے لیے آنکھیں بند کر کے اپنے دل میں غوطہ لگاتی تو معاذ کا چہرہ سامنے آجاتا۔ اُف اللہ ـــــ اسے ابکائی آنے لگتی۔

عجیب دور سے گزر رہی تھی۔

اور پھر جس رات معاذ وصل اور دیوانگی کو یکجا کر دیتا۔ صبح اس کی طبیعت بہت خراب ہو جاتی وہ سوچتی کہ کب تک ـــــ آخر کب تک ـــــ وہ تن کے لٹنے پر من کی آہ و بکا سنتی رہیگی۔

یہ لٹنا نہیں ہے۔ اس کا دماغ کہتا۔

یہ شادی شدہ زندگی کا حسن ہے اور عین شرع کے مطابق ہے۔

تب اسے کوئی جائے فرار نہ ملتی بس یونہی تکیہ منہ پر رکھکر چہرے کو اندھیری غار میں چھپالیتی۔ آنکھیں موندلیتی...... اور اندر باہر کی آوازوں سے چھپ جاتی۔

اتنے میں بے جی اسے پکارتی ہوئی اندر آگئیں۔

"اے ووہٹی...... اے ووہٹی......"

اس نے پھر بھی تکیہ مُنہ سے نہیں ہٹایا تو زور سے بولیں۔

"کیسی ہو ووہٹی ـــــ طبیعت زیادہ خراب تو نہیں ـــــ؟"

"جی نہیں"..... وہ خیالوں سے نکلی اور تکیہ دور پھینک کر اٹھ بیٹھی۔

"پھر اس طرح کیوں لیٹی ہو ـــــ؟"

"بس..... سستی سی ہو رہی ہے"۔ وہ اپنے لمبے بال لپیٹنے لگی۔

"تمھاری امی کا فون آیا ہے۔ تم سے بات کرنا چاہتی ہیں۔"

"اچھا ـــــ"

وہ جلدی سے کھڑی ہوگئی۔ سلیپر پہنے اور اپنی قمیض درست کرتی ہوئی باہر بھاگی۔

"کیا بات ہے تمھاری آواز کچھ بھاری ہو رہی ہے"؟

امی نے چھوٹتے ہی سوال کیا۔

"سو رہی تھی امی اور کچھ نہیں ـــــ"

"ابھی تک سو رہی تھیں ـــــ؟" امی کے لہجے میں سرزنش تھی۔

"جی ـــــ" رملی نے شرمندگی سے ہنس کر کہا۔

"صبح صبح اٹھا کرو۔ اور نماز پڑھا کرو۔ کیا نماز پڑھنے کی عادت چھوٹ گئی"؟

"اچھا امی......" رملی نے بس اتنا کہا۔

"کیا کہتی ہوگی تمھاری ساس۔"

"امی وہ کچھ نہیں کہتیں۔ بہت اچھی ہیں ـــــــ"

"بہت اچھی ہیں تبھی تو تم نو بجے تک سو رہی تھیں"۔

رملٰی دکھ سے مسکرائی۔ اب وہ کیا بتاتی کہ وہ تو پچھلی رات سے جاگ رہی ہے۔

"اچھا آپ بتائیں امی آپ کیسی ہیں۔ ابا جی کیسے ہیں؟ ـــــــ"

سب ٹھیک ہیں۔ امی بولیں۔

"میں آج شام کو پنڈی جا رہی ہوں"۔

"خیریت تو ہے ـــــــ؟"

"ہاں ـــ خیریت تو ہے۔ شان کا فون آیا تھا۔ کسریٰ کو تکلیف ہو رہی ہے۔ اس نے وہاں جا کر گھر کو سیٹ کرنے میں مشقت کی ہوگی۔ اس لیے قبل از وقت تکلیف شروع ہو گئی۔ شان نے اسے ہسپتال میں تو داخل کرا دیا ہے۔ مگر وہاں اس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں ہے میں چند دنوں کے لیے چلی جاؤں"۔

"ہاں امی! آپ ضرور چلی جائیں ـــــــ"

رملٰی نے جلدی سے کہا۔ "پھوپھا جی کی بچی بھی چھوٹی ہے۔ اگر وہ ہسپتال میں ہیں۔ اسے کون دیکھے گا"۔

"تمھاری طبیعت کیسی ہے اب ـــــــ؟"

"میں تو بالکل ٹھیک ہوں امی"۔

"تم بھی ذرا احتیاط کیا کرو"۔

"جی اچھا امی ـــــــ"

"اچھا بیٹی خدا حافظ ـــــــ وہاں سے تمھیں فون کروں گی"۔

"امی ـــــــ" رملٰی ایک دم بولی۔

"میرا بھی پنڈی جانے کو جی چاہتا ہے"۔

امی نے کوئی جواب نہیں دیا تو بولی۔

"پھوپھا جی کے لیے دل اداس ہو رہا ہے"۔

"ٹھیک ہے پہلے مجھے جانے دو۔ میں وہاں کے حالات دیکھ آؤں۔۔۔۔۔ پھر تم معاذ اور بے جی سے مشورہ کرنا۔ اگر انہوں نے اجازت دے دی تو ایک ہفتے کے لیے آجانا نئی نئی شادی میں یوں ہر وقت گھر سے دور رہنا ٹھیک نہیں ہوتا"۔

"امی جان ـــــ انہی کی اجازت سے تو آؤں گی۔ اگر یہ لوگ اجازت نہیں دیں گے تو نہیں آؤں گی۔"

"ہاں۔۔۔ پھر ٹھیک ہے۔ اچھا بیٹا خدا حافظ ـــــ"

"خدا حافظ امی ـــــ"

رملیٰ اپنے پاؤں گھسیٹتی ہوئی آئی اور غسل خانے میں چلی گئی۔ نہا دھو کر باہر نکلی تو طبیعت کافی بشاش ہو چکی تھی۔ ناشتہ کرنے کے بعد بے جی کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ اور انہیں امی جان کے فون کے بارے میں تفصیلات بتانے لگی۔ مگر ابھی پنڈی جانے کی بات نہیں کی۔

تیسرے دن امی جان کا فون پنڈی سے آ گیا۔ انہوں نے بتایا کہ کسریٰ کے ہاں تیسری بیٹی پیدا ہوئی ہے۔ اسی وقت رملیٰ کا دل چاہا کہ اڑ کر پھوبا جی کے پاس چلی جائے۔

ایک ہفتے بعد جب پھوبا جی ہسپتال سے گھر آ گئیں تو اس نے فون پر ان سے بات کی۔ اور اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ تو پھوبا جی بولیں۔

"رمو خدا کی قسم آج کل تیری بہت ضرورت ہے۔ آجا ـــــ امی بھی آجکل میں واپس جانے کا سوچ رہی ہیں۔"

رملیٰ اب اس انتظار میں رہنے لگی کہ پہلے بے جی سے بات کرے۔

پھر ایک دن موقع مل ہی گیا۔ چپکے سے ان کے پاس جا بیٹھی اور کہنے لگی۔

"بے جی ـــ بے جی ـــ اگر آپ اجازت دیں تو میں چند دنوں کے لیے پنڈی چلی جاؤں پھوبا جی کی بیٹی پیدا ہوئی ہے۔ امی جان واپس آ گئی ہیں اور وہ آجکل اکیلی ہیں۔ انہوں نے مجھے بلایا ہے۔"

بے جی نے حسب عادت عینک اتار کر پہلے اس کی طرف غور سے دیکھا اس کی آنکھوں کی التجا پڑھی اور بولیں۔

"معاذ آئے تو اس سے بات کرنا۔"

"بے جی پلیز۔۔۔۔ رملیٰ نے مچل کر کہا۔ بے جی پہلے آپ ہاں کہہ دیں نا؟ پھر میں معاذ سے پوچھ لوں گی۔"

"دیوانی ہوئی ہے لڑکی، شوہر کی بجائے مجھ سے پوچھ رہی ہے۔"

"نہیں بے جی ـــــ میں تو آپ سے پوچھوں گی۔ ان سے مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"کیا وہ ڈراتا ہے تجھے ـــــ؟"

"نہیں ـــــ رملیٰ ہنس پڑی۔ ایسے ہی اگر انہوں نے انکار کر دیا تو پھر میں کچھ بھی نہ کہہ سکوں گی۔"

"اسے بیویاں ہزاروں باتیں منوالیتی ہیں۔ تو اتنی سی بات بھی نہیں منوا سکتی۔"

"وہ نہیں بے جی ——— رملیٰ نے قریب ہو کر ان کا بازو پکڑ لیا۔ پہلے آپ اجازت دیدیں نا؟"

"میری طرف سے تو اجازت ہے۔" بے جی ہنس کر بولیں "چلی جاؤ چند دنوں کیلئے۔"

"ہائے بے جی ——— آپ کتنی اچھی ہیں ———" رملیٰ نے ان کے کندھے پر سر رکھدیا۔

بے جی ہنسنے لگیں۔

"وہ ہٹی ہوش کر، کچھ دنوں میں تو بچے کی ماں بننے والی ہے۔"

"ہاں ——— مگر بے جی ———" رملیٰ بے خیالی میں بولی۔ "شام کو معاذ آئیں گے نا، تو پہلے آپ بات کریں گی۔"

"کیوں ———؟"

"بس بے جی شرم آتی ہے۔ وہ کہیں گے۔ ابھی ایک مہینہ امی کے گھر رہ کے آئی ہے اور اب ———"

"ہاں کہے گا تو وہ ٹھیک۔ تو ہی اس بات کا جواب دے لینا۔"

"ہائے بے جی ——— اگر آپ بات نہیں کریں گی تو میں رو دوں گی۔"

وہ سچ مچ رو پڑی

"پگلی۔ کر دوں گی بات۔ مگر اپنے شوہر سے شرم نہیں کرنی چاہئیے۔ ایک ہی تو رشتہ ایسا ہے۔ جس سے ہر قسم کی بات ہو سکتی ہے۔"

(آپ نہیں جانتیں بے جی ——— اسی رشتے میں کھائیاں اور کھڈ حائل ہو جائیں تو بہت بے جان رشتہ ہو جاتا ہے)

شام کو معاذ دفتر سے آیا تو بے جی وہیں برآمدے میں بیٹھی تھیں۔ اسے وہیں روک لیا۔ رملیٰ اور بیویوں کے برعکس دل سے چاہا کرتی تھی کہ معاذ دفتر سے آتے ہی پہلے اپنی ماں کے پاس رک جایا کرے۔ اسے اس کا والہانہ پن اچھا نہیں لگتا تھا۔ حالانکہ اس کی کزنز اور سہیلیاں اکثر اس بات کی شکایت کرتی تھیں کہ ان کے شوہر پہلے ماں کے حضور حاضری دیتے ہیں اور یہ بات انہیں بہت بری لگتی ہے۔ وہ حیران ہوتی تھی کہ وہ اس بات سے کیوں جلتی ہیں ——— ؟ جب کہ اسے بے جی معاذ سے کہیں زیادہ اچھی لگتی ہیں اور وہ چاہتی تھی معاذ اپنا زیادہ وقت بے جی کے ساتھ ہی گذارے۔ وہ اپنے بیڈ روم میں آتا تو رملیٰ کی جان پہ بن جاتی۔

اب جو بے جی نے باہر روک لیا تو خوش ہو گئی۔ آج تو انہوں نے پنڈی جانے کی بات

بھی کرنا تھی۔ بہرحال اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد بے جی قرینے سے بولیں۔

"اے تو نے سُنا تیری سالی کے بیٹی پیدا ہوئی ہے؟"

"ہاں" معاذ بولا۔ "رملی نے بتایا تھا۔"

"تو نے مبارک باد دی"

"رملی نے جو فون کر دیا تھا۔"

"تم بھی کسی روز بات کر لیتے۔"

"کر لوں گا۔"

"رملی تو خود جانا چاہتی ہے مبارک باد دینے کے لئے"۔

"آپ سے کس نے کہا۔؟"

"خود ہی پُوچھ رہی تھی"۔

"پھر آپ نے کیا کہا۔"

"میں نے اجازت دے دی"۔

"دے دی اجازت" ــــ معاذ کے لہجے کی حیرت نمایاں تھی۔

"ہاں"!

"بے جی اس حالت میں وہ سفر کرے گی ــــ؟"

ابھی کوئی ہرج نہیں ..... بے جی نے بے پروائی سے کہا

مگر ..... آپ ..... اسے اپنے پاس رکھیں نا؟ ہر جمعرات کو وہ میکے چلی جاتی ہے۔ اس طرح تو اسے گھر رہنے کی عادت نہیں پڑے گی۔

"سب پڑ جائے گی۔ بچہ ہونے کی دیر ہے۔ بچّہ زنجیر ہوتا ہے۔ ساری دنیا سے ماں کو کاٹ کر اپنے ساتھ باندھ لیتا ہے۔ ابھی بچاری فارغ ہے۔ تو چار دن عیش کیوں نہ کرلے؟"

مگر بے جی! آپ اس کی عادتیں خراب کر رہی ہیں۔ اسے گھر کے کاموں کی عادت ڈالیں!!

"کام ہی کتنا ہے ــــ؟ ابھی اسکے ہنسنے کھیلنے کے دن ہیں۔ دو چار بچے ہو گئے تو زندگی بھر ان کے بکھیڑوں میں پڑی رہے گی۔"

"بعد میں اس کی غیر ذمّہ دارانہ حرکتوں کا گلہ مجھ سے نہ کریں"

کیوں کروں گی ؟ لڑکی شریف طبیعت کی ہے۔ رفتہ رفتہ سب سکھا لوں گی"

بہرحال شروع میں سختی کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ تو ساس لگتی نہیں !؟

میں کیوں لگوں روایتی ساس ــــ بیٹی بنا کر لائی ہوں اسے ــــ میری کونسی زیادہ اولاد

ہے۔ تیرے بعد وہی ہے جو کچھ ہے۔ میں اُسے آزُردہ نہیں دیکھ سکتی۔ وہ اونچے گھرانے کی بچی ہے۔ میں اس سے کسی گھٹیا حرکت کی توقع نہیں رکھ سکتی۔ میرا بہت ادب کرتی ہے۔ تیرا بھی لحاظ کرتی ہے۔ اجازت کے بغیر گھر سے قدم باہر نہیں نکالتی۔ کیوں خواہ مخواہ سختی کروں ——— ؟"

اندر لیٹی لیٹی رملی دل مسوس کر رہ گئی ———

ہائے ــ یہی ایک بات اسے مار رہی تھی ——— کہ وہ حاجی صاحب کی بیٹی ہے

تھوڑی دیر ماں بیٹا ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔

رملی جان بوجھکر غسل خانے میں چلی گئی۔ جب واپس آئی تو معاذ کمرے میں آ چکا تھا

رملی نے اس سے نظر نہیں ملائی تو وہ خود ہی مسکرا کر بولا۔

" تو بے جی کو رام کر لیا ہے تم نے بالا ہی بالا ———"

رملی بڑی شائستگی سے ہنس پڑی۔

"اجازت تو آپ سے بھی لینا تھی"

وہ اس کے قریب آ گیا۔ اس کے کالے کلوٹے ہاتھ دیکھتے ہی رملی ادھر ادھر بچنے کا بہانہ ڈھونڈنے لگی۔ مگر اس نے اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ لیا اور پوچھنے لگا۔

" تمہارا دل نہیں لگتا یہاں ؟"

" یہ بات نہیں ہے" وہ اس کے چہرے سے چہرہ پرے ہٹا کر بولی۔

" پھوپا جی نے فون کیا تھا۔ مجھے بلایا ہے۔ کہہ رہی تھیں.... پھر تم خود مصروف... ہو جاؤ گی۔ چند دن آ کر میرے پاس رہ جاؤ"

"ہاں" معاذ ہنسا ــ "اچھا جواز ہے"۔ اور بڑے پیار سے دھیرے سے اس کے پیٹ کو چھوا۔

"اللہ کرے تم جلدی مصروف ہو جاؤ۔ تمہارے پاؤں میں ایسی کئی زنجیریں پڑ جائیں۔ اور تم کبھی بھی کہیں نہ جا سکو"۔

رملی نے اپنا آپ چھڑایا اور آ کر پلنگ پر بیٹھ گئی اور غور سے اپنے پاؤں دیکھنے لگی۔ پتہ نہیں موٹے ہو گئے تھے یا سوجن آ گئی تھی۔ عجیب حلیہ ہو رہا تھا۔ جیسے سارے جسم میں ہولے ہولے پھونک بھر رہی ہو....... ایسے میں لوگ عورت کو خوبصورت کیوں کہتے ہیں۔ کیسے احمق لوگ ہیں!

"تو کب جانا چاہتی ہو——؟"

معاذ بھی اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ اس میں سے ایک عجیب سی گرم بھاپ نکل رہی تھی۔ جسے خوشبو بھی نہیں کہا جا سکتا۔ گو پچھلے دنوں رملی کو ہر قسم کی خوشبوئیں بری لگتی تھیں۔ مگر

اب ایک دم طبیعت سنبھل گئی تھی اس کی نظر بے اختیار ڈریسنگ ٹیبل کیطرف اٹھ گئی۔ وہاں بے شمار خوشبو سے بھری شیشیاں پڑی تھیں۔۔۔۔۔۔ پتہ نہیں وہ کون سی خوشبو استعمال کرتا تھا۔ اس کے پاس ہمیشہ ایک مدھر سی خوشبو رہتی تھی۔

(ہائے اچھی خوشبوئیں استعمال کرنے سے کہیں صورت کا گھناؤنا پن بدلا ہے —؟)

"جب آپ بھیج دیں —؟"

"یعنی میں بھیج دوں —؟"

اس نے رملی کے کندھے پر اپنا مضبوط بازو رکھا اور بولا۔

قیامت ہے جو ہووے مدعی کا ہم سفر غالب
وہ کافر کہ خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

"مجھے اتنے مشکل شعروں کا مطلب نہیں آتا —"

رملی نے چڑ کر کہا۔

"تمہیں تو کسی شے کا مطلب نہیں آتا۔" معاذ کی آواز میں گلے ہی گلے تھے۔

رملی خاموش ہو گئی۔

اس کا چپک کر بیٹھنا بھی برا لگ رہا تھا۔

پھر معاذ خود ہی بولا "اگر تم اس ہفتے رک جاؤ تو اگلے ویک اینڈ پر میں خود تمہیں چھوڑ آؤں گا —"

"آپ۔۔۔ آپ کیسے —۔۔۔" الفاظ رملی کے گلے میں اٹک گئے۔

"مجھے بھی ایک دفتری کام سے جانا ہے۔ اپنی موٹر پر جاؤں گا۔ تمہیں بحفاظت پہنچا دونگا بلکہ دو دن تمہارے پاس رہ لوں گا۔ اگر تم گوارا کرو تو۔۔۔۔۔۔ یا اجازت دو تو —۔۔۔۔"

رملی نے ڈرتے ڈرتے اس کا چہرہ دیکھا — وہاں وہی اماوس کی کالی رات تہہ در تہہ بچھی ہوئی تھی۔ کڑوا سا گھونٹ نگل کر بولی۔

"جس طرح آپ کی مرضی۔"

"رملی — تم ضد کیوں نہیں کرتی ہو؟" —

"کیا ضد کروں —؟"

"مثلاً اپنی کوئی بات منوانے کے لیے۔۔۔ لڑو۔۔۔ جھگڑو۔۔۔ چیخو۔۔۔ چلاؤ۔۔۔۔ مجھے کوسو۔۔۔۔۔ اس طرح باتیں منوا کے عورتیں مردوں کو اپنی محبت کا یقین دلاتی ہیں۔ جو عورت اپنے شوہر سے نہیں لڑتی — وہ اپنے استحقاق کو نہیں پہچانتی۔ یا پھر۔۔۔۔"

"مجھے نہیں آتا ـــــ" وہ دگیر سی آواز میں بولی۔

"یا لڑنا نہیں چاہتی ہو ـــــ؟"

"آپ اتنے اچھے ہیں۔ ہر بات خود مان لیتے ہیں تو میں کیوں لڑوں ـــــ"

اس نے پہلی بار بات بنائی۔

"کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے۔ تم ہنسنا نہیں چاہتی ہو۔۔۔۔ بولنا نہیں چاہتی ہو اور۔۔۔۔۔ اور پیار کرنا نہیں چاہتی ہو ـــــ۔۔۔۔"

ایک بڑی سی برچھی رملیٰ کے کلیجے کے پار اتر گئی۔

کتنا چھپایا من کا بھید ـــــ دل تو ندیا جتنا گہرا ہے ـــــ پر چہرہ آئینہ بن جاتا ہے۔ چہرے کو کن بادلوں میں چھپاؤں۔۔۔۔۔ کہ برسات کا دھواں باہر نہ نکلے۔۔۔۔۔ اتنی دراڑیں کیسے چھپاؤں ـــــ کیسے بتاؤں کہ جینے کو بھی جی نہیں چاہتا۔۔۔۔۔

رملیٰ نے گردن جھکالی۔ آنکھوں میں کڑوے کڑوے آنسو آیا ہی چاہتے تھے۔ گلے میں گولے سے لٹک رہے تھے۔ تن لرزنے لگا تھا ـــــ

ضدیں تو محبت کرواتی ہیں ـــــ

ضدیں تو لاڈ کا بہروپ ہوتی ہیں

ظالم مجھے تو سیاہ ناگ نے ڈس رکھا ہے ـــــ سبز زہر کی اسیر ہو گئی ہوں ـــــ کیسے کہوں کہ پھنیر سانپ کے آگے مسکرایا نہیں جاتا ـــــ

ٹوٹے دل کی کرچیاں چن کر چل تو پڑی ہوں۔ پر کرچیوں کا کیسا ساتھ ـــــ؟ لگتا ہے بکھر جائیں گی۔۔۔۔۔ ریزہ ریزہ ہو جائیں گی۔۔۔۔۔ یا مجھے ہی ذرہ ذرہ کر دیں گی۔

یہ پہاڑ ایسا لمبا جیون ـــــ

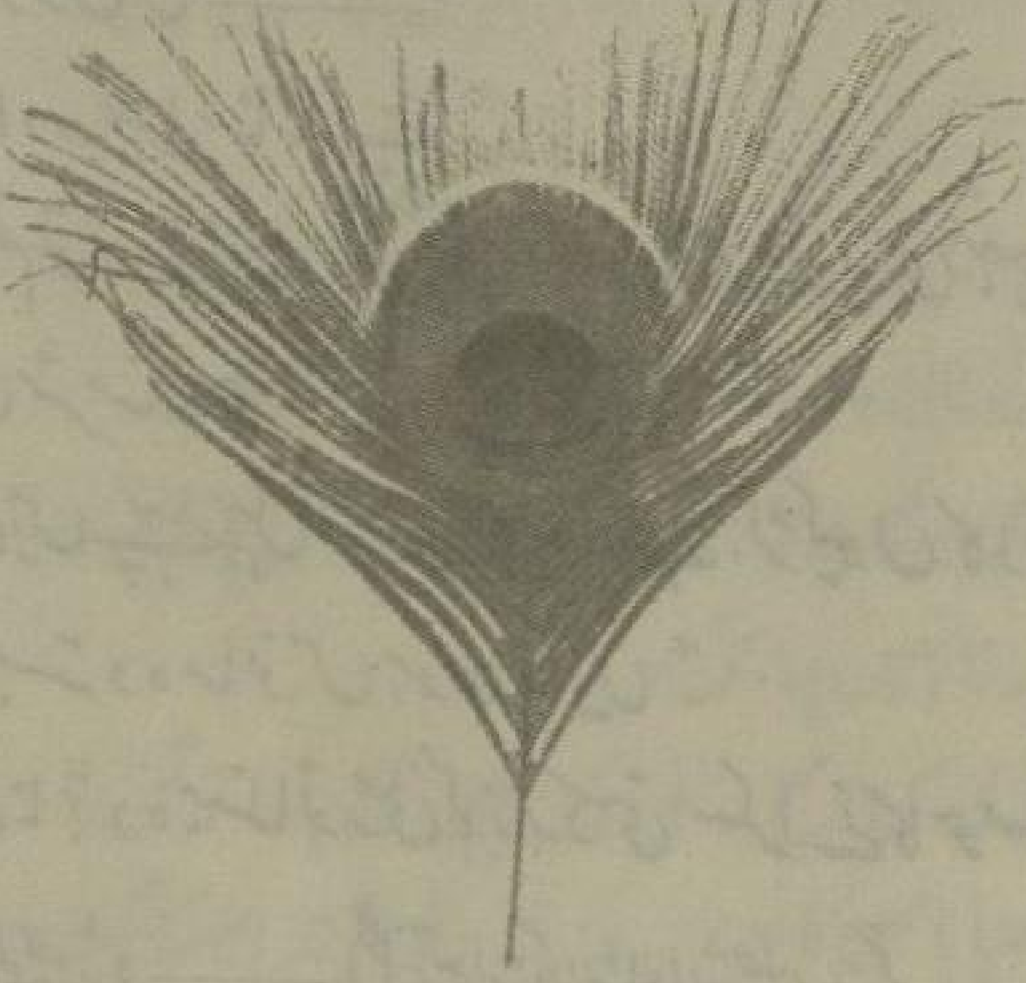
کیسے بیتے گا یہ جوگ۔۔۔۔۔

اندھیرے کنویں کے کنارے بیٹھ کر۔۔۔۔۔ مایوسیوں کے کنکر پھینکنے سے جیون کا راستہ طے ہو جاتا ہے؟

کہاں جا کے کھولوں اپنے تلملاتے ارمانوں کی گٹھڑی۔۔۔۔۔ تمہارے ساتھ میرا تن راضی نہیں ـــــ من شانت نہیں ـــــ

میری زبان قفل ابجد کی طرح ہر بار تمہارے تکلم سے جدا ہو جاتی ہے ـــــ کیا کروں گی۔۔۔۔ کیا کروں گی۔۔۔۔۔ ببول کی شاخ سے لٹکی رہوں گی۔۔۔۔۔ یا۔۔۔۔۔

تپتی ریت پر گر کر دم توڑ دوں گی ــــــ
چاروں اور گہرا سناٹا ہے . . . . .
"اوہو! تم تو سوچ میں گڑ گئیں . . . . . میں تو یونہی تمہیں چھیڑ رہا تھا ــــــ"
معاذ خود ہی شرمندہ ہو کر کھڑا ہو گیا۔
"بے جی کہتی ہیں پہلے پہل ایسا ہی ہوتا ہے۔ لڑکیوں کا دل سسرال میں نہیں لگتا ــــــ پھر آہستہ آہستہ وہ مانوس ہو جاتی ہیں"۔
"ٹھیک ہے نا؟" وہ ہنسا تو ملی کو زبردستی مسکرانے کا حوصلہ ہُوا۔
تم اپنی تیاری کو چھوڑ دو ــــــ اگلی جمعرات کو انشاءاللہ چلیں گے ــ"
تمہارے ساتھ سفر کروں گی ــــــ یہ زندگی کا سفر کافی نہ تھا ــــــ سفر میں سفر کیوں ــــــ دکھ میں دکھ کے گرداب کیوں ــــــ؟
کوئی پڑاؤ . . . . . کوئی چھایا تو ملے۔



"آج رملیٰ پہلے کی طرح چہک رہی ہے ـــــــ"

شان بھائی نے نیپکن سے ہاتھ پونچھتے ہوئے کہا۔ تو رملیٰ چونک گئی۔

اسوقت کھانے کی میز پر شان بھائی، کسریٰ باجی اور رملیٰ بیٹھے ہوئے تھے سامنے ٹی وی پر ایک دلچسپ پروگرام چل رہا تھا۔

رملیٰ نے سرخ دھاریوں والا لائلہ کا سوٹ پہنا ہوا تھا اور میک اپ بھی کافی گہرا تھا۔ بے حد خوبصورت لگ رہی تھی۔

"رملیٰ تو ہمیشہ خوشباش رہتی ہے ـــــــ" کسریٰ باجی نے جلدی سے کہا۔

"نہیں ـــ میں پچھلے دو دن سے نوٹ کرتا رہا ہوں۔ اس کا شوہر ساتھ تھا تو یہ بڑی سہمی سکڑی، گم صُم، اور کھر دری کھر دری سی نظر آ رہی تھی۔ بہت کم ہنستی تھی۔ غور سے کوئی بات نہیں سنتی تھی۔"

رملیٰ نے نظریں جھکالیں۔

"نہیں یہ آپ کا محض خیال ہے۔ کسریٰ باجی نے پھر اسے سنبھالا دیا۔ مجھے تو ہمیشہ جیسی ہی دکھائی دے رہی تھی۔ ہاں نئی نئی شادی ہوئی ہو تو شوہر کے سامنے ہنسی مذاق کرتے ہوئے ذرا جھجک سی محسوس ہوتی ہے۔ اور پھر یہ ہم سب سے چھوٹی ہے اس لیے شرمائی سی رہتی ہے۔"

"کیوں رملیٰ ـــــــ؟" شان بھائی نے براہ راست سوال کر ڈالا۔

"میرا خیال درست ہے یا تمہاری بہن کا ـــــــ؟"

رملی نے سر نہیں اٹھایا بلکہ نمک دانی اٹھا کر مالٹے کی قاشوں پر نمک چھڑکنے لگی۔ اسے معلوم تھا شان بھائی سو فیصد درست کہہ رہے ہیں۔ جب تک معاذ راولپنڈی میں رہا۔ وہ سخت بیزار رہی۔ اصل میں اس کو معاذ کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہوئے ——— آتے جاتے ہوئے بہت شرم آتی تھی۔ وہ یہ سب اپنے دل پر جبر کر کے کرتی تھی۔ لاہور سے لیکر پنڈی تک معاذ اس کے ساتھ میٹھی میٹھی باتیں اور ہنسی مذاق کرتا آیا تھا۔ راستے میں اسکا بہت خیال رکھا۔ جگہ جگہ رک کر کھانے پینے کو پوچھتا رہا۔ اسے لطیفے بھی سنائے ——— ہنسانے کی کوشش کرتا رہا ——— جب ذرا اسٹرک خالی ہوتی تو گیئر چھوڑ کر اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیتا ——— مگر رملی کیا کرتی۔ اس کی سب حرکتیں اچھی لگتی تھیں۔ بس اس کی صورت بری لگتی تھی۔ . . . . . جب جی برابر دکھ رہا ہو تو کسی محبت بھری کارروائی کا کیا جواب دیا جا سکتا ہے؟ سفر میں معاذ اور بھی رومانٹک ہو گیا تھا تھا۔ دو دن کسری باجی کے ہاں رہا۔ اور ہر وقت اس کے ساتھ نتھی رہا۔ رملی کو ہمہ وقت میک اپ میں رہنا پڑا۔ کیوں کہ معاذ کو بنی سنوری عورت بہت پسند تھی۔ محبت میں وہ والہانہ پن کا قائل تھا۔ بعض باتوں میں انتہا پسند تھا۔ کھانا کھاتے وقت پہلے اسکی پلیٹ میں ڈالتا۔ سیب چھیل لیتا تو پہلی قاش اسکی پلیٹ میں رکھ دیتا۔ وہ پانی کا گلاس اٹھاتی تو جھٹ جگ اٹھا کے پانی اس کے گلاس میں انڈیل دیتا۔ رملی خوش ہونے کی بجائے ان باتوں سے چڑ جاتی اور بیزاری کی ایک مستقل لکیر اس کی پیشانی پر نظر آنے لگی تھی۔

آج دوپہر معاذ اپنا کام ختم کر کے چلا گیا تھا۔ اور جاتے وقت اس نے رملی کا ہاتھ تھام کر کہا تھا۔

"تم کب آؤ گی رملی ———؟"

"ارے ———" کچھو باجی اچھی گھڑی کی طرح اندر سے نکل آئیں۔ اور بولیں۔

"ابھی دو دن تو ہوئے اسے آئے ——— اور واپسی کا پوچھا جا رہا ہے ——— اتنی بے اعتباری ہے معاذ بھائی ———؟"

تو معاذ نے شرمندہ ہو کر رملی کا ہاتھ چھوڑ دیا اور ہنستے ہوئے کہنے لگا۔

"یہ تو میرا فرض ہے کہ اس کا پروگرام پوچھ کر جاؤں"۔

بس ——— بس ——— کچھو باجی نے معاذ کا بازو پکڑ کر کہا۔ اب آپ جائیں معاذ بھائی اب جو ہمارا فرض ہو گا ہم ادا کریں گے۔ میں تو کم از کم ایک مہینہ اسے اپنے پاس رکھوں گی۔

"ایک مہینہ ———" معاذ نے حیرت سے کہا ——— پھر شرارت سے بولا۔

"ایسے میں شادی کر کے کسی غریب پر عنایت کرنے کی کیا ضرورت تھی ———؟"

"اور آپ کا کیسے گذارہ ہو رہا تھا اس کے بنا؟"

اس پر رملی نے سر جھکا لیا۔ اور وہ دونوں ہنسنے لگے۔

"جب تو ہو رہا تھا گذارہ پھوپھا جی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب کی بات کریں۔"

"ٹھیک ہے۔ جب رملی نے آنا ہو گا۔ ہم آپ کو فون کر دیں گے۔"

اچھا رملی۔ اس نے رملی کی طرف پُر امید نظروں سے دیکھ کر کہا۔ "دشمنوں کے جھانسے میں نہ آجانا —— دو دلوں کو یہ دنیا ملنے بھی نہیں دیتی ——"

اس پر سب کے سب کھلکھلا کر ہنس دیئے۔

اور ہاں وہ موٹر میں بیٹھتا ہوا بولا۔

"بے جی کا دھیان رکھنا وہ تمہارے بغیر زیادہ دن اکیلی نہ رہ سکیں گی۔"

"دیکھو —— اب دوسری چال چل رہا ہے —— اور آپ جو ہیں ان کے پاس ——"

"اگر میرے ساتھ بات چل سکتی تو وہ بہو کیوں لاتیں ——؟"

"یہ تو ٹھیک ہے"۔ کسریٰ نے جواب دیا —— پھر فوراً بولی

"اب چھ مہینے میں ہی اتنا حق ملکیت نہ جتائیں۔ معاذ بھائی —— آپ تو بلا شرکت غیرے اس کے مالک بن بیٹھے ہیں۔ کچھ ہمارا بھی حق ہے۔ بھیج دوں گی جب دل چاہے گا۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"میں فون کرتا رہوں گا رملی ——"

معاذ نے موٹر میں بیٹھ کر کہا ——

رملی نے صرف اثبات میں سر ہلایا۔

"پروگرام بنتے ہی مجھے بتا دینا۔ لینے آجاؤں گا۔"

"ہم پہنچا دیں گے بابا —— اب جا بھی چکو ——" کسریٰ نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

"بھئی بڑا ظالم سماج ہے۔" معاذ نے مسکراتے ہوئے موٹر اسٹارٹ کی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اس وقت ضروری ہو گیا تھا کہ رملی ایک نظر اس کو دیکھے اور مسکرا کر خدا حافظ کہے۔

مگر حلق میں نفرت کی تلواریں لٹک رہی ہوں تو آدمی کیسے مسکرا سکتا ہے ——؟

پر رملی اس پل صراط سے بھی گذر گئی۔

نظر اٹھا کر معاذ کو دیکھا —— معاذ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کتنی التجائیں تھیں ان آنکھوں میں —— جو کالی دیوار میں دو سفید گولیوں کی طرح دھنسی ہوئی تھیں۔ رملی کا دل چاہا کہ وہ ان آنکھوں کو پھوڑ دے۔ مگر وہ مسکرائی —— مسکرا کر اس نے خدا حافظ کہا —— ہاتھ ہلایا اور اندر آگئی۔

اور واقعی معاذ کے چلے جانے سے گویا اس کے دل کا بوجھ اتر گیا تھا۔ ایک بھوت کا سایا

اس پر سے ہٹ گیا تھا۔ہلکی پھلکی اور خوش باش لگ رہی تھی۔ دوپہر کو خوب سوئی اٹھ کر گرم پانی سے نہائی۔۔۔۔۔ اچھے سے کپڑے نکال کر پہنے ـــــ قرینے سے لپ سٹک لگائی اور کسریٰ باجی کے کمرے میں بچیوں کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

پنڈی میں کافی سردی تھی اور یہ سردی اسے اچھی لگ رہی تھی۔

اور اب جب کھانا کھانے کے بعد شان بھائی نے اسے ٹوکا تو اسے خیال آیا کہ واقعی معاذ کے جانے کے بعد سے اب تک وہ کافی چہک رہی ہے۔ مگر کیا کرتی اتنے دنوں کی گھٹن بھی تو نکالنا تھی۔

"اپنی اپنی جگہ آپ دونوں کا خیال درست ہے۔ میں چہک ضرور رہی ہوں مگر معاذ کے جانے سے نہیں۔۔۔۔ آج میں نے جی بھر کر آرام کیا ہے۔ شاید آب و ہوا کی تبدیلی سے میری طبیعت پر خوشگوار اثر پڑا ہے۔ بہت دنوں بعد میں اپنے آپ کو صحت مند محسوس کر رہی ہوں۔"

"خیر ـــــ شان بھائی ـــــ پڈنگ کھاتے ہوئے بولے۔ مجھے مغالطہ ہوا ہو گا۔ مگر میں نے یہ تبدیلی محسوس کی۔"

"شان تمھیں تو ہمیشہ مغالطے ہوتے رہتے ہیں۔" کسریٰ باجی نے ہنس کر کہا۔

"ہاں۔۔۔۔ جیسے دیکھا میں نے رملی کو اور شادی تم سے کر لی ـــــ"

کسریٰ باجی ہنسنے لگیں۔ ابھی وہ کچھ کہہ نہ پائی تھیں کہ کمرے سے چھوٹی بچی کے رونے کی آواز آئی۔ وہ اٹھ کر بیڈروم کی طرف دوڑیں ـــــ

کھانا ختم ہو گیا تھا ـــــ نوکر برتن اٹھانے لگا۔ رملی چاقو کی نوک سے مالٹوں کے چھلکے چھیدنے لگی۔

"ہاں ـــــ تو رملی بیگم ـــــ" شان بھائی نے ہاں کو ذرا لمبا کر کے کہا۔

"کیسی گذر رہی ہے ـــــ؟"

"بڑی اچھی گذر رہی ہے۔"

"کیسی لگی شادی ـــــ؟"

اس پر رملی ہنسنے لگی۔

"شادی کوئی لگا کرتی ہے۔ شادی تو ہو جاتی ہے۔"

"پھر بھی نئے تجربات کیسے لگ رہے ہیں۔"

رملی جانتی تھی کہ اب شان بھائی کی باری ہے۔ اپنی شادی سے پہلے وہ جی بھر کے انہیں تنگ کرتی رہی تھی اور اب وہ اسے چھیڑ چھیڑ کے لایعنی سوالات کر کے خوب بدلے لیں گے۔

"میری ساس بہت نفیس قسم کی خاتون ہیں یعنی ان سے ملنے کے بعد میں حیران ہو کر سوچا

کرتی ہوں کیا ایسے لوگ بھی اس دنیا میں موجود ہیں۔ اور شاید انہی کے دم سے یہ دنیا اچھی جگہ بنی ہوئی ہے"

اچھا تو ساس کی وجہ سے یہ شادی چل رہی ہے۔"

"جی ——" رملی نے چونک کر خوف زدہ انداز میں شان بھائی کیطرف دیکھا۔

"تمھارا معاذ کے ساتھ کوئی جوڑ نہیں تھا۔ تمھارے ساتھ بیٹھا ہوا یوں لگتا ہے جیسے نازک اندام پری کے ساتھ بھیانک دیو آبیٹھا ہو۔"

ایک گرداب سا رملی کے حلق میں بن گیا کہ بولنے کے سارے راستے مسدود ہو گئے۔ بڑی مشکلوں سے اپنے آپ کو آمادہ کر کے یہاں لائی تھی اور شام ہی سے ہر خیال بھلا کر خوش رہنے کی کوشش کر رہی تھی کیسا اوچھا وار کیا تھا شان بھائی نے —— ساری خوشیاں آنسو بن کر حلق میں ٹپک رہی تھیں —— رملی اپنے حلق کا گولا نگل کر کوئی جواب دینا چاہتی تھی کہ کسریٰ باجی لوٹ آئیں انہوں نے گود میں اپنی نومولود بچی کو اٹھا رکھا تھا۔

انہوں نے بیٹھتے ہی ہلکا سا دھواں رملی کے چہرے پر دیکھا —— اور ایک سفاکی سی شان کے چہرے پر —— مگر موقع کو سنبھالتے ہوئے —— بچی کو چمکار کر بولیں۔

"خالہ کے پاس جائے گی ——؟"

رملی نے خود ہی ہاتھ بڑھا کر بچی کو اٹھا لیا۔

رملی اس وقت بچی اٹھانے کے موڈ میں ہرگز نہ تھی۔ اس نے بھی گفتگو کو نیا موڑ دینے کے لیے عافیت اسی میں جانی —— لیکن جب اناڑی پن سے بچی کو اٹھایا تو کسریٰ باجی بولیں ——

"ذرا ٹھیک سے اٹھا —— تھوڑے دنوں بعد تجھے اپنا بچہ اٹھانا ہوگا۔ بلکہ اسے زیادہ تر اپنے پاس رکھا کرو۔ تاکہ تم بھی بچہ پالنے کا سلیقہ سیکھ لو۔"

رملی شرما کر ہنسنے لگی۔ پھر بولی۔

"آپ کی یہ بیٹی بہت پیاری ہے۔ کس پہ ہے"؟

"مجھ پر ہے" —— شان بھائی بڑی شان سے بولے۔

"ظاہر ہے خوبصورت اور لائق بچہ ہمیشہ باپ پر ہوتا ہے ——" کسریٰ باجی نے چوٹ کی۔

"نام کیا رکھا ہے کسو باجی ——؟" رملی نے پھر پوچھا۔

"تم سوچو نا ——؟"

"ابھی تک آپ نے سوچا ہی نہیں —— . . . . ."

"امی جب تک یہاں رہیں نئے نئے نام تجویز کرتی رہیں۔ بڑی بیٹی کا نام زینب ہے میں تو اس کے ساتھ ملا کر نام رکھنا چاہتی تھی۔ مگر امی نے کہا ہے۔ لڑکیوں کا قافیہ ردیف نہیں ملانا چاہیئے

پھر لڑکیاں ہی پیدا ہونے لگتی ہیں اور آج کل کے زمانے میں تو بس دو لڑکیاں ہی کافی ہیں۔

"بس جی ــــ" شان بھائی بولے ــــ "پیدا ہی دو کریں گے"۔

"ارے بیٹا نہیں چاہیئے آپ کو" ــــ رملی نے حیرت سے کہا۔

"بس بس ــــ" شان بھائی بیزاری سے بولے۔ "لڑکے کی آرزو میں کہیں یہ لڑکیوں کی لائن نہ لگا دے۔"

کِسریٰ باجی ٹھنڈی سانس لیکر خاموش ہوگئیں۔

کِسریٰ باجی کی پہلی بیٹی بالکل کِسریٰ باجی پہ تھی۔ سانولی، سلونی، مستعد اور خوش ادا قریب ہی قالین پر کھیل رہی تھی۔

"زینو! تم جا کے سو جاؤ بیٹا ــــ"

کِسریٰ باجی موضوع بدلنے کے لیے اپنی بیٹی سے مخاطب ہوئیں۔

پھر رملی کیطرف دیکھ کر بولیں۔

"تم آئی ہوئی ہو . . . کوئی خوبصورت سا نام سوچ نا ــــ"

"جب تک نام نہیں ملتا آپ اسے لاڈلی بلایا کریں۔"

"ہاں یہ بھی ٹھیک ہے"۔ کِسریٰ باجی نے مسکرا کر بچی رملی کے ہاتھ سے لے لی۔

"رملی! تیرا ذہن اتنی جلدی کیسے کام کرتا ہے ــــ؟"

"اس کا ذہن صرف شوہر کے زیر سایہ کام کرنا بند کر دیتا ہے"۔

شان بھائی نے پھر چوٹ کی۔

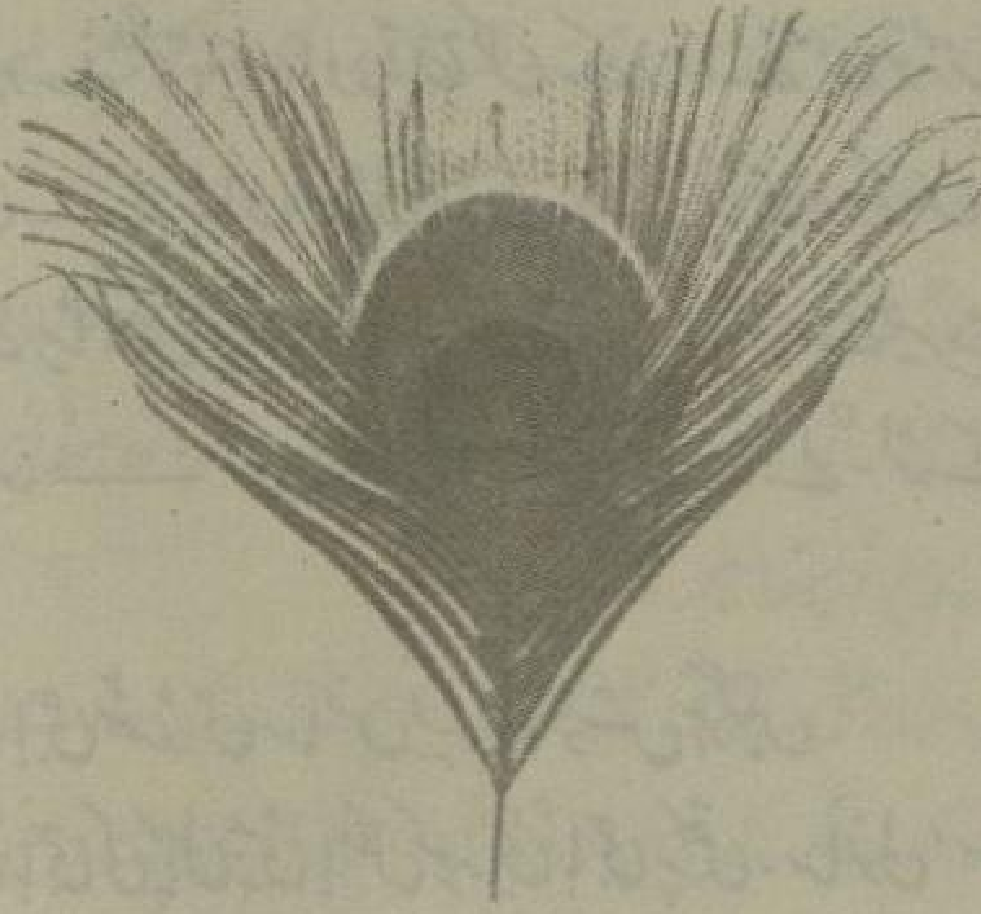
"کیوں ــــ؟" کِسریٰ باجی نے پوچھا۔

"گرہن لگ جاتا ہے"۔

اس پر پہلے تو کِسریٰ باجی زور سے ہنسیں۔ پھر انہوں نے شان بھائی کو گھورا کہ ایسی بات کیوں کہی انہوں نے ــــ؟

پھر بچی کو سنبھال کر کھڑی ہوگئیں اور بولیں۔

"اچھا بھئی اب تم سالی بہنوئی ایک دوسرے پر وار کرو۔ میں بچیوں کو سلا کر آتی ہوں"۔



کسریٰ باجی کی طبیعت ابھی ٹھیک نہیں ہوئی تھی۔ بچی آپریشن سے ہوئی تھی اور چونکہ پری میچور تھی اس لیے تنگ بہت کرتی تھی کوئی اچھی آیا بھی نہ مل سکی تھی۔ اس لیے کسریٰ باجی کی مت ماری رہتی۔ ابھی بڑی بیٹی زینب صرف پونے دو سال کی تھی اور لاڈلی آگئی تھی بلکہ لاڈلی کے آنے سے زینب اور زیادہ ضدی اور چڑچڑی ہوگئی تھی۔ رملی کو کسریٰ باجی کی حالت پر اور زیادہ ترس آتا۔ وہ تو شان بھائی اتنے خوش مزاج اور وسیع القلب واقع ہوئے تھے ورنہ سارا دن جو گھر میں چوں چوں ہوتی رہتی تھی اسے کون برداشت کرسکتا تھا؟ ـــــ

صبح ناشتے کی میز پر عموماً رملی اور شان بھائی ہوتے تھے۔ کسریٰ باجی آتیں بھی تو ملازم کو جلدی جلدی ہدایات دیکر بھاگ جاتیں۔ اسی وقت لاڈلی کو دودھ پلانا ہوتا یا نیپکن بدلنا ہوتا۔ ایک رات رملی سے بولیں۔

"رمو! تو صبح صبح اُٹھ جاتی ہے۔ اپنے دولہا بھائی کو ناشتہ کروا دیا کرنا" ـــــ

"کیا میں اپنے ہاتھ سے ان کے مُنہ میں نوالے ڈالوں ـــــ؟"

"نہیں پگلی! ان کی عادت ہے۔ کھانے کی میز پر اکیلے نہیں بیٹھتے۔ میں رات کو خانسامے کو سب کچھ سمجھا دیتی ہوں۔ مگر تو ذرا ان کے ساتھ بیٹھ جایا کر۔"

"روز ہی تو ساتھ بیٹھ جاتی ہوں۔"

"مگر تو مجھے پکارتی رہتی ہے۔"

"تو آپ بھی آجایا کریں نا؟"

"لاڈلی مجھے ساری رات جگاتی ہے۔ صبح چھ بجے زینب کے دودھ پینے کا وقت ہوتا ہے۔ اٹھ کر کچن میں جاتی ہوں۔ بوتل بنا کے لاتی ہوں۔ اسے پلا کر دوبارہ سلا دیتی ہوں۔ اس

وقت اگر لاڈلی سو رہی ہو تو میں بھی جلدی سے سو جاتی ہوں۔ بس یہی دو تین گھنٹے ملتے ہیں مجھے سونے کے لیے —— پھر سارا دن کہاں سونے کی فرصت ملتی ہے۔"

رملی نے دیکھا۔ کسریٰ باجی کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے تھے۔ رنگ تو پہلے ہی سانولا تھا۔ اب اور مرجھا گیا تھا۔ پیٹ لٹک آیا تھا۔ بال الجھے ہوئے تھے۔ کیسی بھدی اور تھکی تھکی لگ رہی تھیں۔ توبہ ہے۔ دو بچوں میں ہی عورت کا ستیاناس ہو جاتا ہے۔ کیسی ملیح اور لڑکڑاتی جوانی تھی ان کی —— چہرے پر اتنا نمک تھا کہ آنکھ ہٹانے کو دل نہ چاہتا۔ دل ہی دل میں رملی کو ان کے اس طرح لٹ جانے کا بہت افسوس ہوا۔ غصے سے بولی۔

"رات کو شان بھائی کو جگایا کرو۔ آخر ان کا بھی کچھ فرض ہے ——"

کسریٰ باجی معنی خیز انداز میں مسکرائیں۔

"ابھی تجھے پتہ نہیں کہ شوہر کیا ہوتا ہے۔ شوہر بس ایک ہی فرض ادا کرنے عورت کے قریب آتا ہے اس کے علاوہ گھر کے اندر وہ کسی تعاون کا قائل نہیں ہوتا۔"

"نہیں پھوباجی —— آپ نے انہیں سر چڑھا رکھا ہے۔ رات کو جھنجھوڑ کر جگا دیا کریں۔ اور بچی ان کی گود میں پٹخ دیا کریں۔"

"کیسے جگایا کروں —— ؟ جب سے بچیاں ہوئی ہیں۔ وہ الگ کمرے میں سوتے ہیں۔"

"الگ کمرے میں سوتے ہیں —— ؟"

رملی نے حیرت سے کہا۔ "سارا دن تو وہ آپ کے کمرے میں ہوتے ہیں۔"

"ہاں، مگر رات کو ادھر ساتھ والے کمرے میں جا سوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں لڑکیاں روتی ہیں تو میں ڈسٹرب ہوتا ہوں۔ مجھے صبح تازہ دم ہو کر دفتر جانا ہوتا ہے۔" "یہ کیسی رفاقت ہے باجی —— ؟"

"وہ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ مرد کو سارا دن ایک دنیا سے لڑنا ہوتا ہے۔ ہم عورتیں تو گھر میں بیٹھی رہتی ہیں ان کی نیند کا پورا ہونا ضروری ہے۔ ورنہ پھر دفتر جا کر ایک ایک سے لڑتے رہیں گے اور جانے کتنی خرابیاں کر کے آئیں گے۔ شروع شروع میں نے انہیں زبردستی اپنے کمرے میں سلایا تھا شام کو انگارہ بن کے واپس آتے تھے اب تو ان کی وہی پرانی خوش مزاجی پھر لوٹ آئی ہے۔"

"ویسے باجی —— رملی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ آپ ان کے ناز بھی بہت اٹھاتی ہیں۔ میں تو کبھی اتنے نخرے نہ اٹھاؤں ——"

"تمہارا شوہر اور طرح کا ہے۔" پھوباجی نے آہستہ سے کہا۔

"وہ بچارا اپنی صورت کی وجہ سے تم سے دبتا بھی ہے۔ ایسے شوہر کم ہوتے ہیں جن شوہروں کو کسی قسم کا احساس کمتری ہو وہ بیویوں کے ناز اٹھا لیتے ہیں۔ دوسری قسم کے شوہر نہیں اٹھاتے..."

کاش کسریٰ باجی یہ سب نہ کہتیں ...... بھلے اس کو بندوق کی گولی مار لیتیں.....
یوں لگا جیسے وہ آسمانوں سے لڑھکتی زمین پر آ رہی ہو...... اور زمین بھی اتنی سخت کہ جو اسکی ٹوٹی ہوئی پسلیوں کا لہو چاٹ رہی ہے۔

تو یہاں ہر شخص کو احساس ہے کہ میرا شوہر بدصورت ہے۔

اُف ـــ میرے مقدر میں مایوسیاں کیوں لکھی ہیں۔ کاش میرا شوہر خوبصورت ہوتا۔ بلا سے سخت گیر ہوتا ـــ ظالم ہوتا ـــ شدّاد ہوتا ـــ میں اسکی ہر سختی سہہ لیتی ـــ

مگر ایسا نہ ہوتا کہ پاس بیٹھتے ہوئے گھن آئے ..... اور بات کرنے سے ابکائیاں آنے لگیں۔

اب سب جانتے ہیں..... سب کو معلوم ہے...... کہ میں مجبور ہوں......
اور یہ دکھ جھیل رہی ہوں.....

اور کتنی بے غیرت ہوں میں ـــ ؟

رملیٰ کے چہرے نے اتنے رنگ بدلے کہ کسریٰ باجی گھبرا گئیں۔ پھر اس کے قریب کھسک آئیں اور محبت بھرے لہجے میں بولیں۔

"رملیٰ یقین کرو۔ معاذ جیسے شوہر بہت اچھے ہوتے ہیں۔"

"کیا اچھائی ہوتی ہے ان میں ـــ میں بھی تو سنوں ـــ" رملیٰ ایکدم پھٹ پڑی۔
اور پھر زار وقطار رونے لگی۔

کسریٰ باجی کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ اس کا ہاتھ تھام کر بولیں۔

"تم دیکھتی نہیں وہ تمہارا کتنا خیال کرتا ہے۔ کتنی محبت کرتا ہے تم سے ـــ....."

"اس کے علاوہ وہ اور کر بھی کیا سکتا ہے؟ ابھی تو آپ نے کہا تھا بدصورت شوہر احساس کمتری کے مارے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ محبت نہ کریں ناز نہ اٹھائیں تو اپنے عیب پر پردہ کیسے ڈالیں ـــ؟"

"یہ بات ہمیشہ اسطرح نہیں ہوتی رملیٰ ـــ احساس کمتری کے مارے ہوئے شوہر دوسری انتہا پر بھی جا سکتے ہیں۔ مثلاً وہ اپنے عیب چھپانے کے لیے آزار بھی دے سکتے ہیں۔ بیوی پر زندگی کی ہر خوشی حرام کر سکتے ہیں۔"

"اور میں اس کا اندازہ کرنا بھی نہیں چاہتی ـــ؟"

رملیٰ آنسوؤں میں ڈوبی ڈوبی بولی ـــ

"شادی کرتے وقت آپ میں سے کسی کو بھی رحم نہ آیا۔ آپ نے تو معاذ کو دیکھا تھا آپ

کو تو معلوم تھا کہ وہ مکروہ صورت ہے۔ آپ تو مجھ سے بہت محبت کرتی تھیں۔ آپ ہی مجھے بتادیتیں۔"

"پھر تم کیا کرلیتیں رمو ——"

"میں انکار کر دیتی..... میں زہر کھالیتی ...... میں .... میں ..... میں ..... اسطرح روز روز مجھ سے زہر نہیں کھایا جاتا —— روز روز مجھ سے مرا نہیں جاتا ......"

"پگلی ہے تو ——"

کسریٰ باجی نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگالیا۔ پھر تھپتھپانے لگیں۔

"بہادر بنو رمو۔ زندگی میں سب کچھ ایک بار ہی نہیں مل جاتا۔ میں تو خیر مرد کی شکل و صورت کو ثانوی درجہ دیتی ہوں۔ پھر معاذ کوئی ایسا برا بھی نہیں۔ بس چیچک کے نشان ہیں اس کے چہرے پر —— مرد کالے کلوٹے ہی بھلے لگتے ہیں۔ تم دیکھو اس کے اندر کتنا خوبصورت انسان ہے۔ وہ جب بات کرتا ہے تو یوں لگتا ہے اس کے مُنہ سے پھول جھڑ رہے ہیں۔ اس کی ماں کتنی نیک خو ہے۔ کتنا پیار کرتی ہے تم سے —— ایک میری ساس بھی ہے توبہ —— خدا مرتے وقت بھی اس کی صورت نہ دکھائے۔ میں تو جب سے پنڈی آئی ہوں بے حد مسرور ہوں۔ یہاں بچوں کے ساتھ رت جگے کرتی ہوں مگر شکر ہے اس کے مظالم برداشت نہیں کرنے پڑتے۔ زندگی سمجھوتے کا نام ہے —— ازدواجی زندگی میں صرف صورت اہم نہیں ہوتی۔ جوں جوں زندگی گذرے گی تمہیں پتہ چلے گا۔"

رملیٰ نے کوئی جواب نہیں دیا کسریٰ باجی کے کندھے سے لگی بس روتی رہی۔

یہ تو کسریٰ باجی بھی سمجھ رہی تھیں کہ شادی کے بعد رملیٰ چُپ چُپ رہنے لگی ہے۔ وہ پہلے جیسی شوخی اور شگفتگی اس میں نہ رہی تھی۔ مگر وہ سوچتی تھی رفتہ رفتہ بچے ہوتے جائیں گے تو خود ٹھیک ہو جائیگی۔ بچوں کی پیدائش کے بعد عورت کو دُنیا میں کوئی چیز ان سے زیادہ اہم نہیں لگتی۔ انہیں معلوم تھا مرد کا کردار اور عادات واطوار ہی بالآخر عورت کو مسخر کر لیتے ہیں شکل وصورت بیوی کی ہو یا شوہر کی سراب ثابت ہوتی ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر اچھی شکل کے پیچھے اچھا مرد ہو۔

تھوڑی دیر تک کسریٰ باجی نے رملیٰ کا سر اپنے سینے سے لگائے رکھا۔ اسے سہلاتی رہیں۔ پیار کرتی رہیں۔

جب رملیٰ کا سارا غصہ —— سارا غم —— سارا غبار نکل گیا —— تو اس کی سسکیاں بھی تھم گئیں۔

دوپٹے کے کونے سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولی ——

"پھوپا جی! میں نے آج تک کسی سے کچھ نہیں کہا۔ مگر آپ کو کیا معلوم ان چند

مہینوں میں مجھ پر کیا گذر گئی ہے۔ ہر رات مرتی ہوں۔ ہر صبح جی اٹھتی ہوں۔ میں سوختہ تن ہو چکی ہوں کسی دن ٹوٹ جاؤں گی۔ بکھر جاؤں گی۔ مٹ جاؤں گی۔"

"نہیں میری گڑیا!" پھو باجی نے اسے پیار کر لیا۔

"میں جانتی ہوں تو ہم سب بہنوں سے زیادہ بہادر رہے۔ تو اپنے ابا جی اور امی جی کی لاج رکھے گی اور ہمیشہ اچھی بیوی بن کے رہے گی۔"

رملی کی آنکھوں میں کچھ اور تازہ دم آنسو آ گئے۔

"معاذ کو کبھی یہ پتہ نہیں لگنا چاہیئے کہ تو اسے پسند نہیں کرتی تو مرد کی فطرت کو بالکل نہیں جانتی۔"

"تو کیا کر لے گا میرا —— طلاق ہی دے دیگا نا؟"

"اُف ——" کبریٰ باجی کو بہت تکلیف پہنچی۔

"اتنی جلدی اتنے بڑے نتیجے پر نہیں پہنچ جاتے۔ ہر مسئلے کا حل صرف طلاق ہی نہیں ہوتی۔ تمھارا بچہ ہونے والا ہے۔ اب اس کے بارے میں سوچو۔"

"جہنم میں جائے یہ بچہ بھی، مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

"زندگی میں ہر چیز کی ضرورت ہوتی ہے رمو۔ فرض کرو دو چار سال تمہارے ہاں بچہ نہ ہوتا یا ڈاکٹر کہدیتی کہ خدانخواستہ تم تخلیق کی اہلیت سے محروم ہو۔ تو پھر —— اپنے تمام تر ظاہری حسن کے باوجود تمہیں کوئی پسند نہ کرتا۔ یہ بدصورت شوہر بھی تمہیں ٹھکرا دیتا اور کہتا مجھے تو وہ عورت خوبصورت لگتی ہے جس کی گود میں بچہ ہو۔ خواہ اندھی ہو۔ لولی ہو یا لنگڑی ہو۔"

"کاش ایسا ہی ہوتا اور یہ شخص مجھے ٹھکرا دیتا ——"

رملی نے شدید غصے میں نتھنے پھلا کر کہا۔

"بے وقوف تو اسوقت جذباتی ہو رہی ہے۔ تجھے پتہ ہی نہیں کہ تو کیا کہہ رہی ہے۔ خیر —— کچھ وقت لگے گا۔ تو آہستہ آہستہ سمجھ جائے گی زندگی کو ——"

رملی پھر رونے لگی۔

"ازدواجی زندگی میں مرد اور عورت کی صورت ثانوی درجے پر آجاتی ہے۔ اصل چیز فطرت کا حُسن ہوتا ہے۔ تم بھی اس کے اندر کا حسن تلاش کرنے کی کوشش کرو۔"

"میں تو جینا بھی نہیں چاہتی اور آپ کہتی ہیں اندر کا حسن تلاش کروں۔"

"اب مجھے ہی دیکھو ——"

ایکدم پھو باجی بول پڑیں۔ "میرا شوہر مجھ سے زیادہ خوبصورت ہے۔ عام مردوں سے زیادہ دلکش ہے۔ اگر وہ یہ کہے کہ میں تو اس کے ساتھ چلنے کے لائق بھی نہیں ہوں اس کے ساتھ زیب

نہیں دیتی۔ تو میں کیا کروں گی ——؟"

"خیر —— آپ اپنے آپ کو معاذ کے ساتھ نہ ملائیں۔ آپ اس سے ہزار درجے بہتر ہیں۔"

"یہ تو محض تمہارا خیال ہے۔ جو میری عزیز بہن ہو۔ تم نے کبھی شان سے اس کا خیال پوچھا ہے.... یہ سارا بس سوچ کا فرق ہوتا ہے رملو —— جس کو جیسا سمجھ لو۔ وہ ویسا ہو جاتا ہے۔ تمہارا بچّہ ہو جائیگا نا؛ تو تعلقات کی ایک نئی بنا پڑے گی۔ تیری سوچ میں بھی فرق آجائیگا۔"

"مجھے اس بچّے سے کوئی دلچسپی نہیں کھو باجی —— اور میں قیامت تک معاذ کو پسند نہیں کر سکتی۔ ماں باپ کی اس زیادتی کو روپیٹ کر نبھا دوں گی۔ اگر نبھا سکی تو —— اور پھر ایک بدصورت بچہ لیکر مجھے کیا کرنا ہے ——"

"او بے وقوف ——"

کسریٰ باجی ہنسنے لگیں۔

"بچّہ کیوں بدصورت ہوگا۔ کیا تم اس میں شامل نہیں ہو گی اور کیا خبر بچّہ صرف تم پر ہو اور معاذ کے نقوش بھی کچھ ایسے برے نہیں ——"

"ظاہر ہے ——" رملی جلدی سے بولی۔

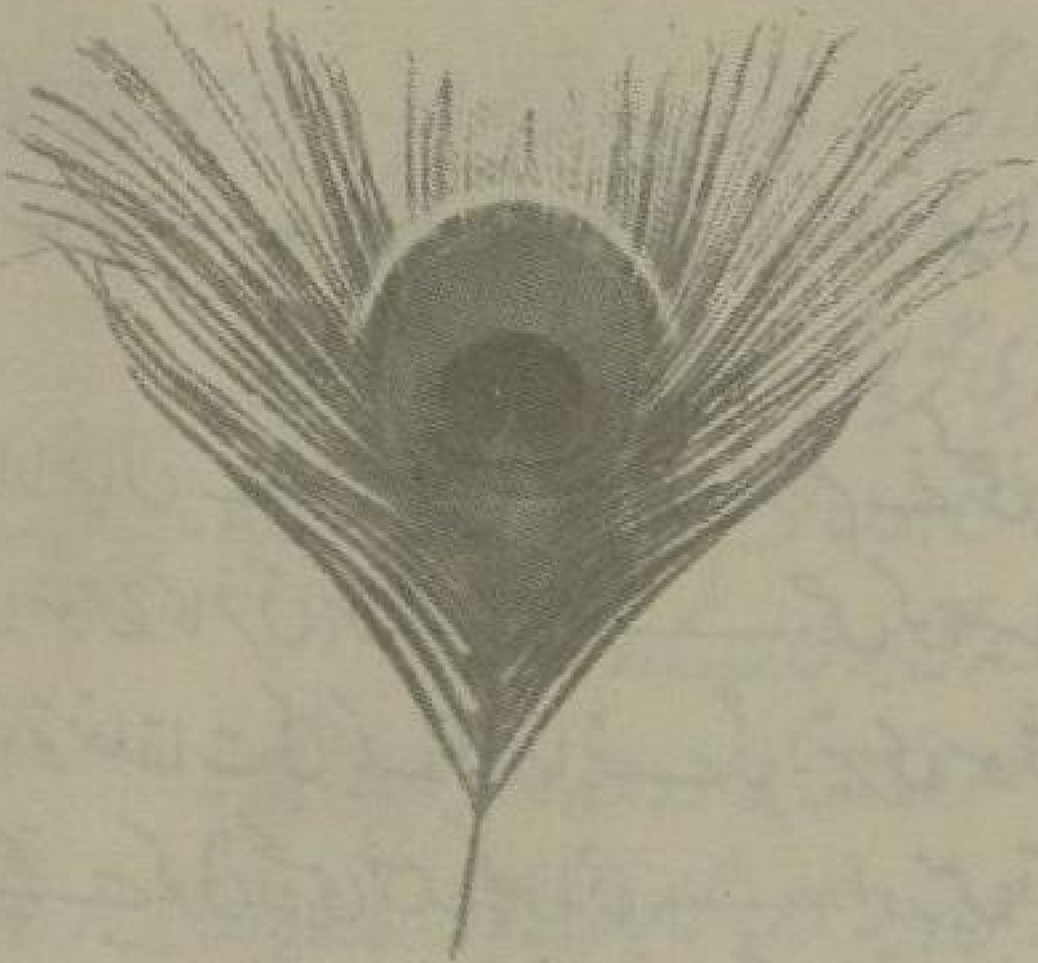
"آپ لوگ باتوں باتوں میں طنز کے خنجر مار کے میرا دل زخمی کرتے رہتے ہیں۔ ہر وقت کسی نہ کسی بات سے مجھے احساس دلاتے رہتے ہیں کہ میرا شوہر بدصورت ھے...... مجھے کیا سمجھ رکھا ہے آپ لوگوں نے —— میں پتھر کا ٹکڑا ہوں —— بے حس تودا ہوں یا زمانے بھر کی احمق لڑکی ہوں ——"

کسریٰ باجی کو احساس ہُوا کہ اس نے آج غلط بات کہدی تھی۔ جب سے رملی اس کے گھر آئی تھی وہ اسکی اداسی اور خاموشی محسوس کر رہی تھی۔ مگر وہ جان بوجھ کر رملی کو کریدتی نہیں تھی وہی ہوا —— ذرا سی ہوا دی تو وہ بھڑک اٹھی۔

اس وقت باہر شان کی موٹر رکنے کی آواز آئی تو کسریٰ باجی بولیں۔

"اب تم جلدی سے اپنے کمرے میں چلی جاؤ اور ہاتھ مُنہ دھو کر ٹھیک ہو جاؤ۔ شان ضرور پوچھیں گے کہ کیا ہوا ہے —— اور ان کے آگے کوئی بودی بات نہ کرنا۔ میں اپنے بہن بھائیوں کے مسائل اور ان کی کمزوریاں اپنے شوہر کے آگے کھول کر نہیں رکھا کرتی۔"

رملی دوڑ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔



صبح ناشتے سے پہلے رملی بطور خاص تیار ہو کر میز پر آگئی تھی۔ رات کو کسریٰ باجی نے اسے اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ کہ شان بھائی کس قسم کا ناشتہ پسند کرتے ہیں۔ کسریٰ باجی پر اسے بے حد ترس آیا تھا۔ بچاری ساری رات ننھی سی پٹاخی کے ساتھ جاگتی تھیں ...... اور پھر تھکی تھکی نیم بیدار آنکھوں کے ساتھ ناشتے کی میز پر آبیٹھتی تھیں۔

رملی ابھی میز پر شان بھائی کا ناشتہ لگا رہی تھی کہ وہ خوشبوئیں چھوڑتے ہوئے آگئے اور اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے اس وقت دھاریدار براؤن سوٹ پہن رکھا تھا جس میں ایک دھاری ہلکی پیلی تھی۔ دھاریدار سوٹ میں ان کا قد زیادہ لمبا لگ رہا تھا۔ زرد چیک قمیص پر ـــــ گہرے براؤن رنگ کی چھوٹی ڈبیوں والی ٹائی لگا رکھی تھی ...... ایک دم تر و تازہ اور جوان لگ رہے تھے۔

بڑی خوش دلی سے اس کی صورت دیکھ کر بولے۔

"گڈ مارننگ خوبصورت خاتون ـــــ"

"گڈ مارننگ"۔ رملی نے بھی انہی کے انداز میں مسکرا کر کہا۔

"اتنی حسین لڑکی صبح صبح ناشتہ کرائے گی تو سارا دن کیوں نہ اچھا گذریگا ـــــ؟"

"تو پھر خوش ہو جایئے اس خوبصورت لڑکی پر یہ خوبصورت ذمہ داری ڈال دی گئی ہے۔"

"دیکھا ـــــ میں نہ کہتا تھا۔ میری بیوی بہت عقل مند ہے۔"

"اچھا ـــــ وہ کیسے ـــــ؟"

"اسے معلوم ہے کہ صبح صبح شوہر کو کیسا مکھڑا دکھانا چاہیئے۔"

رملیٰ ہنسنے لگی۔

"چائے بناؤں....."

"ضرور بناؤ ـــــ" شان بھائی نے اپنے لال ڈوروں والی آنکھیں اس کی آنکھوں میں ڈال کر کہا۔

"خان محمد اب گرم دودھ دے جاؤ۔" اس نے خانساماں کو آواز دے کر کہا اور قہوہ پیالی میں انڈیلنے لگی۔

خان محمد گرم گرم بھاپ چھوڑتا دودھ میز پر رکھ گیا۔

"چینی کتنی شان بھائی ـــــ" رملیٰ نے قہوے میں دودھ ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"ہائے کیا کہوں ـــ ایسا گھسا پٹا محاورہ ہے۔ مگر اس سے زیادہ موزوں جواب مجھے نہیں سوجھ رہا ـــــ بس انگلی ڈبو کر دے دو ـــــ"

رملیٰ زور زور سے ہنسنے لگی۔

" انگلی ڈبو لوں۔ تاکہ اس پر چھالا نکل آئے اور کام سے بھی جاؤں۔"

"نہیں نہیں اتنی خوبصورت انگلی پر چھالا نہیں بلکہ دل نکلنا چاہیئے ـــــ ہے نا!۔ پھر بولے۔

"واہ وا! کیا مزے دار چائے ہے۔"

اس کے بعد بھی وہ اپنی شوخ طبیعت کیمطابق اس سے چھیڑ چھاڑ کرتے رہے۔

پھر گھڑی دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اچھا ہنی ـــــ میرا وقت ہو گیا۔ خدا حافظ ـــــ"

"خدا حافظ شان بھائی ـــــ رملیٰ نے کھڑے ہو کر کہا۔"

شان بھائی رملیٰ کی شادی سے پہلے بھی اس کو ہنی HONEY کہا کرتے تھے۔ پہلے تو لاڈ میں آ کر اسے اپنی بغل میں لپیٹ لیتے تھے۔ چٹیا کھینچ لیتے تھے۔ اور وہ سارا دن شان بھائی شان بھائی کرتی ان کے پیچھے دوڑتی رہتی تھی۔

شان بھائی چلے گئے تو اس نے کسریٰ باجی کے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ دونوں بچیاں اس کے دونوں پہلوؤں میں گھسی ہوئی سو رہی تھیں اور وہ نیند میں بے ہوش پڑی تھیں۔

کمرے میں ہیٹر جل رہا تھا۔

رملیٰ اپنے کمرے میں آ گئی۔ کوئی کام نہیں تھا کرنے کو اور یہاں آئے اسے ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔ ایک ہفتے میں اسکی طبیعت کافی سنبھل گئی تھی۔ اپنی بہن کو اپنا دردِ دل کہہ کر اسے بڑا سکون

ملاتھا۔اب وہ خود فراموشی کی کیفیت میں تھی ـــــــ اور خود فراموشی کے عالم میں ہی چند روز اور گذار دینا چاہتی تھی۔

اس ایک ہفتے میں معاذ کا فون دو مرتبہ آیا تھا۔بڑے پیار سے اس کا حال پوچھتا رہا۔مگر آنے کے بارے میں نہیں پوچھا۔نہ ہی رملیٰ نے کسی قسم کی آمادگی کا اظہار کیا۔

معاذ کا فون عام طور پر شام کو آتا تھا۔جب لوگ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے ہوتے۔ رملیٰ تو سرسری بات کرتی۔کبریٰ لپک کر فون لے لیتی اور اس کے ساتھ خوب گپ بازی کرتی اسے معلوم ہو گیا تھا کہ رملیٰ معاذ کے ساتھ بات کرنا بھی گوارا نہیں کرتی۔اس لیے وہ بڑے سلیقے سے گپ لگا کر رملیٰ کی بے اعتنائی پر بھی پردہ ڈال دیتی۔

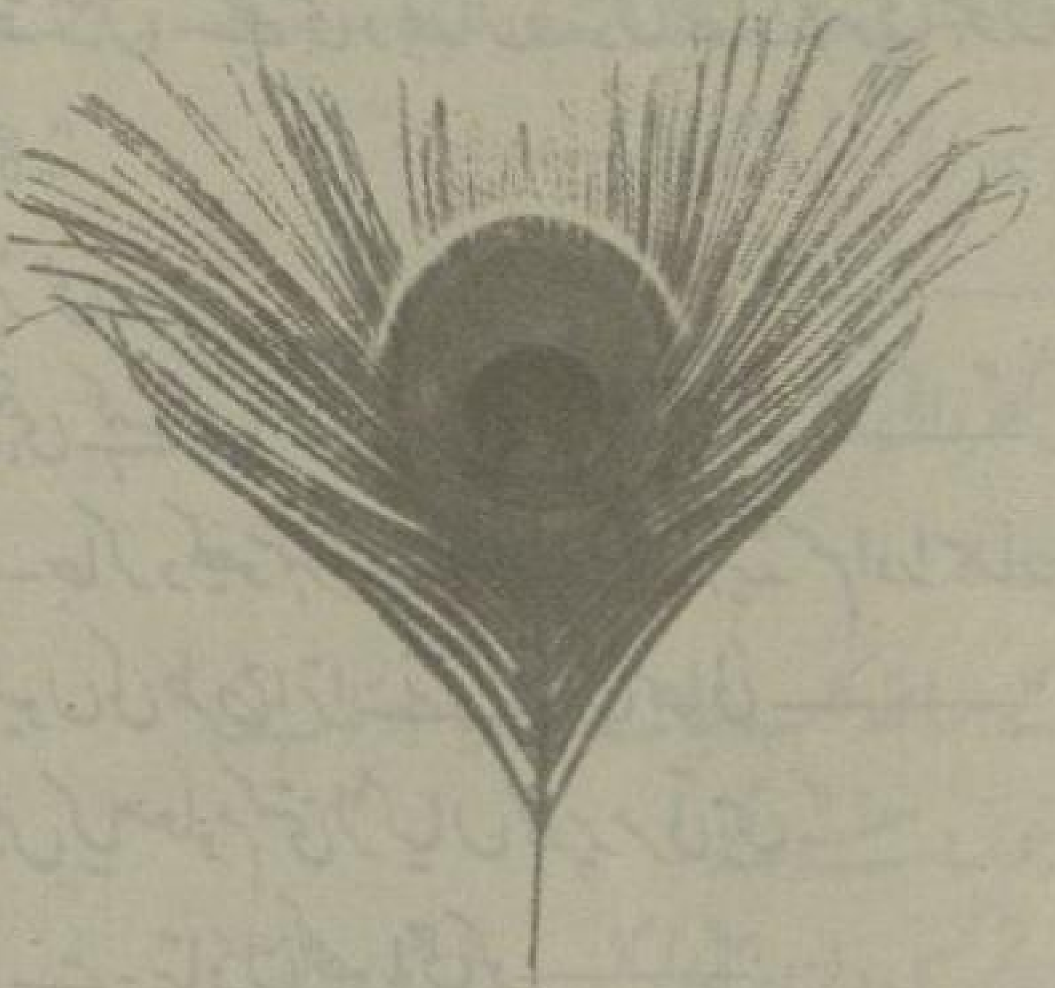
باقی کا سارا دن پھوباجی کے ساتھ گپ لگانے میں گذر جاتا اور وہ غور سے دیکھتی رہتی کہ پھوباجی کس طرح ثریا جتنی لاڈلی کو سنبھالتی اور پالتی ہیں۔

کبھی کبھی وہ کہتی۔پھوباجی!"بچہ پالنا کس قدر مشکل کام ہے"۔

"ہاں"۔پھوباجی کہتیں۔انسان کا بچہ آفت ہوتا ہے۔مگر اللہ تعالیٰ نے یہ درجہ اور یہ صلاحیت صرف ماں کو دی ہے۔دیکھنا جب تمہارا بچہ ہو جائیگا تو آپ ہی آپ تجھے سب آجائیگا"۔

نہیں وہ ہر بار دل میں سوچتی۔ماما کے لیے محبت بہت لازمی ہے۔....اور محبت کے بغیر وہ تو کبھی اچھی ماں نہیں بن سکے گی ـــــــ

اسے ہمیشہ بچے سے گھن آتی رہے گی۔



شان بھائی ابھی ابھی کلب سے ٹینس کھیل کر آئے تھے۔ اتنی سخت سردی کے باوجود ان کے صحت مند چہرے اور جسم پر پسینہ شبنم کی طرح نظر آرہا تھا۔ انہوں نے سفید نیکر سفید ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ سفید جرابوں کے ساتھ سفید کینوس کے جوتے بڑے بھلے لگ رہے تھے۔ ہاتھ میں پکڑے ہوئے ریکٹ کو گھماتے ہوئے آئے اور آکر صوفے پر دھم سے گر گئے۔

"بھئی چائے پلواؤ"۔ انہوں نے کبریٰ سے کہا تو وہ دوڑ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ اور رملی سلائیاں بنتے بنتے غور سے انہیں دیکھنے لگی۔ کیسے بانکے چھبیلے تھے شان بھائی۔ دو بچیوں کے باپ نہیں لگتے تھے۔ انگریزی فلموں کے ہیرو لگتے تھے۔ کھیلنے کیوجہ سے چہرہ سرخ انار ہو رہا تھا۔ ہونٹ عنابی ہو گئے تھے اور ان کی شوخ آنکھوں میں ہر وقت لال ڈورے رہتے تھے دنیا میں مرد بھی حسین بنائے ہیں اللہ نے ——— رملی دل میں سوچنے لگی۔

پھر اسے اپنے نصیبوں پر رونا آنے لگا اور لہو رنگ کے خاموش آنسو اس کے دل کے اندر گرنے لگے۔ اتنے میں اچانک شان نے ٹی۔وی سے نظریں ہٹا کر رملی کیطرف دیکھا اور سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

"یہ گڑیا اتنے غور سے ہمیں کیوں دیکھ رہی ہے؟"

یہ بات کہتے وقت شان بھائی تھوڑے سے اترائے بھی ——— رملی نے نظریں جھکالیں۔ اور گود میں رکھی سلائیاں اٹھا کر بننے لگی۔

"تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا رملی ———؟"

"میں آپ کو تو نہیں دیکھ رہی تھی۔"

"کوئی مضائقہ نہیں۔ مجھے بھی دکھا کرو۔ میں تمھارا بہنوئی ہوں۔ کسی اور کو اتنے اشتیاق سے دیکھو گی تو مجھے برا لگے گا۔"
رملی ہنس پڑی۔
"اسے خوش فہمی کہتے ہیں شان بھائی بلکہ غلط فہمی ——"
"اچھا —— جا کر دیکھو شہر میں میرے جیسا ہینڈسم اور اسمارٹ کوئی مرد ہے۔؟"
"آپ تو لڑکیوں کی طرح اترانے لگے شان بھائی ——"
"اے جی تمھیں کیا معلوم کتنی لڑکیاں مجھ پر مرتی ہیں۔"
"اچھا یہ بات ہے۔ بتاؤں پھوباجی کو ——"
"پھو سب جانتی ہے۔"
اتنے میں کسریٰ باجی چائے لیکر آگئیں۔
"کیا جانتی ہوں میں ——؟" انہوں نے آتے ہی پوچھا۔
"مجھے —— میری رگ رگ کو —— ہے نا؟ ——" شان بھائی سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔
"جانتی تو نہیں جاننے کی کوشش ضرور کر رہی ہوں۔"
"نہیں باجی —— پہلے یہ کچھ اور کہہ رہے تھے؟"
"کیا کہہ رہے تھے شان ——؟" پھوباجی نے چائے بناتے ہوئے پوچھا۔
"میں کہہ رہا تھا کہ میں شہر کا سب سے خوبصورت آدمی ہوں اور بہت سی لڑکیاں مجھ پہ مرتی ہیں۔" یہ کہہ کر انہوں نے کسریٰ باجی کو آنکھ ماری۔ کسریٰ باجی ہنس پڑیں۔ چائے بنا کر انہیں دی اور بولیں۔
"آجکل کے مرد تو لڑکیوں کو مات کر رہے ہیں۔ دیکھا تم نے رملی —— اس نیت سے بناؤ سنگھار کر کے جاتے ہیں کہ باہر جاتے ہی لڑکیوں کو پھانسنا ہے اور مجھے ساتھ لیکر نہیں جاتے تاکہ پتہ نہ چل جائے۔ خیر سے شادی شدہ ہیں۔"
"اونہہ —— تم کوئی میرے ساتھ جاتی ہوئی اچھی لگتی ہو۔ البتہ —— وہ پھر آنکھ دبا کر بولے —— رملی میرے ساتھ جائے تو مزہ بھی آئے۔ لوگ کہیں گے ماشاءاللہ کیا جوڑی ہے۔"
اس پر کسریٰ باجی سادگی سے مسکرائیں۔ مگر رملی کو یہ بات بہت بری لگی اسے یوں لگا جیسے یہ بات کہہ کر شان بھائی نے دانستہ پھوباجی کو تکلیف پہنچائی ہو۔ مگر کسریٰ باجی خوش دلی سے مسکرا رہی تھیں۔ جیسے انہیں یہ بات سن کر بہت مزہ آیا ہو۔

"شان بھائی آپ نے گندی بات کی ہے ـــــ" رملی نے برا سا منہ بنا کر کہا۔
"کیوں تم میری سالی نہیں ہو ـــــ؟"
"ہوں تو ـــــ"
"سالی آدھی گھر والی نہیں ہوتی؟"
"ہوتی ہے"
"تو اس کے ساتھ کلب جانے سے کیا ہوتا ہے؟"
اس پر تینوں ہنسنے لگے۔
"ہاں شان تم کسی دن رملی کو کلب لے ہی جاؤ"
"نہ ـــــ میں نہیں جاؤں گی"۔ رملی جلدی سے بولی۔
"میرے ساتھ جا کر دیکھو۔ کسطرح لوگ تمہیں سر آنکھوں پر بٹھائیں گے"۔
"اگر کسریٰ باجی ساتھ جائیں تو میں چلنے کو تیار ہوں"۔
"لو اور سنو ـــــ" شان بھائی کسریٰ باجی کیطرف دیکھکر بولے۔
"پھر خاک مزہ آئے گا ـــــ کباب میں ہڈی والی بات ـــــ"
کسریٰ باجی ہنستے ہوئے برتن سمیٹنے لگیں۔ شان بھائی کھڑے ہو گئے۔
"کہاں چلے ـــــ؟ کسریٰ باجی نے پوچھا۔ اور چائے پیو ـــــ"
"ذرا کپڑے بدل آؤں۔ تمھاری بہن مجھے نظر لگا دے گی"۔
"اوہنہ بڑے آئے یوسف ثانی ـــــ"
شان بھائی نے قہقہہ لگایا اور اندر چلے گئے۔ واپس آئے تو انہوں نے کتھئی رنگ کا کرتا شلوار پہن رکھا تھا۔ گلے کے کھلے بٹن دونوں ہاتھوں سے بند کرتے ہوئے باہر آ گئے... شلوار کرتے میں وہ اور بھی بھلے لگے۔ مگر رملی نے جان بوجھ کر ان کی طرف نہیں دیکھا بلکہ پیالی پر جھک کر چائے پینے لگی۔
ان کے بیٹھتے ہی کسریٰ باجی بولیں۔
"رملی بچاری کو اتنے دن ہو گئے یہاں آئے ہوئے اسے کہیں گھما ہی لاتے...؟"
"حضور کا چھلا جو نہیں ختم ہو پاتا" ـــــ وہ تمسخرانہ انداز میں بولے۔
"میری تو خیر مجبوری ہے۔ اس بچاری کو لے جاؤ نا؟"
"نہیں کچھو باجی" ـــــ رملی جلدی سے بولی۔
"مجھے گھومنے گھمانے کا بالکل شوق نہیں ہے۔ مجھے تو بس گھر میں مزہ آتا ہے"۔

"اسے تو میرا خیال ہے۔ ایک بار صرف چڑیا گھر کی سیر کرا دی جائے۔"

"کیوں ہے" رملی نے پوچھا۔

"سُنا ہے اب تمہیں خوفناک درندے اچھے لگنے لگے ہیں۔"

رملی کے دل پر ہتھوڑا لگا اور کچھو باجی کا رنگ اڑ گیا۔

انہوں نے تہدیدی انداز میں شان کیطرف دیکھا۔ اور جلدی سے کہنے لگیں۔ "ہماری رملی بہت اچھی لڑکی ہے۔"

"میں نے کب کہا کہ بُری ہے ——" شان بھائی نے اسی طرح جواب دیا۔

مگر اس چوٹ کے بعد رملی بولنے کے قابل نہ رہی۔

دوسرے دن صبح ناشتہ کی میز پر جب شان بھائی بن ٹھن کر آئے تو رملی نے نظر اٹھائے بغیر ناشتہ ان کے آگے سرکا دیا۔

وہ تھوڑی دیر اس کا چہرہ دیکھتے رہے۔ پھر بولے

"رمو تو نے میرے کل کے مذاق کا بُرا تو نہیں مانا۔"

"نہیں تو ——"

"آج کچھ خفا خفا لگ رہی ہے۔"

"شان بھائی وہ مذاق تو نہیں تھا اور سچی بات کا بُرا کیا منانا —— ؟"

"او نو" شان بھائی زبردستی ہنسے۔

"کچھ بھی سچ نہیں تھا۔ میں تو یونہی تمہارے ساتھ چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا"

"چھیڑ چھاڑ اور دل آزاری کا آپ کو حق پہنچتا ہے۔"

"اوہو ——" شان بھائی جز بز ہونے لگے۔ "بھئی تم رُوٹھی روٹھی ذرا بھی اچھی نہیں لگتی ہو۔ مسکراؤ —— ورنہ میں تمہیں گدگداؤں گا۔"

وہ کرسی سے اٹھنے لگے۔ تو رملی جلدی سے مسکرا دی۔

"پلیز شان بھائی —— مجھے ہاتھ نہ لگایئے گا۔"

شان بھائی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔

اور پھر ناشتہ شروع کر دیا۔

"تمہیں پتہ نہیں شاید —— کہ خوبصورت لڑکیاں ہمیشہ مسکراتی ہنستی ہی اچھی لگتی ہیں۔ میں کسی بھی حسین لڑکی کو سوگوار نہیں دیکھ سکتا۔ اسے میری کمزوری کہہ لو۔ کسی اداس خوبصورت لڑکی کو دیکھ لوں تو جی چاہتا ہے۔ دنیا بھر کی خوشیاں لا کے اس کے قدموں میں ڈھیر کر دوں"

(ہائے شان بھائی آپ کتنے عظیم ہیں)

رملی کی آنکھ تر ہونے لگی۔ اس لیئے اس نے سر جھکالیا۔

"تم جب سے آئی ہو۔ گم صم اور اداس ہو۔ اس لیئے میں بار بار تمہیں چھیڑتا ہوں۔ تمہیں ہنساتا ہوں رمو؛ تم اسطرح کیوں اداس رہتی ہو ___؟"

"نہیں تو شان بھائی ___؟"

اب تو باقاعدہ اس کا ایک آنسو باہر آ گیا تھا۔ جسے اس نے انگلی کی نوک پر اُتار لیا۔

ہمدردی کا خنجر کیسا تیز ہوتا ہے۔ حوصلے کا سائبان پھاڑ دیتا ہے۔ کتنے عرصے بعد اسے ایک ہمدرد اور ایک مسیحا نظر آیا تھا۔ کتنی لگاوٹ سے شان بھائی نے اس کے دکھتے دل پر ہاتھ رکھ دیا تھا

شان بھائی اس لمحے اسے بہت اونچے لگے۔

"آج چائے بناؤ گی یا بس ___ سوچتی رہو گی۔"

شان بھائی اس کے ضبط کی ندی میں اضطراب کا ایک کنکر پھینک کر جیسے مطمئن ہو گئے تھے۔

رملی نے جلدی جلدی چائے بنائی اور ان کے آگے رکھ دی۔

پھر نظریں اٹھا کر انہیں نہ دیکھ سکی۔

آج بھی شان بھائی حسبِ معمول شاندار لگ رہے تھے۔ انھوں نے گہرے رنگ کا چیک سوٹ پہن رکھا تھا۔ اندر واسکٹ بھی تھی۔ واسکٹ کے آس پاس ہلکی گلابی امریکن کاٹن کی قمیص نظر آ رہی تھی۔ ویسا ہی گلابی سلک کا رومال جیب سے جھانک رہا تھا۔ قمیص کی آستینوں پر دل کی شکل کے کف لنک کوٹ سے باہر نظر آ رہے تھے اور ناشتہ کی میز کے ارد گرد بے تحاشا خوشبو پھیلی ہوئی تھی

شان بھائی خوشبو میں اسطرح نہا کر آتے جیسے کوئی دُلہن سنگھار مرکز سے نکل کر آئی ہو ___

جب بھی اپنے کمرے سے نکلتے ان کے ساتھ خوشبوؤں کے آبشار نکلتے اور رملی سوچا کرتی۔ پتہ نہیں ان کی خوشبو کا ماہانہ خرچہ کیا ہو گا۔

انھوں نے نیپکن سے منہ صاف کیا اور کھڑے ہو گئے۔

"آج شام کو کہیں گھومنے چلیں گے۔"

اچھا خدا حافظ ___"

"خدا حافظ" رملی نے آہستہ سے کہا۔

اور وہ مسکراتے ہوئے ایک اپنائیت بھری نظر اس پر ڈال کر چلے گئے ___



شام کو شان بھائی خلافِ معمول ذرا جلدی آ گئے۔ اور آتے ہی کسریٰ باجی کو پکارا۔ اور بلند آواز میں بولے۔

"آج میں سینما کے ٹکٹ لایا ہوں۔ جلدی سے تیار ہو جاؤ"

"میں کیسے جاؤں گی شان" کسریٰ باجی تردد سے بولیں۔ لاڈلی کو رات سے بخار ہے۔ میں نے تمہیں بتایا بھی تھا۔"

"بھئی میرے پاس تو آج شام ہی فارغ تھی۔ نہیں جانا چاہتیں۔ تو ٹکٹ پھاڑ دو"

"پھاڑ کیوں دوں ۔۔۔؟ تم رملی کو ساتھ لے جاؤ"

"نہیں باجی میں اکیلی نہیں جاؤں گی"

"اکیلی کہاں ہو تم ۔۔۔ ساتھ میں شان ہیں۔"

"نہیں باجی" رملی بولی "آپ جائیں گی تو میں بھی جاؤں گی۔ مجھے فلم دیکھنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔"

"بے وقوف" کسریٰ باجی سرگوشی میں بولیں۔

"شادی سے پہلے تو تُو ہر وقت شان کے پیچھے پیچھے پھرتی تھی کہ مجھے فلم دکھلائیں"

"اب نہیں جی چاہتا باجی ۔۔۔"

"کیوں نہیں چاہتا؟" باجی غرّائیں "جب سے آئی ہے۔ گھر میں گھسی بیٹھی ہے۔ میری تو مجبوری ہے۔ ابھی گھوم پھر نہیں سکتی۔ تم ہی شان کے ساتھ جا کر ذرا تفریح کر آیا کرو۔"

"اتنی سخت سردی میں تو بس گھر میں گھس کر بیٹھنے میں ہی مزہ آتا ہے؟"

"کیوں بیکار میں بحث کر رہی ہو کسریٰ ۔۔۔؟" شان بھائی ان کی سرگوشیوں سے تنگ آ کر بولے اگر وہ اکیلی میرے ساتھ نہیں جانا چاہتی تو اسے کیوں مجبور کر رہی ہو ۔۔۔؟ نہیں جائیں گے آج۔

لاؤ چائے پلاؤ ۔۔۔"

"کچھو باجی آپ لاڈلی کو لپیٹ کر ساتھ لے لیں۔ کئی عورتیں بچے ساتھ لے آتی ہیں۔ سینما ہال اندر سے گرم ہوتے ہیں۔"

"دیکھتی ہوں ۔۔۔" یہ کہکر کچھو باجی پہلے کچن میں گئیں۔ چائے کا کہہ کر آئیں۔ پھر اپنے کمرے میں جا کر تیار ہونے لگیں۔

رملی بھی خوشی خوشی اُٹھ گئی۔ جا کر ہلکا ہلکا میک اپ کیا۔ پرس اٹھایا۔ شال لپیٹی ۔۔۔ واپس آئی تو شان بھائی چائے پی رہے تھے اور ساتھ میں اخبار بھی دیکھ رہے تھے۔

وہ سیدھی کچھو باجی کے کمرے میں چلی گئی۔ کچھو باجی نے اپنے بکھرے ہوئے بال جُوڑے میں باندھ لئے تھے۔ لمبا کوٹ پہن لیا تھا۔ لاڈلی کو لپیٹ کر ایک طرف لٹا دیا تھا اور خود اس کے دودھ کی بوتل بنا رہی تھیں۔

جونہی بوتل بنا کر کچھو باجی نے لاڈلی کو اٹھایا ۔۔۔ اس نے ایک دم قے کر دی۔ کچھو باجی کا کوٹ اور سارے کپڑے خراب ہو گئے .... انہوں نے غوطے کھاتی لاڈلی کو ایک دم بستر پر لٹا دیا اور روئی لیکر اس کا چہرہ صاف کرنے لگیں۔

اسے صاف کرنے کے بعد کچھو باجی نے رملی کو پکارا اور التجا بھرے لہجے میں بولیں۔" دیکھو رمو! لاڈلی کو کتنا تیز بخار ہے ۔۔۔!

رملی نے ہاتھ لگایا تو اسکی پیشانی آگ بنی ہوئی تھی۔

"اور ساتھ میں یہ الٹیاں بھی کر رہی ہے۔ تیرے کہنے پر میں اسے لپیٹ کر لے چلی تھی۔ مگر تو خود ہی بتا ایسے عالم میں میں وہاں کیسے بیٹھ سکوں گی۔ اور کس طرح فلم دیکھ سکوں گی۔ اس طرح باہر لیجانے سے بچی کو اور ٹھنڈ لگ جائیگی۔"

"تو نہیں جاتے کچھو باجی ۔۔۔ کون سی ایسی مجبوری ہے ۔۔۔؟"

"بیوقوف ۔۔۔ توشان کے مزاج کو نہیں جانتی۔ ابھی برہم ہو جائیگا۔ کہے گا ہم نے اسے تیار کرا کے پروگرام بدل لیا ہے۔ روٹھ کر جائیگا تو کہیں رات گئے واپس آئے گا۔"

"تو پھر میں کیا کروں کچھو باجی۔۔۔؟"

"دیکھ توشان کے ساتھ چلی جا۔۔۔؟"

"نہیں کچھو باجی ۔۔۔ مجھے عجیب سا لگتا ہے۔"

"پگلی وہ برا مان جائیگا۔ سوچے گا تو اسے غیر سمجھ رہی ہے۔ یہ رشتے بڑے نازک

ہوتے ہیں۔ جا ــــ شاباش چلی جا ــــ اور حرج بھی کیا ہے۔ وہ تیرا بہنوئی ہی تو ہے۔ کسی غیر کے ساتھ تو جا نہیں رہی۔"

رملیٰ نے اپنی کالی شال درست کی اور بادلِ نخواستہ باہر نکل آئی۔

جب موٹر چل پڑی تو شان بھائی کا موڈ بڑا شگفتہ ہو گیا۔ مسکرا مسکرا کر اسے لطیفے اور چٹکلے سنانے لگے۔

سینما کے اندر داخل ہوئے تو شان بھائی ڈریس سرکل میں جانے کی بجائے ایک باکس کی طرف بڑھے۔ دروازہ کھولا تو اندر اندھیرا تھا۔ ٹارچ والا بھی پیچھے چلا آیا۔ رملیٰ گھبراہٹ میں اگلے صوفے پر آ گئی اور دھپ سے بیٹھ بھی گئی۔ ٹارچ والا روشنی دکھا کر چلا گیا۔ اور دروازہ بند ہو گیا تو شان بھائی بھی اس کے پاس بیٹھ گئے۔

"شان بھائی آپ نے باکس کا ٹکٹ کیوں لیا ــــ؟"

رملیٰ کے لہجے میں شک تھا۔

"بھئی سارے خاندان نے جو آنا تھا۔ دیکھو یہ چھ لوگوں کا باکس ہے۔ اب اگر دونوں بچیاں بھی ساتھ ہوتیں تو انہیں لٹانے اور دودھ پلانے میں کتنی آسانی ہوتی۔ پھر بچے ساتھ ہوں تو ہمیشہ باکس میں بیٹھنا چاہیئے۔ بچے اندھیرے سے گھبرا کر ضرور چلاتے اور شور مچاتے ہیں۔ اس طرح لوگ ڈسٹرب ہوتے ہیں۔ باکس میں بیٹھے ہوں تو انہیں آسانی سے باہر نکالا جا سکتا ہے۔"

"ہاں .... ہاں ......" رملیٰ بے حد شرمندہ ہو گئی۔ اسے احساس ہوا کہ یہ پوچھتے وقت اس کا لہجہ ٹھیک نہیں تھا۔

"اگر تمھیں اچھا نہیں لگ رہا تو نیچے گیلری میں چل بیٹھتے ہیں۔"

"ایسی کوئی بات نہیں شان بھائی ــــ"

رملیٰ سامنے سکرین پر دیکھنے لگی۔

"میں سوچ رہی تھی آپ نے ناحق اتنے پیسے ضائع کیے ...."

"پگلی ــــ تمھیں خوش دیکھنے کے لیے میں کیا نہیں کر سکتا ــــ؟"

شان بھائی کا فقرہ اسکی سمجھ میں نہیں آیا۔ اس لیے جلدی سے بولی۔

"پکچر شروع ہوئے تو کافی دیر ہو چکی ہے۔"

"ہاں ــــ خواتین کا ساتھ ہو تو ہمیشہ دیر ہو جاتی ہے۔ انہیں پہلے کپڑوں اور بچوں کے بارے میں ایک کانفرنس کرنا ہوتی ہے۔"

"نہیں شان بھائی"، رملیٰ تڑپ کر بولی۔

"پھوباجی ایسی خواتین میں سے نہیں ہیں۔ وہ جھٹ پٹ تیار ہو گئی تھیں۔ مگر واقعی لاڈلی کو بڑا تیز بخار تھا۔"

"بس جانے دو —— وہ بھی عجیب سُست الوجود عورت ہے۔" یہ کہکر شان بھائی نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگالی اور پکچر دیکھنے لگے۔

شان بھائی کا لہجہ پھوباجی کے لیے اسے ذرا بھی اچھا نہ لگا۔ مگر وہ بڑے قرینے سے کِسک کر صوفے کے دوسرے کنارے پر ہو گئی۔

پکچر دیکھنے کی بجائے اس کے ذہن میں ایک کشمکش سی ہونے لگی۔ بھلے شان بھائی اس کے بہنوئی تھے۔ اور وہ ان سے ہمیشہ سے بے تکلف تھی۔ مگر تھے تو نامحرم نا!—— اب جبکہ وہ شادی شدہ خاتون تھی۔ اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر ایک نامحرم کے ساتھ یوں چلے آنا کیا اچھی بات ہے ——؟ گو وہ پھوباجی کی اجازت سے آئی ہے۔ بلکہ ان کی مجبوری کو نبھانے چلی آئی ہے۔ مگر کیا خبر معاذ اس بات کو پسند نہ کرے۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ وہ معاذ کو بالکل پسند نہیں کرتی۔ اور نہ اس کے ساتھ پکچر دیکھنا پسند کرتی ہے۔ جب سے شادی ہوئی ہے وہ بچارا کئی بار کہہ چکا ہے کہ اسے انگریزی فلمیں پسند ہیں۔ مگر رملیٰ کو اس کے ساتھ سینما ہال میں بیٹھنے سے گھن آتی تھی۔ اور ہمیشہ کہہ دیتی۔ آج کل ہال میں بیٹھنے سے میرا جی الٹ جاتا ہے۔ پلیز ابھی نہیں! اب اگر وہ سنے گا تو کیا کہے گا ——؟ اگرچہ بہنوئی کا رشتہ کوئی غیر نہیں ہوتا۔ لیکن فرض کرو معاذ برا مان جائے تب ——؟

فلم کیا خاک دیکھتی۔ بیٹھی اپنے ذہن کی الجھی گتھیاں سلجھاتی رہی۔

اتنے میں انٹرول ہو گیا۔ تب اسے احساس ہوا کہ وہ لوگ آدھا گھنٹہ لیٹ آئے تھے۔ روشنی ہوتے ہی جیسے لوگوں کا سیلِ رواں تنگ دروازوں میں سے باہر کی طرف لپکا......

سیٹیاں...... سگریٹ...... چیخیں...... چہکار...... بچوں کا شور وغل...... ایک دم زندگی جاگ اٹھی تھی۔ شان بھائی بھی باہر نکل گئے۔ شاید وہ سگریٹ پینا چاہتے تھے۔ رملیٰ کو یوں محسوس ہوا جیسے اس نے شان بھائی کے ساتھ آکر اچھا نہیں کیا ——؟ لیکن اب اس کا اظہار اپنی کسی حرکت سے نہیں کرنا تھا۔

پانچ منٹ کے بعد شان بھائی اندر آ گئے ان کے ہاتھ میں چپس اور چلغوزوں کے لفافے تھے۔ سارے لفافے انہوں نے رملیٰ کی گود میں ڈال دیئے اور بولے۔

"چائے پیو گی؟"

"نہیں شان بھائی ابھی گھر سے پی کر چلی تھی۔"

وہ پھر باہر چلے گئے۔

دوبارہ اندھیرا ہوا تو وہ جلتے سگریٹ کے ساتھ اندر آ گئے سارے باکس میں سگریٹ کی بو پھیل گئی جو رملی کو اچھی نہیں لگی۔ جب ساری بتیاں گل ہو گئیں اور سکرین دوبارہ متحرک ہوئی تو شان بھائی نے سگریٹ کا ٹکڑا فرش پر پھینک کر جوتے سے مسل دیا۔ فلم دوبارہ شروع ہو گئی۔

"فلم میں کیا دیکھنے آتے ہیں لوگ ـــــ؟"

رملی نے کرب سے سوچا ـــــ

نہ تو اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکراتا ہوا ہیرو اچھا لگ رہا تھا اور نہ اداؤں سے کھیلتی بنی ٹھنی ہیروئن ـــــ شادی سے پہلے اسے فلموں کا جنون تھا۔ ہر فلم ہر صورت میں دیکھتی تھی اور ہر نوجوان لڑکی کی طرح ـــــ اپنے آپ کو ہیروئن کے فریم میں جڑ لیتی تھی۔ لڑکیاں اور لڑکے شاید اپنے خواب مجسّم دیکھنے آتے ہیں۔ وہ اکثر سوچتی نہ جانے یہ ادھیڑ اور بوڑھے کیا دیکھنے آتے ہیں؟ اس کا کوئی بھی خواب پورا نہیں ہوا تھا تو ساری دنیا ایک جھوٹ نظر آ رہی تھی۔

ایک ہی تو بازی ہوتی ہے عورت کے مقدر کی ـــــ وہ بھی ہار جائے تو اس کے پاس کیا رہ جاتا ہے۔؟ کل کو اس کا بچہ ہو جائیگا اور لوگ کہیں گے بچے والی ماں کو خواب دیکھنے کی کیا ضرورت تھی ـــــ؟ اسے تو اس کائنات میں سے ایک حصّہ مل چکا ـــــ

کیا دنیا ایک فریب مسلسل ہے؟ ـــــ

کیا زندگی خوابوں سے کوئی الگ شے ہے؟ ـــــ

اگر انسان مجبورِ محض ہے تو اسے خواب دیکھنے کی صلاحیت کیوں بخشی گئی۔

کیا زندگی ایک پر فریب بہلاوہ ہے؟ ـــــ

لوگ لوگوں کو پھسلائے جا رہے ہیں؟ کہانیاں سنا کر ـــــ فلمیں بنا کر ـــــ یہ فلمیں یہ افسانے ـــــ یہ سب ان تشنۂ آرزو لوگوں کے نہ پورے ہونے والے خواب تو نہیں ...... جنھیں کبھی وہ سکرین پر پھیلا دیتے ہیں اور کبھی کاغذ پر ـــــ اور مجھ جیسی دیوانی لڑکیاں ان خوابوں میں اپنی ذات کے گھروندے بنا لیتی ہیں........

یکایک اسے محسوس ہوا کہ شان بھائی اس کیطرف کھسک آئے ہیں۔ اس کا دل پھر دھڑ دھڑ بولنے لگا۔

اور وہ سُن ہو گئی۔

شان بھائی اس کے ساتھ جڑ کر بیٹھ گئے۔

تھوڑی دیر بعد چہرہ اسکی طرف جھکا کر بولے۔

"اتنی سمٹ کر کیوں بیٹھی ہوئی ہو؟ کیا خوف آ رہا ہے ــــ"؟

"نہیں تو ــــ"؟ وہ جلدی سے بولی۔

"کیسی لگ رہی ہے پکچر ــــ"؟

"بے ہودہ ــــــــ"

"تو چلو پھر چلتے ہیں ــــ" وہ بھی حامی بھرنے والی تھی کہ وہ بولے۔ "اس سے اچھا ہے کسی ریستوران میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ گپ لگاتے ہیں۔ کھانا کھاتے ہیں"۔

رملی ایک دم چپ ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد بولی۔

"بس تھوڑی سی تو رہ گئی ہے فلم ــــــ اب دیکھ کر ہی چلیں گے۔

لیکن پھر اسکے بعد رملی فلم نہیں دیکھ سکی۔ اسے شان بھائی کے یوں جڑ کر بیٹھنے سے ذہنی کوفت ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے صوفے کی پشت پر اسطرح بازو رکھ لیا کہ اسکا سر بازو کے حلقے میں آ گیا۔ رملی کا دل چاہ رہا تھا یہاں سے اٹھ کر بھاگ جائے اس نے جلدی سے اپنے ٹھنڈے ہاتھ اپنی شال میں چھپا لیے اور دم سادھ کر بیٹھ گئی۔

بارے فلم ختم ہوئی ــــ تو اس کی جان میں جان آئی۔ شال لپیٹ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ بلکہ دروازے کی طرف دوڑی ــــــ

ٹھیرو ــــ رمّو! ذرا بھیڑ کو چھٹنے دو ــــ شان بھائی نے بڑی نرم آواز میں کہہ کر آہستہ سے اس کا بازو تھام لیا۔

چاہنے کے باوجود وہ بازو نہ چھڑا سکی۔ جب ذرا راستہ صاف ہوا تو وہ اسے تھامے تھامے یوں نیچے لائے جیسے وہ صدیوں کی بیمار ہو اور ان کے سہارے کے بغیر چل نہ سکتی ہو۔

موٹر میں بیٹھی تو اور بھی سکڑ گئی۔

"کچھ کھاؤ گی ــــ"؟

"نہیں شان بھائی ــــ"

اس نے جلدی سے کہا۔

"مجھے بار بار کچھو باجی کا خیال آ رہا ہے۔ پتہ نہیں لاڈلی کی طبیعت اب کیسی ہو گی؟ وہ اکیلی پریشان ہو رہی ہوں گی"۔

"اچھا کہیں رک کر پان لے لیتے ہیں"۔

انہوں نے ایک جگہ گاڑی روک کر پان خریدے۔

وہ دونوں جب گھر میں داخل ہوئے تو میز پر کھانا لگوائے کچھو باجی سلائیاں لیکر

بیٹھی ہوئی تھیں۔

شان بھائی کا چہرہ چمک رہا تھا اور بڑے شگفتہ موڈ میں نظر آرہے تھے۔ انہوں نے پانوں کا بنڈل کسریٰ باجی کی گود میں پھینک دیا اور پھر اس کے کندھے پر دھپ رسید کرتے ہوئے اس کے ساتھ جڑ کر بیٹھ گئے۔

"کیسی ہو ڈارلنگ ——— ؟"

"پکچر کیسی لگی رمو ——— ؟" کسریٰ باجی نے شان بھائی کے چمپاتے چہرے سے نظریں ہٹا کر رملیٰ کا بجھا بجھا چہرہ دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اچھی تھی ——— ؟" وہ بیدلی سے بولی۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" وہ پھر بولیں۔

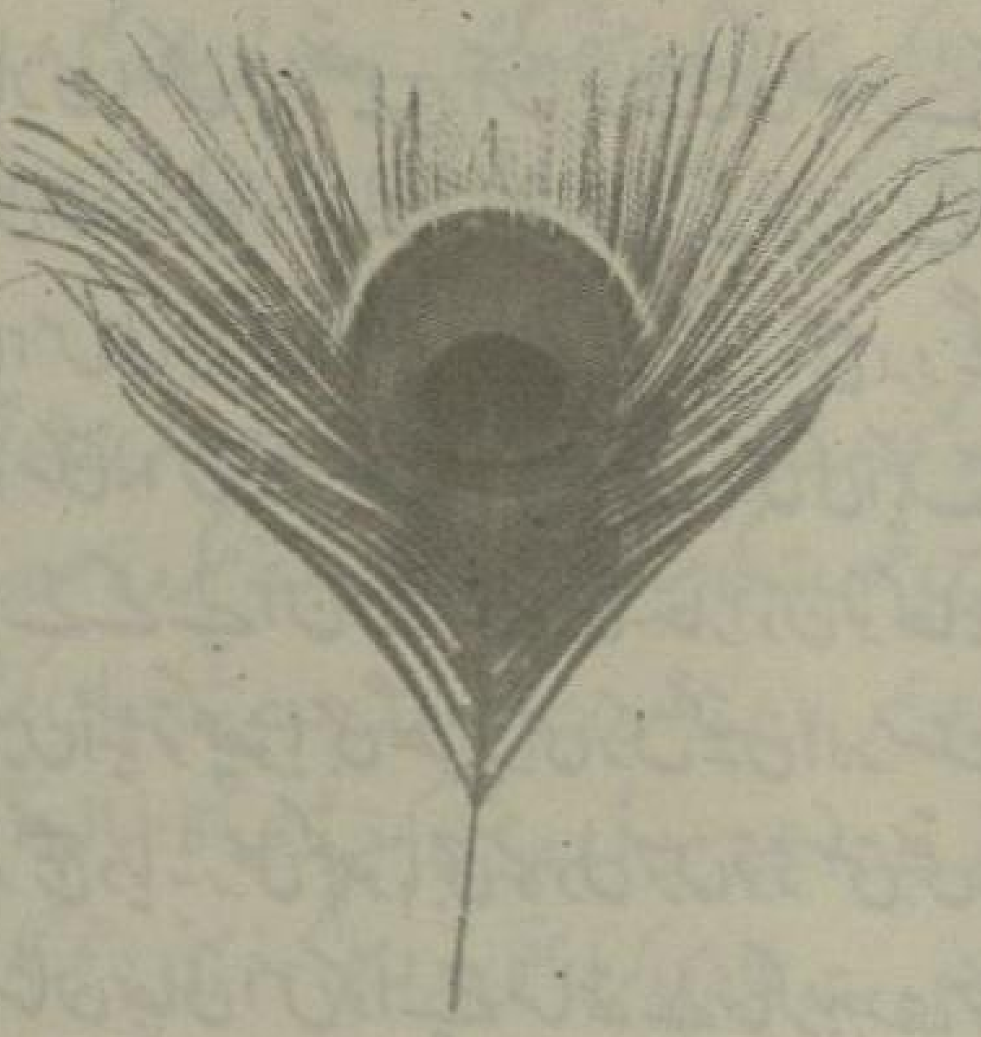
"ٹھیک ہوں"۔ رملیٰ نے زبردستی ہنس کر جواب دیا۔ "اتنی دیر بیٹھنے سے میری کمر میں درد ہونے لگتا ہے۔"

"اچھا تم لوگ کھانا کھالو۔ ٹھنڈا ہو جائے گا۔" پھپھو باجی سلائیاں لپیٹ کر کھڑی ہو گئیں۔

"لاڈلی کا کیا حال ہے پھپھو باجی ——— ؟" رملیٰ نے تردد سے پوچھا۔

"ابھی دوا کی آخری خوراک پلا کر سلایا ہے۔ پہلے سے تو بہتر لگ رہی ہے...."

پھر تینوں کھانے کی میز پر جا بیٹھے۔



رملی زینب کی انگلی پکڑے ہوئے، شان بھائی کے ساتھ کلب میں داخل ہوئی تو ہر فرد و بشر کی نگاہ اسکی سمت اٹھ گئی ایک تو اسپر آج کل ویسے ہی آسمانی روپ اتر رہا تھا اس پر زکام کی وجہ سے ننھی سی ناک سرخ ہو گئی تھی اور آنکھوں میں ایک کیف آگیں نمی ٹھہر گئی تھی۔ اس نے اپنے سارے وجود کو تلے دار شال میں ڈھکا ہوا تھا۔ لمبے اور سیدھے بال کندھوں پر جھول رہے تھے۔

مسکراتی ہوئی ہال میں داخل ہوئی تو ہر چہرہ سوال تھا۔

لوگوں کو یوں مبہوت دیکھ کر رملی جی ہی جی میں بہت خوش ہوئی۔ شان بھائی نے کندھے اچکائے اور سرگوشی میں بولے۔

"دیکھی میری شان ——؟"

"اچھا آپ بھی شان دکھاتے ہیں۔"

"جی ہاں میں تو ہوں ہی شاندار ——"

"رملی ہنس دی"۔ کاش کچھو باجی بھی ساتھ ہوتیں۔"

"چپ رہو۔ کئی لوگوں کو معلوم ہی نہیں تم میری کیا لگتی ہو؟ دیکھو —— کیسے رشک سے دیکھ رہے ہیں۔"

"تو آپ انہیں بتادیں نا؛ شان بھائی —— کہ یہ میری سالی ہے۔"

"ارے بھئی اتنی جلدی کیا ہے؟ پہلے یہ لوگ اچھی طرح میری قسمت پر رشک تو کرلیں"۔ رملی کو یہ بات اچھی نہیں لگی۔

آج جمعہ تھا اور شان بھائی نے اٹھتے ہی بتا دیا تھا کہ آج کلب میں طنبولا پارٹی ہے اور سب لوگ جائیں گے۔

کچھو باجی بچاری بالکل تیار تھیں۔ آج تو لاڈلی کی طبیعت بھی ٹھیک تھی اور پھر پارٹی چار بجے شام تھی۔ خیال تھا لاڈلی کو لپیٹ کر اٹھالیں گے اور سب چلیں گے۔ مگر عین وقت پر خانساماں دغا دے گیا اس کی بیوی کی طبیعت خراب تھی۔ صبح دو گھنٹے کی چھٹی لیکر گیا تھا مگر شام کو کہلا دیا کہ وہ نہیں آسکتا۔ اس پر غضب یہ ہوا کہ کچھو باجی کی ایک سہیلی واہ سے پنڈی آئی ہوئی تھی۔ وہ دن گذارنے کے لیے ان کے ہاں آگئی۔ سارا دن تو کھانا تیار کرنے میں گذر گیا تھا۔ جب شام کو خانساماں نہیں آیا تو کچھو باجی گھر پر ہی رک گئیں اور منت سماجت کر کے رملیٰ اور زینب کو شان کے ساتھ بھیج دیا۔ رملیٰ کچھو باجی کا دل نہیں توڑ سکتی تھی۔ ناچار آنا پڑا۔ آج رملیٰ نے پہلی بار محسوس کیا۔ شان بھائی اس کو اپنے ساتھ لے جاکر بہت خوش ہوتے تھے۔

کبھی بیٹھے بیٹھے کبریٰ باجی کہہ دیتیں۔ شان آج پھل بالکل نہیں ہے۔ ذرا دوڑ کے پھل تو لے آؤ۔ ہاں —— رملیٰ کو ساتھ لیتے جانا۔

کبھی رملیٰ کے ہاتھ پر پیسے رکھکر کہتی۔ رملیٰ شان کے ساتھ جاکر انڈے ڈبل روٹی تو لے آؤ۔ یہاں پاس ہی بیکری ہے۔

اور نہیں تو لاڈلی کے دودھ کے ڈبے —— دوائیاں —— یا فیڈر وغیرہ لینا ہوتا تو کچھو باجی مسلسل چلاّئے جاتیں۔ شان بھائی کے کان پر جوں تک نہ رینگتی۔ جونہی وہ کہتی —— "رملیٰ تم ہی جاکر لادو" —— تو شان بھائی چابیاں پکڑ کر کھڑے ہو جاتے —— رملیٰ جانتی تھی کہ وہ اپنی سب بہنوں میں حسین ہے۔ اس کو اپنی جاذبیت کا پورا پورا احساس تھا۔ اسے شان بھائی کا سراہنا اچھا بھی لگتا تھا۔ مگر جب سے اس نے ان کے گھر میں رہ کر شان بھائی کا رویہ کچھو باجی کے ساتھ دیکھا تھا اسے بہت بُرا لگا تھا۔ کسقدر معمولی شے سمجھتے تھے شان بھائی کچھو باجی کو —— ذرا بھی توجہ کے قابل نہیں سمجھتے تھے۔ صرف ان کا رنگ ہی گندمی تھا نا ؟ مگر کتنی کشش تھی ان کے سانولے رنگ میں ——

"شان بھائی آپ کچھو باجی کو بھی یہاں لاتے ہیں۔"

"ابھی تو میں خود نیا ممبر بنا ہوں اور جب سے وہ پنڈی آئی ہے بیمار ہے۔"

ان کو بھی لائیں نا ؟ ——

"ارے وہ میرے ساتھ چلتی ہوئی اچھی لگے گی۔"

"کیوں —— ان میں کیا کمی ہے ؟"

"تم ذرا اپنی طرف دیکھو۔ پھر بات کرو۔ ادھر دیکھو لوگ آپس میں چہ میگوئیاں کر رہے ہیں اور سوچ رہے ہیں کتنی لاجواب جوڑی ہے۔ ؟ ——"

وہ دونوں ایک میز کے گرد بیٹھ گئے۔ ـــــ زینب بھی ساتھ بیٹھ گئی۔

بیٹھتے ہی رملی کو معاذ کا خیال آ گیا۔ اگر کبھی رملی معاذ کے ساتھ کلب میں آئے تو لوگ کیا سوچیں گے ـــــ؟

سوچیں گے کتنی بدذوق عورت ہے؟ ـــــ احساس جمال تو اس میں ہے ہی نہیں....

اور ممکن ہے یہ بھی سوچیں کہ اس عورت کی بینائی کمزور ہے جو اتنے مکروہ صورت آدمی کے ساتھ اٹھتی بیٹھتی ہے۔

عام طور پر حسین و جمیل عورتیں ان بدصورت مردوں سے شادیاں کر لیتی ہیں، جن کے پاس اقتدار یا بے تحاشا دولت ہوتی ہے۔ ایسے میں اُسے جیکی کنیڈی کا خیال آ گیا۔ جان۔ ایف کنیڈی کے بعد جب اس نے اوناسس سے شادی کر لی تھی تو رملی کو ذہنی دھچکا لگا تھا۔ اس کا خیال تھا جیکی کو جان کی طرح کے کسی خوبرو اور پُرکشش آدمی سے شادی کرنی چاہیئے تھی۔ لیکن پھر کسی نے بتایا کہ اوناسس دنیا کا امیر ترین آدمی ہے، تب جیکی کی بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔

لیکن معاذ تو امیر ترین آدمی نہیں تھا۔ بس اچھا گذارہ ہو رہا تھا۔ گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ ویسے تو سب ہی کہتے تھے۔ معاذ ایک دن بہت بڑا آدمی بن جائے گا۔ اس کے اندر بڑا آدمی بن جانے والی ساری صلاحیتیں تھیں، مگر اُسے کیا ـــــ؟

دس بارہ سال بعد اگر وہ بڑا آدمی بن گیا تو رملی کو اس سے کیا فائدہ ہو گا ـ کیا اس کے لٹے ہوئے ارمان اور بجھی ہوئی جوانی لوٹ آئے گی ـــ وہ بھی تو اپنا تن من مار چکی ہو گی۔

کیا خوبی ہے ایسے بڑے آدمی کی، جس کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے ہوئے دل کراہتا رہے۔

آنکھ روتی رہے، ہونٹ آہیں بھرتے رہیں۔

اور پھر کیا دولت سے سب خوشیاں خریدی جا سکتی ہیں۔

اب بھی اُسے اپنی سب بہنوں سے زیادہ جہیز ملا تھا۔ سبھوں نے دل کھول کر تحفے دیئے تھے۔ بری میں بے جی دو سونے کے اور ایک ہیروں کا سیٹ لائی تھیں۔ بے جی کا ایک ہی بیٹا تھا۔ انھوں نے اپنا سارا گہنا، کپڑا اسی کو دے دیا تھا۔ مگر وہ تو اس زیور اور کپڑے کو ہاتھ بھی نہیں لگاتی تھی.......

یہ گہنا اور کپڑا اس کے جذبات کا مول تو نہ تھا۔

اس لئے کانوں میں وہ ہیروں کے چھوٹے چھوٹے ٹاپس پہنے رہتی۔ جو خصری اباجی نے اُسے شادی پر دیئے تھے، اور کلائیوں میں وہ چوڑیاں جو امی جان کی طرف سے ملی تھیں، انگلیوں میں بس دو انگوٹھیاں، ایک سیدھے ہاتھ میں جو شبِ عروس معاذ نے پہنائی تھی۔ اور جس کے ساتھ اس کے قیمتی جذبات وابستہ نہیں تھے۔ اور دوسری اُلٹے ہاتھ میں

ویسے اس کے پاس ہیرے کی دو چار انگوٹھیاں تھیں۔ مگر آجکل کی نمائش پسند عورتوں کی طرح اُسے ایک ہی انگلی میں تین تین، چار چار ہیرے کی انگوٹھیاں پہننا بالکل بھی پسند نہیں تھا۔ سچّی بات تو یہ ہے کہ اس کی مخروطی انگلیاں اس قدر خوب صورت تھیں، کہ، اگر وہ انگلیوں میں کچھ نہ بھی پہنا کرتی، تو وہ خوب صورت ہی لگتیں۔

نہ اوڑھنے پہننے میں دلچسپی تھی، نہ ہار سنگھار میں —— ایسے میں وہ سوچا کرتی کون سی شے دل کو خوش رکھ سکتی ہے؟

نظر اٹھا کر دیکھا تو شان بھائی بیرے کو آرڈر دے رہے تھے۔

شان بھائی واقعی اسمارٹ آدمی تھے۔ آج انھوں نے بادامی رنگ کا سوٹ پہنا تھا۔ پرنٹیڈ ٹائی کی ناٹ بڑی اچھی لگ رہی تھی۔ پرنٹیڈ رومال جیب سے جھانک رہا تھا۔

بال قرینے سے بنے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں حد درجہ چمک تھی۔ شان بھائی کسی بھی لڑکی کو لبھا سکتے تھے ...... اور پھر کتنا مہذب اور دلکش انداز تھا، ان کا باتیں کرنے کا —!

کاش! اس کا شوہر بھی کچھ اسی قسم کا ہوتا، تو پھر وہ دنیا سے منہ چھپا کر اس طرح نہ رہتی ——

"کیا دیکھ رہی ہو —؟"

شان بھائی نے ایک دم اس کی چوری پکڑ لی۔

"دیکھ رہی تھی۔" وہ سادگی سے بولی "آپ کے سوٹ کا رنگ آج کی شام میں بہت اچھا لگ رہا ہے —"

"شکریہ!" انھوں نے سر کو خم دے کر کہا

"صرف سوٹ کا رنگ ہی اچھا ہے، خاکسار کے متعلق تم نے کچھ نہیں فرمایا؟"

"بس اب اترایئے نہیں۔" رملی نے اپنے لڑکپن والے انداز میں اچک کر کہا۔

"ذرا سی تعریف کر دیں، تو آپ اترانے لگتے ہیں۔"

"بھئی، میں تو ہوں ہی تعریف کے قابل —— دیکھا نہیں، کلب کی ساری عورتیں مجھے پُرشوق نظروں سے دیکھ رہی ہیں —!"

"کچھ کم خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہیں آپ!؟"

"اچھا تو تم یہ جوس پی لو — گیم شروع ہونے والی ہے۔"

رملی نے جوس کا گلاس اپنے آگے کر لیا، اور اس میں سے STRAW

نکال کے پھینک دیا۔

پہلا گھونٹ لے کر بولی:

"شان بھائی! میں جب سے آئی ہوں، آپ ہر روز ایک نیا سوٹ پہن رہے ہیں، کتنے سوٹ ہیں آپ کے پاس——؟"

شان بھائی کھلکھلا کر ہنس دیئے اور بولے:

"میں شہر کا خوش لباس آدمی ہوں۔ میرے دفتر میں بھی میرے پہناوے کی دھوم ہے۔"

"شان بھائی! آپ کو دیکھ کر میں سوچتی ہوں، عورتیں تو بچاری ناحق بدنام ہیں، آجکل کے مرد فیشن میں عورتوں سے چار ہاتھ آگے ہیں۔ دیکھیں نا، آپ کے پاس جتنے سوٹ ہیں، اتنی ہی قمیصیں، جرابیں، نکٹائیاں، رومال اور سوئیٹر ہوں گے —— کف لنک، کریم، لوشن، خوشبوئیں، الگ —— اور ظاہر ہے مردانہ کپڑے، زنانہ کپڑوں سے زیادہ مہنگے ہوتے ہیں تو اس مہنگائی کے دور میں مرد اتنی زیادہ فضول خرچی کیوں کرنے لگے ہیں، جب کہ پہلے زمانے کے مرد ایک کوٹ اور دو پتلونوں میں گذارہ کر لیتے تھے۔"

"رملی ڈیر!" شان بھائی بولے:

"اب وہ زمانہ نہیں رہا۔ زندگی کے معیار بدل گئے ہیں۔ اب لوگ اپنی ظاہری حیثیت اور لباس سے پہچانے جاتے ہیں۔ مردوں میں بھی خود پسندی اور خود نمائی آگئی ہے۔ اور پھر ہم لوگ کماتے ہیں، چاہیں تو ساری تنخواہ لباس پر ہی خرچ کر لیں۔"

"تو پھر بچاری عورتیں بدنام کیوں ہیں، کہ فیشن پر پیسہ تباہ کرتی ہیں۔ میک اَپ پر سینکڑوں روپیہ ضائع کرتی ہیں۔ حالانکہ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ آجکل کے نوجوان لڑکے بیوٹی پارلر جا کر بال سیٹ کراتے ہیں۔ ناخن بڑھا کے نیل پالش لگاتے ہیں، گلے میں لاکٹ پہنتے ہیں۔ حتیٰ کہ ہلکا ہلکا میک اَپ بھی کرتے ہیں..... آپ تو روزانہ خوشبو میں نہا کر نکلتے ہیں۔ روزانہ ایک شیشی تو استعمال کرتے ہوں گے"

"فیشن کے ساتھ سب اچھا لگتا ہے۔" شان بھائی نے کہا، اور میں فیشن کا مخالف نہیں ہوں۔ خواہ عورتیں کریں یا مرد —— میرے خیال میں عورت کو ہمیشہ خوبصورت نظر آنا چاہیئے۔ خوش لباس ہونا چاہیئے۔ ہر وقت شگفتہ نظر آنا چاہیئے۔ جیسے تم ہو؟"

"ہم سب بہنوں میں کسریٰ باجی خوش لباس تھیں اور میک اَپ کی شوقین بھی تھیں۔"

رملی جلدی سے بولی:

"اونہوں ——" شان بھائی نے بیچ میں ٹوک دیا۔

"کسریٰ تو انتہائی بد ذوق عورت ہے۔ کئی کئی دن تک کپڑے نہیں بدلتی۔ ویسے وہ بچاری فیشن کرے بھی تو اس پر جچتا نہیں ——"

یہ سُن کر رملیٰ کو دھچکا سا لگا۔

پھوپا جی، شان بھائی پر جان چھڑکتی تھیں۔ سارا دن ان کی خوشنودی میں لگی رہتیں۔ ان کے اشارے پر زندگی گذار رہی تھیں، اور شان بھائی کو دیکھو —— ان کی عدم موجودگی میں کس قسم کے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔

اسی وقت سب لوگ اُٹھ کر ہال کے اندر چلے گئے تو رملیٰ بھی زینب کی انگلی پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔ ہال کے اندر شان بھائی بہت سے لوگوں سے ہاتھ ملا کر ملے۔ کئی لوگ رملیٰ کو دیکھ کر مسکرائے —— دو ایک نے استفسار کیا، "مسز شان ہیں؟"

"بوجھیں تو یہ کون ہیں؟"

شان بھائی ہر ایک کو گول مول جواب دیتے رہے، مگر زینب کو بیٹی بیٹی کہہ کر پکار رہے تھے۔ رملیٰ کو یہ ادا بھائی نہیں —— اور اس نے خود ہی عورتوں کو بتانا شروع کر دیا کہ شان اس کے بہنوئی ہیں۔ اس کی بہن آجکل چھلے میں ہے، اس لئے وہ نہیں آسکی۔

طنبولا شروع ہوا، مگر رملیٰ نے حصّہ نہیں لیا۔ شان بھائی نے بہت مجبور کیا اور کہا، وہ بہت خوش نصیب ہے۔ خوب جیتے گی۔ مگر رملیٰ نے صاف انکار کر دیا۔ زینب کو گود میں بٹھا لیا اور صوفے سے سر ٹکا لیا، اور بولی:

"مجھے اس کھیل سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں صرف دیکھوں گی۔"

دور بیٹھ کر وہ کھیل نہیں دیکھ رہی تھی، بلکہ سب مردوں اور عورتوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ عورتوں پر تو اُس نے بس سرسری نگاہ ڈالی اور چرالی —— مگر مردوں کو خوب غور سے دیکھ رہی تھی۔ شادی سے پہلے وہ مردوں کو غور سے نہیں دیکھا کرتی تھی۔ اس کے ذہن میں مرد کے حسن کا کوئی خاکہ نہیں تھا، کوئی معیار نہیں تھا .....

مگر اس وقت اس نے اندازہ لگایا، کوئی مرد گورا تھا —— کوئی سانولا، اور کوئی کالا —— کسی نے عینک لگا رکھی تھی —— کسی کا قد لمبا تھا —— کسی کا قد چھوٹا تھا، کوئی درمیانہ تھا۔ کوئی بہت دُبلا تھا، کسی کی توند نکلی ہوئی تھی۔ مگر کوئی چہرہ ایسا نہیں تھا جسے دیکھ کر طبیعت متلانے لگے۔

شادی سے پہلے وہ بڑی نخریلی ہوا کرتی تھی - ذرا کوئی بے ڈھنگا مرد دیکھ لیتی تو، وہ فوراً ناک سکوڑ کر کہتی :

"آخ تھو - کتنا گندہ ہے !"

لیکن آج اُسے سب مرد ٹھیک ٹھاک لگ رہے تھے - کیونکہ اُس نے ایک انتہائی بدصورت مرد دیکھ لیا تھا -

یہ مرد اپنی جگہ ٹھیک ٹھاک نظر آ رہے تھے، ان کی بیویوں کی طرف دیکھتی تو وہ بھی خوش باش اور مطمئن نظر آ رہی تھیں - کچھ ایسے مرد بھی تھے محفل میں جو ہر لحاظ سے اپنی بیویوں سے اچھے تھے - مگر سب لوگ مگن اور خوش نظر آ رہے تھے -

مگر وہ کبھی خوش نظر نہیں آ سکتی -

اس میں اور معاذ میں دن اور رات کا فرق تھا -

جس طرح دن اور رات، ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر نہیں چل سکتے ... وہ دونوں بھی ایک ساتھ دیکھے نہیں جا سکتے - کتنا ارمان تھا، کہ شادی کے بعد اپنے شوہر کے قدم بہ قدم ساری دنیا کی سیر کرے گی - جگہ جگہ جائے گی - خوب گھوما پھرا کریں گے —— گھومنے پھرنے کا اُسے بہت شوق تھا، اور گھومنے پھرنے کے لئے —— مستی میں لہرانے کے لئے —— ایک طرحدار، خوبرو مرد کی ضرورت تھی، جس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے، تو احساس کے سارے قمقمے ایک دم روشن ہو جائیں -

اور اب غالباً یہ تمنا ایک حسرت میں بدل گئی تھی —— اور حسرت کو بھی چُپ چاپ آنسوؤں کی قبر میں دفن کرنا تھا - جب وہ خود اپنے شوہر کے ساتھ چلنا برداشت نہیں کرتی تو دیکھنے والے اس تضاد کو کیسے سہہ سکتے تھے ... ہر ہر قدم پر طنزیہ نظروں کے بھالے دل میں اتارنا —— اور لوگوں کے زہر بھرے فقرے سننے کا یارا اس میں نہیں تھا -

آج اُسے پھر ایک بار قنوطیت کا دورہ پڑا تھا اور وہ بیٹھے بیٹھے احساس کمتری کے اندھیرے کنوئیں میں اتر گئی ..... اس کا دل خالی کنوئیں کے ڈول کی طرح ..... اِدھر اُدھر الٹنے پلٹنے لگا —— ہاتھ پاؤں ٹھنڈے برف ہو گئے —— دل اُلٹ جائے تو ایک دم جسم کی ساری توانائی نچوڑ لیتا ہے — اس کے چہرے کا نکھار شبنم کی طرح ہوا ہو گیا —— اور وہ ایک دم زرد، پیلی —— اداس اور گم صُم دکھائی دینے لگی -

جب گیم ختم کر کے شان بھائی آئے تو اُسے دیکھ کر حیران رہ گئے - !

"تمہیں کیا ہوا ہے رمو، تھکی تھکی لگ رہی ہو - ؟"

اس نے بھی بات پکڑ کے بات بنالی۔

"زیادہ دیر بیٹھی رہوں، تو تھک جاتی ہوں۔"

"دیکھو۔" شان بھائی مٹھی میں کچھ نوٹ پکڑے ہوئے تھے۔

"جتنی گیمز تمہارے نام پر کھیلیں، جیت گیا۔ اور اپنے نام کی پرچیاں ہارتا رہا۔ تم بڑی خوش قسمت لڑکی ہو۔"

رملہٰ دُکھ سے مُسکرائی۔

"لوگ محبت کے پردے میں پتہ نہیں کیوں اُس کے زخم کریدتے ہیں...... اور یہ میرے دکھ کو کیا جانیں — ؟"

"الٰہی! ساری دنیا کو میں کیونکر رازداں کرلوں —؟"

"آؤ!" وہ بولے۔ "کلب کی گرل سے کچھ کھائیں۔"

"نہیں شان بھائی!" — رملہٰ کے چہرے پر بیزاری تھی۔

"ارے تمہارے نام سے جیتے ہوئے پیسوں سے —— آج تو میں تمہیں ضرور ٹریٹ دوں گا۔"

"میرا کچھ بھی کھانے کو دل نہیں چاہ رہا۔ اور میرا خیال ہے، زینو کو بھی نیند آرہی ہے۔ اب گھر چلیں ——"

شان بھائی نے آگے بڑھ کر اس کا ٹھنڈا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور اسے کھینچا —— رملہٰ ڈر کر فوراً کھڑی ہوگئی۔ سب کے سامنے اُسے شان بھائی کی بے تکلفی ذرا بھی اچھی نہیں لگی۔ خوف کے مارے ان کے پیچھے چل دی ——

لان میں کرسیاں لگی تھیں، اور بیرے تکے اور کباب کی گرم گرم دھواں دیتی سیخیں اُٹھائے سروس کر رہے تھے۔ لوگ قہقہوں کے ساتھ تکے کباب بھی کھا رہے تھے۔

رملہٰ بھی لہو کے گھونٹ پیتی وہیں بیٹھ گئی۔

بیرے نے جب گرم سیخیں ان کے آگے لا کے رکھیں تو اُسے یُوں لگا جیسے کباب نہیں بلکہ اس کے دل کو سیخوں میں پرو دیا گیا ہے۔ ایسی تکلیف دہ حالت اس کے دل کی بھی تھی —— جل بھی رہا تھا، اور لہو بھی ٹپک رہا تھا —— دھواں نکل بھی رہا تھا اور کسی کو نظر بھی نہیں آرہا تھا۔ البتہ زینو کی بھوک چمک اُٹھی تھی اور وہ اُسے گودی میں بٹھا کر اپنے ہاتھ سے کھلانے لگی۔ کبھی کبھی بے دلی سے خود بھی کوئی لقمہ کھا لیتی۔

یہاں بھی چاروں طرف دیکھتی۔ اکثر شادی شدہ جوڑے، ایک دوسرے کے ساتھ

چہلیں کر رہے تھے - کبھی یہی خواب اس نے بھی دیکھا تھا - اس کا ہر خواب اپنے شوہر کے ساتھ وابستہ تھا - اس نے شادی سے پہلے بھی کسی کے ساتھ فلرٹ نہیں کیا تھا حالانکہ اس کے کئی کزن اسے بے تحاشہ پسند کرتے تھے - اُسے خوب صورت لڑکیوں کی طرح لڑکوں کو ناز نخرے دکھانے میں بھی مزہ نہیں آتا تھا - بس ذہنی طور پر تو وہ بڑی مشرقی لڑکی تھی، اور ہر تمنا شادی کے بعد پوری کرنا چاہتی تھی۔

مگر قسمت کا کتنا عجیب مذاق تھا ——

جس شوہر کے ساتھ اس کی ذہنی اور جسمانی ہم آہنگی نہیں تھی، اُس کا بچہ اس کے پیٹ میں تھا۔

واپسی پر وہ کار میں بڑی گم صم بیٹھی تھی - زینو اس کے سینے کے ساتھ لگ کے سو رہی تھی - زینو کو گود میں سُلا کر وہ بیٹھ نہ سکتی تھی، اس لئے اُسے ذرا ٹیڑھا ہونا پڑا - ایک بازو اس کے گرد لپیٹ لیا اور دوسرا سیٹ کی پُشت پر رکھ لیا - وہ ہمیشہ شان بھائی کے ساتھ آگے ہی بیٹھا کرتی تھی - پیچھے بیٹھنے کا شان بھائی بُرا مانتے تھے۔

" رمو —" شان بھائی، بڑی آہستہ کار چلا رہے تھے

" مجھے ایسے لگتا ہے، جیسے تم اکثر کسی خیال میں کھوئی رہتی ہو،"

" نہیں تو شان بھائی "

" خیر اب مجھ سے نہ چھپاؤ — میں تمہارا روایتی رشتہ دار نہیں ہوں کہ نصیحتیں کرنا شروع کر دوں —"

" کیا مطلب شان بھائی —؟"

" میں جانتا ہوں تمہیں معاذ بالکل پسند نہیں ہے۔"

رملی تھرّا گئی — اس کا سیٹ کی پشت پر رکھا ہوا بازو، اپنے آپ سیٹ پر گر گیا — اس نے اپنی ہتھیلی سیٹ پر ٹکا کر اپنے آپ کو سہارا دیا اور کوشش کی کہ اس بات کی تردید کرے - اگر کچھ اور نہ کہہ سکے تو حسبِ عادت نہیں تو — ہی کہہ دے۔

مگر اس کا مُنہ سل گیا — آج وہ بے حد افسردہ تھی — اس لیے اپنی افسردگی کو چھپا بھی نہ سکی - سُن ہو گئی۔

" تمہارے ساتھ جو ظلم ہوا ہے — اس کا مجھے پورا احساس ہے، مگر اب اس کا اظہار کرنے کا کوئی فائدہ نہیں — ویسے اتنا تمہیں بتا دوں کہ دن رات جو تمہارے دل پر گذرتی ہے، میں اس سے بے خبر نہیں ہوں - جب بھی معاذ کو تمہارے ساتھ

دیکھتا ہوں ——— اس انمل، بے جوڑ شادی پر جی ہی جی میں کھول اٹھتا ہوں۔ جی چاہتا ہے۔ تمہیں اس خبیث کے پہلو سے نوچ کر اپنے دل میں چھپا لوں … کیا کسی نے چاند کو بھی کبھی اندھیرے کنوئیں میں لٹکایا ہے ——— ؟

" مگر میں کڑھنے کے علاوہ تمہارے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتا رمو ———"

اس بات پر رملی باقاعدہ رونے لگی۔

اور اس کے آنسو زینو کے چہرے پر گرنے لگے۔ رملی نے اپنا چہرہ پرے کر لیا۔ کہ کہیں زینو کی نیند نہ کھل جائے۔ مگر اس کا دل نہیں چاہا کہ وہ اپنے آنسو چھپائے۔

آج وہ اپنے سرکش جذبوں سے ہار گئی تھی، اور چھالے کی طرح پھوٹ پڑنا چاہتی تھی ——— اگر چھالا زیادہ پھول جائے تو اس میں نشتر چبھو دیتے ہیں کہ یہی اس کا آخری علاج ہوتا ہے۔

اگر شان بھائی نے ہمدردی کا نشتر چبھویا تو بہت اچھا کیا ——— زہریلا مادہ باہر تو نکلا ———

" کتنی خوبصورت ہے تو رمو ——— جیسے پریوں کے دیس کی البیلی شہزادی!

——— " مجھے یاد ہے، کل تک تیرا معصوم اور مقدس چہرہ ہر غم اور ہر فکر سے آزاد تھا۔ اور آج تیرے چہرے پر کتنا کرب ہے ——— کتنی یاسیت اور کتنی تھکن ہے۔ کون ظالم چھین کر لے گیا ——— تیرے چہرے کا لاابالی پن ..... وہ بے پروائی .... وہ بے فکری ..... وہ معصومانہ دلکشی ———"

" اف ..... اپنا چہرہ دیکھو ——— کتنی بے چارگی ہے، تمہارے چہرے پر ———"

رملی کے بے آواز آنسو اس کے رخساروں پر گرتے رہے۔ اس وقت پوری دنیا میں صرف شان بھائی ہی اُسے سچے ہمدرد نظر آ رہے تھے۔ وہ تو شکر ہوا کہ وہ موٹر چلا رہے تھے۔ اور اس کی گود میں زینو لیٹی ہوئی تھی، ورنہ اس وقت، وہ شان بھائی کے کندھے سے لگ جاتی اور چیخ چیخ کر رونے لگتی

"کاش میں تیری تقدیر بدل سکتا رمو! اے کاش ———"

یہ کہہ کر شان بھائی نے آہستہ سے اپنا گرم گرم مضبوط ہاتھ سیٹ پر پڑے ہوئے رملی کے ٹھنڈے ٹھار ہاتھ پر رکھ دیا ——— رملی چونک گئی ——— چاہنے کے باوجود اپنا ہاتھ الگ نہ کر سکی۔

شان بھائی کے ہاتھ کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ رملیٰ کا سارا جسم لرزنے لگا۔

"رمو" شان بھائی کی آواز جذبات میں بھیگ گئی۔

"تو کیا جانے مجھے تیرا کتنا خیال ہے۔ کاش تجھے اندازہ ہو سکتا۔؟ اگر تجھے منظور ہو تو، میں اپنی زندگی کی ساری خوشیاں تیرے قدموں پر رکھ دوں"

رملیٰ نے زور سے ہاتھ کھینچ لیا۔

کوئی بات ضرورت سے زیادہ ہو گئی تھی..... کہیں دراڑ آ گئی تھی... کچھ ٹوٹ گیا تھا........ جیسے چلتے چلتے پاؤں کے نیچے کوئی پلاسٹک کا کھلونا آکر چور چور ہو جائے.......

رملیٰ اپنے پرس سے رومال نکال کر اپنا چہرہ صاف کرنے لگی.......وہ کافی رو چکی تھی۔ اس کے آنسو اس کی دلی کیفیت کا اظہار کر چکے تھے.....اس کا بھید کھل گیا تھا۔ اس کی کمزوری ظاہر ہو گئی تھی۔...... اب مزید کچھ کہنا بیکار تھا۔—— اپنی حماقت کی نفی کرنا فضول تھا۔

اسے اپنے آپ پر بے حد غصہ آنے لگا۔.....آہ......

میں نے سوچا تھا کہ رونے سے بھرم جاتا ہے
پانی پڑ جائے تو شمشیر کا دم جاتا ہے

کم ظرف کے سامنے رونے سے آدمی بے آبرو ہو جاتا ہے——

پر اب کیا فائدہ —— جو ہونا تھا ہو چکا——

پتہ نہیں شان بھائی پھوپھو باجی سے جا کے کیا کہہ دیں——؟

شکر ہے۔ سامنے ہی گھر کا گیٹ آ گیا......اسے کچھ بھی نہ کہنا پڑا—— اور اس کے بعد شان بھائی نے بھی کچھ نہ کہا۔

وہ سوئی ہوئی زینو کو بمشکل اٹھا کر گھر کے اندر داخل ہوئی۔ پھوپھو باجی اس وقت لاڈلی کو دودھ پلا رہی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی ان کا چہرہ کھل اٹھا۔

جب وہ زینو کو اس کے بستر پر لٹا کر پلٹی......تو پھوپھو باجی نے اس کے چہرے اور سوجی ہوئی آنکھوں کو غور سے دیکھا——

"کیا بات ہے رمو——؟"

"کچھ نہیں پھوپھو باجی——" رملیٰ نے نظریں چرا کر کہا۔

کہیں راستے میں شان سے لڑائی تو نہیں ہو گئی۔

"خدانخواستہ ——" رملی نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"ایسی بات کیوں ہونے لگی۔ بس —— آپ تو جانتی ہیں۔ کبھی کبھی اچانک طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔" یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے کی طرف جانے لگی تو پھپھو باجی نے اسے پکارا۔

"رمو دو بار معاذ کا ٹیلی فون آیا تھا۔"

"اچھا —— ؟"

رملی رک گئی۔

آج پہلی بار اسے محسوس ہوا کہ معاذ کی جانب سے فون کا سن کر اسے عجیب طرح کا اطمینان ہوا ہے۔ جیسے تیز ہوا کے جھکڑ کے پیچھے ایک مضبوط دیوار ہے۔

"کیا کہتے تھے ——؟"

"بس تیرا پوچھ رہا تھا۔"

آپ نے کیا کہا —— ؟

"میں نے بتا دیا کہ شان کے ساتھ کلب گئی ہے۔"

"اچھا ——" رملی کا دل دھڑک اٹھا۔

"پھر کیا بولے ——؟"

"کہنے لگا۔ ایک گھنٹے بعد پھر کر لوں گا۔"

"تو کیا ایک گھنٹے بعد ——؟"

"ہاں —— میں نے معذرت کی کہ وہ ابھی نہیں آئے —— جونہی آئیگی میں اسی وقت فون کرا دوں گی۔ تو بولا آپ لوگ زحمت نہ کریں۔ دس بجے رات میں خود فون کر لوں گا۔"

رملی نے گھڑی دیکھی اس وقت پونے نو بج رہے تھے۔

کسریٰ باجی بولیں۔

"دس بجنے میں تو کافی وقت ہے۔ جاؤ نمبر ملا کر بات کر لو۔ خوش ہو جائیگا.... کوئی ضرورت نہیں اس کی کال کا انتظار کرنے کی ——"

"نہیں ——" رملی کے اندر کی آواز ایک دم پھوٹ کر باہر آ گئی۔

"میں دس بجے تک انتظار کروں گی۔ اگر فون نہ آیا تو خود کر لوں گی۔"

"ٹھیک ہے کسریٰ باجی نے لاڈلی کے منہ سے بوتل نکال لی۔ وہ سو گئی تھی۔ اسے اچھی طرح کمبل میں لپیٹا اور کھاٹ میں ڈال دیا۔ پھر رملیٰ کے ساتھ ہی باہر نکل آئیں۔

"تم کھانا کھاؤ گی۔" انہوں نے رملیٰ سے پوچھا۔

نہیں شان بھائی نے تکے کباب کھلا دیئے تھے۔ حالانکہ رملیٰ نے برائے نام کھایا تھا۔

"تو اس کا مطلب ہے کہ شان بھی کھانا نہیں کھائیں گے" میں ذرا ان سے پوچھ لوں۔

شان بھائی سامنے ٹی وی لاؤنج میں نہیں تھے۔ اس لیے کچھو باجی ان کے کمرے میں چلی گئیں۔

رملیٰ اپنے کمرے کیطرف مڑ گئی۔ دل سخت گھبرا رہا تھا۔ غسل خانے میں جا کے منہ دھویا تو کہیں قرار آیا۔ ساڑھی اتار کے رات کے ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے ——— کنگھی سے اپنے بال سلجھا کے ایک چٹیا باندھ لی پھر اون سلائیاں اٹھا کر ٹی۔ وی لاؤنج میں آ گئی ———

خبرنامہ ہو رہا تھا اور ٹی وی کے پاس کوئی بھی نہیں تھا۔ رملیٰ کو کسریٰ باجی نے اون لا دی تھی کہ وہ زینو اور لاڈلی کا ایک ایک سیٹ ہی بنا دے ——— سو وہ بیٹھ کر سلائیاں چلانے لگی۔

اتنے میں کسریٰ باجی ٹرالی گھسیٹتی ہوئی آئیں اور اس کے پاس بیٹھ گئیں۔

"کافی پیو گی ———؟"

"اس وقت ———؟"

"اور کب ———؟"

"کیا کوئی مہمان آ رہے ہیں کچھو باجی ———؟"

"نہیں تو ——— شان کہہ رہے ہیں۔ کافی پینے کو دل چاہ رہا ہے۔ ان کے لیے بنا لائی ہوں۔"

"کہاں ہیں شان بھائی۔"

"اپنے کمرے میں ہیں۔"

"تو کیا وہ آپ کے کمرے میں نہیں رہتے ———؟"

"پگلی ———" کسریٰ باجی ہنسیں ——— پتہ نہیں کیوں ہنسیں ———

"جب سے دوسری بچی ہوئی ہے۔ میں خود بچوں والے کمرے میں آگئی ہوں۔ مجھے تو ساری رات جاگنا ہوتا ہے۔ انہیں کیوں بے آرام کروں۔"

"مگر بچوں کے ساتھ جو بے آرامی ہوتی ہے۔ اس میں دونوں، ماں اور باپ کے لیے ایک قسم کی راحت ہوتی ہے۔ شوہر کو بھی اسے Share کرنا چاہیئے۔"

"اچھا ——" کچھو باجی حسبِ عادت بڑے پیار سے مسکرائیں اور پھر بولیں۔

"اب تمہارا بچہ ہو گا نا؟ تو تم سب سے پوچھوں گی۔"

ہائے ——

رملیٰ نے دل میں سوچا ——

وہ تو بچے کے بغیر بھی ہمیشہ یہی چاہتی رہی کہ معاذ دوسرے کمرے میں سوئے.. دوسرے بستر پر سوئے —— اس سے دور رہے...... پرے رہے....

اسی وقت اسے کال کا خیال آگیا —— گھڑی دیکھی تو ابھی پونے دس ہوئے تھے۔ کسریٰ باجی نے کافی کی پیالی بنائی اور شان بھائی کو دینے چل دی۔ اٹھتے ہوئے بولیں۔

"تمہیں آکر بنا دوں گی۔"

اندازے سے زیادہ دیر لگا کر آئیں تو ہنستے ہوئے بولیں ——

"خوبصورت مرد کے نخرے بڑے ہوتے ہیں۔"

"کیسے ——؟"

"شان کہہ رہے تھے پہلے پاس بیٹھ جاؤ —— پانچ دس منٹ سر کو دباؤ۔ پھر جانے دوں گا۔"

"تو آپ نے دبایا سر ——؟"

"ہاں۔"

"چھی —— میں ہوتی تو کبھی نہ دباتی۔" اس کے تصور میں اپنا شوہر تھا۔

کسریٰ باجی نے اسے غور سے دیکھا اور بس ہنس پڑیں۔

"پگلی تو نے ابھی ازدواجی زندگی کی اصلیت کہاں دیکھی ہے۔ رفتہ رفتہ تجھے سب نشیب و فراز سمجھ میں آجائیں گے۔"

اس پر رملیٰ خاموش ہو گئی اور سوچنے لگی —— اور نشیب و فراز کیا ہونگے اور برہم گردشِ شمس و قمر ہو گی تو کیا ——؟

کسریٰ باجی نے کافی بنا کر اس کے ہاتھ میں پکڑائی تو اندر سے لاڈلی کے چیخنے کی آواز آئی۔

وہ پیالی چھوڑتے ہی اندر بھاگ گئیں۔

بیچاری ——

یہ کہہ کر رملیٰ نے کڑوی کڑوی گرم گرم کافی کو گھونٹ گھونٹ کر کے پینا شروع کر دیا۔

دس بج گئے تھے۔ اور معاذ کا فون نہیں آیا تھا۔

کبھی وہ سوچتی کیا معاذ اس کے کلب جانے کا بُرا مان گئے۔ یا کسی دلچسپی میں لگ گئے۔ دونوں باتوں سے اسے سروکار نہیں تھا۔ برا مانتا ہے تو مانے —— بلا سے ...... میں کسی غیر کے ساتھ تو نہیں گئی۔ اپنے بہنوئی کے ساتھ گئی تھی ——

اور اگر بھول گیا تو اور بھی اچھا —— وہ کون سا اس کو یاد رکھتی ہے۔ ہاں اسے اچانک بے جی کا خیال آگیا ——

بڑی نیک خاتون ہیں۔

کافی پی کر اس نے پیالی ٹرالی پر رکھدی۔ ٹی وی پر کوئی خاص پروگرام نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے اٹھ کر ٹی وی بند کر دیا۔ گھر میں خاموشی چھا گئی۔ وہ پھر سلائیاں بننے لگی۔

ٹھیک ساڑھے دس بجے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے میکانکی انداز میں رسیور اٹھا لیا۔

"رملیٰ ——" معاذ نے بیقراری سے کہا۔

"جی ——" رملیٰ نے آہستہ سے کہا۔

"معاف کرنا تمہیں آدھا گھنٹہ انتظار کرنا پڑا۔ پتہ نہیں ٹیلیفون میں کیا گڑبڑ ہو گئی تھی۔ پونے دس بجے سے، تھوڑی تھوڑی دیر بعد کوشش کر رہا ہوں۔ لگ نہیں رہا تھا مجھے معلوم تھا تمہیں انتظار ہو گا۔"

اتنی سی بات سے رملیٰ کا جی برہم ہو گیا۔ سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو ——

"کیسی ہو رملیٰ ——؟"

اس نے اتنے پیار سے پوچھا کہ رملیٰ جواب دینا بھول گئی۔

"اس وقت کیا کر رہی ہو؟"

رات کے گہرے سناٹے میں رملیٰ نے پہلی بار محسوس کیا کہ معاذ کی آواز فون پر بہت دلکش بہت ہی گمبھیر لگ رہی تھی۔ بھاری بھاری —— بھیگی بھیگی —— اور سوز میں

ڈوبی ہوئی۔۔۔۔۔۔۔مردوں کی ایسی آواز اسے بہت پسند تھی۔ جو دل پر گلاب برساتی ہے۔
اس سے پہلے اس نے کبھی معاذ کی آواز پر غور ہی نہیں کیا تھا۔

"جان چپ کیوں ہو۔۔۔۔؟"

اس نے دوبارہ پوچھا۔۔۔۔ تو رملیٰ نے کرب سے سوچا کاش تمھاری صورت بھی تمھاری آواز کیطرح ہوتی۔ تو پھر جو برقی تاروں میں سے تمھاری آواز کی لہریں نکل رہی ہیں میں ان کو چوم چوم لیتی۔

"میں تو ٹھیک ہوں معاذ۔۔۔۔"

وہ آہستہ سے بولی۔

"نہیں ایسا لگ رہا ہے۔ تمھارا جی اچھا نہیں۔۔۔۔"

"اچھا ہے بالکل۔۔۔۔" وہ زبردستی ہنسکر بولی۔

اتنے میں کسریٰ باجی نکل آئیں اور آکر اس کے پاس بیٹھ گئیں۔

"کب آرہی ہو جان۔ میں تو بہت اداس ہو گیا ہوں۔۔۔۔"

اس کا ڈائریکٹ جواب دینے کی بجائے رملیٰ بولی۔

"بے جی کہاں ہیں۔۔۔۔ ان کا کیا حال ہے؟۔۔۔۔"

"اسوقت تو غالباً سو گئی ہیں۔ ورنہ میں انہیں ضرور بلا دیتا۔" معاذ بولا۔
"وہ بھی تمھارے لیے بہت اداس ہیں۔ روز پوچھتی ہیں دولہن کب آئیگی؟"

"آجاؤں گی۔۔۔۔" رملیٰ نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

"ذرا فون مجھے دو۔" کسریٰ باجی نے حسب عادت ریسور اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

"کیا حال ہے معاذ۔۔۔۔" چونگا منہ سے لگا کر بولیں۔

"پھوباجی میری بیوی کو کب بھیج رہی ہیں؟"

"بھیج دیں گے بابا۔۔۔۔"

"کب بھیجیں گے۔۔۔۔ بس بہت ہو چکی۔"

"اب مجنوں بن کے مت دکھاؤ۔"

"میں بن کب رہا ہوں۔۔۔۔" معاذ ہنسنے لگے۔

اس پر کسریٰ باجی نے بھی قہقہہ لگایا۔

"دیکھو معاذ میرے کہنے پر ابھی اسے ایک ہفتہ اور یہاں رہنے دو۔"

"بھئی یہ زیادتی ہے؟"

"دیکھونا؟ جتنے دن رملیٰ یہاں رہی ——— میں بچوں میں مصروف رہی۔ اب کل میرا سوا مہینہ پورا ہو جائے گا۔ میں چاہتی ہوں ایک ہفتہ کے لیے میں لاہور آجاؤں۔ رملیٰ کو روک رکھا ہے کہ اسے چھوڑنے کے بہانے میں بھی آجاؤں گی۔ ورنہ میرا گھر سے نکلنا مشکل ہو جائیگا۔

"اچھا آپ کی خاطر ایک ہفتہ اور سہی ——" معاذ نے ٹھنڈی سانس چھوڑ کر کہا

"معاذ! تم بڑے اچھے ہو"۔ اللہ تمہیں چاند سا بیٹا دے۔

"پہلے میری چاند سی بیوی تو واپس کریں۔"

کسریٰ باجی زور سے ہنس پڑیں۔

"لو ——— اپنی چاند سی بیوی سے بات کر لو۔"

رملیٰ نے پھر ریسور پکڑ لیا۔

"جان ——" معاذ اپنی جذبات میں بھیگی آواز میں بولا۔

"میں نے صرف ایک ہفتے کی چھٹی اور دی ہے۔"

"جی اچھا . . . ." رملیٰ نے سعادت مندی سے کہا۔

"اور ———"

"کچھ نہیں ———" رملیٰ بولی۔

"اور ———"

رملیٰ خاموش ہو گئی . . . .

"اور کچھ بولو رملیٰ ———؟"

"جی کیا کہوں ———؟"

"تمہیں تو زیادہ بولنے کی عادت نہیں رملیٰ۔"

"بے جی کو میرا سلام کہدیں۔" رملیٰ نے جلدی سے کہا۔

"کہدوں گا حضور ——— اور کوئی پیغام ———؟"

"جی اور تو کوئی پیغام نہیں۔"

"اپنا خیال رکھو۔ ایسے لگ رہا ہے آج تم ذہنی طور پر ٹھیک نہیں ہو"۔

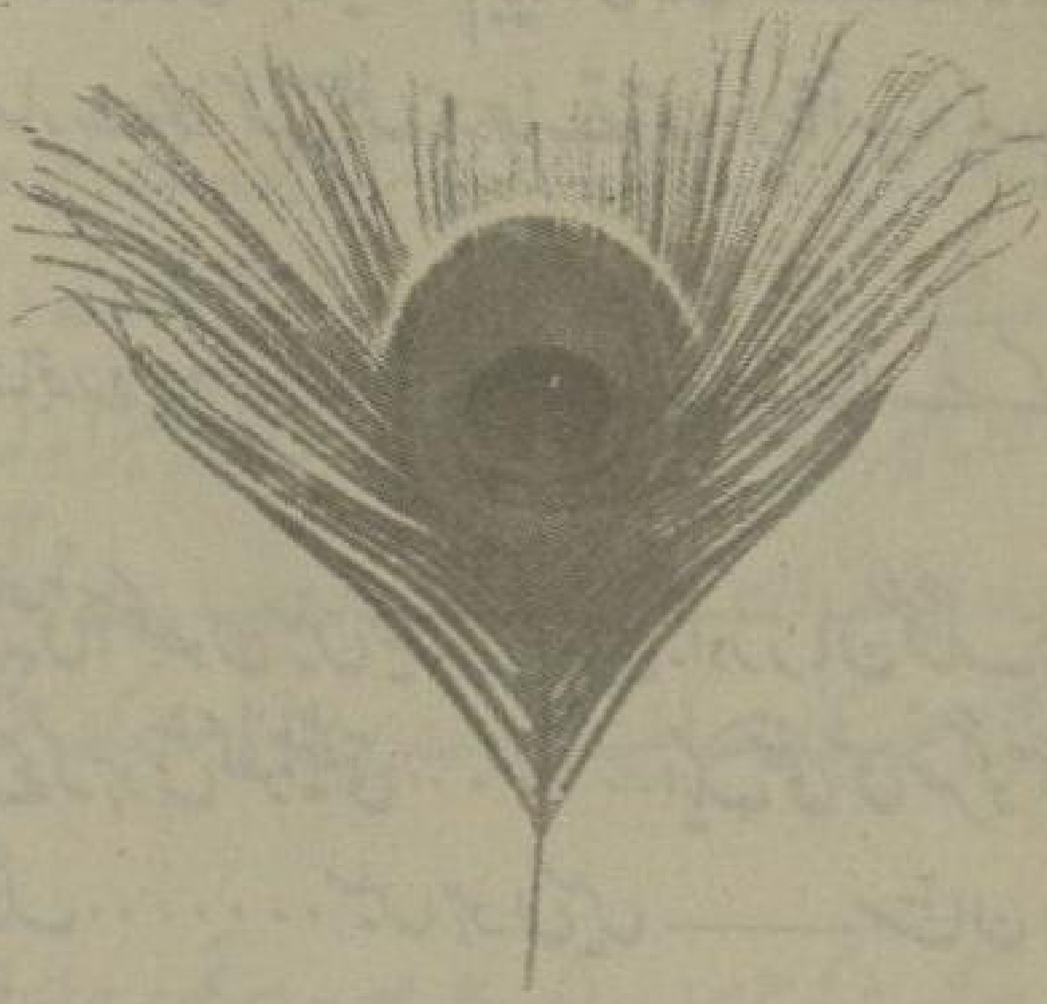
"نہیں جی ——— میں تو بالکل ٹھیک ہوں" . . . . . .

"اچھا اب جاؤ ——— آرام کرو۔ کافی دیر ہو گئی ہے۔

خدا حافظ ———"

"شب بخیر........"

"شب بخیر........"



دوراتیں رملیٰ بالکل نہ سو سکی تھی۔ جانے کیا پریشانی تھی۔ ساری رات بستر میں پڑی کروٹیں بدلتی رہی۔ ڈاکٹر نے کہا بھی تھا۔ ایسے میں اگر نیند نہ آئے تو نیند کی گولی کھا لیا کریں۔ مگر گولی کھانے کو اس کا دل ہی نہیں چاہا۔ اس کا جی عجیب طرح بے چین تھا۔ ایسے لگ رہا تھا اسے کوئی ذہنی اذیت پہنچ چکی ہے یا پہنچ رہی ہے۔۔۔۔۔۔

آج رات ذرا پرسکون تھی۔ اس لیے بغیر کوشش کے نیند آگئی اور چونکہ قدرتی نیند تھی اس لیے وہ جلدی گہری نیند سو گئی۔ نیند میں اسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی اس کے چہرے سے اس کے بال ہٹا رہا ہے۔ کوئی اس کے چہرے کو چھو رہا ہے ——— کوئی اپنے گرم سانس کی ہوا اسے دے رہا ہے۔۔۔۔۔۔۔

کوئی۔۔۔۔۔۔۔

کوئی۔۔۔۔۔۔۔

وہ ایکدم گڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ رضائی دور پھینکی۔۔۔۔۔۔۔ تو سایہ ذرا پرے ہٹ گیا۔ غنودگی اور غضب کے ملے جلے عالم میں ذرا سی دیر کو وہ بالکل اوسان کھو بیٹھی۔ گھور گھور کر اپنے مقابل چہرے کو پہچاننے لگی۔۔۔۔۔۔۔ زیرو کا ہلکا نیلا بلب روشن تھا چہرہ اتنا قریب تھا کہ صاف نظر آرہا تھا۔ جسے پہچان کر بھی پہچاننے سے گریز کر رہی تھی۔ کبھی کبھی کسی وحشت ناک آواز کو سنکر شب کے پچھلے پہر اچانک آنکھ کھل جاتی ہے۔ نیند کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی اگر آنکھ اس طرح کھل جائے تو آدمی ہوش اور بے ہوشی کے درمیان معلق ہو جاتا ہے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ جاگ رہا ہے یا

سو رہا ہے ـــــ خواب میں ہے یا عالم بیداری میں ـــــ زمین پر ہے یا آسمان پر ـ تھوڑی سی دیر کے لیے سارے حواس معطل ہو جاتے ہیں۔ اپنا آپ ایک انجانا سوال بن کر روبرو آکھڑا ہوتا ہے۔

پہلا سوقت جو روبرو تھا۔ وہ شناخت کی گرفت میں آنے کے باوجود فہم کی گرفت میں نہیں آرہا تھا۔

رملی کی پھٹی پھٹی آنکھوں میں حیرت ٹھہر گئی۔ اور زبان گنگ ہو گئی۔

پیشتر اس کے کہ ہوش کھو بیٹھتی...... ایک ننھی سی سرگوشی اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"رمو ڈارلنگ...... میں ہوں میں ـــــ شان!"

"شان بھائی ـــــ؟"

رملی حلق پھاڑ کر اس طرح چیخی جیسے مدت کے بعد گویائی ملی ہو......

آہستہ بولو......

"انھوں نے اپنا معطر ہاتھ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیا۔"

رملی نے دھکا دے کر انہیں پیچھے کیا۔ اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ غصیلے لہجے میں وہ تھرتھراتی ہوئی بولی ـــــ

"آپ اس وقت یہاں کیا کر رہے ہیں ـــــ؟"

"ڈارلنگ"۔ وہ عجیب سی آواز میں بولے "میں تمھارا ادنیٰ پرستار ہوں۔ عاشق ہوں.... میرے آنے کی وجہ نہ پوچھو" ـــــ......

"شان بھائی ـــــ؟"

اب رملی کی پوری آنکھیں کھل چکی تھیں۔

"پھپھو باجی کہاں ہیں ـــــ؟" وہ اپنے خوف سے دھڑدھڑاتے دل پر قابو پا کر بولی۔

"وہ اپنے کمرے میں سو رہی ہے۔ فکر نہ کرو۔ آج اس کے سر میں درد ہو رہا تھا۔ میں نے درد کی دوائی کے ساتھ اسے ایک نیند کی گولی کھلا دی ہے۔..... آج میں تمہیں بتانے آیا ہوں کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں ـــــ اور اسوقت سے محبت کرتا ہوں جب اپنی شادی کے روز آرسی مصحف کے وقت میں نے کسریٰ کی بجائے تمھارا چہرہ آئینے میں دیکھ لیا تھا...... تم اس بدصورت انسان کے لیے پیدا نہیں کی گئیں....... تمھارا صحیح قدردان اور تمھارا اصل جوڑ میں......"

مگر ان کا فقرہ پورا ہونے سے پہلے رملی نے ایک زناٹے دار تھپڑ مار کے شان بھائی

کا منہ بند کر دیا۔

شان بھائی اس اچانک حملے کے لیے تیار نہیں تھے۔ کم زور اور بزدل سی رملیٰ سے وہ ایسی توقع بھی نہیں رکھتے تھے...... چونکے...... جھلائے...... پھر یوں رملیٰ کی طرف دیکھا جیسے بھینسا لال کپڑے کو دیکھتا ہے۔ مگر جلدی ہی پینترا بدل لیا۔

رملیٰ دل ہی دل میں ان کے اس زہریلے روپ سے ڈر گئی......

انہوں نے بھی جلدی سے اپنے چہرے پر پرانا ماسک چڑھا لیا اور آواز کو زیادہ پرسوز بنا کر بولے۔

"میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ ایک عرصے سے تم پر جان چھڑکتا ہوں۔ اب تم اتنی قریب ہو...... اتنی اداس ہو...... میں تم سے اتنی محبت کرنا چاہتا ہوں کہ"....

رملیٰ کے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں...... رات کے سنسان لمحوں نے جلدی سے اس کے ذہن میں ایک شمع روشن کر دی۔ دروازے کیطرف دیکھکر بولی ——

"وہ پھوپھو باجی آگئیں ——!"

بس اتنا کہنا تھا کہ شان بھائی اسطرح اٹھے جیسے انہیں کرنٹ لگ گیا ہو چھلانگ لگائی اور کچھ کہے بغیر دروازے سے نکل گئے۔ اور لپک کر رملیٰ نے اپنے دروازے کی کنڈی لگا لی۔

نیا گھر تھا۔ رات کو تنہا سوتے ہوئے اسے ڈر لگتا تھا۔ پھوپھو باجی نے کہا تھا ساری رات بچیاں باری باری اٹھتی رہتی ہیں اور میں سارے گھر میں پھرتی رہتی ہوں۔ تم گھبراؤ نہیں اپنے کمرے کا دروازہ کھلا چھوڑ کر سو جایا کرو۔ میں آتے جاتے ہوئے تمہیں بھی جھانک جایا کروں گی... اس لیے وہ بے دھڑک دروازہ کھول کر سو جاتی تھی۔ کئی بار پھوپھو باجی جاتے جاتے اس کے کمرے کی بتی بجھا جاتی تھیں......

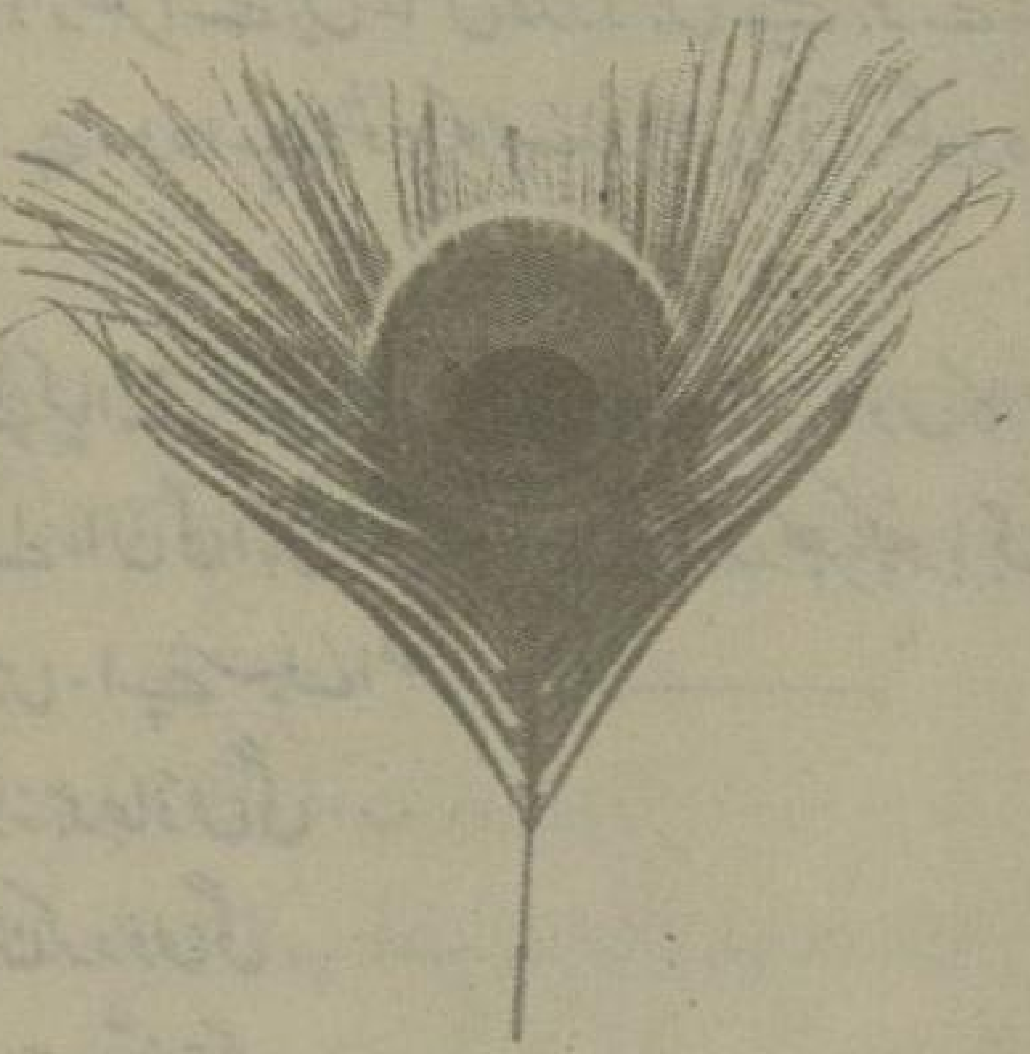
پر آج...... اف اس نے پھڑ پھڑ بولتے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے جسم کے اندر کئی پنکھے لگ گئے ہوں۔ تمام جسم پسینے سے تر بتر ہو رہا تھا اس نے رضائی دور پھینک دی۔ اور بستر پر آلتی پالتی مار کے بیٹھ گئی۔ دیوار سے ٹیک لگا کے اس نے اپنے ابھرے ہوئے پیٹ کی جانب دیکھا اور یہ دیکھکر اسے تعجب ہوا کہ اس کا پیٹ مسلسل ہل رہا تھا۔ یہ اضطراری لہر اس کے پیٹ کے اندر سے اٹھ رہی تھی۔ اور جب اور زیادہ غور کیا تو صاف پتہ چلا کہ پیٹ کے اندر بچے کی جنبش تیز ہو گئی تھی......

اس کے اپنے وجود کا اضطراب اور بے چینی بچے کے وجود میں ڈھل گئی تھی....

اور اس پورے عرصے میں پہلی بار ـــــ رملی کو محسوس ہوا کہ ماں اور بچے کا ناتا کیا ہے؟ کیا اسے بچے کی فطرت کہتے ہیں. یا ماں کا قدرتی روپ ـــــ؟ میں جذباتی طور پر پریشان ہوں تو بچہ اپنی جگہ بے کل ہے. . . . . یہ بچہ ہوتا ہے ـــــ اسے دل کا ٹکڑا کہتے ہیں ـــــ یہ تعلق کے رشتے ہوتے ہیں ـــــ یہ محسوسات کے بندھن ہوتے ہیں ـــــ

اس نے اپنے ہلتے ہوئے پیٹ پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ لیے . . . . جیسے اپنے ان دیکھے بچے کو اپنے بازوؤں میں لے لیا ہو ۔

اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی . . . . .



صبح ہونے تک رملی بستر میں یونہی بیٹھی رہی ....

جب تک رنج اور غصے کے مارے اعصاب تنتے رہے۔ سردی کا بالکل احساس نہیں ہوا۔ سوچ سوچ کر شل ہو چکی...... اور رو رو کر غصہ نکال چکی تو پھر سارا جسم ایک دم ٹھنڈا ہو گیا جلدی سے قالین پر گری ہوئی رضائی اٹھائی اور اپنے اوپر اوڑھ لی جس قدر رضائی کو پیٹتی ——— اتنا ہی لرزہ بڑھتا جاتا...... ہاتھ پیر ٹھنڈے برف ہو گئے۔ حالاں کہ آج کل اس حالت میں اس کے ہاتھوں کی ہتھیلیاں اور پاؤں کے تلوے گرم رہتے تھے۔ اس وقت یوں محسوس ہوا جیسے وہ برف میں دب گئی ہو۔ برف باری کی یہ کیفیت صبح پانچ بجے تک رہی ———

اگر کوئی کتاب اٹھا کر پڑھنے کی کوشش کرتی تو الفاظ برف کے گالے بن جاتے۔

رفتہ رفتہ اس کے دانت بھی کپکپانے لگے۔ تب اس نے ہمت کر کے ہیٹر جلایا۔ ہیٹر کے آگے رکھ کے اپنے ہاتھ گرم کئے۔ پھر ان گرم ہاتھوں میں ٹھنڈے یخ پاؤں دبا کر بیٹھی رہی۔ اسے احساس ہوا کہ جینے کے لیے حرارت کس قدر ضروری ہے ——— جانے کب تاریکیوں سے چھن چھن کر فجر کی اذان کی آواز آنے لگی.......

تو سحر قریب ہونے کے احساس سے اس کے مردہ تن میں آپ ہی آپ جان آنے لگی۔

بار بار سوچتی آخر شان بھائی کس نیت سے اس کے کمرے میں آئے تھے ———؟

اور انہوں نے اسے کس قماش کی لڑکی سمجھا تھا؟

اف توبہ ——— اس خیال سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ آخر شان بھائی

جو اتنے شان دار نظر آتے ہیں۔ اس قدر ذلیل کیسے ہو گئے ——— ؟ یہ ٹھیک ہے کہ اس کے چہرے پر لکھا ہے۔ وہ اپنے شوہر کو پسند نہیں کرتی۔ مگر وہ بد دیانت عورت ہرگز نہیں ہے . . . . . .

شان بھائی کیا اتنے گھٹیا ہو سکتے ہیں کہ رشتوں ناتوں کا احترام چھوڑ دیں۔

صبح ہو لے۔ ان کی اچھی طرح خبر لوں گی اور پھر پھپھو باجی کو سب کھول سناؤں گی۔ ذرا پٹہ باندھ کے رکھیں۔ اپنے سیف الملوک کو ———"

کل ہی روانہ ہو جاؤں گی . . . . . .

معاذ کو فون کر دوں گی . . . . . .

لعنت بھیجو اس تفریح پر . . . . . .

ابھی میری آنکھ نہ کھلتی تو جانے کیا ہو جاتا ——— ؟

بیٹھی اپنے خیالوں سے لڑتی اور الجھتی رہی۔ رات تو جادو کی ایک چادر ہے۔ آتی ہے تو اپنے ساتھ شر اور اسرار کو لیکر آتی ہے۔

مگر صبح کا رنگ نرالا ہے۔

یوں جھانکتی ہے کہ رات کے اندھیروں کے علاوہ دل پر گرے ہوئے منوں بوجھ اپنے آپ ہی سرک جاتے ہیں۔

رات موت ہے اور صبح زندگی ہے !

زندگی کی طرح مسکراتی ہے اور وسوسوں کا لہو کر دیتی ہے۔

صبح کی پہلی آہٹ محسوس کرتے ہی رملی کے جسم میں نئی توانائی آ گئی . . . . رضائی کو اچھی طرح اپنے گرد لپیٹا ——— باہر لاؤنج میں کسی کے چلنے کی آواز آئی تھی۔ شاید پھپھو باجی چل پھر رہی تھیں لاڈلی کی ایک چیخ بھی سنائی دی تھی۔ یہ سب سن کر رملی کے تھکے ہوئے اعصاب کو بڑی تسکین ملی۔ رضائی کے اندر منہ کر لیا۔ سانس کی گرمی کا نشہ چڑھا تو وہ بے سدھ ہو کر سو گئی۔

نیند کھلی تو دن کے دس بج رہے تھے اور پھپھو باجی بری طرح دروازہ پیٹ رہی تھیں اور ساتھ میں چلا چلا کر اسے بھی پکار رہی تھیں۔ رملی ہڑبڑا کر اٹھی۔ رضائی کو دور پھینکا اور گرتی پڑتی نے اٹھ کر دروازے کی کنڈی کھولی اور پھر واپس آ کر دھم سے بستر پر گر گئی۔

"ہائے رمو ——— یہ تو نے کیا کیا ——— ؟"

پھپھو باجی اندر بڑھتی چلی آئیں۔

"کیا ——— ؟" رملی نے ڈر کر ان کی طرف دیکھا۔

"اندر سے دروازہ بند کرلیا ——؟"
رملی سنبھل گئی۔
"تو کیا ہوا ——؟"
"اس سے پہلے دو دفعہ آکے تجھے جگا چکی ہوں۔ پہلے تو تو کبھی دروازہ بند کرکے نہیں سوتی تھی۔ جب کئی بار دروازہ پیٹنے پر بھی تو نے نہیں کھولا تو میں ڈر گئی کہ کہیں تو نے خودکشی نہ کرلی ہو ——"
"خودکشی —— ...... شاید اسکی نوبت آتی پھوپھو باجی ——!"
پھر وہ انگڑائی لیکر بیدار ہوگئی اور اپنے آپ کو سنبھال کے بولی ——
"کل رات میں سوتے سوتے ڈر گئی تھی۔ اس لیے اٹھ کر دروازہ بند کرلیا۔"
"اگر ڈر گئی تھی۔ تو میرے کمرے میں آجاتی ——"
"میں نے آپ کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہ جانا۔ بمشکل تو آپ سوئی تھیں۔"
"کل رات پتہ ہے میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ آدھے سر میں مسلسل درد ہو رہا تھا۔"
پھوپھو باجی بولیں —— "کل رات شان نے میرے سر میں خوب مالش کی... پھر گرم دودھ کے ساتھ مجھے دو گولیاں کھلا دیں۔ اس کے بعد میں ایسے سکون سے سوئی کہ بچیوں کے رونے پر بھی نہیں جاگی۔ صبح اٹھ کر شان سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ انہوں نے دانستہ مجھے نیند کی گولی دی تھی۔ تاکہ میں ایک رات آرام کرلوں۔ اور خود رات کو اٹھ اٹھ کر بچیوں کو دیکھتے رہے ہیں۔"
پھوپھو باجی محبت سے مسکرائیں۔ "دیکھ نہیں رہی ہو۔ آج میں کتنی تازہ دم لگ رہی ہوں۔ ساری رات گھوڑے بیچ کر سوئی ہوں۔"
رملی کے دل میں درد سا اٹھنے لگا۔
ابھی پھوپھو باجی کو کچھ معلوم نہیں کہ اس خبیث نے کیوں انہیں نیند کی گولی کھلائی ——؟
اور اس کے جی میں کیا تھا ——؟
افوہ! یہ بیویاں اسقدر بھولی کیوں ہوتی ہیں؟
رنج اور غم سے پھر رملی کے اعصاب میں تناؤ پیدا ہونے لگا اور اس ڈر سے کہ صبح صبح کوئی بات غلط طریقے سے نہ نکل جائے۔ وہ ایک دم کھڑی ہوگئی اور کہنے لگی۔
"پھوپھو باجی آپ ناشتہ رکھوائیں۔ میں غسل خانے میں جارہی ہوں۔"
غسل خانے جاکر پھر اسے شان بھائی کی رات والی باتیں یاد آنے لگیں۔ وہ پھر غصے سے کھولنے لگی۔...... پھر ہاتھ پاؤں میں تشنج سا ہونے لگا۔ پھر جسم لرزنے لگا۔ اسی وقت اسے

محسوس ہوا۔ اس کے پیٹ کے اندر جنبش تیز ہونے لگی ہے ——

اف میرے خدا ——؟

یہ تعلق ہوتا ہے ماں بچے کا ——

اتنی مضبوط ڈور ہے مامتا کی ——

ذرا احساسات تپش کی زد میں آتے ہیں ...... اندر ہلچل ہونے لگتی ہے ......

منہ ہاتھ دھو کر باہر آگئی ——

تھوڑی دیر کے لیے پلنگ پر بیٹھ کر لمبے لمبے سانس لینے لگی ..... جیسے اپنے بچے کو تھپک رہی ہو پھر اٹھ کر کنگھی سے بال سنوارے۔ کندھوں پر شال ڈالی —— اور کھانے والے کمرے میں آگئی۔ جمعدارنی لاؤنج میں جھاڑو لگا رہی تھی اور گرم گرم چائے آگے رکھے کچھو باجی اس کا انتظار کر رہی تھیں۔

رملی بھی آکر ان کے سامنے بیٹھ گئی۔

اور سوچنے لگی۔ بات کس طرح شروع کیجائے؟

وہ جانتی تھی یہ بات سن کر کچھو باجی کو ذہنی صدمہ پہنچے گا۔ وہ نہ صرف اپنے شوہر سے محبت کرتی تھیں بلکہ ان پر حد درجہ اعتماد بھی کرتی تھیں اسی لیے تو انہیں یوں شتر بے مہار چھوڑ رکھا تھا۔ اور ممکن ہے یہ بات کھلنے کے بعد کچھو باجی شان بھائی پر کبھی اعتماد نہ کرسکیں۔ لڑائیوں کا ایک راستہ کھل جائے۔ عین ممکن ہے۔ بات اتنی بڑھے کہ ان میں ناچاقی ہو جائے کچھو باجی ہمیشہ کے لیے ان کو چھوڑ جائیں۔ اس طرح ایک بھرا گھرا برباد ہو جائے گا۔

ایک طرف ان کی بہن تھی جس پر شان بھائی نے بری نظر ڈالی تھی۔

دوسری طرف شوہر تھا۔

رملی ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو گئی۔

بتائے یا نہیں ——

"کیا بات ہے ——؟" کچھو باجی نے رملی کی دلی کشمکش کو اس کے چہرے سے پڑھ کر پوچھا۔ "اسوقت تم تذبذب میں لگ رہی ہو۔"

رملی نے آئی بات منہ پر روک لی اور جلدی سے کہا۔

"کچھ بھی نہیں —— رات مجھے ٹھیک طرح سے نیند نہیں آئی۔ طبیعت اب بھی گری گری محسوس ہو رہی ہے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا ——؟" کچھو باجی نے تردد سے پوچھا۔

"جسم میں عجیب سی لہریں اٹھ رہی ہیں۔"

"ابھی ساتواں شروع ہوا ہے نا؟"

پھپھو باجی فکرمندی سے بولیں۔

"بھئی کچھ نہیں ہو سکتا۔ خدا کے لیئے مجھے ڈرانے والی باتیں نہ کرو۔ ابھی میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے چلتی ہوں۔"

رملی ہنسنے لگی۔

"وہ بات نہیں پھپھو باجی۔"

"تو کیا بات ہے؟"

رملی نے چائے کا گھونٹ بھرا۔ اِدھر اُدھر دیکھا کہ جمعدارنی اس وقت کہاں ہے؟ اور نوکر تو نہیں سن رہا ــــــ

پھپھو باجی نے ٹوسٹر میں سے ٹکڑے نکال کر اس کے آگے سرکائے اور اس کی طرف دیکھے بغیر بولیں۔

"پہلے بچے کا تجربہ بھی عجیب ہوتا ہے۔ مجھے بھی طرح طرح کے وہم ہوتے رہتے تھے۔ ذرا بچے کی MOVEMENT زیادہ ہوتی۔ میں بھاگی بھاگی ڈاکٹر کے پاس جاتی۔ کمر میں درد ہوتا تو رونا شروع کر دیتی...... تم فکر نہ کرو...... ایسی کیفیات سے عورتیں گذرتی رہتی ہیں۔"

رملی سر جھکا کر ٹوسٹ پر مکھن لگانے لگی۔

وہ بھلا بات کس طرح شروع کرے ــــــ؟

اور اگر اس بات کو پی جائے تو عین ممکن ہے۔ شان بھائی دوبارہ اسے تنگ کرنے کی کوشش کریں۔

یہ سوچکر اسے جھرجھری آگئی۔......

اور اگر پھپھو باجی کو سب پتہ چل گیا اور انہوں نے بازپرس شروع کر دی تو ــــــ

اور اس کے جواب میں شان بھائی صاف مکر گئے تو ــــــ

آخر رملی کے پاس کیا ثبوت ہے اس بات کا ــــــ؟

جو آدمی اتنا گر سکتا ہے وہ مکر بھی تو کر سکتا ہے۔

اس خیال سے رملی لرز گئی......... پھر اس کی اپنی وقعت کیا رہ جائیگی......

ٹوسٹ پر جام لگاتے ہوئے وہ ایک کڑی منزل سے گزر رہی تھی۔

اتنے میں باہر گھنٹی بجی۔ تو ملازم نے آکر کہا۔

"جی دھوبی آیا ہے ——"

"اسے بٹھاؤ ————" پھپھو باجی نے چائے کا آخری گھونٹ پیا اور کھڑی ہو گئیں۔ بولیں۔

"رمو! تم ناشتہ کرو میں ذرا دھوبی کو کپڑے دے آؤں ——"

رملی ناشتہ کرنے کے دوران برابر سوچتی رہی۔

مگر کسی فیصلے پر نہیں پہنچ رہی تھی۔

کبھی سوچتی —— ممکن ہے شان بھائی نے محض مذاق کیا ہو۔ کیونکہ وہ مذاق میں بڑی بڑی باتیں کہہ جانے کے عادی تھے..... ممکن ہے وہ شام کو آکر خود ہی معذرت کر لیں...... بات کھول دیں...... کہہ دیں کہ انہوں نے تو جان بوجھ کر شرارت کی تھی۔ وغیرہ وغیرہ.........

یہ سوچ کر اسے قدرے اطمینان ہوا۔ اس نے سوچا —— بہتر ہے وہ شام تک انتظار کر لے جلدی میں اس گھر کے سکون کو برباد نہ کرے.......

پھپھو باجی کس لگن سے اپنے گھر کے معمولات میں مگن ہیں۔ گھر میں ڈوب جانا ہی عورت کے اطمینان کی علامت ہے۔ یہ ننھے ننھے کام —— ہر روز کے کھیڑے —— صبح و شام کی سردردی ——

اگر دل مطمئن ہو تو عورت ان میں لگی رہتی ہے...... اور زندگی تمام کر دیتی ہے —— لیکن گھر میں بے سکونی کی ہوا چلنے لگے...... تو معمولات کے سارے ورق اڑ جاتے ہیں۔ اور پھر گھر میں انتشار ہی انتشار نظر آنے لگتا ہے۔



رات کے کھانے پر کچھو باجی بہت دیر تک شان بھائی کا انتظار کرتی رہیں۔ عام طور پر شان بھائی شام کے چھ بجے کلب سے ٹینس کھیل کر واپس آجایا کرتے تھے۔ یا زیادہ سے زیادہ آٹھ بجے تک باہر رہتے تھے، مگر آج تو ساڑھے دس بج گئے تھے۔ اب کچھو باجی نے سب کو کھانا کھلا دیا تھا اور ان کا کھانا ہاٹ کیس میں رکھ دیا تھا۔ اندر ہی اندر کچھو باجی مضطرب سی تھیں۔

مگر رملی دیکھ رہی تھی کہ بظاہر کچھو باجی مطمئن نظر آنے کی کوشش کر رہی تھیں اور ہر کام معمول کے مطابق کر رہی تھیں۔

رملی سلائیاں بنتے بنتے نگاہ اٹھا کر ان کا مطمئن چہرہ مگر ماتھے پر تردد کی تین سلوٹیں دیکھ لیتی۔ خود بھی دل میں پریشان تھی۔ وہ تو سوچ رہی تھی۔ آج شام شان بھائی شرمندہ شرمندہ اور چپ چپ لوٹیں گے۔ کسی سے نظر نہیں ملائیں گے۔ موقع کے انتظار میں رہیں گے۔ جونہی وہ تنہا ہوگی۔ گڑگڑا کر معافی مانگیں گے اور وہ بھی اس وعدے پر معاف کر دے گی کہ آئندہ وہ کسی دوسری عورت پر بری نگاہ نہیں ڈالیں گے اور نہ اس کی معصوم اور حساس بہن کے ساتھ بد دیانتی کریں گے۔ وغیرہ وغیرہ......... مگر وہ تو آ نہیں چکتے تھے ——

رملی کو ویسے بھی آج اپنے کمرے میں سونے سے ڈر لگ رہا تھا۔ جس طرح چور آ کے چلا جائے تو کئی دن تک گھر پر اس کی دہشت طاری رہتی ہے۔ اسی طرح تنہا سونے کے خیال سے جھرجھری آجاتی......... عورت کتنا کچا آبگینہ ہے۔ وہ دل میں سوچتی —— کسی صورت، کسی حالت اور کسی عمر میں اسے قرار نہیں......

رات ہوتے ہی کچھو باجی نے اسے خود ہی کہہ دیا تھا کہ

"اگر بچوں کی چوں چوں میں تجھے نیند آ جائے تو بے شک میرے کمرے میں چلی آؤ۔ شان والا پلنگ تو خالی پڑا رہتا ہے ——"

زیادہ دیر تک رملی کچھو باجی کے ساتھ شان بھائی کا انتظار نہ کر سکی۔ اس لیے اٹھ کے ان کے کمرے میں چلی گئی۔ اور اطمینان سے سو گئی ——

آدھی رات کے وقت کچھ شور اور ہنگامہ سن کر اسکی آنکھ کھل گئی۔ دل اس کا بدگمان سا ہو گیا۔ اٹھتے ہی نظر کچھو باجی کے پلنگ پر گئی۔

وہ اپنے بستر پر نہ تھی۔ ذرا کان شور کی طرف لگائے تو پتہ چلا کہ آوازیں تو باہر سے آ رہی تھیں۔ بلکہ ساتھ والے کمرے سے آ رہی تھیں۔ اس کا مطلب ہے یہ سب تلخ و ترش کچھو باجی اور شان بھائی میں ہو رہی تھی۔ تب اسے یاد آیا —— رات گیارہ بجے تک شان بھائی نہیں آئے تھے۔ جلدی سے اس نے رضائی میں سے ہاتھ نکال کر اپنی کلائی کی گھڑی کو دیکھا۔ اس وقت دو بج رہے تھے۔

اللہ شان بھائی اتنی دیر تک باہر کیا کرتے رہے ——؟

پھر اس نے ان آوازوں کو غور سے سننا شروع کر دیا۔ بھلا سنے تو میاں بیوی میں کس بات پر لڑائی ہو رہی ہے ——

حالانکہ اسے معلوم تھا کن سوئیاں لینا بری بات ہے۔

مگر کل رات کا واقعہ بھوت کی طرح اس کے ذہن پر منڈلا رہا تھا۔ پتہ نہیں شان بھائی کچھ الٹ سلٹ نہ بک دیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اسے زیادہ غور نہیں کرنا پڑا۔ رات کے سناٹے میں آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں اور کچھو باجی نے یہ غلطی کی کہ دروازہ کھلا چھوڑ گئی تھیں شاید اس خیال سے کہ بچیاں روئیں تو وہ دوڑی آئیں۔

"میرا گھر آنے کو دل نہیں چاہتا۔ سن لیا تم نے ——" شان بھائی نے غرا کر کہا۔

"کیا ہے اس گھر میں جو میں آؤں —— دو ڈھائی سال سے تمہاری منحوس صورت دیکھ کر تھک گیا ہوں۔"

شان —— شان —— کچھو باجی دکھ سے بولیں۔

"کبھی کبھی تمہیں کیا ہو جاتا ہے ——؟ کل تک تو تم بالکل ٹھیک تھے۔ رات تم اتنی محبت سے پیش آ رہے تھے۔ میرے سر میں مالش کر کے مجھے گولی کھلائی —— اور اب ذرا میں نے یہ پوچھ لیا کہ اتنی دیر کہاں رہے ——؟ تو تم . . . . . ."

"تم ہوتی کون ہو مجھ سے یہ پوچھنے والی ـــــ کہ میں اس وقت کہاں سے آرہا ہوں میرا جب دل چاہے گا اور جہاں دل چاہے گا۔ جاؤں گا ـــــ اور جب دل چاہے گا آؤں گا ـــــ یہ میرا گھر ہے۔ اگر تم نے حوالدار بن کر رہنا ہے۔ تو اپنے گھر چلی جاؤ۔"

"شان ـــــ" کچھو باجی کی آواز میں دکھ ہی دکھ تھے۔

"میں تمہاری بیوی ہوں۔ میرے ساتھ اس طرح نہ بولو۔ میں نے کون سی بری بات کی ہے۔ ہر بیوی کو حق پہنچتا ہے وہ اپنے شوہر سے دیر سے آنے کا سبب دریافت کرے۔ اگر تم جاتے وقت مجھے بتا جاتے تو میں کبھی نہ پوچھتی .... دس بجے تک تمہارے انتظار میں ہم نے کھانا نہیں کھایا۔ اگر دیر سے آنا تھا تو کم از کم فون ہی کر دیتے ـــــ رملی کیا کہے گی کہ ـــــ"

"مجھے کسی کی پروا نہیں ہے۔" شان بھائی جھپٹ کر بولے۔

"میں تمہارے بہن بھائیوں کو جوتے کی نوک پر جانتا ہوں۔ اگر وہ یہاں ہمارے معمولات میں دخل دینے آئی ہے تو اسے کہو یہاں سے دفعان ہو جائے۔ میری زندگی اجیرن کرنے کو ایک ہی بہن کافی ہے۔"

رملی کو یوں لگا جیسے اس کے کلیجے میں کسی نے گھونسا مارا ہو۔

"اس بچاری نے تو کچھ بھی نہیں کہا۔" کچھو باجی کی آواز آپ ہی آپ آہستہ ہو گئی۔ "اس غریب کو کیوں بیچ میں گھسیٹ رہے ہو۔ اور کون کسی کے گھر ساری عمر رہنے کو آتا ہے۔"

"میں نے تم سے پہلے بھی کئی بار کہا ہے کہ اپنے رشتے داروں کو یہاں مت بلایا کرو میں ان کا غلام نہیں کہ ان کی مرضی کے مطابق اپنے دن رات گذاروں تمہیں جو گوارا کر رہا ہوں یہی بہت احسان ہے ان پر ـــــ"

(یہ ہیں شان بھائی ـــــ! رملی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کی خوشامد کرتے نہ تھکتے تھے۔ اور کیسے کیسے اسے شیشے میں نہیں اتارا)

(اف شوہر کا اتنا گھناؤنا روپ ہوتا ہے۔ میرے اللہ)

"آہستہ بولو شان ـــــ کچھو باجی نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا۔ رملی میرے کمرے میں سو رہی ہے۔ کہیں سب سن نہ لے۔"

"میں اس سے ڈرتا نہیں ہوں اور اگر تم نے زیادہ سوال وجواب کیے تو ابھی دونوں بہنوں کو چٹیا سے پکڑ کر باہر کھڑا کر دوں گا۔ ذلیل عورت ـــــ مکروہ صورت ـــــ ایسے مجھے چپک گئی ہے جیسے چاند کو گرہن لگا ہو۔ مجھے بھی لوگوں نے بدصورتی میں اسیر

کر دیا۔ تمہاری صورت دیکھ کر قے آتی ہے ...... چپ چاپ پڑی رہو۔ یہی بہتر ہے تمہارے لیے۔ اور کیا دوں تمہیں میں ــــ دو بیٹیاں دے دی ہیں۔ یہ احسان سمجھو میری طرف سے ــــ زیادہ جرح کروگی تو صاف بتا دونگا کہ تمہاری صورت بری لگتی ہے۔ اس لیے گھر آنے کو دل نہیں چاہتا ــــ اگر مجھے گھر میں رکھنا ہے تو اپنی صورت بدل کے آؤ ــــ"

"تقدیر نہیں بدل سکتی تو صورت کیسے بدل سکتی ہے شان ــــ"

یہ کہہ کر کچھو باجی رونے لگیں۔ ان آنسوؤں کی نمی رملیٰ نے اپنے کلیجے پر محسوس کی۔ ایسے لگا جیسے ایک برچھی سی اس کا دل چیر کے گذر گئی۔ کچھو باجی ہرگز بدصورت کہلائے جانے کی مستحق نہ تھیں۔ ان کی کالی کالی لمبی لمبی اور گہری گہری آنکھیں تھیں گھنی پلکوں کی باڑھ نے ان آنکھوں کو مزید پرکشش بنا دیا تھا۔ چھوٹی سی باریک سی ناک تھی جس میں ہیرے کی کیل رہتی :

بال بھی سیاہ کالے اور گھنے لمبے تھے۔

ہاں صرف ان کا رنگ سانولا تھا۔

مگر اب تو کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ پلکوں کا گھنیرا پن نہ آنکھوں میں جگنوؤں جیسی چمک ــــ نہ لمبے بال گھٹاؤں سے ــــ

تو اس طرح جل جل اور رو رو کر کچھو باجی نے دو سالوں میں اپنا آپ تباہ کر لیا تھا۔ ایک طرف بچے پیدا کرنا۔ دوسری طرف شوہر کے کچوکے سہنا ــــ ان حالات میں تو حسین سے حسین عورت بھی ختم ہو جاتی۔

اور یہ شان بھائی کا دوسرا رخ ہے۔

شادی سے پہلے وہ اسکی نظر میں ایک آئیڈیل شوہر تھے۔ مہذب ..... معطر ...... شائستہ ..... اور طرحدار ــــ بس آنکھوں میں اپنا دل لیے پھرتے تھے۔ جس کیطرف مست نظروں سے دیکھ لیتے وہ دل تھام کر وہیں بیٹھ جاتی۔

اور کچھو باجی کیطرف دیکھو ــــ کبھی بھی تو ان کے ماتھے کی شکن سے ان کا دلی کرب آشکار نہیں ہوا۔ ٹھوکریں کھا رہی ہیں اور سیج سجا رہی ہیں۔

ایک تم بھی ہو رملیٰ ــــ ؟

لعنت ہے تمہاری سوچ پر ــــ رملیٰ اندر سے لرز گئی۔

اسی وقت لاڈلی نے چیخ مار کر کروٹ بدلنا چاہی تو کچھو باجی کے دوڑنے کی آواز آئی ...... رملیٰ لاڈلی کو چمکارنے کی بجائے جلدی سے رضائی میں گھس گئی۔ مبادا کچھو باجی کو پتہ

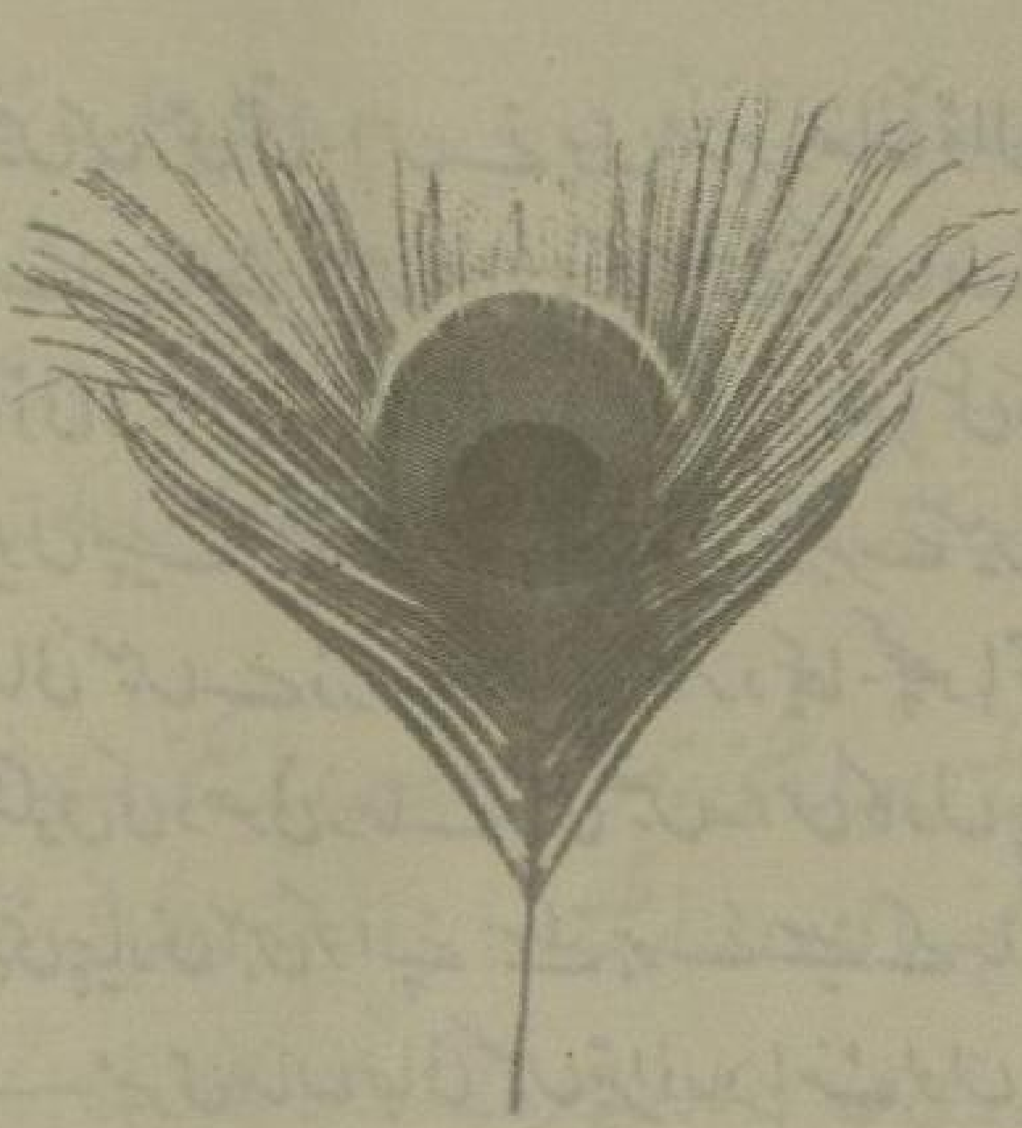
چل جائے کہ وہ اس کی باتیں سن رہی تھی۔ اس نے یوں منہ پر رضائی ڈال لی جیسے گہری نیند سو رہی ہے۔ کچھو باجی جب اپنے بستر پر بیٹھیں تو ان کے سسکنے کی صاف آواز آ رہی تھی۔ انہوں نے آنسو بہاتے ہوئے لاڈلی کا نیپکن بدلا۔ اسے دودھ پلایا اور پھر اسکی کھاٹ میں لٹا دیا۔ پھر اس کے بعد رضائی اپنے گرد یوں لپیٹ کر بیٹھ گئی۔ جیسے فقیر اپنے حجرے میں بیٹھ کر آنسوؤں کی تسبیح گھماتا ہے۔ رملی نے رضائی میں سے ذرا سا سوراخ بنا کر دیکھا۔ کچھو باجی .... تن مارے ہارے سادھو کی طرح اشکوں کی دھونی رمائے بیٹھی تھیں۔ اس کا دل چاہا وہ رضائی پرے پھینک دے اٹھ کر بیٹھ جائے۔ اپنی پیاری بہن کو اپنے سلگتے ہوئے سینے کے ساتھ لگا لے اور کہے ——

"آ —— میری ماں جائی میں تیرا درد بانٹ لوں ...... آ ..... میں تیرے سارے آنسو پی لوں .... آ میں تجھے اس سنگدل بے مروّت اور کمینے انسان سے دور لے جاؤں ....

آ میری بہن آ ——

تیرا میرا درد مشترک ہے۔ سلگنے کا انداز جداگانہ ہے۔

مگر رضائی کے اندر منہ کر کے وہ بھی لگاتار آنسو بہانے لگی۔ پتہ نہیں ایسے میں شرکتِ غم کچھو باجی کی غیرت کو گوارا ہو یا نہ ہو ——"



صبح دونوں بہنیں ایک دوسرے سے آنکھ نہیں ملا رہی تھیں۔ کچھو باجی بچّوں کے کپڑوں کا ڈھیر لگا کے دھونے بیٹھ گئیں۔ تو رملی دونوں بچیّوں کو لیکر دھوپ میں جا بیٹھی ——

رات تک انہوں نے صرف سرسری سی گفتگو ایک دوسرے کے ساتھ کی ——

لیکن اپنے اپنے طور پر دونوں نے اپنے آپ کو مصروف رکھنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کر لیا تھا۔

بلکہ صبح رملی بہت خوفزدہ تھی۔

جب تک شان بھائی کی باتیں نہیں سنی تھیں اور طرح کا خوف تھا۔ اب ان کی گفتگو کا انداز جان کر اس کی جان نکلی جا رہی تھی۔ ایسے گھٹیا آدمی سے ہر گری ہوئی حرکت کی توقع کی جا سکتی ہے۔

بالفرض وہ کچھو باجی کو بتائے اور استفسار پر شان بھائی بالکل مکر جائیں۔ بلکہ آپے سے باہر ہو جائیں۔ بقول ان کے دونوں بہنوں کو چٹیا سے پکڑ کر نکال باہر کریں ——

تو ——

تو لوگ کیا کہیں گے؟ زمانہ اس پر کیا الزام دھرے گا —— یہی نا؟ کہ چند دنوں کے لیے بہن کے گھر گئی تھی —— اپنی بہن کا ہرا بھرا گھر برباد کر کے آ گئی . . . . . .

بے جی کیا سوچیں گی ——؟

معاذ کے کیا تاثرات ہوں گے؟ ——

ممکن ہے معاذ یہ بھی سوچ لے کہ میرے عرصۂ دراز سے شان سے مراسم ہوں گے۔

تبھی تو اسے اب دست درازی کی جرأت ہوئی ——— ؟

امی اباجی کو کیا جواب دوں گی ——— ؟

کتنے لوگوں کو سمجھانا پڑے گا ——— بار بار رونا پڑے گا۔ قسمیں کھانا پڑیں گی سارے رشتوں میں بال آجائے گا۔

اور پھر پتہ نہیں میری بیگناہی کا کسی کو یقین آئیگا یا نہیں ——— لوگوں کو اس بات کا یقین کیسے دلایا جائیگا کہ میرا دامن بے داغ ہے ———

میں چھینٹوں سے محفوظ رہی ہوں ——— ؟

اور ... اور ..... شان بھائی دشمنی میں آکر جانے اور کیا کیا کہہ دیں —؟

بیٹھے بیٹھے رملی سر سے پاؤں تک لرز جاتی۔ اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو جاتے۔ اسکا دل چاہتا وہ یہاں سے بھاگ جائے۔ مگر کچھ بھی تو اس کے اختیار میں نہ تھا۔ ابھی تک تو اس کا شان بھائی سے سامنا نہیں ہوا تھا اور نہ اس کا شان بھائی کے سامنے جانے کا ارادہ تھا لیکن سامنا ہو گیا تو پھر کیا ہو گا ——— ؟

ادھر جب پھپھو باجی کی ازدواجی زندگی کیطرف دیکھتی تو دل ٹھہرنے لگتا ——— وہ اوپر سے کتنی مطمئن نظر آرہی تھی۔ پتہ نہیں کتنے سخت مرحلوں سے گذری ہوں گی۔ پتہ نہیں اور کتنے کٹھن مقام ان کی زندگی میں آئیں گے ——— ؟

ہائے اللہ کیا ہر عورت اتنی مجبور ہوتی ہے ؟

اگلے دو تین دن بڑی کشمکش میں گذرے ———

شان بھائی سے سرسری سا سامنا ہوتا رہا ——— وہ یوں نکل جاتے جیسے جلدی میں ہوں۔ اور وہ یوں ظاہر کرتی جیسے اس نے دیکھا نہیں ....

شاید یہی بندوبست ٹھیک تھا۔

پھر پھپھو باجی نے بتایا کہ جمعہ کو وہ لوگ لاہور جا رہے ہیں۔ تو جیسے اس کے دل کی کلی کھل اٹھی۔

دو دن پھپھو باجی بچوں کے کپڑے اور چیزیں سمیٹتی رہیں۔ اور وہ ہنس ہنس کر ان کی مدد کرتی رہی۔

سب سے عجیب بات اسے یہ لگ رہی تھی کہ پھپھو باجی ہمیشہ کی طرح ہنس ہنس کر شان بھائی کے آگے پیچھے پھر رہی تھیں۔ جیسے کبھی کانٹے ان کی راہ میں نہیں آئے تھے۔ وہ ہمیشہ سے پھولوں اور پتیوں پر چل رہی ہیں ———

وہ آجاتے تو کھل اٹھتیں۔ کھانا، چائے ـــــ لوازمات ـــــ لے لے کے ان کے کمرے میں جاتیں۔ وہ جانے لگتے تو پوچھ پوچھ کر خدا حافظ کہتیں ـــــ

کیا پھپھو باجی حوصلے کا سمندر ہیں ؟ ـــــ

یا پھپھو باجی بے غیرت ہیں ـــــ ؟

رملی کا دماغ پھٹتا جا رہا تھا۔ یہ سب دیکھ دیکھ کر ـــــ

بارے جمعہ کا دن آیا اور وہ وہاں سے ریل کار میں سوار ہو گئیں۔

بچوں کے ساتھ سفر کرنے کا رملی کا پہلا تجربہ تھا۔ کوئی اور دن ہوتا تو وہ پھپھو باجی کو صاف جواب دے دیتی کہ وہ ان کی بچیوں کو ہرگز نہ سنبھالے گی۔

مگر پھپھو باجی کی اندرونی حالت کو جان کر وہ ہر ہر کام میں ان کا ہاتھ بٹاتی رہی..... بچیوں کو سنبھالتی رہی۔ بالآخر پھپھو باجی نے کہہ ہی دیا ـــــ

"رمو تو ساتھ نہ ہوتی تو میں اکیلی مر کھپ جاتی۔ اسی لیے تو تجھے روک رہی تھی۔"

"اور واپسی پہ آپ کیا کریں گی پھپھو باجی ـــــ ؟"

"واپسی پہ شان لینے آجائیں گے۔"

پھپھو باجی نے یوں لاپروائی سے کہا جیسے شان بھائی ان کے اشارے کے غلام ہوں رملی جانتی تھی شان بھائی سفر میں کیا کریں گے۔ جو اپنی بیوی کے کمرے میں سونا پسند نہیں کرتے وہ سفر میں اسے کیا آرام پہنچائیں گے ـــــ ؟

اسٹیشن پر امی جان نے ڈرائیور بھیج دیا تھا۔ اس لیے وہ دونوں پہلے میکے چلی گئیں۔ سارا پروگرام رملی نے فون پر معاذ کو بتا دیا تھا۔ اس لیے رات کے دس بجے معاذ وہیں پر لینے آگیا۔ آیا تو امی جان نے زبردستی اسے کھانے پر بٹھا لیا۔ کچھ دیر گپ شپ ہوتی رہی۔ پھر معاذ اسے گھر لے آئے ـــــ

بے جی اس کے انتظار میں جاگ رہی تھیں۔ اٹھ کر اس کی بلائیں لیں۔ کھانے پینے کو پوچھا ـــــ اور پھر بولیں۔

"کمرے میں چل کر آرام کرو۔ میں وہیں آرہی ہوں۔"

رملی اپنے کمرے میں آگئی۔

مگر وسط میں ہی کھڑی رہ گئی۔ کمرے کی ترتیب بالکل بدلی ہوئی تھی۔ اب پلنگ دوسری دیوار کے ساتھ لگا تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل کھڑکی کے پاس آگئی تھی۔ صوفوں کا رخ دروازے کی طرف ہو گیا تھا۔ گلاب کے ادھ کھلے پھول سائیڈ ٹیبل کے گلدان میں پڑے تھے۔

ڈریسنگ ٹیبل کی ہر چیز چمک رہی تھی ـــــــ

کمرے میں ایک زندگی تھی ـــــــ ایک اطمینان تھا۔ جس کی چھاپ ہر شے پر لگی تھی۔ رملی کھڑی اک اک شے کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اگر عورت اپنے گھر واپس آئے اور اسے ہر شے صاف ستھری۔ مسکراتی گاتی ملے تو جی کتنا نہال ہوتا ہے ـــــــ؟

اس کا سامان اٹھا کر معاذ اندر آ گیا۔ اور بولا۔

"کمرے کی ترتیب میں نے بدل دی ہے؟"

"کیوں ....." وہ آہستہ سے بولی۔

موسم بدلنے والا ہے نا؛ اب بستر اس رخ پر ٹھیک رہے گا۔ اور پھر وہ شوخی سے مسکرایا۔ ایک اور بستر کے لیے جگہ کی ضرورت ہوگی؟ .....

رملی نے چونک کر معاذ کیطرف دیکھا ـــــــ

تاریک رات میں کوئی ستارہ نہ جل رہا تھا۔

اپنا پیٹ پکڑ کر گھسٹتی ہوئی آئی اور پلنگ پر بیٹھ گئی۔

معاذ باقی ماندہ سامان لینے پھر باہر نکل گیا۔

رملی گم صم سی بیٹھی اِک اِک شے کو تک رہی تھی۔ یہاں ہر بے جان چیز میں حسن تھا ـــــ سوائے معاذ کے چہرے کے ـــــ

بے جی تسبیح گھماتی اندر آگئیں ......"

"کیسی طبیعت ہے دوہٹی تمہاری ـــــ؟"

"جی ـــــ بس میں بالکل ٹھیک ہوں۔" رملی نے مسکرانے کی کوشش کی۔

مجھے تو تو بہت کمزور لگ رہی ہے۔ چہرہ اترا ہوا ہے۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئی ہیں۔ وہاں ڈاکٹر کو دکھاتی رہی ہے۔

"جی ـــــ دکھایا تھا ایک بار ـــــ مگر آج تو ذرا سفر کی تکان ہے۔"

پاؤں اوپر کر لو۔ انہوں نے اسطرح کہا کہ رملی نے جوتا اتار کر جھٹ پاؤں اوپر کر لیے۔

"دکھانا ـــــ" بے جی اس کا پائنچہ ہٹا کر بولیں "تمہارے پاؤں پہ سوجن بہت ہے۔ کیا وجہ ہے دوہٹی ـــــ؟"

"کچھ نہیں بے جی ـــــ" رملی دونوں پاؤں پلنگ پر رکھ کر گھٹنے جوڑ کر بیٹھ گئی۔

"ٹرین میں پاؤں لٹکا کے بیٹھی رہی ہوں نا؛ تو اس لیے سوج گئے ہیں ـــــ"

بے جی نے اپنا ہاتھ نکال کے دونوں پاؤں کے اوپر والے حصوں کو ملا ـــــ

"یہ کیا کر رہی ہیں بے جی آپ ——— ؟"

"دیکھ رہی ہوں سوجن کیوں ہے ——— ؟"

"کبھی کبھی پاؤں لٹکانے سے ہو جاتی ہے - آپ ہی آپ ٹھیک ہو جائیگی۔ آپ اس طرح ہاتھ نہ لگائیں۔"

"خیر ہے۔ تو میری بیٹی ہے"۔

بے جی نے اسکا چہرہ غور سے دیکھا اور کچھ سوچتے ہوئے بولیں.....

صبح اپنی ڈاکٹر کو ضرور دکھا لینا - ویسے اسوقت تو بہت تھکی ہوئی لگ رہی ہے۔ میرا خیال ہے اب آرام کرو ———"

یہ کہہ کر بے جی کھڑی ہو گئیں۔

معاذ رملیٰ کا باقی ماندہ سامان لے آیا اور اسے قرینے سے ایک طرف رکھ دیا بے جی باہر نکل گئیں تو آ کر ان کی جگہ پر بیٹھ گیا۔ اس نے غور سے رملیٰ کے اترے ہوئے چہرے اور تھکی تھکی آنکھوں کو دیکھا۔

تو رملیٰ نے اپنی ٹھوڑی اپنے گھٹنوں پر رکھ لی۔ معاذ اسے چہرے کی طرف سے دیکھتا ہوا قدموں تک آیا۔ پھر اپنے دونوں ہاتھ اس کے پاؤں پر رکھ کر بولا۔

"ایسے لگتا ہے تم بہت تھک گئی ہو رملیٰ ——— ؟"

رملیٰ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے کالے سیاہ ہاتھوں کا موازنہ اپنے گورے چاندی سے پاؤں کے ساتھ کرنے لگی ———

پاؤں پر رکھے ہوئے دو ہاتھ کسقدر برے لگ رہے تھے ———

اس کے اندر پھر ابال اٹھنے لگے۔

ٹرین میں سارا وقت وہ اپنے آپ کو لعنت ملامت کرتی آئی تھی۔ بار بار اپنا موازنہ چھوٹو باجی سے کرتی اور شرمندہ ہو جاتی ——— اور اپنے دل کو سمجھاتی ——— کہ اسے معاذ کے ساتھ اچھا سلوک کرنا چاہیئے۔

جو کچھ بھی ہے معاذ ایک شریف آدمی ہے۔ منکسر المزاج ہے ——— خدمت گذار ہے کیتنی مٹھاس ہے اس کی زبان میں ——— اک ذرا صورت ہی بری ہے نا؟ تو کیا اتنی خوبیوں کے آگے وہ صورت برداشت نہیں کر سکتی ——— ؟

اسے برداشت کرنی چاہیئے ———

ایک انسان میں دنیا بھر کی خوبیاں نہیں ہو سکتیں اور پھر صورت بنانے والا تو

اللہ ہے ـــــــــ

ہر طرح سے اس نے اپنے آپ کو سمجھا لیا تھا منا لیا تھا۔ اس کی مہربانیوں کو بار بار یاد کیا تھا اور دل میں تہیہ کیا تھا کہ اب اس کے ساتھ اپنا رویہ بدل لے گی ـــــــــ

مگر اس کی صورت دیکھتے ہی سارے ارادے اور سارے وعدے بھک سے اڑ گئے تھے۔ اندر وہی لال آندھیاں چلنی شروع ہو گئی تھیں ـــــــــ اور اب جو وہ اس والہانہ پن سے قریب آ کر بیٹھا تو رواں رواں احتجاج کرنے لگا ـــــــــ نس نس میں درد کی ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

سارا کڑوا پانی پپوٹوں کے آس پاس اکٹھا ہونے لگا۔

"واقعی تمہارے پاؤں سوج گئے ہیں ـــــــــ"

اس نے اپنے گرم ہاتھوں کا دباؤ پاؤں پر ڈالا ـــــــــ تو رملی کو یہ گرم دباؤ بہت اچھا لگا۔ واقعی وہ بہت تھک گئی تھی۔ اور جیسے اس کے پاؤں تھکاوٹ سے چیخ رہے تھے۔ معاذ نے محبت سے ہاتھ رکھے تو عجیب سا چین ملا ـــــــــ سارے جسم میں طمانیت کی لہر دوڑ گئی۔

رملی کا دل چاہا۔ وہ معاذ سے کہے۔ میرے پاؤں اپنی گود میں رکھ لو ـــــــــ اور اسی طرح لیے بیٹھے رہو جب تک کہ میں خوابوں کے دیس میں نہ اتر جاؤں ـــــــــ ایسے میں اندازہ ہوا کہ ہاتھوں کا لمس تھکے ہوئے اعصاب کو نئی زندگی دیتا ہے۔

آنکھوں پہ پٹی باندھ کے آنکھ مچولی نہ کھیلو ـــــــــ

اس کے دل نے کہا ـــــــــ

آنکھیں کھول کر چلو ـــــــــ آنکھیں کھول کر چلنے سے گرنے کا ڈر نہیں رہتا۔

رملی نے پوری آنکھیں کھول کر معاذ کو دیکھا۔ کوئی شے گلے میں اٹک گئی۔

"تم آرام کرو رملی" معاذ ایک دم کھڑا ہو گیا۔

"بہت ہی نڈھال لگ رہی ہو"۔

"لیٹ جاؤ ......"

"سو جاؤ ......"

رملی حیرت سے معاذ کا چہرہ دیکھنے لگی۔ اس کا چہرہ ایسا تھا کہ دلی جذبات ظاہر نہ کرتا تھا۔

معاذ نے پائنتی کی طرف رکھا ہوا کمبل اٹھایا۔

اور بڑے پیار سے بولا

"لیٹ جاؤ میں تمہارے اوپر کمبل ڈال دوں"۔

اسے حیرت سے تکتی ہوئی رملی اسی طرح لیٹی ہو گئی - چت لیٹ گئی۔
معاذ نے آہستہ سے کمبل اس کے اوپر اوڑھا دیا ....
ایک بتی بجھا دی ———
رملی کی بولتی نگاہوں کو پڑھ کر بولا۔
"آج مجھے دفتر کی کچھ ضروری فائلیں دیکھنا ہے - وہاں بیٹھ کے لیمپ جلا کے دیکھتا رہوں گا۔ تم لمبا سفر کر کے آئی ہو۔ آرام کرو۔"
رملی کو یقین نہیں آرہا تھا۔
آنکھیں پھاڑے اسے تک رہی تھی۔ ٹیلی فون پہ اپنی بے تابیوں کا اظہار کرنے والا۔ اسے اصرار کر کے بلانے والا ——— جنونی سا مرد اسے کہہ رہا تھا۔ تم آرام کرو۔
کتنا عجیب شوہر ہے۔ رملی نے دل میں سوچا ———
اس کے قریب آنے کے خیال سے رملی کا رواں رواں احتجاج کر رہا تھا اور اب جو اس نے احساس مندی کی نئی روش اختیار کی ——— تو یہ رملی کو پہلے سے بھی عجیب لگی۔ ..... پتہ نہیں یہ آدمی دلوں کا بھید جان لیتا ہے ——— یا ——— خموشی کی زبان پڑھ لیتا ہے۔ انسانیت کے درد سے مالا مال ہے ——— یا خبطی ہے۔

خیر.......
اس کے باغی خیالات کو تو پناہ مل گئی۔
معاذ ساتھ والے کمرے میں چلا گیا۔ اور رملی نے بہت آہستہ سے دائیں طرف کروٹ بدل لی۔
رملی کے بیڈ روم کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس کا دروازہ دونوں کمروں کو ملاتا تھا۔ یہ کمرہ معاذ نے اپنے دفتری امور کے لئے بنا رکھا تھا۔ اس میں درازوں والی ایک دفتری میز پڑی تھی۔ آرام دہ کرسیاں تھیں۔ فائلوں کے انبار تھے۔ اور معاذ کے پیشے سے منسلک ہر شے وہاں تھی۔
ہاں ایک بات اور تھی ——— کام کرنے کے دوران معاذ کو موسیقی سننے کی عادت تھی ——— جس دن وہ سنجیدگی کے ساتھ دفتری کام کرنا چاہتا ——— اس کے کمرے کے چاروں سپیکر دھیرے دھیرے موسیقی اگلنا شروع کر دیتے۔ ایسے جیسے اس کے اردگرد موسیقی کا دائرہ بنا رہے ہوں اور اس دائرے کے اندر وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر کام کیے جاتے۔ جب کافی عرصہ بعد سپیکر ایک دم خاموش ہو جاتے تو رملی کو اندازہ ہو جاتا کہ معاذ نے

کام ختم کر دیا ہے ۔ اور اب آ رہا ہے ۔

کتنے نفیس اور انوکھے شوق ہیں اس بدصورت آدمی کے ——— وہ دل میں سوچا کرتی ۔ شاید اپنے بہت سارے کامپلیکس دور کرنے کے لیئے اس نے انوکھے نرالے شوق پال رکھے ہیں ۔

آج بھی معاذ اسے شب بخیر کہہ کے اپنے اسی چھوٹے سے کمرے میں چلا گیا ——— اور پھر میوزک شروع ہو گیا ۔ دھیما دھیما ——— آہستہ آہستہ ——— رگِ جاں میں اترتا ہُوا ۔ جیسے در و دیوار گنگنا رہے ہوں ——— جھوم رہے ہوں ——— سرگوشیوں میں ہنس رہے ہوں ———

دھک دھک دھن دھن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دھک دھک دھن دھن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

رات کے خاموش لمحوں میں موسیقی کا دھیما دھیما شور بہت اچھا لگ رہا تھا ۔

بہت پراسرار لگ رہا تھا ———

خیال بج دھج کے آ رہے تھے ———

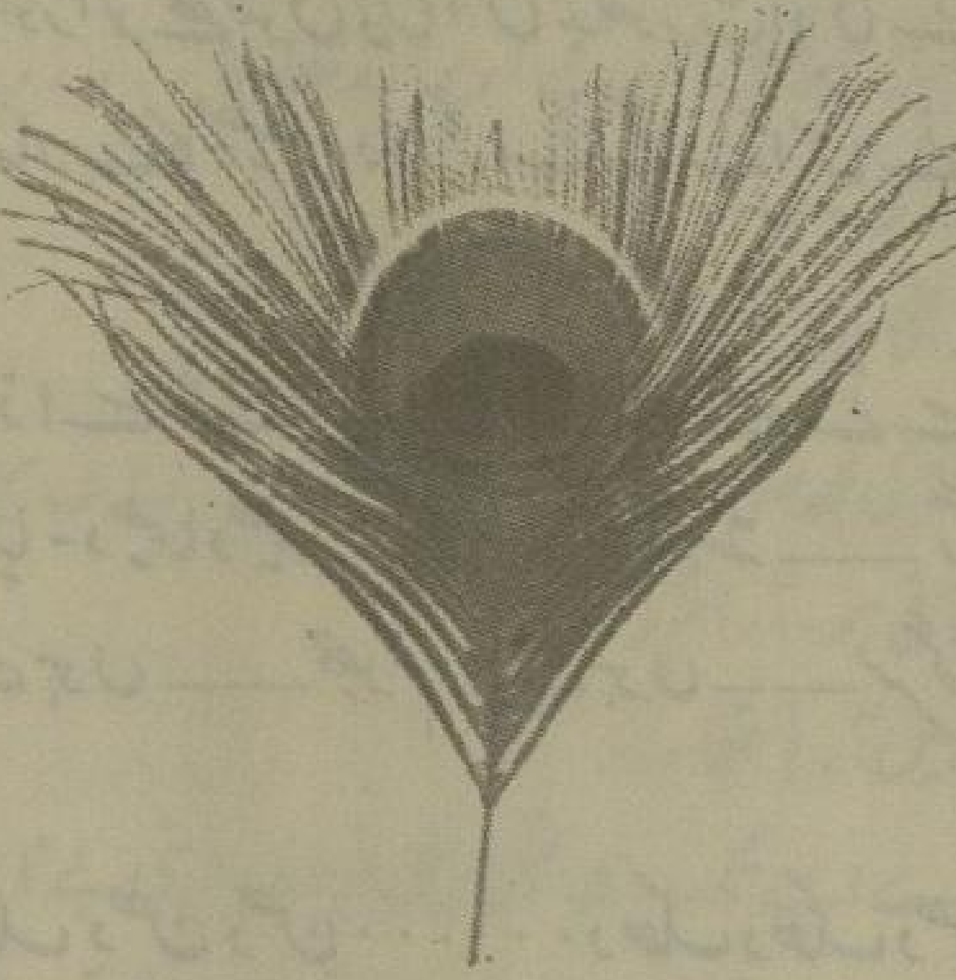
رملی نے اپنی ہتھیلی پر اپنا رخسار رکھا ۔

اور سوچا ۔ خوابوں کی کوئی حد بھی ہے ——— کہاں سے شروع ہوتے ہیں ۔ کہاں جا کے ختم ہوتے ہیں ———

اجازتوں کی گلیاں کہاں سے شروع ہوتی ہیں ———

ممنوع کی تختیاں کب لگ جاتی ہیں ؟

اور جس دیس کا کوئی نام نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دل اس دیس میں کیوں جا نکلتا ہے ۔ ۔



اس روز رملی صبح اٹھی .... تو طبیعت کی بے چینی اور گرانی ایک نئے موڑ پر دکھائی دی۔ جب تک معاذ دفتر نہیں چلا گیا وہ اٹھتی بیٹھتی کام کرتی رہی وہ جب چلا گیا تو آکر بستر پر لیٹ گئی ——

بستر پر لیٹی تو یوں لگا جیسے ادھر ادھر سب کانٹے بچھے ہوئے ہیں۔ جسم کے ادھڑنے کا احساس سا ہو رہا تھا۔ بیکلی کی سمجھ نہیں آ رہی تھی ——

اور سارا وجود بیگانہ بنا کھڑا تھا۔

تھوڑی دیر اسی طرح لیٹی رہی۔ اور روتی رہی ——

پھر اٹھ کر باہر آ گئی۔ بے جی حسب معمول دوپہر کے لیے سبزی بنا رہی تھیں اور ان کے پاس محلے کی ایک خوش پوش خاتون بیٹھی تھی۔ وہ سلام کر کے چارپائی پر بیٹھ گئی اور دیوار سے ٹیک لگا لی۔

"بے جی آپ خود ہی انصاف کریں نا؟ وہ عورت بولی۔ یہ کتنا بڑا ظلم ہے۔ میں دفتر میں بھی کام کروں۔ بچے بھی پالوں اور پھر آ کر گھر کا سارا کام کروں۔ کم از کم گھر کے کام میں تو شوہر کو ہاتھ بٹانا چاہیئے۔"

بے جی مسکرائیں۔

"یہ دفتر کا کام چھوڑ دو اور لڑائی جھگڑوں سے نجات حاصل کر لو۔"

"بے جی! آپ تو جانتی ہیں۔ گھر کے آدھے اخراجات میری تنخواہ سے پورے ہوتے ہیں۔ اور نوکری میں نے اپنے شوہر کی اجازت سے کی تھی۔"

"میں جانتی ہوں" بے جی بولیں۔

"غور کرو کہ دونوں تکلیفوں میں سے کون سی تکلیف کم ہے اور برداشت کی جا سکتی ہے اس طرح ایک بڑی تکلیف سے چھٹکارا حاصل کر لو۔"

"بے جی! آپ سوچیں میں نے کس محنت سے اپنی جگہ بنائی ہے۔ بار بار تو نوکری نہیں ملتی نا ——— ؟

"جھلی . . . . . ." بے جی نے سبزی کا ٹرے ایک طرف رکھ دیا۔

"دنیا کا دستور ہے کہ جو جتنا بوجھ اٹھاتا جاتا ہے۔ اس پر اتنا زیادہ بوجھ لادا جاتا ہے۔ جدید عورت کا یہی المیہ ہے ———

"اس غریب نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی پرانا لبادا اتارا۔ روایات کو خیر باد کہا۔ مرد کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کی کوشش کی۔ اقتصادی بوجھ کو بٹانے کے لیۓ میدان میں نکل آئی۔ مگر مرد ان سب باتوں کو کہاں مانتا ہے ——— ؟ باہر کی دنیا میں وہ عورت کے عمل دخل کو پسند نہیں کرتا اس لیے عورت کی صلاحیت کو نہیں مانتا ——— اور نہ مانے گا ———

"تو جھلّو ——— یہ کوشش کیوں کر رہی ہو۔ میں دیکھتی ہوں بے چاری کام کرنے والی عورتیں تپتی دوپہر دں میں تھکی ہاری گھر آتی ہیں۔ تو گھر کے بے شمار مسائل جبڑے پھاڑے ان کا استقبال کرتے ہیں۔ دفتر میں جتنا بھی سر کھپا کر آتی ہوں۔ گھر آ کر گھر داری کرنی پڑتی ہے ہر عورت کی استطاعت تو نہیں ہوتی کہ وہ خانساماں یا آیا رکھ لے ——— اس مہنگائی کے دور میں ہر کوئی نوکر نہیں رکھ سکتا۔ اس طرح بچاری عورت دو خانوں میں بٹ جاتی ہے۔ گھر آ کر بچوں کیطرف توجہ دے تو گھر عدم توجہی کا شکار ہوتا ہے۔ اور اگر گھر کو بنائے سنوارے ——— تو بچے بیدل ہو جاتے ہیں۔ بیٹا ایک عورت کتنے کام کر سکتی ہے۔؟ کوئی عورت فولاد کی تو بنی ہوئی نہیں ہوتی۔ وہ مہینے بعد خواہ کتنی تنخواہ لائے۔ مرد یہ نہیں دیکھتا۔ ایک دن اگر سالن خراب ہو تو طعنے دے دے کر اس کا کلیجہ چھلنی کر دیتا ہے . . . . . . پتر یہ ٹھیک ہے تم نے بڑی محنت کر کے دفتر میں ایک مقام بنایا ہے۔ اور اب ماشاء اللہ کافی تنخواہ ہو گئی ہے تمہاری ——— مگر اپنی جان کو کیوں مصیبت میں ڈالا ہوا ہے۔ باہر نکلتی ہو۔ موسموں کا مقابلہ کرتی ہو۔ شوہر تمہیں شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس کی جلی کٹی سنتی ہو۔ آرام کا وقت نہیں ہے تمہارے پاس گھر بیٹھ جاؤ آرام سے . . . . . .

عورت کو جو آرام گھر کے اندر ملتا ہے وہ باہر نہیں مل سکتا۔ توبہ میں تو یہ دیکھ کر حیران ہوتی ہوں کہ عورتوں نے خواہ مخواہ بے شمار ذمہ داریاں اپنے کندھوں پر لاد لی ہیں جن سے یہ مرد

بے پروا اور تن آسان ہو گیا ہے۔"

"دیکھیں نا؟ بے جی ——"

وہ عورت ایک دم بھڑک اٹھی۔

"ہم لوگ کتنا کام کرتے ہیں۔ صبح اٹھکر پہلے ناشتہ بناتی ہوں۔ پھر بچّوں کو تیار کر کے خود تیار ہو جاتی ہوں۔ شبیر تو ناشتہ کر کے اپنے سکوٹر پر دفتر چلے جاتے ہیں۔ میں بچّوں کو کار میں بٹھا کر پہلے ان کے سکولوں میں چھوڑتی ہوں پھر دفتر جاتی ہوں۔ دوپہر کو پہلے ان کو سکولوں سے لیتی ہوں پھر بازار سے سودا سلف خریدتی ہوں۔ بجلی کے بل میں جمع کراتی ہوں۔ ٹی وی کا لائسنس میں بنواتی ہوں اور جتنے بل گھر میں آتے ہیں وہ بھی میں جمع کراتی ہوں۔ بچّوں کی فیس دینے میں خود جاتی ہوں۔ ان کے استادوں سے میں خود ملتی ہوں۔ کتابیں وغیرہ خریدنا ہوں تو میں بازار جاؤں۔ رات کو ہوم ورک کروانا بھی میری ڈیوٹی ہے۔ پھر شہر رشتہ داروں سے بھرا ہے اگر کہیں سے بلاوا آجائے تو میں ہی جاؤں۔ شبیر صاحب تو دفتر سے آنے کے بعد تھکاوٹ کا بہانہ کر کے لیٹ جاتے ہیں۔ اور تو اور —— اگر بچّہ بیمار ہو تو میری ڈیوٹی ہے کہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں نہ مکمل طور پر آرام کرنے کا وقت ملتا ہے اور نہ مقدر میں تفریح ہے۔ اس پر ہر روز کی لڑائی —— اب تو میں تنگ آگئی ہوں۔ میں نے شبّیر سے کہدیا ہے کہ ہمیں علیحدہ ہو جانا چاہیئے۔

"او بے وقوف!"

بے جی نے اس کی طرف دیکھکر کہا۔ ہر مسئلے کا حل علیحدگی نہیں ہوتا تو بچّوں والی ہے علیحدگی کے بعد اور طرح کے ہزار مسئلے اٹھ کھڑے ہوں گے تو یہ سوچ لے کہ وہ اسی طرح بولتا رہے گا اور تجھے گذارہ کرنا ہو گا۔ وہ عورت زیادہ آرام میں تھی جو گھر کے اندر رہتی تھی۔ مگر اس وقت بھی وہ کمبخت مطمئن نہ تھی۔ اب تم لوگ باہر نکل آئی ہو اور اپنی ہمت سے بڑے کام سنبھال لیے ہیں۔ تو حوصلہ بھی بڑا رکھو۔"

"مگر بے جی۔ کسی بات کا کوئی صلہ تو ہونا چاہیئے ——"

"تم کو باہر آنے کا صلہ مرد نہیں دے گا۔ خود آئی ہو تو خود اس کی قیمت بھی ادا کرو۔ عورت کو جب گھر کے اندر رہنے کو کہا جائے تو اسے بہت غصّہ آتا ہے اور وہ سمجھتی ہے اس کی ترقی کی راہیں مسدود کی جا رہی ہیں۔ نہیں پُتر یہ بات نہیں ہے —— میں کوئی زیادہ پڑھی لکھی نہیں ہوں۔ میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ عورت نازک ہے۔ نفیس ہے۔ خوبصورت ہے اس کو نازک اور نفیس کام کرنے چاہییں۔ اپنی زندگی آرام اور چین سے بسر کرنی چاہیئے۔ بچے پالنا اور گھر داری کرنا بڑے مشقت کے کام ہیں۔ مگر انہی کاموں میں اسکی راحت ہے۔ اتنی ذمہ

داریاں نہیں اٹھائے گی تو مرد خود بخود ٹھیک ہو جائیگا ——"

"بے جی —— آپ ہمیشہ مرد کی حمایت میں بولتی ہیں"۔

اس عورت کو غصہ آگیا۔

بے جی ہنسنے لگیں۔

"اچھا تو اپنا غصہ تھوک دے۔ میں آؤنگی کسی دن تیرے گھر —— شبیر سے بات کرؤں گی مگر دیکھو...... لڑائی جھگڑے کے دوران علیحدگی کا لفظ بالکل استعمال نہیں کرتے۔ خواہ میاں بیوی میں کتنی شدید لڑائی ہو رہی ہو۔ یہ لفظ زبان پر نہیں لاتے۔ یہ لفظ فاصلے پیدا کرتا ہے محبتوں کی جڑیں کاٹ دیتا ہے —— ازدواجی زندگی میں محبت ایک فصل کی طرح اگتی ہے۔ بعض اوقات جب اس فصل کو حالات کی کھاد اور احساس کی گرمی نہ ملے تو اس کی نشونما رک جاتی ہے۔ لیکن جب تم نئے لوگ ہر لڑائی کے بعد طلاق کا لفظ زبان پر لانے لگتے ہو تو یہ فصل گل سڑ جاتی ہے۔ —— فصل کا دھیان رکھنا چاہیئے —— اس پر نکھار کا موسم ضرور آتا ہے"۔

رملیٰ جو بڑی بے زار سی شکل بنائے بیٹھی تھی۔ بڑے غور سے بے جی کا چہرہ دیکھنے لگی۔ کیا یہ اگلے وقتوں کے لوگ اتنے گہرے ہوتے ہیں۔؟

"میں جاؤں اب بے جی —— وہ عورت کھڑی ہوگئی۔ آپ سے بات کر کے تسلی ہو جاتی ہے۔ اسی لیے آ بھی جاتی ہوں"۔

"اچھا کرتی ہے۔ زندگی میں کوئی ایسا آدمی ضرور ہونا چاہیئے۔ جس سے آدمی دل کی بات کہہ سکے۔ رنج اور غصے اندر نہیں رکھنے چاہییں۔ یہ انسان کی خوبصورت عادتوں کو کھا جاتے ہیں۔ اور ان کی جگہ انسان کے اندر کینہ، بغض اور تعصب لے لیتا ہے۔ تم نے دیکھا نہیں لوگوں میں اب کتنا حسد آگیا ہے۔ کیونکہ لوگ ایک دوسرے کے خلاف اندر ہی اندر کھولتے رہتے ہیں۔

"پر بے جی —— دنیا میں کتنے لوگ ہیں جن پر کوئی بھروسہ کر سکتا ہے۔"

یہ بھی تو ٹھیک کہتی ہے۔ دل کی بات کوئی ظرف والا ہی ہضم کر سکتا ہے۔ دل کی بات کہنے کے لیے صحیح آدمی کا انتخاب کرنا چاہیئے۔

"بے جی ——" وہ عورت بولی۔ "اللہ کا شکر ہے۔ آپ مجھے مل گئی ہیں۔ قسم خدا کی ورنہ میں پاگل ہو جاتی۔ جس رات لڑائی ہوتی ہے۔ صبح دفتر نہیں جا سکتی۔ بس آپ کے پاس آکر بیٹھ جاتی ہوں۔ اور ایک ایک بات بتا کے چین ملتا ہے۔

"یہی رویہ ٹھیک ہے۔ بیٹی —— اس کام کے لیے گھر کے بزرگ ضروری ہوتے ہیں جن سے تم لوگ دور بھاگنا چاہتی ہو۔ بزرگ اور کسی کام کے قابل ہوں یا نہ ہوں۔ مگر ان کے

دل میں اتنی وسعت اور گہرائی ہوتی ہے کہ تمہاری ہر بات اپنے سینے میں دفن کر لیتے ہیں۔ ان کے نحیف و نزار سینے راز کے کنوئیں ہوتے ہیں۔ ان کے پاس ان کی ساری عمر کا تجربہ ہوتا ہے۔ یہ بزرگ جب تم لوگوں کو کسی بات سے منع کرتے ہیں تو اس لیے نہیں کہ وہ اپنے آپ کو بہت عقلمند سمجھتے ہیں بلکہ انہوں نے ماضی میں جو غلطیاں کی ہوتی ہیں ان کی روشنی میں تم لوگوں کو غلطیاں کرنے سے روکتے ہیں۔ زندگی کے ہر تجربے کا ردِ عمل ایک دم سامنے نہیں آجاتا۔ بڑھاپا ایک بازگشت ہے۔ جب آدمی ضعیف ہو کر ایک طرف بیٹھتا ہے۔ تو اسے گذری زندگی آئینے کی طرح نظر آنے لگتی ہے۔ کس بات کا کیا نتیجہ نکلا ——؟ یہ تجربات کی ڈگر سے گذر کے پتہ چلتا ہے۔ اگر گھر کے بزرگوں پر بھروسہ کیا جائے۔ انہیں اپنا راز دار بنایا جائے اور ان کے تجربوں سے روشنی ادھار لی جائے تو زندگی آسان ہو سکتی ہے۔"

"بے جی آپ مانیں یا نہ مانیں ——" وہ عورت بولی۔

میں نے آپ جیسے سیانے بزرگ بہت کم دیکھے ہیں۔ ایک میری ساس بھی ہیں۔

اپنی جوان بہوؤں سے بس حسد ہی کرتی رہتی ہیں . . . . . .

ہائے وہی ساس بہو کی رقابت ——

بے جی سبزی کا ٹرے پکڑ کے کھڑی ہو گئیں . . . .

"ایک دوسرے کے قریب رہنے کے لیے ایک دوسرے کو سمجھنا ضروری ہوتا ہے۔

اچھا اب تو جا —— میں پھر کسی روز تیرے ساتھ بات کروں گی۔"

جاتے جاتے اس عورت نے رملیٰ کیطرف دیکھا ——

اور بولی ——

"بے جی! آپ بڑی خوش نصیب ہیں۔ آپ کو بڑی اچھی بہو مل گئی ہے"۔

"کیسی ہو رملیٰ ——" اس نے پھر رملیٰ سے پوچھا۔

رملیٰ جیسے زبردستی مسکرائی اور بولی۔

"ٹھیک ہوں جی ——"

"ہاں آجکل بیچاری بیزار ہو رہی ہے بڑے واہیات دن ہوتے ہیں یہ۔ ابھی تمہیں آگے آگے پتہ چلے گا کہ عورتوں کو کیا کیا بھگتنا پڑتا ہے۔ شادی بس ایک سہانا سپنا ہے۔ زیور اور کپڑے کے پس پردہ ساری سردردی ہے۔"

یہ کہکر اس نے خدا حافظ کہا اور باہر نکل گئی۔

مگر بے جی نے جو اچٹتی سی نگاہ رملیٰ پر ڈالی تھی۔ تو ان کی وہ نگاہ وہیں اٹک گئی . . . .

جب وہ عورت باہر نکل گئی۔ تو بے جی رملی کے قریب آئیں۔ بڑے تردد سے اس کا چہرہ دیکھا۔ پھر اس کے پاس چارپائی پر بیٹھ گئیں۔

"کیا بات ہے وہٹی.....؟" انہوں نے اس کی آنکھوں میں اپنی تجربہ کار بوڑھی آنکھیں گاڑ دیں۔

"تیرا سارا چہرہ نیلا ہو رہا ہے ——"؟

رملی تو جیسے پھٹ پڑنے کو بیقرار بیٹھی تھی بے جی کا ہاتھ تھام کے چیخ اٹھی......

بے جی نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ ٹھنڈا برف ہو رہا تھا۔ اپنے ہاتھوں سے پسینہ پونچھا اور اسے لٹا دیا ——

اس کے رخسار پر ہاتھ رکھ کر پوچھا ——

"کب سے ہے یہ حالت ——؟"

"پچھلی رات سے ——"

"پچھلی رات سے...... اور تو نے مجھے بتایا نہیں..... ہائے ہائے یہ لڑکیاں"...... بے جی پریشان ہو کر کھڑی ہو گئیں۔

"آخر مجھے بتایا کیوں نہیں ——؟"

"ہائے بے جی ——" رملی بلک بلک کر رونے لگی۔ "اب برداشت نہیں ہوتا۔ دیکھیے گا میں مر جاؤں گی....... آج میں ضرور مر جاؤں گی۔"

"جھلی....." بے جی پھر سٹپٹا کر اس کی چارپائی پر بیٹھ گئیں۔

"منہ سے خیر کا کلمہ نکال...... اللہ اللہ کر —— ابھی سب ٹھیک ہو جائیگا۔ ابھی...... ابھی...... دیکھنا تو سہی......"

لیکن بے جی کو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ ایک دم بوکھلا گئیں۔ رملی تکلیف سے تلملا رہی تھی۔ اور اس کی گھٹی گھٹی چیخیں انہیں اور بھی مضطرب کر رہی تھیں۔ کبھی اندر جاتیں اور کبھی باہر آجاتیں ——

"بے جی..... بے جی......" رملی روتے روتے بولی۔

"پلیز میری امی کو بلا دیں —— بلا دیں نا؟ میری امی کو —— ورنہ میں مر جاؤں گی۔"

اسی وقت بے جی کو معاذ کا خیال آگیا۔

فوراً اندر گئیں۔ معاذ کے دفتر میں فون کیا۔ اتفاق سے وہ مل گیا۔ اسے فوراً گھر آنے کا کہہ کے بے جی باورچی خانے میں چلی گئیں۔ انہیں معلوم تھا اب کیا کرنا ہے۔ انہوں نے چولہے پر

تھوڑا سا دودھ رکھ دیا۔ دودھ میں ایک چمچ دیسی گھی کا ڈالا۔ ایک چھوہارا بھی کتر کے ڈال دیا۔ پھر چٹکی سونف اور سفید زیرے کی ڈالی ـــــ جب ابال آگیا تو چٹکی بھر ہلدی بھی ڈال دی خوب جوش دلا کر دودھ کو ایک پیالے میں ڈالا اور رملی کے پاس لے آئیں۔

"یہ کیا ہے بے جی ـــــ؟"

"دودھ ہے بس ـــــ اسے پی لو۔ اس سے درد تیز ہو جائیں گے۔"

"بے جی ـــــ" رملی چیخنے لگی "آپ کیا ظلم کرتی ہیں۔ میری پہلے ہی جان نکلی جا رہی ہے اور آپ کہتی ہیں درد تیز ہو جائیں...... کیوں مارنا چاہتی ہیں مجھے ـــــ......"

بیٹی بیٹی....... بے جی نے پیالہ تپائی پر رکھ دیا اور اس کو سہارا دیکر اٹھایا۔

تم ابھی ناتجربہ کار ہو۔ وہاں پتہ نہیں ہسپتال میں کتنی دیر لگ جائے ـــــ وہ ٹیکہ لگا کے تمہیں ایک جگہ ڈال دیں گی۔ یہ گرم دودھ پی لو گی...... تو جلدی سب ہو جائے گا۔ اٹھو ـــــ شاباش ـــــ ضد نہیں کرتے......"

"اٹھو...... اٹھو......"

رملی نے جب اٹھنے کی کوشش کی تو کئی ہزار برچھیاں اس کے جسم میں کھب گئیں۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا آگیا۔ زمین و آسمان گھومنے لگے ـــــ اپنا آپ اپنے ہاتھوں سے چھٹنے لگا...... کیسی کڑی مسافت تھی کہ چل بھی نہ رہی تھی۔ پھر بھی تھکن سے چور چور تھی ـــــ جوڑ جوڑ الگ ہو رہا تھا ـــــ اور ہمت جواب دے رہی تھی ـــــ سانس پھول رہی تھی...... پتہ نہیں بے بسی کا کونسا مقام تھا ـــــ اس کی آنکھوں سے جھڑی لگی تھی۔ ایسے لگتا تھا بس دم نکلنے والا ہے۔

"امی کو فون کیا آپ نے ـــــ؟"

اس نے ایک گھونٹ دودھ پی کر یوں سر اٹھایا جیسے نزع کے وقت اپنی ماں کو دیکھنا چاہتی ہو۔

"نہیں ـــــ" بے جی نے آہستہ سے کہا۔

"کیوں.... کیوں ـــــ" رملی نے ہاتھ مار کر ذرا سا دودھ گرا دیا۔

"میں مر رہی ہوں اور آپ میری ماں کو نہیں بلاتیں ـــــ"

"پہلے تم یہ دودھ پی لو ـــــ میں پھر جا کے فون کروں گی ـــــ"

رملی نے بے دلی سے گھونٹ گھونٹ کر کے دودھ پیا ـــــ دودھ اس طرح گلا چیر کر جا رہا تھا جیسے ہر گھونٹ کے ساتھ خنجر کی دھار اندر جا رہی ہو...... اندر باہر کوئی ستانے

کامقام نہ تھا ــــــ درد کا ایک بگولا تھا جس نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ سکون کی زمین پر قدم نہ ٹکتے تھے اور وہ درد کے گرداب میں پھنسی لمحہ بہ لمحہ فضا میں معلق ہوئی جا رہی تھی۔

اس وقت اسے اپنی زندگی بہت پیاری لگی۔ اپنی ذات دنیا کی ہر شے سے قیمتی لگی۔ اس کی آنکھوں میں ایک خاموش التجا اتر آئی ــــــ

"مجھے بچا لو ــــــ کسی طرح مجھے بچا لو ــــــ"

اس احساس کے ساتھ ہی ماں کی گود میں چھپ جانے کی تمنا جاگ اٹھی ــــــ ماں کی گود ــــــ جو زندگی کے ہر کٹھن اور کڑے لمحوں میں یاد آ جاتی ہے ــــــ جو عافیت کی چھایا ہے ــــــ اور جس گود میں منہ چھپا کر انسان دنیا کے ہر غم سے بے نیاز ہو جاتا ہے ــــــ

"پلیز امی کو فون کر دیں بے جی ــــــ"

رملیٰ نے رکتی سانسوں کے درمیان کہا ــــــ

"اچھا ۔ ۔ ۔ ۔" بے جی نے پیالہ اٹھایا اور خاموشی سے اندر چلی گئیں ــــــ

بے جی کے اٹھتے ہی درد کی ایک لہر آئی ــــــ اور رملیٰ زور سے چیخی ــــــ

بے جی واپس آ گئیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پاس بیٹھ کے انہوں نے رملیٰ کے دونوں کندھے پکڑ لیے ــــــ

اس ایک لمحے میں جب کرب کا دریا اسے ایک نامعلوم جہاں کی طرف بہا لے جانے والا تھا۔ اس نے اپنی سوچی سوچی اور آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھوں کو کھول کر آسمان کی طرف دیکھا ــــــ اور آنسوؤں کی زبان میں التجا کی ــــــ

"خدایا! مجھے ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے بچا لے ۔ ۔ ۔ ۔ میں جینا چاہتی ہوں ــــــ ابھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ابھی نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ خدایا ــــــ خدایا ــــــ"

اور پھر نڈھال ہو کر اس نے سر تکیے پر رکھ دیا۔

اس کے بعد کافی دیر تک سکون رہا اور بے جی اندر جا کر بچے کا سامان اکٹھا کرنے لگیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اسی وقت گھبرایا ہوا سا معاذ گھر کے اندر داخل ہوا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

گھبراہٹ میں اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اور ایسے میں وہ کچھ اور بھی بے ہودہ لگ رہا تھا ــــــ

رملیٰ نے اپنی نیم وا آنکھوں سے اسکی طرف دیکھا ــــــ تو خوف اور وسوسوں میں گھرے دل میں ایک کانٹا سا چبھ گیا۔ اس شخص کے لیے تو خدا سے زندگی مانگ رہی ہے ــــــ ۔ ۔ ۔ ۔

"کیا ہوا ہے رمو ——" معاذ ایکدم اس کے قریب بیٹھ گیا۔
رملی نے اپنا بازو اپنی روتی ہوئی آنکھوں پر رکھ لیا۔ ....."کیا بتاؤں کیا ہوا ہے؟"
رملی پھر رونے لگی۔
جو بھی ہو رہا ہے تمہارے کارن ہو رہا ہے —— کون سا درد گھناؤنا ہے یہ نہیں
جانتی ..... تھوڑی دیر پہلے زندہ رہنے کی خواہش جاگی تھی .... زندگی پیاری لگی تھی
—— دنیا خوبصورت لگی تھی ——
"تم آئے ہو تو ——"
وہ سسکنے لگی ......
دعا بیچ راہ کے حیران کھڑی ہے ——
انسان کتنا متلون مزاج ہے —— پل میں زندگی مانگتا ہے۔ پل میں موت ——
آسمان ششدر ہے۔ کس دعا کے لیئے دروازہ کھولے —— کس دعا کے لیئے دروازہ بند کر دے
—— ساری دعائیں آسمان کے نیچے کھڑی انسان کو کوستی ہیں ——
رملی نے ادھر ادھر سر پٹکا .....
مجھے نہیں چاہیئے زندگی —— مجھے نہیں چاہیئے بچّہ ——
بس .... بس .....
اسی وقت معاذ نے اس کا ٹھنڈا برف ہاتھ پکڑ لیا۔
"رمو سب ٹھیک ہو جائیگا جان ——"
اس نے اتنے پیار سے کہا۔ جیسے اردگرد دودھ اور شہد کی نہریں بہہ رہی ہوں۔
کتنا ملائم تھا اس کا لہجہ —— کتنی یقین دہانی تھی اس کے ہاتھ کے لمس میں —— اسکی پور
پور احسان مندی کا اظہار کر رہی تھی ——

اس کی سانس کی خوشبو رملی کے چہرے پر گر رہی تھی —— اور صاف کہہ رہی
تھی۔ محبتوں کو مجسّم کرنے کے موسم کرب کی آندھیوں میں لپٹے ہوتے ہیں —— اپنا وجود تقسیم کرتے
ہوئے اذیت کی انتہا سے گزرنا پڑتا ہے .... اسطرح ہم تعلق کی ایک اٹوٹ ڈور باندھتے ہیں۔
ایک دوسرے کے خون سے گرہ لگاتے ہیں —— ایک دوسرے کی روح کے آرپار ہو جاتے
ہیں —— .....
تعلق کی بہار سے پہلے ...... نازک پل صراط آتے ہیں۔
میں یہاں تمہارے ساتھ ہوں۔ تمہارے دل کے قریب .... اپنے پیارے

کو تکلیف میں مبتلا دیکھنا سب سے بڑی اذیت ہے ـــــ جب تم درد بانٹ نہیں سکتے . . .
اور جب تمہیں درد کی انتہا کا علم ہے ۔ تو تم بن چھری کے ذبح ہو جاتے ہو . . . . . . تڑپ تو میں بھی رہا ہوں ۔ مگر کچھ اور طرح سے ـــــ

عذاب میں تو میں بھی مبتلا ہوں ـــــ روح تو میری بھی اذیت کے سوا نیزے پہ ٹنگی ہے ۔ جان تو میری بھی نکل رہی ہے ـــــ

مگر دونوں کا انداز جداگانہ ہے ـــــ

میں اپنی ساری عقیدتوں کے چراغ جلا کر، نس نس سے تمہاری زندگی کے لیے دعا مانگوں گا . . . .

"زندگی . . . . . زندگی . . . . . . مجھے نہیں چاہیئے زندگی . . . . .

رملیٰ پھر زار وقطار رو رہی تھی ۔

بے جی کپڑوں کی ٹوکری اٹھائے باہر آئیں تو معاذ کو وہاں بیٹھے ہوئے دیکھا ۔

جلدی کرو معاذ یہ سامان موٹر میں رکھو اور رملیٰ کو ہسپتال لے چلو ـــــ

لیبر روم میں جانے سے پہلے رملیٰ نے ایک بار پھر بے جی سے پوچھا ـــــ

"بے جی ـــــ میری امی کو فون کر دیا ہے ـــــ"

"کر دیا ہے ـــــ" بے جی نے آہستہ سے کہا ـــــ

اور پھر تسبیح لے کر دروازے کے ساتھ کھڑی ہو گئیں ـــــ معاذ باہر نکل گیا . . . .
ہسپتال کی عمارت سے نکل کر ہرے بھرے لان میں اتنی دور نکل گیا ۔ جہاں اسے رملیٰ کی چیخیں نہ سنائی دیں ـــــ

کتنی دلخراش چیخیں تھیں ۔ جیسے کوئی اسکی من موہنی چاند سی رملیٰ کی کھال اتار رہا ہو

اسی لیے شاید ماں کو اتنا بڑا درجہ دیا گیا ـــــ

جب وہ درختوں کے ایک نیم تاریک جھنڈ میں پہنچ گیا تو اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا مُصلّےٰ گھاس پر بچھا دیا ـــــ

اور اپنی اِک اِک سانس کے ساتھ ـــــ اللہ سے اپنی رملیٰ کی زندگی کی بھیک مانگنے لگا ۔ نوافل پڑھتے پڑھتے اس نے نگاہ اٹھا کے سامنے دیکھا تو انٹرنس والے گیٹ پر بے جی کھڑی اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھیں ـــــ

معاذ نے جلدی سے مُصلّےٰ لپیٹا اور ان کیطرف بھاگا ۔ دل میں وسوسوں کا ایک ہجوم تھا اور دل بری طرح دھک دھک کر رہا تھا ۔

تیز تیز قدم اٹھاتا ہکا بکا سا جب وہ قریب پہنچا تو بے جی اسے دیکھ کر ہنس پڑیں....

"کیا بات ہے بے جی ——؟"

وہ بے جی کی ہنسی کا مفہوم بھی سمجھنے سے قاصر لگ رہا تھا۔

"اللہ کا کرم ہوا ہے آجاؤ ——"

بے جی ہسپتال کے کوریڈور میں مڑ گئیں۔ معاذ بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔

بہت کچھ پوچھنے کو دل مچل رہا تھا —— مگر کچھ بھی پوچھنے کا ڈھنگ نہیں آ رہا تھا۔

لیبر روم کے باہر پہنچ کر بے جی نے معاذ کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر خوشیوں کے چراغ جل رہے تھے ——

"اللہ کا بڑا احسان ہے۔ پوتا دیا ہے اللہ نے مجھے ——"

ارے —— معاذ ایک دم چونکا......

سب بہت جلدی لگا اسے...... بہت خوبصورت...... عجیب......

بے جی اسے خبر سنا کر اندر جانے لگیں...... تو وہ بے تاب ہو کر ان کے پیچھے لپکا۔

"بے جی رملیٰ کیسی ہے ——؟"

"بے جی...... رملیٰ تو ٹھیک ہے ——؟"

"بے جی رملیٰ کا کیا حال ہے ——؟"

مگر بے جی نرس سے باتیں کرنے میں مگن تھیں۔

اس وقت نقاہت سے چور اور تھکاوٹ سے ریزہ ریزہ رملیٰ کے کان میں معاذ کی آواز پڑ گئی۔

وہ پوچھ رہا تھا۔

"بے جی —— رملیٰ تو ٹھیک ہے نا؟ ——"

"مبارک ہو سر آپ کا بیٹا ہوا ہے"۔ نرس نے قریب سے گزرتے ہوئے کہا۔

"مگر سسٹر میری بیوی کیسی ہے ——؟"

نرس ہنس کر قریب سے گزر گئی۔

"اب تو جی بالکل ٹھیک ہے ——"

معاذ کی آواز نے رملیٰ کو زندگی کا احساس دلایا —— تھوڑی دیر پہلے جب زبردست طوفان اٹھا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اپنی ماں کی تمنا کی تھی —— اس خیال سے کہ شاید اس کی ماں اسے اس عذاب سے بچا لے گی۔ لیکن اس عذاب سے گزرے بغیر تو کوئی ماں، ماں نہیں

بن سکی ——

پھر ایک نرم سی آواز آئی تھی . . . . . .

اور اس کے ساتھ ہی سکون کے بادل چھا گئے تھے . . . . . .

ڈاکٹر نے بڑی دیر کے بعد اسے بتایا —— "کہ تمہارا بیٹا ہوا ہے ——"

اُف ——

اس نے اپنی تھکی ہوئی پلکوں کے سائبان ڈھیلے کر دیئے . . . . . .

نہ تو بچے کو دیکھنے کی تمنا جاگی —— نہ دل میں کوئی ہلچل اٹھی۔ شکر ہے کھولتے لاوے سے نجات ملی ——

یوں لگ رہا تھا ایک زمانے سے پاپیادہ چلتی آ رہی ہے —— اور اب تھک کے سو جانا چاہتی ہے —— . . . . . .

اور جب انجکشن کے اثر سے نیند کے پاتال میں اترتی جا رہی تھی تو ایک بھیانک خیال کا کوڑا لگا آکر —— اور اس کے زخمی تن میں پھر درد کی لہریں اٹھنے لگیں ——

وہ ایک بدصورت بچے کی ماں بن گئی تھی . . . . ایک اور کریہہ المنظر انسان کو اس نے جنم دے دیا تھا۔ دنیا کی بدصورتی میں اضافہ کر ڈالا تھا۔ تبھی تو کسی نے اسے بچہ نہیں دکھایا —— وہ دور پالنے میں پڑا ہوا تھا اور ایک نرس اس کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔

بے جی مسکراتی ہوئی نرس کے پاس جا کھڑی ہوئیں۔ اور بڑے اترائے ہوئے انداز میں کہنے لگیں۔

بالکل میرے معاذ پہ گیا ہے —— چھوٹا سا معاذ لگ رہا ہے مجھے —— وہ پیدا ہوا تھا تو ایسا ہی تھا ——"

اف . . . . . .

اف . . . . . .

رملیٰ نے اپنے سر کو ادھر ادھر مارا۔

"جی اب تو سارا کام ختم ہو گیا ہے۔ اب کیوں بے چین ہو رہی ہیں آپ ——"

نرس نے اس کے اوپر سفید چادر ڈالتے ہوئے کہا۔

تو رملیٰ نے اپنے خشک اور نیلے ہونٹوں پر زبان پھیری . . . . . .

"چلیئے آپ کو آپ کے کمرے میں چھوڑ آئیں۔"

دو نرسوں نے مل کر اسے اسٹریچر پہ ڈالا —— اور اسٹریچر دھکیلتے ہوئے

لیبر روم سے باہر نکل آئیں۔

باہر دروازے کے پاس معاذ کھڑا تھا۔ منتظر اور مضطرب ——

اسے دیکھکر آگے بڑھا —— شاید اسکا دل چاہ رہا تھا کہ رملی کو ہاتھوں میں بھر کے کلیجے میں چھپالے۔ مگر رملی نے اپنی آنکھیں بند کرلیں ...... نرس بڑی مشاقی سے گول گول دائروں میں اسٹریچر کو گھسیٹتی ہوئی اوپر کی منزل میں لے جارہی تھی۔ مگر رملی کو یوں محسوس ہورہا تھا۔

ساری دنیا اس کے ارد گرد گھوم رہی ہے —— ساری دنیا اس کی طرف دیکھ رہی ہے —— ساری دنیا کہہ رہی ہے۔ دیکھو یہ عجیب الخلقت بچے کی ماں ہے ——

دیکھو...... دیکھو......

اس نے دنیا کو کیا دیا —— ؟



ہسپتال کے دستور کے مطابق پورے چوبیس گھنٹے بچہ ماں کے پاس نہیں لایا گیا۔ بس تھوڑی دیر بعد بے جی کمرے سے نکل جاتیں اور بچوں والے کمرے میں جاکر اپنے پوتے کو دیکھ آتیں۔

پھر آکر کہتیں۔ "کم بختیں کہیں میرا بچہ بدل نہ دیں ——"

اے کاش بدل دیں۔ سوئی سوئی رملیٰ سوچتی۔ بے جی کے علاوہ کسی نے بچے کا ذکر نہیں کیا تھا۔ کل سارا دن امی بھی یہاں رہی تھیں۔ امی اس وقت آئیں جب وہ اپنے کمرے میں پہنچ چکی تھی۔

اور ان کے آنے سے پہلے بے جی نے اسکی پیشانی چوم کر اسے بتایا تھا کہ

"میں نے بچہ ہونے کے بعد تیری ماں کو اطلاع دی ہے۔"

"کیوں بے جی —— رملیٰ نے کمزور آواز میں پوچھا۔ اگر میں مر جاتی تو ——"

"اچھا اب ایسی منحوس باتیں نہ کر —— دھیٹی تو اسوقت اتنی پریشان تھی اور تیرا چہرہ اسقدر عجیب ہو رہا تھا کہ میں نے تیری ماں کو نہیں بلایا۔

بیٹی! اس معاملے میں ماؤں کا دل کمزور ہوتا ہے۔ خود اس کرب سے کئی بار گذرتی ہیں۔ مگر اپنی بیٹیوں کو تکلیف میں تڑپتا ہوا نہیں دیکھ سکتیں۔ مریض تو اندر ڈاکٹروں کی تحویل میں ہوتا ہے مگر مریض کے لواحقین ہسپتال کے سنگدل برآمدوں میں کھڑے کھڑے مر جاتے ہیں۔ اور میں جانتی ہوں تیری ماں کا دل بڑا چھوٹا ہے۔ اس لیے سوچا آکر ناحق پریشان ہوں گی اور ان کی صورت دیکھ دیکھ کر تم اور بھی گھبرا جاؤ گی ——"

اسی وقت دروازہ کھول کر امی اندر داخل ہوئیں اور رملی سے لپٹ گئیں۔ امی کی خوشبو نتھنوں میں پہنچی تو رملی پھر رونے لگی ــــــ

اس کی خیر خیریت پوچھنے کے بعد امی تو بالکل مطمئن ہوگئیں اور پھر ہنس ہنس کر بے جی سے باتیں کرنے لگیں۔ کسی نے اسے اس کے بچّے کے بارے میں نہیں بتایا۔ حتیٰ کہ امی بھی جاتے وقت وہیں نومولود بچوں کے کمرے میں اسے دیکھ کر گھر چلی گئیں ــــــ پتہ نہیں یہ کیسی بات ہے جو اس سے اس طرح چھپائی جارہی ہے۔۔۔۔۔۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے نرس نے آکر بے جی سے کہا تھا۔ بچّے کے کپڑے نکال کر رکھیں میں اسے لارہی ہوں۔

بے جی تو چیزیں نکالنے میں مگن ہوگئی تھیں۔ مگر اس کی نظریں دروازے پر ٹنگ گئی تھیں بظاہر اس نے اپنے آپ سے کہا تھا کہ اسے ایسا مکروہ صورت بچّہ دیکھنے کا شوق بالکل نہیں ہے ــــــ مگر اندر شوق نے آگ لگا رکھی تھی ــــــ کچھ انجانے سے جذبے سر اٹھا رہے تھے۔ ــــــ اپنے جسم کا ایک حصہ مجسّم دیکھنے کو دل مچل رہا تھا مگر اپنی کہنی چہرے پر ٹکائے یوں دروازے کی طرف ٹکٹکی لگا رکھی تھی کہ دیکھنے والے سمجھیں سو رہی ہے ــــــ مگر بازو کے ننھے سے مثلث میں، سے دروازے کا ہر زاویہ نظر آرہا تھا۔

اسی وقت کالی سی نرس سفید تولیے میں لپٹا ہُوا ایک لوتھڑا لیکر اندر داخل ہوئی۔ بچّہ بہت چھوٹا تھا اور پوری طرح کپڑے میں لپٹا ہوا تھا۔ صرف اس کے سر کے بال نظر آرہے تھے جو بہت سیاہ اور بہت گھنے تھے ــــــ بہت سیاہ اور بہت گھنے بال تو معاذ کے بھی تھے۔

بسم اللہ کہہ کر بے جی مڑیں اور نرس کے ہاتھ سے بچہ لے لیا۔

"ابھی اسکو غسل دینا ہے۔ کل سے یہ نہایا نہیں ــــــ"

"ہائے تم نے گندہ بچّہ رکھا ہوا تھا۔" بے جی نے کہا۔

"ہم صرف بچوں کو سپنج کرتے ہیں۔ اب آپ نہلا دھلا کر اسے اچھے کپڑے پہنا دیں جو لیکر آئی ہیں ــــــ"

"تم میری مدد کروگی ــــــ؟" بے جی نے پوچھا۔

"ضرور کروں گی ــــــ میں تو اسی کام کے لیے آئی ہوں۔"

نرس بچّے کو لیکر غسل خانے میں چلی گئی۔ تو بے جی نے ہلکا نیلا فراک اٹھایا۔ اس کے ساتھ ہلکا نیلا بب بھی تھا۔ نیلے رنگ کے تولیے اور نیلا صابن لیکر جب وہ غسل خانے میں داخل ہوئیں تو نرس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کیا آپ کو یقین تھا آپ کی بہو کے لڑکا ہوگا۔"

بے جی ہنس پڑیں۔

"بس ——— ایسی باتیں واشگاف الفاظ میں نہیں بتاتے۔۔۔۔۔

ویسے پہلی لڑکی بھی ہو جاتی تو ہمیں کیا فرق پڑتا تھا۔"

"پھر آپ اسے بھی نیلے کپڑے پہنا دیتیں ———؟"

"اس سے کیا ہوتا ہے ———؟" بے جی نے کہا۔ "یہ تو آج کے فیشن ایبل دور کا تقاضا ہے۔ ویسے میں نے بچے کے لیے ہر رنگ کے کپڑے احتیاطاً بنا لیے تھے ———"

نرس بچے کو نہلانے لگی اور ساتھ ساتھ گفتگو بھی جاری رکھی۔

"پہلوٹھی کا بچہ ہے آپ کی بہو کا ———"

"ہاں جی ——— "بے جی نے کہا۔

"بہت خوش ہیں آپ پوتا ہوا ہے ———"

میرا ایک بیٹا ہے۔ اس لیے میں چاہتی ہوں۔ اسکی بہت سی اولاد ہو ———

(اونہہ ۔۔۔۔۔۔ کہنی چہرے پر ٹکائے ٹکائے۔۔۔۔۔۔ رملی کو ابال آ گیا۔ ایک بدصورت بچہ پیدا کر کے اور بدصورت بچوں کی لائن لگانا چاہتی ہیں۔)

نرس نے بچے کو تیار کر دیا اور لپیٹ کر بے جی کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ پھر بولی۔

"ابھی صرف اسے ابلا ہوا پانی اور شہد دیں"۔۔۔۔۔ اور باہر نکل گئی۔

بے جی نے کچھ پڑھ کر بچے پر دم کیا۔

پھر ایک دم اسے رملی کے پاس لے آئیں اور بولیں۔

"دو بیٹی اپنا بچہ تو دیکھو ———"

رملی کا دل دھڑک اٹھا۔۔۔۔۔۔۔۔ اس نے کہنی اٹھائی تو جذبات کی شدت سے اپنی جگہ پر جم گئی۔

بے جی نے آہستہ سے ننھا سا فرشتہ اس کے پاس لٹا دیا۔ مگر ہاتھوں سے اسے تھامے رکھا۔ رملی نے بے تابی سے دیکھا ——— پھر دیکھا ——— پھر دیکھا ——— بہت چھوٹا سا انسان ——— بہت چھوٹا سا ——— مگر کتنا خوبصورت ——— سفید اور سرخ رنگت تھی۔ آنکھیں بہت زور سے بند کی ہوئی تھیں۔ جیسے شرط جیت کر ہی کھولے گا۔ باقی نقش و نگار کا پتہ ہی نہیں چل رہا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔ اس میں سے ایک الوہی خوشبو نکل رہی تھی۔ ریشمی ریشمی چاند کا ٹکڑا کمبل میں یوں لپٹا تھا جیسے آسمان اپنی تمام تر زمیوں، دلآویزیوں، اور

خوبصورتیوں کے ساتھ ماں کی گود میں اتر آیا ہو۔۔۔۔
رملی کے دل سے مامتا کی ایک ہوک اٹھی۔ اندر ایک چشمہ پھوٹا ـــــ ایک جھرنے کا منہ کھل گیا۔ اسکا دل چاہا۔ پلٹ کر اس ننھے سے وجود کو اپنے سینے میں بھر لے۔۔۔۔۔۔۔ اس کے منہ پہ اپنا منہ رکھ دے ـــــ دل میں دفن کی ہوئی ساری محبتیں اس پر لٹا دے ـــ ساری گھٹن نکال دے ـــــ پتہ نہیں روئے کر چلائے ـــــ ہنسے یا قہقہے لگائے۔۔۔ اپنے سے قریب۔۔۔۔۔ اپنے بہت پاس۔۔۔۔۔۔۔ بہت عزیز۔۔۔۔۔۔ دل کے نزدیک ایک وجود۔۔۔۔۔۔ ایک ٹھنڈا میٹھا ٹکڑا محسوس ہو رہا تھا۔
مگر اس نے دل پر جبر کیا۔ یا شاید بے جی سے شرما گئی۔ منہ پھیر لیا۔
اسی وقت بچے نے ایک کمزور سی اور معصوم سی آواز نکالی۔ شاید وہ احتجاج تھا۔
بے جی نے لپک کر اسے اٹھا لیا۔
"میرے بچے کو بھوک لگی ہوگی۔ نہانے کے بعد بچے کو ضرور بھوک لگتی ہے۔"
انہوں نے اسے سینے سے لگایا۔ پھر بڑی مشاقی سے الٹے بازو پر اٹھا کر سیدھے ہاتھ سے اس کی بوتل میں پانی انڈیلنے لگیں۔ پانی میں ذرا سا شہد ملایا اور بستر پہ بیٹھ کر اسے گود میں لٹا لیا۔ اور پانی پلانے لگیں۔
بچے نے بس ایک ہلکی سی آواز نکالی تھی۔ اس کے بعد پھر مٹھیاں بھینچ کر اپنی دنیا میں گم ہو گیا تھا۔۔۔۔۔۔۔
بے جی کوشش کر کے اس کے منہ میں نپل ڈالتیں اور وہ پھر باہر نکال کر منہ بند کر لیتا۔ تھوڑی سی دیر کو اس کی لال لال زبان نظر آتی اس پر ایک میٹھا قطرہ گرتا۔۔۔۔۔۔۔ جسے چوس کر وہ پھر منہ بند کر لیتا۔
بے جی ہنسنے لگیں۔
"دیکھو دو ہٹی ـــــ ہم اسے انسان بنانے کی کوشش کر رہے ہیں ـــــ!"
ابھی تک یہ فرشتہ تھا اور اس کی زبان لذت سے نا آشنا تھی۔ ہم اس کو لذت کی عادت ڈال رہے ہیں۔۔۔۔۔۔۔ بلکہ نپل کی عادت ڈال رہے ہیں۔ پتہ نہیں یہ نپل کس چیز کا بنا ہوگا۔ ؟ لیکن ہم ایک خالص دنیوی اور مصنوعی چیز سے اس کے ذہن کو آشنا کر رہے ہیں۔ جب تک ماں کے پیٹ میں رہا۔ فرشتہ ہی رہا۔ دیکھا تم نے ـــــ دنیا میں رہنے کے لیے انسان بننا بہت ضروری ہے۔ اور اس کو انسان ہم اپنے طریقے سے بنا رہے ہیں ـــــ ویسے قدرت ان فرشتوں کے لیے ماں کی چھاتی کو مالا مال کر دیتی ہے ـــــ تاکہ ملاوٹ کے بغیر

پاک صاف دودھ ان کے مقدس دہن میں اترے ــــــ پر جب تک . . . . . .

انہوں نے نظر اٹھا کر رملی کیطرف دیکھا ــــــ

اسی وقت رملی کو اپنے سینے میں عجیب سی ٹیسیں محسوس ہوئیں۔ بھاری پن . . . . . . جیسے پتھر لڑھک کر سینے پر چڑھ آئے ہوں ــــــ اور درد کی میٹھی میٹھی چھریاں چل رہی ہوں....

کیا یہ مامتا ہے ــــــ؟

اس نے دل میں سوچا ــــــ

"لیکن بچّہ پہلوٹھی کا ہو تو دودھ اترنے میں دو چار دن لگ جاتے ہیں ــــــ تب تک ہم بچّوں کو مصنوعی دودھ کی لت لگا دیتے ہیں۔ پھر کہتے ہیں جی آج کل خالص انسان نہیں ملتے ــــــ"

رملی نے بہت حیران ہو کر بے جی کی طرف دیکھا ــــــ

ایک نیم خواندہ گاؤں کی بوڑھی عورت بڑے مزے سے اپنا فلسفہ بیان کر رہی تھی۔

بھوک لگی ہے بیچارے کو ــــــ مگر دیکھو ــــــ ہر بار نپل منہ سے نکال دیتا ہے تھوڑی دیر احتجاج کرے گا۔ پھر قدرت اسے بتائے گی۔ پیٹ بڑا پاپی ہے۔ خود ہی پئے گا۔ خود ہی پکڑ لے گا ــــــ . . . . . ."

"مگر بے جی ــــــ" رملی ایک دم بیقراری سے بولی۔

"آپ کو کیسے پتہ چلے گا کہ اسے بھوک لگی ہے۔"

"ہاں . . . . ہاں . . . . . یہ سب دنیا داری کے مرحلے ہیں جو یہ بچہ آپ ہی آپ طے کرے گا۔ زمانے کی ہوا ماں کے بطن سے مختلف ہوتی ہے ــــــ"

"ان چالیس دنوں کے اندر ہی تو قدرت اسے بتائے گی۔ وہاں روتا نہیں تھا۔ اور خوراک مل جاتی تھی۔ بادلوں جیسے بستر میں پڑا رہتا تھا۔ تیز روشنی نہیں تھی۔ اردگرد ماں کی مامتا کا نور تھا۔ دونوں کے دل ایک ساتھ دھڑکتے تھے ــــــ ماں اور بچے کا دل پیٹ کے اندر ہی ایک ساتھ دھڑکنا سیکھ لیتے ہیں۔ اسی لیے تو بچہ جہاں کہیں بھی ہو ــــــ تکلیف میں ہو تو ماں کا دل تڑپنے لگتا ہے ــــــ بچے کا دل ماں کے دل سے دھڑکنا سیکھتا ہے ــــــ احساسات کی ایک ڈور سی بندھ جاتی ہے۔ پر جب بچہ دنیا میں آتا ہے نا؟ تو سب سے پہلے یہ چکا چوند روشنی اسے بری لگتی ہے۔ دیکھا نہیں تم نے کسقدر زور سے آنکھیں بند رکھتا ہے ــــــ پھر رفتہ رفتہ اس کی پاک آنکھیں اس روشنی سے مانوس ہو جاتی ہیں۔ چالیس دن کے اندر اندر وہ اپنی عادتیں بدل لیتا ہے۔ بھوک لگے تو روتا ہے۔ چلّاتا ہے ــــــ آنکھیں کھول کے اردگرد

دیکھتا ہے ــــ آوازیں اس کو اچھی لگنے لگتی ہیں ــــ پھر جب تک بچہ روئے نہیں ماں دودھ نہیں دیتی ــــ اصل میں اسطرح ہم اسے احتجاج کرنے کی عادت ڈال دیتے ہیں۔ اسے پتہ چل جاتا ہے کہ اپنی بات منوانے کے لیے یا اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے چیخنا چلاّنا اور دوسروں کو بے سکون رکھنا جائز ہوتا ہے۔ .....؟"

بے جی نے بوتل ایک طرف رکھدی۔ اور بولیں۔ "وہ گھٹی والا محاورہ تو بس اب کتابوں کے لیے رہ گیا ہے۔ یہاں ہسپتالوں میں جس نرس کی ڈیوٹی ہو وہی منہ سے بوتل لگا دیتی ہے.... بابا کیا کریں ہم تو پرانے زمانے کے ہو گئے۔ کچھ کہیں تو نئی نسل مذاق اڑاتی ہے۔ گھٹی کو مذاق سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں بچے کو سرمہ نہ لگائیں۔ اس سے لکروں کی بیماری لگ جاتی ہے...... بے جی یہ کہہ کر چپ ہو گئیں کہ کہیں رملی برا نہ مان لے۔ پھر بوتل کے اوپر ہتھیلی چڑھا کے اسے ایک طرف رکھ دیا اور دُلار سے بولیں۔ جیون جوگا۔ سو بھی گیا ہے...... لو بس اتنی سی تو بھوک ہوتی ہے۔ نومولود کی۔ صرف دو تین قطرے ہی اندر گئے ہوں گے..... میں صدقے جاؤں ــــ"

انھوں نے بِب سے اسکا دہانہ صاف کیا۔

"بڑا صابر بچہ ہے ماشاءاللہ ــــ بالکل میرے معاذ کی طرح ــــ"

اوہ...... رملی نے کھینچ کے ایک لمبی سانس نکالی۔

اور ماں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے بے جی ــــ ماں صابر نہیں ہے۔ جس نے اپنے دل کا دھواں آہ کی صورت میں بھی باہر نہیں نکالا ــــ نفس نفس پہ تالے لگا کے بیٹھی ہے۔ آپ کو ہر گن اپنے بیٹے میں ہی نظر آتا ہے ــــ یہ خوبی بس آپ کے بیٹے میں ہے۔ اور یہ سرخ و سفید گورا چٹا، مکھن جیسا بچہ......

صاف نظر آرہا ہے کہ اس نے رنگ و روپ اپنی ماں سے لیا ہے۔ اسے کون معاذ کا بچہ کہہ سکتا ہے ــــ؟

مگر ممتا اندھی ہوتی ہے نا؟ ــــ

رملی کو کروٹ بدلنے سے تکلیف ہوتی تھی۔ اس لیے اس نے صرف سر موڑ لیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

عورت کیا کچھ قربان کر دیتی ہے ــــ

سیج بھی اور سپنے بھی ــــ پھر بھی بچہ اس کا نہیں ہوتا۔ ہر بچے پر باپ کی چھاپ ہوتی ہے!

پتہ نہیں جو بچے خوابوں سے سینچے جاتے ہیں وہ خواب پورے کرتے ہیں یا نہیں۔

تمہاری کروٹ بدل دوں آکے دونتی ———"

اسے اپنی پشت سے بے جی کی آواز آئی۔

رملی سیدھی ہو گئی۔ دو چار آنسو بہا کے اب اس کا دل ہلکا ہو گیا تھا۔ اس نے گردن بے جی کی جانب گھمائی۔ . . . .

وہ بڑے مزے سے بچے کو زانو پہ لیے اپنے ململ کے دوپٹے سے ڈھکے یوں بیٹھی تھیں جیسے کوئی سادھو دھونی رمائے آسن جمائے کوئی جاپ کر رہا ہو۔

ان کے چہرے پر اطمینان کا نور تھا۔ اور ذرا بھی تو تھکاوٹ کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔

رملی کا دل چاہا —— وہ بے جی سے پوچھے کیا بچہ آپ کی گود میں سو گیا ہے —— ؟ کیا آپ بچے کو اپنی گود سے مانوس کر لیں گی۔ ؟ مگر اس نے کچھ نہیں کہا۔ صرف ان کی بات کے جواب میں کہا۔

"میں اسی طرح ٹھیک ہوں بے جی۔ ابھی کروٹ بدلنے کو جی نہیں چاہ رہا۔"

بے جی نے دوپٹہ ہٹا کے بچے کو جھانکا ——

جس طرح ندیدہ بچہ کوئی کھانے کی چیز دیکھتا ہے۔ پھر رملی کیطرف دیکھا۔ اور کہنے لگیں . . . .

"میں جب اسکول میں پڑھتی تھی نا؟" . . . . .

پھر ایک دم اپنی ہی بات کاٹ کر بولیں "اب تم کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ اپنے آپ کو تعلیم یافتہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ بس جیسے اسکول گاؤں میں ہمارے زمانے میں ہوتے تھے . . . . . اس میں میری ماں نے مجھے بھی داخل کرا دیا تھا۔ اس زمانے میں لڑکیاں بمشکل پانچ چھ جماعتیں پڑھتی تھیں کہ ان کی شادی ہو جاتی تھی۔ ہاں تو جب میں اردو پڑھنے لگ گئی تو ادھر ادھر سے کتابیں مانگ کر پڑھا کرتی تھی۔ ایک بار میرے ابا نے مجھے ایک کتاب لا کر دی جس میں جنگ بدر کا واقعہ درج تھا۔ اس میں دو جوان بھائیوں کا ذکر تھا جو یہ تہیہ کر کے آئے تھے کہ اسلام کے سب سے بڑے دشمن ابوجہل کا خاتمہ کر کے رہیں گے۔"

"وہ بے جگری سے جان ہتھیلی پر رکھ کر لڑتے رہے۔ انہیں ایک ہی جنون تھا کسی طرح ابوجہل کے قریب پہنچ جائیں۔ آخر ہنگامے کے دوران ان کی عقابی نظروں نے ابوجہل کا پتہ لگا لیا۔ اور بجلی کی سی تیزی کے ساتھ جھپٹ کر اسکی طرف بڑھے۔ اور پے در پے حملے کر کے اسلام کے بڑے دشمن کا پُر غرور سر قلم کرنے کی سعادت حاصل کی۔ ان کے جوش

وخروش اور جذبۂ ایمانی کا یہ عالم تھا کہ ابو جہل کے بیٹے نے ایک مجاہد کا بازو تلوار سے کاٹ دیا مگر ایک تسمہ لگا رہ گیا۔ چونکہ یہ لٹکتا ہوا بازو لڑنے میں رکاوٹ پیدا کر رہا تھا۔ اس لیے اس صاحب ایمان بہادر نوجوان نے اسے الگ کر کے پھینک دیا۔ اور اپنے ایک ہاتھ سے ہی جنگ جاری رکھی۔ جب میں یہ واقعہ پڑھا کرتی تو میرے اندر جوش وخروش کا ایک ولولہ جاگ اٹھتا اور میں سوچتی اے کاش میں بھی لڑکا ہوتی۔ اور کسی جہاد میں شامل ہو سکتی۔"

بے جی ہنسنے لگیں۔

"جانتی ہو ان خوش نصیب نوجوانوں کے کیا نام تھے۔ ایک کا نام معوذ تھا۔ دوسرے کا نام معاذ تھا۔ بس معوذ اور معاذ —— دونوں نام جیسے میرے دل میں گڑ کر رہ گئے۔ پتہ نہیں یہ کہانی ہمیشہ میرے ذہن میں کیوں محفوظ رہی۔ جب میری شادی ہو گئی تو میں سوچا کرتی تھی۔ میں اپنے بیٹوں کے نام معوذ او معاذ رکھوں گی۔ اتفاق سے پہلی بیٹی ہو گئی۔ پھر دوسرا بیٹا پیدا ہوا۔ تو میں نے جھٹ اس کا نام معاذ رکھ دیا۔ ایاز صاحب میری اس خواہش کا بہت احترام کرتے تھے۔ ایک دن بھی انہوں نے اعتراض نہیں کیا —— لیکن صد افسوس"۔

—— وہ تھوڑی دیر کے لیے چپ ہو گئیں —— ......

جیسے یادوں کے سمندر میں غوطہ زن ہوں۔

پھر سر اٹھا کر بولیں۔

"ایاز صاحب کے انتقال کے بعد میں نے سوچ لیا تھا۔ معاذ کے بیٹے کا نام معوذ رکھ دوں گی"۔ ......

ان کے کہنے سے پہلے یہ بات رملیٰ کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ کتنی خوبصورتی سے بے جی نے اپنی خواہش بیان کر دی تھی۔ اور رملیٰ میں اتنی ہمت کب تھی کہ ان کی خواہش کی نفی کرتی اول تو وہ رملیٰ پر جان دیتی تھیں۔ بالفرض ایسا نہ بھی ہوتا تو معاذ کی خاطر اسے ایسا کرنا پڑتا۔ معاذ اپنی ماں کی خوشی کو ہر حال میں مقدم جانتا تھا۔

لیکن اصل بات یہ تھی کہ رملیٰ نے کبھی اپنے بچے کے نام کے بارے میں سوچا ہی نہیں تھا۔ وہ تو اسکی صورت ذہن میں نہیں لاتی تھی۔ بھلا اسے نام سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ حالانکہ نو بیاہتا لڑکیاں چن چن کر افسانوی اور رومانوی نام رکھتی ہیں۔ مگر وہ پورے نو مہینے اپنے دل پر پڑے بے نام دکھوں کی گرد ہی جھاڑتی رہ گئی تھی۔ اس لیے نام کیطرف اس کا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔

رملیٰ نے چونک کر دیکھا۔ بے جی اسکی طرف عجیب ملتجی نظروں سے دیکھ رہی تھیں وہ کچھ

رہی تھیں ۔شاید رملی کو یہ نام پسند نہیں آیا۔یا اس نے اپنے طور پر کوئی اور نام تجویز کر چھوڑا ہے ۔
رملی کو اپنی غلطی کا فوراً احساس ہو گیا۔اس لیے لہجہ خوشگوار بنا کے بولی ۔
"بے جی ــــ معوذ بڑا خوبصورت نام ہے اور مجھے بھی پسند آیا ہے۔"
اللہ تجھے خوش رکھے ۔سدا سہاگن رکھے ۔ دنیا کی سب خوشیاں دے تجھے ــــ
بزرگوں کا دل رکھنے والوں کو اللہ دنیا میں بڑا عزت و احترام دیتا ہے ۔ دیکھنا تجھے بہت بخت لگے
گا ــــ بہت پھلے پھولے گی تو ــــ میرے روئیں روئیں سے تیرے لیے دعا نکلتی ہے ۔"
رملی نے پھر آنکھیں بند کر لیں ۔آنکھوں پر کرب کے بادل چھا گئے تھے ۔ بے جی آپ
کی دعائیں میری تقدیر تو نہیں بدل سکتیں ــــ آپ کا بیٹا تو نہیں بدل سکتیں ــــ . . .
میں نیا جیون تو نہیں لا سکتی . . . . . .
"میں تجھے یخنی پلا دوں دو ہٹی ــــ" بے جی نے اٹھ کے بچے کو اسکی کھاٹ میں لٹا
دیا ۔اور تھوڑی دیر بسم اللہ ــــ بسم اللہ کر کے اسے تھپکتی رہیں ۔
پھر جالی والا رومال کاٹ کے اوپر ڈال دیا ۔
پیالے میں یخنی انڈیل کر لائیں اور کہنے لگیں ۔
"دو ہٹی ــــ یہ یخنی پی لے ۔اور ذرا منہ ٹھیک کر کے سر پر دوپٹہ اوڑھ لے ۔حافظ
صاحب آتے ہوں گے ۔"
"کون حافظ صاحب بے جی ــــ"
"بیٹی یہ ہمارے گاؤں کے حافظ صاحب ہیں ۔ بہت ضعیف ہیں ۔انہوں نے معاذ
کے کان میں اذان دی تھی ۔اللہ بخشے میری ساس بتاتی تھیں کہ معاذ کے ابا جی کے کان میں بھی
انہوں نے ہی اذان دی تھی اب نوے سال کے ہو گئے ہیں ۔مسجد کے امام رہے ہیں ساری
عمر ــــ بڑے باعمل اور باکردار عالم ہیں ۔اب جب کہ یہ زندہ ہیں تو میں نے سوچا معاذ کے
بیٹے کے کان میں بھی انہی سے اذان دلوا دوں ۔کل شام میں نے معاذ کو گاؤں بھیجا تھا ۔تا کہ
بہت آرام سے انہیں اپنی موٹر میں لے آئے ۔ بس ابھی وہ لوگ آتے ہوں گے ــــ
"بیٹی میرا یہ تجربہ ہے کہ بچے کے کان میں جس شخص کی پہلی آواز جائے وہ انتہائی دین
دار اور مومن آدمی ہو تو پوری زندگی ان الفاظ کا بچے کے کردار پر اثر رہتا ہے ۔"
"بے جی ــــ مگر بچے کو پیدا ہوئے تو آج دوسرا دن ہے اور وہ کئی آوازیں سن چکا ہے ۔"
"ہاں ــــ" بے جی نے برا سا منہ بنایا ۔
"بس مشنری ہسپتالوں کی یہی قباحت ہے ۔ اپنے نغمات تو ہر صبح سننے پر مجبور

کرتے ہیں مگر فوراً مولوی نہیں آسکتا ــــــ ..... پر کیا کریں بیٹی۔ ہر زمانے کے اپنے حالات ہوتے ہیں۔"

ابھی وہ دونوں اس فلسفے پر گفتگو کر رہی تھیں کہ باہر گھنٹی ہوئی اور پھر معاذ ایک سفید ریش سفید بھنوؤں والے ایک نحیف و نزار بزرگ کو لیکر اندر داخل ہوا۔

بے جی کھڑی ہوگئیں۔ حافظ صاحب کو کرسی پیش کی۔ معاذ کے ہاتھ میں ایک مٹھائی کا ڈبہ تھا۔ جو اس نے بے جی کو یہ کہہ کر پکڑا دیا کہ آپ کے لیے حافظ صاحب لائے ہیں۔

بے جی بچے کو اٹھا لائیں...... حافظ صاحب نے کانپتے ہاتھوں پر اسے تھام لیا..... مسکرا کر اسکو دیکھا۔ دم کر کے پھونک ماری۔ پھر اس کے دائیں کان میں پہلے اذان دی اللہ اکبر کی پہلی آواز سن کر بچہ ڈر گیا ــــــ ہاتھوں کی مٹھیاں کھل گئیں ــــــ اور پورا کا پورا جھنجھنا اٹھا ــــــ ہلکی سی چیخ ماری اور پھر کسمسانے لگا ــــــ

واقعی اللہ اکبر کی آواز انسان کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے ــــــ اک نومولود بھی اس کے اثر سے غافل نہیں ہے۔ رملیٰ نے دل میں سوچا۔

باری باری دونوں کانوں میں اذان دے کر حافظ صاحب نے بچہ بے جی کی گود میں دے دیا۔

"حافظ صاحب میری بہو کو بھی دم کر دیں۔"

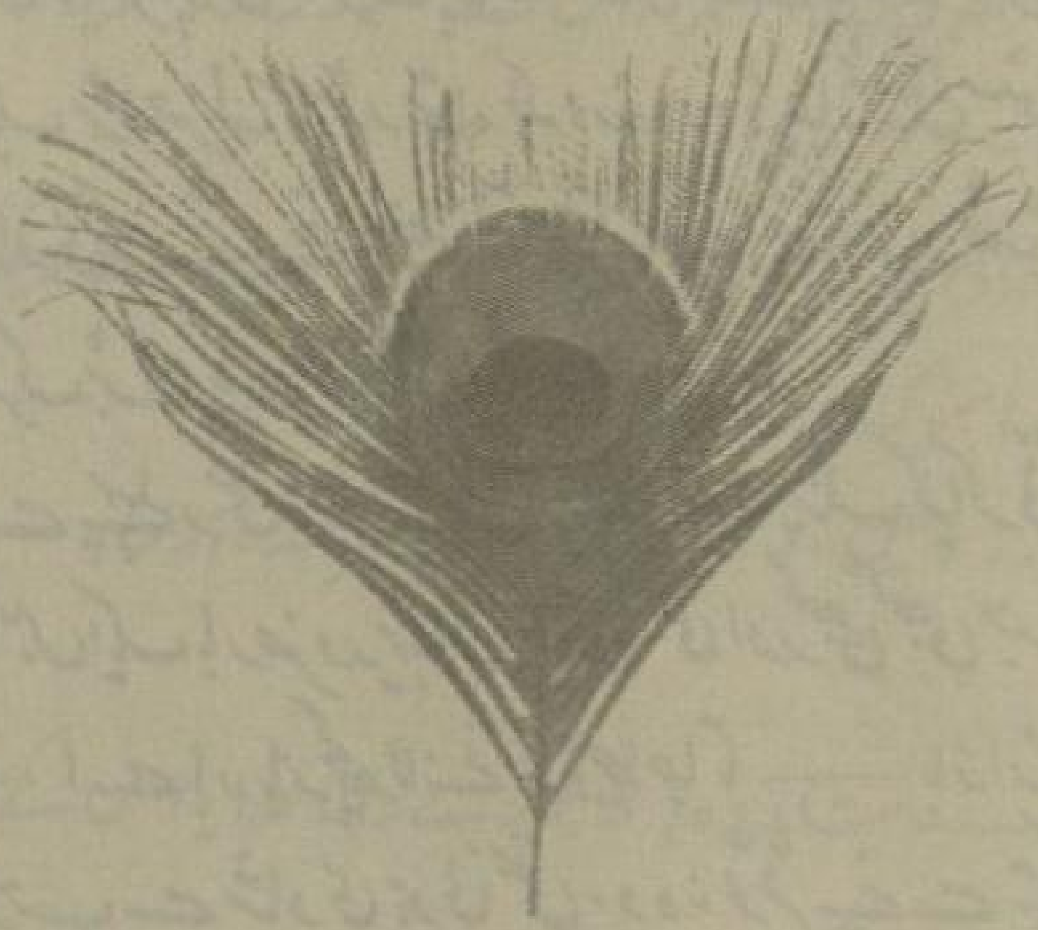
بے جی نے رملیٰ کو ذرا اونچا کر کے بٹھا دیا تھا۔

حافظ صاحب اس کے قریب آئے۔ سر پر ہاتھ رکھا اور آنکھیں بند کر کے دم کرنے لگے۔

رملیٰ کی آنکھوں میں پھر گرم گرم پانی اکٹھا ہونے لگا۔

پتہ نہیں دل میں اتنا سوز کہاں سے آگیا تھا ــــــ

جو بات منہ سے نہیں نکلتی تھی وہ آنکھوں سے نکلنے کو بیقرار رہتی تھی۔ اور معاذ بڑے غور سے اور بڑے ڈلار سے رملیٰ کے زرد ہلدی جیسے چہرے اور کانپتے لرزتے نیلے ہونٹوں کو دیکھ رہا تھا۔



دستور کے مطابق ہسپتال سے رملیٰ اپنی ماں کے گھر آگئی تھی ...... معوذ ایک مہینے کا ہوگیا تھا اور اس نے اپنے آپ کو اس کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں مگن بھی کرلیا تھا۔ اس روز رملیٰ کو معوذ کے لیے کچھ چیزوں کی خریداری کرنا تھی۔

معوذ کو نہلا دھلا کر سلا دیا۔ پھر ہاتھ منہ دھو کر کپڑے بدلے اور اپنے لمبے بالوں پر کنگھی کر کے انہیں کھلا چھوڑ دیا۔ پھر پرس پکڑ کے باہر آگئی۔ اور امی جان سے کہنے لگی۔

"امی میں ذرا بازار جا رہی ہوں۔"

امی نے مڑ کر دیکھا اور بولیں۔

"شام کو تیرے ابا آتے تو ان کے ساتھ چلی جاتی"۔

"امی جی —— کئی دنوں سے تو اباجی کے جلدی آنے کا انتظار کر رہی ہوں۔ مگر وہ رات کو اتنی دیر سے آتے ہیں کہ میں جا نہیں سکتی۔ معوذ کی ضرورت کی سب چیزیں ختم ہوگئی ہیں۔ کل ایک فیڈر بھی ٹوٹ گئی ہے۔ مجھے بھی اپنی کچھ چیزیں لانا ہیں۔ بس یہ سامنے والے سٹور پر جاؤں گی جو کچھ یہاں سے مل سکا لے آؤں گی۔ باقی چیزیں پھر اباجی کے ساتھ جا کر لے لوں گی۔

"ٹھیک ہے"! امی نے دوبارہ عینک لگالی اور اخبار کا اندر والا حصّہ اپنے آگے پھیلا لیا۔ "خانساماں کو ساتھ لیتی جاؤ۔۔۔۔"۔

"نہیں امی"۔ رملیٰ بولی ——

"دو قدم پر تو اسٹور ہے۔ وہ بیچارہ کوئی کام کر رہا ہوگا اور پھر کون سا میں پہلی مرتبہ جا رہی ہوں۔"

رملیٰ کی امی کا گھر چھوٹی سڑک پر تھا۔ لیکن جونہی چھوٹی سڑک سے نکل کر سامنے مین روڈ پر جائیں تو وہاں ایک بڑا جنرل سٹور تھا۔ بلکہ اب وہ ڈیپارٹمینٹل اسٹور بن گیا تھا۔ اس کالونی کے لوگ یہیں سے خریداری کرتے تھے۔ چھوٹی سڑک کے اختتام پر ٹھنڈی بوتلوں کا ایک سٹال بھی تھا۔ اس لیے یہ سڑک بڑی بارونق تھی۔

شادی سے پہلے رملیٰ اکثر اسی سٹور سے شاپنگ کیا کرتی تھی۔ بلکہ چھوٹی موٹی خریداری کے لیے دن میں ایک بار ضرور یہاں جاتی تھی اور کبھی کبھی جب گھر میں کوئی بہن یا بھابھی آئی ہوتی تو —— اسے بار بار کچھ لانے کو بھیجا جاتا —— بازار میں خریداری کرنا رملیٰ کو بہت پسند تھا۔ مگر جب سے شادی ہوئی تھی۔ وہ نہ تو قرینے سے میکے آ کر رہی اور نہ اپنے دل پسند اسٹور پر خریداری کے لیے جا سکی۔ اب کئی دنوں سے وہ بازار جانا چاہ رہی تھی معاذ بھی یہاں نہیں تھا۔ وہ پچھلے ہفتے دفتری کام سے کراچی چلا گیا تھا۔ آج مجبور ہو کر وہ تیار ہو گئی۔ پھر اپنا پرس جھلاتی باہر نکل آئی۔ سڑک اسی طرح مصروف تھی —— اپنی شادی کی شاپنگ کرتے ہوئے وہ ہزاروں بار اس سڑک پر سے مختلف جذبات کے ساتھ گزری تھی۔ مگر آج جب اسی سڑک پر چلی جا رہی تھی تو قدم بہت سُست تھے۔ ان میں نہ وہ خود اعتمادی تھی اور نہ جوانی کا وہ غرور تھا۔ کتنی عجیب بات ہے۔ اس نے سوچا وہ ایک سال کے اندر اندر بچے کی ماں بن گئی تھی۔ مگر اس کے ذہن نے ابھی تک اس کی شادی کو ہی قبول نہیں کیا تھا۔

اب وہ سڑک پر اس طرح سے جا رہی تھی جیسے مفلوک الحال ہے۔ کل تک جو خزانہ اس نے چھپایا ہوا تھا۔ بیدردڈاکو لوٹ کر لے گئے ہیں۔ اپنے خالی ہونے کا احساس اسے پہلے بھی کئی بار ہوا تھا۔ اور اب اپنی چال کے نمایاں فرق کو وہ صاف محسوس کر رہی تھی۔

چھوٹی سڑک کے آخری کونے پر رک کر اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ مین روڈ پر کوئی ٹریفک نہیں تھا۔ اس نے سڑک پار کر لی اور اسٹور کیطرف بڑھی تو ماچس کی ایک جلتی ہوئی تیلی عین اسکی قمیض کے اگلے حصے پر آ کر لگی۔ ڈر کر وہ ایک قدم پیچھے ہوئی۔ قمیض کو غور سے دیکھا پھر غصے بھری نظر اٹھا کر اس موٹر کی طرف دیکھا جس میں سے تیلی آئی تھی۔

وہاں اسٹیرنگ پر ایک نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ نوجوان کے منہ میں سگار تھا۔ اور دوسرے ہاتھ میں ماچس تھی۔ سگار کو سلگا کے اس نے بے خیالی میں تیلی اسطرح پھینکی تھی۔ کہ تیرتی ہوئی رملیٰ کی قمیض کے دامن پر لگی جا کر —— یہ تو اچھا ہوا کہ قمیض کو لگتے ہی تیلی ہولے بجھ گئی۔ ورنہ اسکا دامن جل جاتا ——

جب رملیٰ نے ملامت بھری نظروں سے دیکھا تو وہ ایک دم دروازہ کھول کر باہر نکل آیا اور سر تا پا معذرت بن گیا ——

اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے انکساری کی تصویر بن گیا ——— بڑے نرم اور رقت آمیز لہجے میں بولا۔

"میں معافی چاہتا ہوں غلطی سراسر میری ہے۔ مجھے دیکھ لینا چاہیئے تھے اور پھر مجھے حق نہیں پہنچتا کہ میں سڑک پر اسطرح تیلیاں پھینکوں ——— ..... سڑک راہگیروں کے لیے ہوتی ہے .... میں .... میں بہت شرمندہ ہوں ......"

"پلیز .... "

بس ——— شاید وہ ہاتھ جوڑنے والا تھا یا اس کے احساس ندامت نے ہاتھ جوڑ ہی لیے تھے ———

رملیٰ تو اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہ گئی۔

چمکتی ہوئی شیشے کی گولیوں کی طرح متحرک اور بے چین آنکھیں۔ اتنی صاف جتنا آسمان ——— کہیں کہیں شفق رنگ ڈورے ———

کتنا خوبصورت آدمی ہے ———، رملیٰ نے سوچا ....

"جی ..... کہیں آگ تو نہیں لگی ———" اس نے جھک کر رملیٰ کی ہلکے کاسنی رنگ کی قمیص اسطرح دیکھی جیسے سونگھ رہا ہو۔ پھر یوں کھڑا ہو گیا جیسے اسکی خوشبو کا گھونٹ بھر لیا ہو۔

"اللہ کا شکر ہے۔ آپ کو آگ نہیں لگی ......"

"تو تم مجھے آگ لگانا چاہتے تھے ———"..... رملیٰ نے گھور کر اسکی طرف دیکھا۔

"میں معافی چاہتا ہوں۔ پلیز معاف کر دیں ....."

وہ بہت قریب کھڑا تھا۔ اس چمکیلی صبح میں وہ بہت تر و تازہ لگ رہا تھا ——— اس کے صحت مند چہرے پر لالیاں ابھری ہوئی تھیں ..... بس رملیٰ کی آنکھوں کے آگے اس کا چہرہ چھا گیا اور پھر رملیٰ بل کھا کر سٹور کے اندر چلی گئی اور اس نے منہ سے کچھ بھی نہیں کہا ———

وہ کچھ کہنے کے قابل نہیں تھی۔ جب وہ تھکاوٹ سے نیم جان ہو رہی تھی اور اپنا زادِ راہ لٹا چکی تھی۔ اچانک اسے اپنے خوابوں کا شہزادہ نظر آ گیا تھا۔ ایسا ہی ایک آدمی اس کے ذہن میں رہا کرتا تھا۔ سلگتا ہوا۔ آنکھوں میں شیشے کی گولیاں سجائے ——— دور مار میزائل کی طرح خفیہ ٹھکانوں کو پھونکتا ہوا ....

اسٹور کے اندر جا کر بھی کافی دیر تک اس کی اتھل پتھل سانس ٹھیک نہ ہو سکی۔ جلدی میں وہ غلط کاؤنٹر پر کھڑی ہو گئی۔ اور جب سیلز مین نے آکر فرمایئے کہا تب اسے خیال آیا کہ اسے باورچی خانے کا سودا سلف نہیں لینا تھا وہ مڑی اور مڑ کر اسٹور کے دوسرے حصے میں

چلی گئی۔

اس وقت اسٹور میں کافی خواتین شاپنگ کر رہی تھیں۔ اس نے کسی کی طرف غور نہیں کیا۔ اپنی شوریدہ سرامنگوں کی آواز سے بچنے کے لیے جلدی سے پرس کھول کر کاغذ نکالا۔ جس پر چیزوں کی فہرست لکھی ہوئی تھی۔ اور پھر آہستہ آہستہ اسے آرڈر دینے لگی۔۔۔۔۔

آرڈر نہیں دینے لگی بلکہ اپنے آپ کو برا بھلا کہنے لگی۔

دوکاندار ساری چیزیں نکال نکال کر کاؤنٹر پر رکھتا گیا۔ نپل، بوتلیں، نیپکن ــــــ گرائپ واٹر۔۔۔۔۔ صابن لوشن۔۔۔۔۔۔

وہ اپنی مرضی کی چیزیں چن کر الگ رکھتی گئی۔۔۔۔۔۔ اور جب دوکاندار بل بنا رہا تھا اور وہ شوکیس میں پڑی ہوئی چیزوں پر نظر دوڑا رہی تھی تاکہ کچھ اور یاد آجائے تو لے لے۔ــــ اسی وقت ایک سایہ سا اس کے پیچھے لہرایا۔

مڑکر دیکھا ــــ تو وہی کھڑا تھا۔ بالکل قریب ــــ

اُف اگر وہ ڈگمگاتی تو اس سے ٹکرا جاتی ــــ

"کیا اسے اپنی وجاہت کا احساس ہے ــــ"

جب وہ سیلزمین سے کسی شے کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ رملی نے بغور اسکا جائزہ لیا۔ درمیانے قد کے ساتھ اس کے بہت ہی متناسب اعضاء تھے۔ پینٹ اور ٹی شرٹ میں بہت ہی کم عمر لگ رہا تھا۔ ہونٹوں کے اوپر بڑی طرح دار مونچھیں تھیں جس سے اس کی شخصیت نکھر گئی تھی۔ وہ ان بہت کم خوش نصیب لوگوں میں سے تھا جن کے چہرے پر مونچھیں اجالا بکھیر دیتی ہیں۔ اس کی گردن میں ایک خاص بات تھی اور وہ بے تحاشا سگار پی رہا تھا ــــ سگار کا دھواں خارج کرتے وقت وہ آنکھیں ذرا سی سکوڑ لیتا اور بڑے مزے سے اسے اپنا جلوہ دکھا کے وہ باہر نکل گیا ــــ بچے کی خوبصورت اور پیاری پیاری چیزیں جو پھولوں کی طرح آس پاس بکھری ہوئی تھیں ــــ رملی سے میلوں دور چلی گئیں ــــ اس نے کاؤنٹر پر جا کر بل ادا کیا ــــ اپنا تھیلا اٹھایا اور جب مڑنے لگی تو ایک فیشن ایبل خاتون سے ٹکرا گئی ــــ

"ارے رملی ــــ؟"

اس فیشن ایبل خاتون کے منہ سے اپنا نام سن کر اس نے سر اٹھایا اور اس کی طرف غور سے دیکھا ــــ

"جیدہ تو ــــ"؟

پھر دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔۔۔۔۔۔

خیریت اسی میں تھی کہ وہ کاؤنٹر سے دور ہو جائیں۔ لوگ انہیں کافی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔

جیدہ رملی کی کلاس فیلو تھی۔ دونوں اسکول سے اکٹھی کالج آئی تھیں۔ لیکن فرسٹ ایئر کا امتحان دینے کی بجائے جیدہ نے شادی کرلی تھی۔ ان دنوں اس کا رومانس کالج میں بہت مشہور ہوا تھا۔ بلکہ وہ عشق میں نیم پاگل نظر آتی تھی۔ پھر سنا کہ اس کی شادی ہوگئی اور شادی کے کافی عرصہ بعد کسی نے بتایا کہ وہ اپنے شوہر کے ہمراہ انگلینڈ چلی گئی ہے۔

اور پھر آج اتنے عرصے بعد اسے دیکھکر اس سے مل کر رملی کو عجیب طرح کی خوشی محسوس ہوئی ——!

"اُف جیدہ کتنے عرصے بعد ملے ہیں ہم —— امید نہیں تھی میں کبھی تمھیں دیکھوں گی —— ؟"

اچھا یہ بتا تیری شادی ہوئی ہے کہ نہیں —— بس ویسی ہی لگ رہی ہے —— ہاں تھوڑی سی موٹی ہوگئی ہے۔

رملی سوگواری سے ہنسی ...... معاذ کا چہرہ اس کے سامنے آگیا۔ وہ کوئی جواب نہ دے پائی ——

"تو سنا —— کوئی بچہ بھی ہے —— "؟

"نہیں ——" جیدہ اداسی سے بولی۔

"پاکستان کب آئی ہو ——"؟

"اب تو عرصہ دراز ہوگیا۔"

"مگر تو اپنے بارے میں بات گول کر رہی ہے۔ ہے کچھ دال میں کالا ——"

جیدہ نے اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا تھیلا دیکھا —— پھر ذرا سا منہ کھول کر اندر جھانکا ——

"ارے یہ تو بچے کی چیزیں ہیں —— بتا بتا —— بتاتی کیوں نہیں —— تیرے بچہ ہوا ہے ——؟"

رملی پھیکی سی ہنسی ہنس پڑی اور سر کے اشارے سے اثبات میں جواب دیا ——

"کب —— کہاں ——"

"کب ہوئی تیری شادی ——؟"

"اب ساری باتیں اسٹور کے اندر ہی پوچھے گی؟"

"تو اور کہاں پوچھوں ــــــ؟"

"اچھا یہ بتا تو کہاں رہتی ہے آجکل ــــــ؟" رملی نے پوچھا۔

"یہیں ماڈل ٹاؤن میں ــــــ"

"نمبر بتا ــــــ"

بھئی یہ سامنے والی سڑک ہے نا؛ اس کے آخر میں ــــــ ۷۶ نمبر کی کوٹھی ہے نا اسکی انیکسی میں آئے ہیں ــــــ"

"غضب خدا کا ــــــ اور مجھے پتہ ہی نہیں"۔ رملی بولی۔

"کیوں ــــــ کیا تو ان لوگوں کو جانتی ہے ــــــ؟"

"جانتی کی بچی وہ میرے والدین کا گھر ہے اور آجکل میں وہیں آئی ہوئی ہوں۔

"سچی ــــــ؟"

جیدہ نے خوشی سے دمکتے ہوئے کہا۔

"مگر میں نے تو تجھے وہاں کبھی نہیں دیکھا ــــــ"

"کتنے دنوں سے وہاں ہے ــــــ؟"

"چھ مہینے سے ــــــ"

"مجھے یاد ہے۔ امی نے ایک بار مجھے بتایا تھا کہ یہ کرائے دار بڑے اچھے ہیں۔ ایک نوجوان جوڑا ہے ــــــ مگر میں نے کبھی غور ہی نہیں کیا تھا۔ تجھے معلوم ہے یہ انیکسی پچھلے سال بڑے بھائی جان نے بنوائی تھی۔ ان دنوں بھائی جان کا ارادہ بال بچوں کو لیکر پاکستان آنے کا تھا۔ مگر اب بھابی نے انکار کر دیا ہے۔ کہتی ہیں میں دو سال بعد آؤنگی تو اباجی نے کہا تھا۔ گھر خالی رکھنے سے بہتر ہے کرائے پر دے دیا جائے۔ پتہ ہے تم پہلے کرائے دار ہو ــــــ اور میرا خیال ہے تم گھومنے پھرنے کے شوقین ہو۔ اس لیے میں نے تم کو کبھی گھر کے باہر نہیں دیکھا۔"

"اصل میں ہمارا گیٹ بھی تو دوسری طرف ہے اور پھر تم ٹھیک کہتی ہو۔ ہم دونوں گھومنے پھرنے کے بہت شوقین ہیں۔ بچہ تو ہے نہیں وہ افسردگی سے بولی ــــــ تو کیا کریں اپنے آپ کو مصروف رکھتے ہیں۔"

رملی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس بات کا کیا جواب دے ــــــ

جیدہ بولی۔

"آ تجھے اپنے میاں سے ملاؤں۔ باہر بیٹھے ہیں۔"

جیدہ نے پہلے بل ادا کیا۔ سودے کی ٹوکری اٹھائی اور پھر دونوں آگے پیچھے باہر

نکل آئیں۔

جیدہ کو دیکھتے ہی وہی آدمی موٹر سے باہر نکل آیا ——
اسی وقت ایک کانٹا سا رملی کے دل میں چبھا —— اور ایک زردسی بدلی اس کے چہرے پر چھاگئی —— بس ذرا کی ذرا ——
پھر وہ اپنے آپ میں لوٹ آئی۔ بلکہ انتہائی سنگدل فقرے کے لیے اپنے آپ کو تیار کرلیا۔

"یہ میرے شوہر ہیں......"

یہ.......

یہ.......

یہ...... یہ میرے شوہر ہیں۔

شوہر ہیں...... شوہر ہیں...... شوہر ہیں......

سڑک کی گرد اڑاڑ کر رملی کا مذاق اڑانے لگی تو کسی کی بیوی ہے۔ یہ کسی کا شوہر ہے۔ اس دنیا میں یہی ہوتا رہتا ہے ——

رملی نے ایک زبردستی کی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر سجائی اور اسے سلام کیا۔

"یاور یہ میری بچپن کی دوست ہے رملی ——"

یاور.... یاور..... یاور.....

رملی نے پلکوں سے یہ نام چنا ——

یاور نے بڑے دلکش انداز میں اس ہاتھ سے سلام کیا۔ جس ہاتھ کی دو انگلیوں میں ولایتی سگار پکڑا ہوا تھا۔

مسکرایا —— جیسے کسی نے قندھاری انار چھیل دیا ہو اور پھر بولا۔

"میں تو انہیں ابھی آگ لگانے والا تھا ——"

(اور جیسے تم نے مجھے پھونک کے نہیں رکھدیا)

"اچھا —— "جیدہ نے اپنے اسی پرانے انداز میں قہقہہ لگایا۔

"یاور! پلیز اب بس کرو۔ یہ آگ لگانے والا کھیل بند کرو۔"

یاور نے ٹوکری جیدہ کے ہاتھ سے پکڑلی۔ ڈکی کھولی اور اسمیں رکھ دی۔ پھر واپس آگیا اور اسی بے پروا انداز میں بولا۔

"یہ تو بہت محتاط معلوم ہوتی ہیں۔ انہوں نے اپنے دامن کو آگ ہی نہیں لگنے دی"

دل...... دل..... دل.....

رملیٰ کے نتھنے پھڑکنے لگے۔
(دل میں بھر لی آگ جس سے دامن کو بچایا)
رملیٰ نے نظریں جھکالیں ......"
اور یاور مسز بے لے کر اسے تیلی پھینکنے اور رملیٰ کے برہم ہو کر گھورنے کا قصہ سنانے لگا۔
"جس طرح یہ گھور کر اندر چلی گئی تھیں۔ میں سمجھا غالباً یہ خاتون گونگی ہیں۔"
(اور اس کی تصدیق کرنے تم اندر چلے آئے)
"ویسے فی زمانہ خوبصورت عورت کی یہ ایک ایکسٹرا کوالی فیکیشن ہے کہ وہ گونگی ہو۔"
"یاور..... یاور....." جیدہ مچلنے لگی۔
بس اب تم پھر عورتوں کو لتاڑنے لگے۔
"بھئی کسی بہانے سے تو یہ بولیں گی۔ میں نے تو ان کی آواز ہی نہیں سنی ــــــ"
"اچھا رملیٰ" جیدہ نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔
"انشاء اللہ آج شام تم سے ملاقات ہو گی ــــــ ہم دونوں آئیں گے تمہارے بچے اور شوہر کو دیکھنے ــــــ ......"
اسی وقت رملیٰ نے نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ یاور کے چہرے پر سایہ سا لہرایا ــــــ ایسا سایہ جو رملیٰ کے دل پر لہرایا تھا۔ یہ دلوں کے سائے چہروں پر کیوں آجاتے ہیں؟
رملیٰ گھر پہنچی تو اسکا چہرہ بجھا بجھا تھا۔ ایک مہینے میں اس نے اپنی زندگی کا دھارا موڑ لیا تھا۔ اور ایک نئی ڈگر پر چل پڑی تھی۔ اپنے آپ کو زندگی کے حوالے کر دیا تھا۔ آج پھر طبیعت اکھڑ گئی تھی اور قدم ڈگمگائے جاتے تھے ــــــ پھر محرومیوں کے ناگ سرسرانے لگے تھے ــــــ پھر تن من کو پھونکنے والی آندھیاں اٹھ رہی تھیں۔
جلدی جلدی قدم اٹھا کر گھر پہنچی ــــــ
تو معوذ نے رو رو کر سارے گھر کو سر پہ اٹھا رکھا تھا ــــــ اوہ ــــــ وہ تو بھول ہی گئی تھی کہ بچے کو گھر پر سلا کر گئی ہے ــــــ
بچے کو بھول جانا ماما تا کی ریت نہیں ــــــ نزع میں بھی ماں بچے کو یاد رکھتی ہے ــــــ ہاں ــــــ لیکن راستے سے بھٹک جائے تو بچہ ذہن سے محو ہو جاتا ہے ــــــ
رملیٰ نے تھیلا میز پر رکھا اور لپک کر معوذ کو پکڑ لیا۔
ننھی سی جیز رو رو کر نیم جان اور ہلکان ہو رہی تھی۔ ہاتھ اور ہونٹ نیلے ہو رہے

تھے۔ اور سارا جسم سرخ ہو گیا تھا۔

"اس کو کیا ہوا ہے امی ——؟"

رملی نے گھبرا کر اپنی امی کی طرف دیکھا۔

"کچھ نہیں زیادہ رونے سے بچّے پر تشنج کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے —— پہلے اسے چپ کراؤ۔ تمھاری گود کی خوشبو ملے گی تو چپ ہو جائیگا۔ چپ کرا کے اسے اپنا دودھ پلاؤ۔ پہلی دفعہ چھوڑ کر گئی ہو۔ بچّے بہت حساس ہوتے ہیں۔ سب جان جاتے ہیں ——"

رملی نے اناڑی پن سے معوذ کو سینے سے لپٹایا —— ہلایا جلایا —— چمکارا پیار کیا —— تب اس کے جسم کا تشنج رفتہ رفتہ کم ہوا ...... رو رو کر اس کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔

امی جان نے بتایا کہ "تمھارے جاتے ہی اٹھ گیا تھا۔ پہلے تو ٹھیک ٹھاک کھیلتا رہا پھر میں نے بوتل سے پانی بھی پلایا —— پھر نہ جانے کیا ہوا۔ ایک دم مچل اٹھا۔ ہاتھوں سے نکلنے لگا میں تو سچ مچ گھبرا گئی۔ بھئی بڑا من موجی بچّہ ہے۔"

"اب دیکھو تمھارے سینے سے لگتے ہی چپ ہو گیا —— توبہ توبہ —— نہ چھوڑ کے جایا کرو اسے ——"

"میں تو بابا سے موجی ہی کہا کروں گی۔......"

رملیٰ نے معوذ کو سینے سے لگایا اور اپنے کمرے میں آگئی۔ اسے اپنے دیر لگانے پر ندامت سی محسوس ہونے لگی ....

اف اتنی معصوم جان تڑپتی رہی ...... اور وہ سرابوں میں الجھ گئی۔

بستر پر بیٹھتے ہی رملیٰ نے معوذ کو زانو پر لٹا لیا۔ اور زانو پر لیٹتے ہی معوذ نے اپنا چہرہ بائیں طرف موڑ لیا یا اس کا چہرہ خود بخود بائیں طرف مڑ گیا۔...... اس کے نتھنوں میں مقدس دودھ کی خوشبو پہنچ گئی تھی۔ رملیٰ نے دیکھا اس کی قمیص گیلی ہو رہی تھی ——

یہ تعلق کیا ہے ——؟

اس نے دل میں سوچا ——

طلب ہے —— چاہ ہے —— یا ضرورت ——

بچّے کو بھوک لگتی ہے تو دودھ چھاتیوں میں سرسرانے لگتا ہے ......

بچّہ چیخ چیخ کر روتا ہے۔ ماں کی قمیص گیلی ہو جاتی ہے ——

یہ تحفے تو آسمانوں سے اترتے ہیں۔ یہ کسی سائنس کی ایجاد نہیں ——

یہ پیمانے قدرت کے ہیں ......

انہیں قدرت ہی چھلکاتی ہے ـــــــــ

کیا خدا کو جاننے کے لیے اتنا کافی نہیں ......

نازک نازک ـــــــ معصوم ...... نرم وگداز ...... مطہر اور بے ریا ہونٹوں کی خفیف سی جنبش دودھ کی دھاریں کھول دیتی ہے ـــــــ

معوذ کو دودھ پلانے سے رملی کو ایک درد آمیز سکون اور آسودگی سی محسوس ہونے لگی۔ وہ غور سے اس کی بند آنکھوں کو دیکھنے لگی۔ بند آنکھیں جو اپنی ماں کو اچھی طرح دیکھ سکتی تھیں محسوس کر سکتی تھیں ـــــ اسوقت پوری کائنات ان بند آنکھوں کے حلقے میں تھی ـــــــ

بچے کے چہرے پر طمانیت کا نور تھا ـــــــ

وہ اسوقت اپنے سب سے قیمتی تخت پر بیٹھا تھا ـــــــ

وہ دنیا کا سب سے امیر انسان تھا ـــــــ

یہ ماں کی حقیر سی گود ...... اس کی حسین کائنات تھی ......

رملی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ......

اس نے دوسرے ہاتھ سے معوذ کی بند مٹھی پکڑ لی اور اسے اپنے ہونٹوں سے لگا لیا

معوذ میرے بچے ـــــ دنیا بڑی گندی جگہ ہے۔ مجھے بچا لینا ـــــــ

ان ہونٹوں کا صدقہ ـــــ میرے تن کا ایک ایک دکھ چن لینا ـــــ مجھے بچا لینا ـــــ

رملی باقاعدہ رونے لگی۔

وہ کیا جانتی تھی مامتا کیا بلا ہوتی ہے ـــــــ

یہ تو اس دن معلوم ہوا جس دن معوذ نے مقدس دھاروں کو پہلی مرتبہ اپنے ہونٹوں سے پیا ـــــــ

اور اس مرحلے سے آگہی بھی بے جی کی وجہ سے ہوئی۔

وہ بچے کو دودھ پلانے کے حق میں نہیں تھی ...... مگر بے جی نے ایک دن ہسپتال میں خوب لیکچر پلایا تھا۔

"وہیٹی یہ تکلیف تو دو چار دن کی ہے۔ رفتہ رفتہ جب بچہ عادی ہو جائیگا تو تجھے دودھ پلانے میں سکون ملے گا۔ پگلی یہ قدرت کے خزانے ہوتے ہیں۔ ان کی ناقدری نہیں کرتے آج کل کی ماڈرن مائیں نہیں جانتیں کہ وہ بچے کو کس شے سے محروم کر دیتی ہیں۔ تبھی تو آج کل ماں اور بچے کا وہ رشتہ نہیں رہا۔ بچے بھی جوان ہوتے ہی پرے پرے ہو جاتے ہیں۔ اور مائیں بھی انہیں ڈبے کے دودھ پہ ڈال کے سرخرو ہو جاتی ہیں۔ میری بات مانو ـــــ اگر بچہ ماں کا

دودھ پیتا ہو تو سو بلاؤں سے محفوظ رہتا ہے۔ اور پیٹ تو اس کا کبھی خراب ہوتا نہیں —— ڈھکی چھپی چیزوں میں برکت ہوتی ہے۔ قدرت کا کوئی کام گہری مصلحت سے خالی نہیں ہوتا..... اور پھر تم کون سا ملازمت پیشہ عورت ہو۔ جو بچے کو ڈبے کا دودھ لگانا چاہتی ہو —— ..... میرا کہا مان جاؤ..... بعد میں پچھتانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا ——

شاباش ——

بچے کو اللہ کی ایک اچھی نعمت سے محروم نہ کرو .....

اور روتے روتے رملیٰ نے سوچا —— بے جی نے کتنی صحیح بات بتائی تھی۔ بچے کو دودھ پلا کر اسے کتنا سکون ملتا ہے۔ خود وہ دنیا کے اونچے مینار پر پہنچ جاتی ہے —— اپنی ذات کے اندر خود اعتمادی کے کنوئیں نکلنے شروع ہو جاتے ہیں..... اور دل ایک عجیب روحانی لذت سے سرشار ہوتا ہے —— شاید یہی ماں اور بچے کا تعلق ہے ——

شاید دنیا میں اس سے خوبصورت اور کوئی نظارہ نہیں.....

اس نے اپنے آنسو صاف کر لیے..... دیکھا تو معوذ گہری نیند سو گیا تھا.....

کتنی جلدی سو جاتا ہے بلا ——

اس نے محبت سے مسرور ہو کر سوچا —— ماں کا دل نہیں بھرتا اور بچہ سو بھی جاتا ہے۔

اسے گود میں لیا تو ساری دنیا سے بے نیاز ہو گئی..... اس نے معوذ کو دونوں ہاتھوں پر اٹھایا اور اپنی کھاٹ میں ڈال دیا۔ اس کے سرخ ہونٹوں پر سفید دودھ کا ایک قطرہ رہ گیا تھا —— یہ قطرہ اسے روشن چاند کی طرح نظر آ رہا تھا۔ جیسے یہ قطرہ اس کے سرخ خون کا دوسرا رنگ ہو —— مگر اس نے ململ کا رومال اٹھایا اور آہستہ سے اس قطرے کو صاف کر دیا —— معوذ نے موہوم سی جنبش کی —— پھر سو گیا ——

رملیٰ آ کے بستر پہ لیٹ گئی —— بالکل سیدھی ——

آنکھیں بند کیں —— تو سڑکوں کی گرد اڑ اڑ کر ایک ہیولہ بنانے لگی ——

اف ——

اس نے گھبرا کر کروٹ بدل لی۔

اس وقت اسے محفوظ ترین قلعہ صرف معوذ ہی نظر آ رہا تھا۔



شام بھی ہوگئی ـــــ جس طرح روز ہو جاتی ہے. مگر اس شام . . . . . رملی کے اندر اضطرابی سی لہریں اٹھ رہی تھیں ۔ بظاہر اس نے اپنے دل سے کہا تھا ۔ مجھے تو شام کا بالکل بھی انتظار نہیں ہے ـــــ اونہہ ـــــ

مگر بے خیالی میں اٹھ کر اپنا ایک خوبصورت پرنٹڈ سوٹ نکالا اور غسل خانے میں چلی گئی ۔ کپڑے بدل کر آئینے کے آگے آکر کھڑی ہوگئی ۔ اپنا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد اسے محسوس ہوا کہ اسکا پیٹ ذرا سا نکل آیا ہے، اور اس پیٹ کو فٹ ٹھیک کرنا ہے ـــــ اپنی پرانی حالت پہ واپس جانا ہے ـــــ پتلی نازک کمر کا دھیان رکھنا ہے ـــــ

مگر کیوں ـــــ ؟

ویسے ہی۔ اس کے دل نے جواب دیا۔

آہستہ آہستہ اس نے میک اپ کیا۔ اپنی خوبصورت اور اداس آنکھوں کو مسکارے سے سنوارا ـــــ لمبے چمک دار بالوں پر برش کر کے انہیں کھلا چھوڑ دیا۔ گھوم کے اپنے آپ کو آگے پیچھے سے دیکھا ـــــ

ایسا کیوں کر رہی ہے ـــــ

ویسے ہی . . . . . .

کون آنے والا ہے ـــــ ؟

کوئی نہیں ـــــ

کوئی نہیں —— کوئی نہیں ——

سَرسَر کرتے بال ادھرادھر بکھر کر اس کا مذاق اڑانے لگے۔

اونہہ

میں شادی شدہ عورت ہوں۔ مجھے سنگھار کرنے کا حق نہیں ——

ہے تو ——

مگر اپنے شوہر کے لیے تو تو کبھی اسطرح بنی سنوری نہیں ——

بکو نہیں —— اس نے اپنے دل کو ڈانٹا ——

خوشبو اٹھائی اور اپنے اوپر چھڑک لی۔

معوذ سو رہا تھا۔ اس لیے وہ رسالہ لیکر لیٹ گئی.....

باہر بیل ہوئی چونک کر اٹھ بیٹھی...... کافی دیر گذر گئی۔ کوئی اس کے کمرے میں نہیں آیا —— شرمندہ ہو کر پھر لیٹ گئی —— دو صفحے پڑھے۔ فون کی گھنٹی بجی —— کان دروازے پر لگا دیئے۔ کوئی اسے اطلاع دینے نہیں آیا —— خجل سی ہو کر پھر کتاب پڑھنے لگی۔ یہ کیا دیوانگی ہے......

کیا تجھے کسی کا انتظار ہے ——

نہیں تو ——؟

شرم کر اسطرح سج بن کر کس کا انتظار کر رہی ہے؟

یہ دل میں چراغ سے کیوں روشن ہو رہے ہیں ——؟

دوسرے کے گھر کی روشنی ادھار مانگنا چاہتی ہے —— ادھار کی روشنی سے کیا اپنا گھر منور ہو جاتا ہے ——؟.....

ذرا سوچ —— یا در تیری سہیلی کا شوہر ہے ——؟

اپنی سہیلی کے شوہر کو بن ٹھن کے دکھانا کہاں کی شرافت ہے ——؟

اچھا بھلا تو کیا چاہتی ہے ——؟

اگر وہ تیرا اسیر بھی ہو جائے تو تجھے کیا فائدہ ہے ——؟ کیا تو اس کے ساتھ اپنا شوہر بدل سکتی ہے ——

کیا شوہر بھی خوش رنگ کپڑوں کی طرح ہے —— کہ ادل بدل کر لیا جائے ——

شرم —— شرم ——

گھبرا کر اس نے کتاب دور پھینک دی۔ چوری پکڑی جائے تو آدمی پسینہ پسینہ

ہو جاتا ہے ——

توبہ —— استغفراللہ ——

وہ تو ایک بچے کی ماں ہے۔ اس دنیا میں ایسی مائیں بھی ہیں جنھیں شوہروں نے ایک بچے کے بعد پلٹ کے نہ پوچھا۔ مگر انہوں نے اس ایک بچے کے سہارے زندگی گذار دی ——

عورت قناعت کی لاٹھی تھام لے —— تو زندگی کے گھپ اندھیرے سے پاپیادہ نکل جاتی ہے۔

میرے بچے —— اس نے سوئے ہوئے معوذ کو دیکھا —— تو دودھ کے سمندر میں ابال آگیا ——

میرے بچے تیری ماں گھٹیا اور کمینی نہیں ہے۔

کھڑی ہوگئی بچے کے دودھ کے برتن اٹھائے اور کچن میں چلی گئی۔ ہر روز کچن میں جاکر وہ خود اس کے برتن ابالتی تھی۔ نوکر پر بھروسہ نہیں کرتی تھی۔ برتن ابالنے کے دوران نوکروں کے ساتھ گپ شپ میں مصروف ہوگئی۔ بالوں کو لپیٹ کر پیچھے گولہ سا بنالیا۔ دوپٹہ اتار کر دور پھینک دیا —— اور بیسن پر کھڑی دھڑادھڑ برش چلارہی تھی۔ جب ملازم نے آکر کہا۔

"جی آپ کے وزیٹرز آئے ہیں ——"

"کون لوگ ہیں ——؟" رملی نے گھبرا کر یوں پوچھا جیسے ابھی تھوڑی دیر پہلے اسے کسی کا انتظار نہیں تھا۔

"جی ایک صاحب ہیں اور ایک بیگم صاحبہ ہیں۔"

"جاؤ انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ ......"

رملی نے ہاتھ دھو کر تولیے سے صاف کئے۔ دوپٹہ اٹھایا۔ سر کو جھٹک کر اپنے بال کھولے اور دل میں کہا۔ کاش آخر یہ لوگ نہ آتے ——

آگئے ہیں تو کیا ہے۔ اس کے دل نے کہا —— کیا تو اتنی کمزور اور پلپلی ہے۔

نہیں میں تو اپنے حالات سے بہت مطمئن ہوں —— بہت مگن ہوں ——

بہت...... بہت ......

خوش —— خوش کہنے کا اسے حوصلہ نہ ہوا ......

ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو جیدہ مسکرا کر کھڑی ہوگئی۔ ساتھ ہی یاور بھی کھڑا ہوگیا۔ اس کے ہاتھ میں سگار تھا ——

اس نے سگار والی انگلیوں سے اسی طرح اسے سلام کیا اور پھر سب بیٹھ گئے۔
"تمہارا بیٹا کہاں ہے ——؟"
جیدہ نے پوچھا۔
"سو رہا ہے ——"
"کتنے دنوں کا ہے؟"
"ابھی صرف ایک مہینے کا ہے ——"
رملی نے نظریں جھکا کر جواب دیا۔
"کیا نام رکھا ہے ——؟"
"معوذ ——"
"تمہارا شوہر کہاں ہے ——؟
کراچی گئے ہیں ——
"کب آئے گا ——؟"
"بس دو چار دن میں آجائیں گے"
"اور تمھارے شوہر کا کیا نام ہے"۔ جیدہ نے پوچھا۔
"معاذ ——"
واہ —— کتنے انوکھے نام ہیں۔ اب تک سنے نہیں۔ اس کا مطلب ہے تمھارے شوہر کی شخصیت بھی بڑی انوکھی اور دلکش ہوگی ——
"ہاں ——" پھر وہ شوخی سے مسکرا کر بولی ——
"تو خود بھی تو شروع دن سے بڑی انوکھی اور طرحدار تھی۔ یاد ہے۔ تیری انوکھی نرالی عادتوں کی وجہ سے ہم لوگ تجھے شہزادی مارگریٹ کہا کرتے تھے۔"
رملی نے ہنس کر سر جھکا لیا۔ وہ زمانے جو گذر گئے۔ ان کا ذکر کیا ——؟
وہ کہانیاں جو کہی نہ گئیں ان کا عنوان کیوں دھریں ——
"تمھیں پتہ ہے یا د ر ——" جیدہ خوشدلی سے بولی۔
"رملی کو بھی کوئی پسند نہیں آتا تھا۔ ہر آدمی میں کیڑے نکالتی تھی۔ ہر ایک پر پھبتیاں کستی تھی۔ ہم کہتے تھے پتہ نہیں اس کے لیے آسمانوں سے کوئی شہزادہ اترے گا ——؟"
رملی کے کلیجے میں برچھی کھب گئی . . . . .
(اتر آیا آسمان سے سیاہ رات کا مہیب روپ ——)

"بھئی مجھے تمہارے شوہر کو دیکھنے کا بہت شوق ہو رہا ہے ——"

یاور نے سب باتیں سن کر ادا سے سگار منہ کے ساتھ لگایا۔ ایک لمبا سا کش چھوڑا اور پھر دھوئیں کی اوٹ سے اسکی طرف عجیب نظروں سے دیکھنے لگا۔

"جو شخص انھیں دیکھ لے۔ اسے کسی کو دیکھنے کا شوق نہیں رہتا۔ کم از کم مجھے تو ان کے شوہر کو دیکھنے کا بالکل شوق نہیں ہے ——"

رملی نے چونک کر یاور کیطرف دیکھا۔

(جل گئے ہو...... رقابت میں دیکھ نہیں سکتے)

(کاش تم نہ دیکھو) ——

یاور نے اس وقت سنہرے رنگ کا کرتا شلوار پہن رکھا تھا۔ اس کا چہرہ ایسے لگ رہا تھا جیسے اسے گہری نیند سے جھنجھوڑ کر جگا دیا گیا ہو —— آدھا سویا —— آدھا جاگا ——

یا پھر انتہائی چاق و چوبند چہرے پر ایک خوابیدہ کیفیت تھی —— آنکھیں گو کھلی تھیں —— مگر سوئی سوئی معلوم ہو رہی تھیں —— سارے نقش و نگار چمک رہے تھے مگر انھیں دیکھ کر خوابوں میں کھو جانے کو دل چاہ رہا تھا۔ ایسے سوئے سوئے چہرے جو احساس کو جگاتے ہوں۔ کتنے خطرناک ہوتے ہیں۔

"میں تمہارے لیے چائے لاؤں ——؟"

یہ کہہ کر رملی باہر نکل گئی۔

باہر نکل کر اسے محسوس ہوا۔ اس کا دل دھڑک رہا ہے۔

اور دل کے اندر کوئی چور دروازہ بھی کھل گیا ہے۔

ساری سگار کی خوشبو حلق کے راستے دل کے اندر جا رہی تھی پہلی بار اسے محسوس ہوا۔ اسکی ٹانگیں کانپ رہی ہیں۔ پتہ نہیں وہ اسے کن آنکھوں سے دیکھتا تھا۔ رملی کی سانس اکھڑنے لگی تھی۔

چائے کے دوران گپ شپ ہوتی رہی۔

یاور زیادہ نہیں بولتا تھا۔ اگرچہ وہ اپنے چہرے کے ایک ایک نقش سے کام لیتا تھا یوں اس کے ہونٹ چپ رہتے تھے —— مگر سگار پینے کے دوران پر زاویے بنتے بگڑتے رہتے تھے —— آنکھیں مفہوم ادا کرتی تھیں۔ ہونٹ کہتے رہتے تھے —— مچلتے رہتے تھے...... ناک سونگھتی رہتی تھی احساس کی خوشبو —— انداز کی خوشبو —— کان سنتے رہتے

تھے —— فاصلوں پر بجتی دھڑکنیں —— اور اس کے ہاتھ مصروف رہتے تھے ——
پتہ نہیں کیوں مصروف رہتے تھے —— کبھی سگار سلگا رہے ہیں —— کبھی سگار
جھٹک رہے ہیں —— کبھی سگار بجھا رہے ہیں —— کبھی سگار مروڑ رہے ہیں —— ....
رملی کو اس کی ہر شے بولتی محسوس ہوئی . . . .

اس لیے رملی واقعی گونگی ہو گئی . . . .

جیدہ اس کے بیٹے کے لیے تحفہ لائی تھی۔ اٹھ کر اس کے کمرے میں گئی۔ بچہ دیکھا——
رملی کی امی سے بات چیت کی—— . . . .

پھر وہ لوگ آکر ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے . . . . .

اچانک جیدہ بولی۔ "یاور میں یہاں سے نرگس کو فون کر دوں ——؟"

"پھر کیا پروگرام ہے تمھارا چل رہے ہو ان کے ہاں ——"

یاور نے نیم وا آنکھوں میں سارا دھواں بھر کے چھوڑا۔ اور بولا۔

"بھئی جہاں بھی لے جاؤ میں تمھارے اختیار میں ہوں۔ تم تو جانتی ہو
میں بندۂ بےدام ہوں ——"

جیدہ اٹھ کر کوریڈور میں چلی گئی۔

رملی کا دل خواہ مخواہ دھڑکنے لگا۔ وہ یاور کے ساتھ کمرے میں اکیلی رہ گئی تھی۔
نہیں وہ تو اکیلی نہیں تھی۔ اس کا شوہر بھی تھا اور بچہ بھی —— پھر ایسے کیوں محسوس
ہو رہا تھا۔ جیسے ایک انتہائی تنگ گلی میں آمنے سامنے آتے جاتے ہوئے وہ دونوں پھنس گئے
ہیں —— اگر ایک ساتھ نکلیں گے تو ایک دوسرے کو مسلتے ہوئے نکلیں گے اس کے باوجود
مخالف سمتوں میں نکلیں گے —— اپنی اپنی سمتوں میں نکلنے کے لیے بہت ضروری ہے
کہ ایک پیچھے ہٹ جائے ——

کیا وہ پیچھے ہٹ جائیگا ——؟

رملی نے نظر اٹھا کر اسکی طرف دیکھا —— کیا وہ راستہ چھوڑ دے گا تنگ گلی کا ——
وہ کیسی والہانہ نظروں سے رملی کو دیکھ رہا تھا۔ جیسے اس کے ہاتھ میں سگار نہ ہو
رملی کی ننھی سی ذات ہو ——

ایک دوسرے کو مسلتے ہوئے گذرنا اگرچہ ایک دوسرے کو خاک کرنا ہے۔ مگر——
تنگ گلی سے مسل کر گذرنے میں جو کیف ہے اس کے احساس سے دل خواہ مخواہ زندہ ہونے
لگتا ہے۔

رملی کا سارا چہرہ سرخ ہو گیا۔
وہ اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔
"آپ باتیں کر لیتی ہیں ——— ؟"
وہ اپنی سفاک آنکھوں کا زاویہ بدل کر بولا۔
کوئی بات کہنے کے لیے رملی کے ہونٹ ہلنے لگے۔
تھوڑی دیر اسے دیکھتا رہا۔ پھر بولا ———
"اور اگر ہونٹ کوئی ایسی بات کہنا چاہتے ہیں ——— جو آپ کے دل کو گوارا نہیں تو ان غریبوں کو یوں دانتوں سے کاٹ کاٹ کر سزا کیوں دے رہی ہیں ان کو وہ بات کہنے دیں۔ جزا اور سزا خود پائیں گے ———"
"چور ———؟"
رملی نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا ———
"خطرناک چور......"
سارے دل کے ارادے چرانے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ چپ کی زبان جانتا تھا۔ اس کے سامنے وہ کیا بات کرتی......
تقدیر کی روایتی دیوار میں چنی ہوئی وہ ایک زندہ درگور لاش تھی ——— اتنی دیواریں اوپر ——— اتنی دیواریں نیچے ———
بولنے کا کیا فائدہ تھا ——— ؟
اتنے میں جیدہ فون کر کے آگئی ———
"مل گئی تھی گوہر ——— میں نے کہہ دیا ہے۔ ساڑھے سات بجے ہم پہنچ جائیں گے"
یاور نے کوئی جواب نہیں دیا ———
بے تحاشا سگار کے کش لگانے لگا...... رملی کی کشمکش اس کے چہرے سے ظاہر ہونے لگی۔ اسے یاور کے اسطرح سگار پینے سے الجھن ہو رہی تھی ——— اس لیے ایک دم بولی۔
"آپ اتنا زیادہ تمباکو پیتے ہیں ———؟"
یاور نے اپنے جلتے ہوئے انگارہ سے ہونٹ پہلے سکوڑے پھر پھیلائے... اور مزے سے بولا۔
"آپ کے شوہر کتنے سگریٹ پیتے ہیں ؟"
"میرے شوہر سگریٹ نہیں پیتے ———"، رملی نے دانستہ جھوٹ بولا، گو

معاذ کو سگریٹ کی لت نہیں تھی، مگر کبھی کبھی کسی محفل میں پی لیتا تھا۔

"تو . . . ."

اس نے جملہ ادھورا چھوڑا ــــ کش لگایا ــــ دھواں چھوڑا ــــ فضا میں معطر نس نس چھوڑ کر لطف لیا۔ اور پھر اس کی اداس آنکھوں میں ٹھہر کر بولا ــــ

"آپ کے شوہر کیا پیتے ہیں ــــ"؟

کیا پیتے ہیں ــــ ؟ . . . . . . رملیٰ نے نظریں جھکالیں۔

عجیب سا دوراہا آ گیا ــــ

اس کا دل چاہا کہہ دے ــــ وہ میرا لہو پیتے ہیں ــــ میری جان پیتے ہیں ــــ میرا چین پیتے ہیں ــــ میرے دن رات پیتے ہیں ــــ

مگر فقروں کی یلغار میں وہ الجھ کر رہ گئی۔

وہ مسکرا رہا تھا۔ ہونٹوں پر آگ لیے . . . . . . جیسے جانتا ہو۔ وار کاری ہے۔

"آپ کے شوہر خوش قسمت ہیں ــــ" . . . . خود ہی ہنس کر بولا۔

"وہ بھلا سگریٹ کیوں پئیں ــــ؟ کیوں پئیں بھلا وہ حقیر سا سگریٹ ــــ"

رملیٰ نے فوراً اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

ایسے جیسے اسے اس کے تشنہ لبوں کا راز معلوم ہو گیا ہو۔ جیسے چوری پکڑی گئی ہو . . . . . جیسے اس کی کھوکھلی زندگی ٹھن ٹھن کر کے بجنے لگی ہو . . . . . جیسے . . . . . . جیسے چہرے نے ہر راز اگل دیا ہو ــــ

مگر وہ اسی دلکش انداز میں مسکرا رہا تھا ــــ

"ان کے پاس پینے کو بہت کچھ ہے ــــ"



دوسرے روز جمعہ تھا اور معاذ کہہ کر گیا تھا کہ وہ جمعے تک ضرور آجائیگا۔ اس لیے رملیٰ کا دل چاہ رہا تھا۔ معاذ کے آنے سے پہلے ایک بار جاکر جیدہ کے گھر سے ہو آئے۔ جیدہ بھی تو جاتے جاتے کہہ گئی تھی۔

"بھئی اب ہمارے گھر ضرور آنا۔ جب تک میکے میں ہو کم از کم روز تو ملتی رہو۔"

جاتے جاتے یاور نے کچھ نہیں کہا تھا۔

یاور کو آنکھوں سے باتیں کرنے کا فن خوب آتا تھا۔ ایک نظر دیکھتا اور سب کچھ کہہ دیتا۔ جاتے ہوئے اس نے اسطرح دیکھا۔ جیسے کہہ رہا ہو——؟

"کیسے نہیں آؤ گی۔ میں دل اور آنکھیں بچھا کر رکھوں گا——"

رملیٰ کا دل مچلنے لگا۔ اس نے معوذ کو نہلا دھلا کر دودھ پلایا اور کھاٹ میں سلا دیا نہانے کے بعد معوذ دو تین گھنٹے سوتا تھا۔ اس لیے تیار ہوکر باہر نکل آئی امی جان کو بتایا کہ وہ ذرا جیدہ کے ہاں جارہی ہے۔ وہ معوذ کا خیال رکھیں۔ جیدہ کے گھر جانے کے لیے ایک تو راستہ سڑک سے ہوکر جاتا تھا اور دوسرا گھر کے اندر سے ایک چھوٹی سی روش انیکسی کی طرف جاتی تھی رملیٰ اسی روش پر ہو لی ادھر کو چلی تو یوں لگا جیسے آج پہلی بار چوری کرنے جارہی ہے —— پہلی بار ڈاکہ ڈالنے کا ارادہ ہے۔ پنجوں پر اڑتی ہوئی۔ اپنے ہی سائے سے ڈرتی ہوئی۔ ہولے ہولے بچ بچ کے چلتی ہوئی . . . . . آگے پیچھے دیکھتی ہوئی —— گاہ چونکتی —— گاہ ٹھٹکتی ہوئی . . . دل دھڑکتا تو وہ اسے ملامت کرنے لگتی۔ دل شرمندہ ہوتا تو وہ اسے کوسنے لگتی۔

یہ ذرا سا راستہ ہزاروں میل لمبا ہو گیا تھا اور پتہ نہیں کس طرح اس نے ہزاروں میل کا یہ راستہ طے کیا اور جا کر کال بیل پر ہاتھ رکھ دیا ــــــ یوں جیسے اس نے شہر ممنوع کے صدر دروازے پر دستک دی ہو یا ناممکنات کی اندھیری وادی سے روشنی کی ایک کرن مانگی ہو۔

کال بیل پر انگلی رکھ کر اس نے فوراً اٹھا لی۔

لیکن گھنٹی کی آواز اندر جا چکی تھی ــــــ اور جیسے اندر ہر شے ہمہ تن انتظار تھی۔ اس نے گھنٹی پر انگلی کیا رکھی سارا گھر جاگ اٹھا۔ منڈیروں پر رکھے انتظار کے چراغ لو دے اٹھے اور شہنایاں بجنے لگیں۔

دروازہ یاور نے یوں کھولا جیسے ساری رات چھپ کے دروازے کے پیچھے کھڑا رہا ہو ذرا سا دروازہ کھول کے باہر یوں دیکھا ــــــ جیسے سیاہ بادلوں کی چادر چیر کر چاند نے دنیا کو جھانکا ہو ــــــ

ایک دم ــــــ بالکل اچانک ــــــ کہ رملی اپنا چہرہ پیچھے کرنا بھول گئی۔ اور اس کے سانسوں سے نکلنے والی سگار کی خوشبو نے بڑھ کے رملی کے چہرے کو چوم لیا ــــــ اپنے جی میں کھائی ہوئی ساری قسمیں بھک سے اڑ گئیں ارادوں کی فصیلیں گر گئیں۔ . . . . عقل کی اونچی برجیوں پر بیٹھی ہوئی اخلاقیات کی ساری فوجوں نے مورچے ہٹا لیے۔ . . . بغاوت کے بارود نے دھائیں دھائیں ساری روایات کو پھونکنا شروع کر دیا۔ رملی کو ایسے محسوس ہوا جیسے وہ غنیم کے محاصرے میں کھڑی ہے ــــــ

اور دشمن بھی وہ ــــــ جو اسکی جان کا دشمن تھا ــــــ تن کا دشمن تھا۔ من کا دشمن تھا۔

ذرا سا چہرہ باہر نکال کے پاگلوں کی طرح اسکی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا اور اس کی آنکھوں کے طلسم سے رملی پتھر کی ہو گئی تھی ــــــ

سرگوشی میں بولا ــــــ

"کل رات سے انتظار کر رہا ہوں۔ اب آئی ہو؟"

اب آئی ہو. . . . . اب آئی ہو. . . . . دروازے کے باہر چھت تک لٹکی ہوئی زخمِ حیات کی بیل کے بڑے بڑے پتے تال دے کے گنگنانے لگے ــــــ

ایک ننھے سے لمحے میں اس پر زندگی کا سب سے بڑا حملہ ہو گیا اور اس نے پسپائی کا اعتراف بھی کر لیا۔ اور دنیا میں کسی کو پتہ بھی نہیں چلا ــــــ

"آیئے آیئے ــــــ اندر تشریف لایئے ــــــ"

پسپائی کی گھڑی کو دونوں ہاتھوں سے قبول کر کے یاور نے صدر دروازہ کھول دیا اور پھر جیدہ کو آواز دی۔

"جیدہ ——— آؤ دیکھو کون آیا ہے ——؟ میں تو بے ہوش ہونے لگا تھا۔"

جیدہ دوڑ کر کچن سے باہر نکلی اور رملی سے لپٹ گئی۔ جیدہ کے کٹے ہوئے بالوں سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے اور وہ اس طرح تر و تازہ لگ رہی تھی۔ جیسے ابھی نہا کر نکلی ہو۔

"بہت اچھا کیا تم آ گئی ہو رملی ——؟ میں ابھی یاور کے لیۓ چائیں اور تکے بنانے لگی تھی۔"

"تمھارے پاس خانساماں نہیں ہے۔" رملی نے ایک بیہودہ سا سوال کر دیا۔

نہیں یار! جیدہ اسے لیکر ڈرائنگ روم میں آ گئی۔ پانچ سال انگلینڈ میں رہی تو گھر کا کام کرنے کی عادت سی پڑ گئی ہے۔ یہ باہر کے ممالک پھوہڑ سے پھوہڑ عورت کو بھی گھرداری کا سلیقہ سکھا دیتے ہیں۔

"میں اس کی گواہی دیتا ہوں۔" یاور نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

مگر رملی کو یاور کی طرف دیکھنے کا حوصلہ نہ ہوا۔

تینوں بیٹھ گئے۔

"معوذ کو نہیں لائیں۔" جیدہ نے پوچھا۔

"یہ اس کے سونے کا وقت ہے۔ پھر اتنا چھوٹا سا تو ہے۔ کیسے لاؤں ——؟"

"ڈارلنگ پہلے ایک ایک کپ کافی پلواؤ۔ پھر باتیں ہوں گی۔" یاور نے جیدہ کیطرف دیکھ کر کہا۔

"ہاں بنا لاتی ہوں۔" جیدہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"چلو میں بھی تمہارے ساتھ کچن میں چلتی ہوں۔" رملی بھی کھڑی ہو گئی۔

نہیں نہیں رملی تم یاور کے پاس بیٹھو۔ جیدہ نے سادگی سے کہا۔ بھئی میرا شوہر کوئی اتنا خوفناک آدمی نہیں کہ تم اس کے پاس بیٹھنے سے گھبرا رہی ہو۔

نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ رملی نے سنجیدگی سے کہا۔ میں نے سوچا تمھاری مدد کر دوں گی تو تم جلدی آ کر یہاں بیٹھ سکو گی۔

"میں آج جلدی تمھارے پاس آ کر نہ بیٹھ سکوں گی۔ بلکہ آتی جاتی رہوں گی۔ جمعہ کے روز ہم لوگ ناشتہ تو کرتے نہیں۔ ایک ساتھ کھانا کھاتے ہیں۔ اور میں نے بہت سی چیزیں

چولہے پر رکھ چھوڑی ہیں۔"

"پھر تو میں بہت غلط وقت پر آگئی ہوں"

"ارے نہیں ——" جیدہ نے رملی کو زبردستی بٹھا دیا۔ اگر میں کچن میں زیادہ وقت لگاؤں تو یاور بہت بور ہوتا ہے۔ اچھا ہوا تم آگئیں۔ تم اس کو کمپنی دو جب تک میں سب تیار کر لوں گی۔

"لیکن تم اپنی سہیلی کو میری شرافت کی کوئی سند تو دیتی جاؤ"۔ جاتی ہوئی جیدہ کو یاور نے روک کر کہا۔ انہیں بتاؤ کہ میں ایک بے ضرر سا انسان اور بے چارہ سا شوہر ہوں ——

جیدہ نے اپنا مخصوص قہقہہ لگایا۔

"بھئی رملی ڈرو نہیں۔ یاور سچ کہہ رہا ہے۔ یہ بڑا مسکین اور مظلوم شوہر ہے۔ اس کی شرافت کی گواہی میں دیتی ہوں۔"

یہ کہہ کر جیدہ باہر نکل گئی۔ شرم سے رملی کا منہ سرخ ہو گیا۔

بیٹھ گئی اور اپنی شرمندگی پر قابو پا کر بولی۔

"آپ لوگ دوسرے کی نیت پر شک کیوں کرتے ہیں"

"شک تو آپ کو میری نیت پر ہے"۔ یاور دو بدو بولا۔

"کیا شک ہے ——؟" رملی نے ہمت کر کے پوچھا۔

جواب دینے سے پہلے وہ ہنسا۔ اس کے موتیوں جیسے دانت نمایاں ہو گئے۔ گھبرائی گھبرائی رملی اس کے دانتوں کو غور سے دیکھنے لگی۔ اسی وقت اسے خیال آیا۔ اس نے کبھی معاذ کے دانتوں کو غور سے نہیں دیکھا۔ ایک سال ہو گیا شادی کو۔ مگر اس نے معاذ کے دانت دیکھے ہی نہیں —— جب کہ .... تیسری ملاقات پر اسے یاور کے دانت نظر آگئے تھے۔ ہنستا ہوا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ پاگل نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس وقت بے اختیار رملی کا دل چاہا کہ اپنا کلیجہ نکال کر اس کے آگے ڈال دے۔ اور کہے —— ظالم آدمی! لے اسے میرے سامنے چبا لے۔ روز روز کے جھنجھٹ سے تو نجات ملے۔

"تمھارا یہ خیال ہے کہ میں ان مردوں میں سے ہوں جو ہر خوبصورت لڑکی پر جھٹ عاشق ہو جاتے ہیں۔ یعنی پیشہ ور عاشق ہوں ——"

اف —— رملی کے دل نے ڈبکی لگائی۔

سوچتی تو وہ بھی ایسا ہی تھی۔ مگر اس خیال کو اس نے کبھی آنکھوں میں بھر کر اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ جانے اسے کیسے معلوم ہو گیا۔ رملی اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے قالین کو کریدنے

لگی - جواب نہیں دیا -

تو وہ دوبارہ بولا ــــــ

یہ ٹھیک ہے کہ تمھیں دیکھا ــــــ اور تم سے عشق ہو گیا - مگر میں پیشہ ور عاشق نہیں ہوں ــــــ"

اسی وقت ایک ٹرے اٹھائے جیدہ کمرے میں داخل ہوئی - رملی اپنے دونوں ہاتھ گود میں رکھے سر جھکائے بیٹھی تھی - اگر جیدہ اندر نہ آجاتی تو وہ اپنی دونوں ہتھیلیوں کو جو دعا کیطرح پھیلی ہوئی تھیں - آنسوؤں سے بھر دیتی - ہاتھ پھیلا ہو اور آدمی دعا نہ مانگ سکے ــــــ زبان مچل رہی ہو - تمنا سامنے ہو اور آدمی اسکا نام نہ لے سکے تو کیسی بے بسی کا مقام ہوتا ہے -

"تم دونوں گم صم کیوں بیٹھے ہو ــــــ؟" جیدہ نے تپائی کھسکا کے اس پر سنیکس رکھ دیئے - جب تک میں کافی لاؤں کچھ کھاؤ -

"بھئی رملی تم کیوں شرما رہی ہو - بات کرو نا ! میرے شوہر سے ــــــ" پھر جیدہ نے یاور کی طرف دیکھا -

"اور یاور کتنی حیرت کی بات ہے - اتنی حسین لڑکی تمھارے سامنے بیٹھی ہے اور تم بھی خاموش ہو - حالانکہ تمھارے آگے کسی خوبصورت لڑکی کو بٹھا دیں تو تمھارے منہ سے پھول جھڑنے لگتے ہیں -"

"بعض حسین لڑکیاں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کے سامنے زبان گنگ ہو جاتی ہے -" یاور نے کش لیکر کہا -

"خیر تمھارے جیسے چرب زبان مرد کی زبان کسی کے آگے گنگ نہیں ہو سکتی -"

"بھئی معاملہ تمھاری نازک مزاج سہیلی کا ہے ــــــ میں ٹھہرا جنگی آدمی ــــــ کوئی بات الٹ سلٹ منہ سے نکل گئی تو تمھاری سہیلی خفا نہ ہو جائے -"

"میری سہیلی ایسی ہرگز نہیں ہے - میں اسے بچپن سے جانتی ہوں -" یہ کہہ کر اس نے کوارٹر پلیٹ رملی کو پکڑائی اس نے جلدی سے پکڑ لی -

جیدہ باہر نکل گئی -

رملی بال برابر باریک پل صراط پر پہنچ گئی -

ڈرتے ڈرتے نظر اٹھا کے یاور کی طرف دیکھا - وہ عاشقانہ نظر سے اس کو دیکھ رہا تھا - تب رملی کو احساس ہوا کہ جیدہ کی موجودگی میں وہ اسے اور طرح دیکھتا ہے - مگر جیدہ کے جاتے ہی اس کی نظر کا زاویہ بدل جاتا تھا - اس کو رملی کو پاگل پن سے دیکھنا بہت

اچھا لگتا تھا۔ مگر رملیٰ کے اندر احساس جرم کی لہریں اٹھنے لگیں۔ یاور اس کی سہیلی کا محبوب شوہر تھا اور وہ اس کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یا اسکی آنکھ مچولی کو پسند کر رہی تھی۔

کتنی بری بات ہے ——؟

رملیٰ نے اٹھ کے اپنی پلیٹ میں سینڈوچ رکھا۔ تو نیم دراز یاور نے اپنی پلیٹ آگے پھیلا دی اور بولا۔ "پلیز میری پلیٹ میں بھی کچھ ڈال دیں ——"

رملیٰ نے سینڈوچ والی پلیٹ اٹھائی اور اس کے آگے کر دی۔ تاکہ وہ خود اٹھالے مگر اس نے آنکھوں سے انکار کر دیا اور بولا: "وہ ٹکڑا جو تم نے اپنی پلیٹ میں رکھا ہے۔ وہ میری پلیٹ میں رکھ دو۔ بس وہی کھاؤں گا۔ اور کچھ نہیں لوں گا۔"

کیوں —— کیوں۔ کیوں —— رملیٰ کا دل چاہا چینی کی پلیٹ اس کے سر میں دے مارے اور کہے مجھے اشاروں پر نچانے والے تم کون ہوتے ہو۔ آج تک میرے شوہر کو یہ کہنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ مگر اس نے جلدی سے —— اپنا سینڈوچ اٹھا کے یاور کی پلیٹ میں رکھ دیا۔ اور خود ایک ٹکڑا اٹھا کر اپنی جگہ پر آکے بیٹھ گئی۔

اسی وقت جیدہ تین گرم گرم پیالیاں کافی کی اٹھائے اندر داخل ہوئی۔

"رملیٰ تمہیں ایک بات بتادوں۔"

جیدہ نے رملیٰ کو کافی کی پیالی پکڑاتے ہوئے کہا۔

"یاور بہت بے تکلف آدمی ہے اور بے تکلفی کو پسند کرتا ہے۔ زبان بھی ذرا اس کی کھلی ڈلی ہے۔ پلیز اس کی کسی بات کا برا نہ ماننا —— دل کا یہ بہت اچھا ہے۔"

(یہ دل کے اچھے لوگ دوسروں کا دل کیوں لوٹ لیتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شکل پر تو اس کی گلاب کھلے رہتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آنکھیں ایسی دی ہیں قدرت نے اسے کہ ان میں ڈبکی لگا کے پھر کبھی ابھرنے کو جی نہیں چاہتا —— دانت ایسے ہیں کہ دل چاہتا ہے کہ ہمارے سامنے ہمارا دل چبالے —— اور ہونٹوں پر ہر وقت آگ کا ایک شعلہ رہتا ہے —— اس شعلے کے قریب جا کے بھسم ہو جانے کو جی چاہتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کتنے کمینے ہوتے ہیں ایسے لوگ ۔ ۔ ۔ ۔ ہم ان کی زد میں تھر تھر کانپنے لگتے ہیں —— نہ بھڑکاتے ہیں۔ نہ بجھاتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔)

"تم بار بار اپنے شوہر کی صفائیاں کیوں پیش کر رہی ہو جیدہ ——"

یاور نے سینڈوچ کھاتے ہوئے کہا۔

"بھئی رملیٰ بڑی شرمیلی لڑکی ہے۔ اور اس کی تربیت ایک مذہبی ماحول میں ہوئی ہے۔ مجھے یاد ہے۔ جب ہم کالج میں ایک دوسرے کو گندے لطیفے سنایا کرتے تھے تو یہ ہم سے روٹھ

کر ایک طرف جا بیٹھی تھی۔"

"مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے یہ ابھی تک سب سے روٹھی ہوئی ہے ــــــ ہے نا؟
جیدہ ــــــ یہ شکل سے ایک دل گرفتہ ناراض شہزادی معلوم ہوتی ہے ــــــ!"
یاور کے لہجے میں اس بار بے تکلفی تھی۔

رملی دھیرے سے مسکرائی۔ پلیٹ اس نے ہاتھ سے رکھ دی اور کافی کی پیالی اٹھا لی۔ اور بولی۔

"میری ذات اتنی اہم تو نہیں کہ آج بس مجھی پر گفتگو کی جائے ــــــ!"

"اوہو ــــــ ہر لڑکی بار بار یقین دہانی چاہتی ہے۔ دیکھا جیدہ میں ٹھیک کہتا ہوں نا! لڑکیوں کو یقین دہانی کی بہت ضرورت ہوتی ہے ــــــ اب رملی چاہتی ہے۔ ہم اسی کے بارے میں گفتگو کرتے رہیں۔ کچھ اور کہیں۔۔۔۔ کچھ اور کہیں۔۔۔۔۔"

رملی شرمندہ ہو گئی۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہ تھا۔ مگر اسے اپنے بارے میں یہ سب سننا اچھا لگ رہا تھا۔

"اوہ میں ذرا آنچ کم کر آؤں ــــــ" جیدہ ایکدم اٹھ کر باورچی خانے کیطرف بھاگی۔

"تمھاری ذات کتنی اہم ہے۔ یہ سب تم جان گئی ہو رملی ــــــ"

یاور نے آہستہ سے کہا "کم از کم میرے لئے تو ــــــ اگر سچ پوچھو تو آج تین دن سے میں تمھارے بارے میں ہی سوچ رہا ہوں۔"

کیوں سوچ رہے ہو میرے بارے میں ــــــ؟ رملی کا دل چاہا وہ اسے جھڑک دے اور اس سے کہے تم بد دیانت آدمی ہو۔ تم میری سہیلی کے شوہر ہو۔ ایک زمانے سے لڑ کے میری سہیلی نے تمھیں اپنایا تھا اور اب تم میرے سامنے ہی۔۔۔۔

مگر پتہ نہیں کیا ہوا۔ رملی اس معاملے میں بہت بودی ثابت ہوئی۔ ایک تو اس آدمی کی موجودگی میں اس کا دل دھڑکتا تھا۔ اس پر اسکا چہرہ بالکل رملی کے خوابوں جیسا تھا۔ جانے کب سے زندگی کی بھول بھلیوں میں وہ یہ چہرہ تلاش کرتی پھر رہی تھی۔ اور کتنی عجیب بات تھی کہ وہ چہرہ ملا تو اس کی محبت میں سرشار ملا۔ مگر ــــــ

راستے ہی جدا ہو چکے تھے۔ اب جب راستے جدا تھے تو وہ اسے کیا کہتی ــــــ؟ اک ذرا ٹھنڈی چھاؤں تلے بیٹھنے سے زندگی کا سفر نہیں بیت جاتا۔ البتہ تھکن ضرور اتر جاتی ہے۔ ایک ہی سال ہوا تھا اس کی شادی کو ــــــ مگر تھکاوٹ سے وہ چور ہو رہی تھی۔

پاؤں میں آبلے تھے اور جسم شرابور تھا۔ ایسے میں کوئی سایہ دار پڑاؤ آجائے۔ تو ٹھنڈی ہوا کے جھونکے بھی آنے لگتے ہیں۔ یہ جھونکے تھکے ہوئے جسم کو لوری دینے لگتے ہیں۔ تھکے ہوئے آدمی کو بہت جلد نیند آجاتی ہے۔ رملیٰ کا دل چاہ رہا تھا۔ اب وہ آرام سے سو جائے ـــــ ایسی نیند کہ جس میں سے پھر کوئی اسے نہ جگائے۔

"تم سو گئی ہو ـــــ"؟

یاور نے اس کے بجھے ہوئے چہرے کو غور سے دیکھ کر پوچھ ڈالا۔

"آپ بہت خطرناک باتیں کرتے ہیں۔"

بالآخر رملیٰ نے منہ بسور کر کہا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتیں ایسی باتیں۔"

یاور نے قہقہہ لگایا۔ اور بولا

"رفتہ رفتہ سمجھ میں آجائیں گی . . . . . ویسے تم شکل سے کچھ ایسی بے سمجھ بھی نہیں دکھائی دیتی ہو ـــــ"؟

جیدہ یاور کا قہقہہ سن کر دوڑی آئی

"بھئی کیا لطیفہ ہوا ہے مجھے بھی بتاؤ ـــــ"

"تمھاری سہیلی کہہ رہی ہے۔ میں بڑی خطرناک باتیں کرتا ہوں۔"

"یاور تم نے رملیٰ کو ڈرانے کی کوشش کی ہے ـــــ"

جیدہ نے گھور کر یاور کو دیکھا۔

"تمھاری قسم ـــــ" یاور نے پھر ہاتھ کھڑا کیا۔ "میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی اب کسی خوبصورت لڑکی کو خوبصورت کہنا اگر خوفناک جرم ہے۔ تو تم مجھے سزا دے لو ـــــ"

جیدہ بھی ہنسنے لگی۔

"یاور کو معاف کر دو۔ میں نے کہا تھا نا؟ خوبصورتی اس کی کمزوری ہے۔ کسی خوبصورت عورت کو دیکھ کر یہ دل اور زبان پر قابو نہیں رکھ سکتا۔"

"ویسے ڈرو نہیں اس کی مہار میرے ہاتھ میں ہے ـــــ"

رملیٰ نے حیران ہو کر جیدہ کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر خلوص کا اجالا تھا۔ اسوقت رملیٰ کو اپنے آپ سے بے حد شرم آئی۔ رملیٰ کا دل چاہا زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے۔

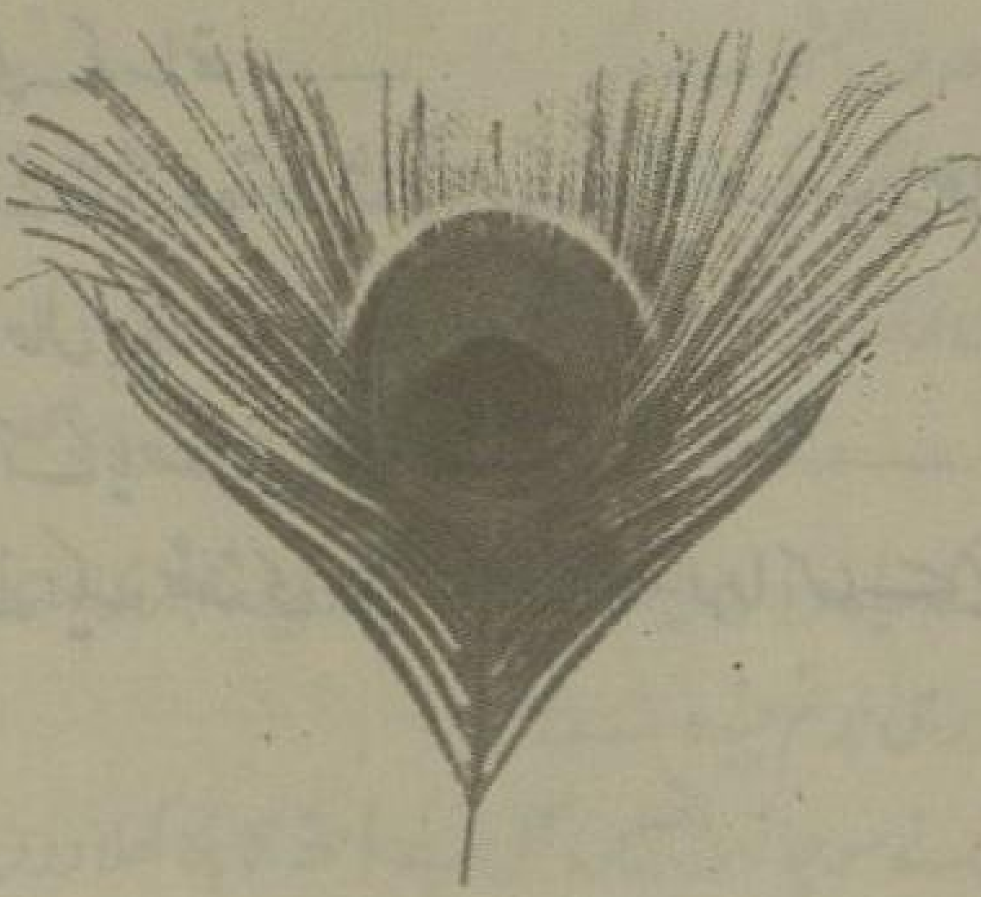
جیدہ نے ہاتھ میں کفگیر پکڑا ہوا تھا وہ دوبارہ کچن میں واپس چلی گئی۔

رملیٰ نے اپنے ہاتھ پر لگی ہوئی گھڑی دیکھی۔ اور بولی۔

"آپ جمعہ کی نماز پڑھنے نہیں جائیں گے ـــــ"؟

"میرا مذہب صرف عشق ہے۔"
وہ لہجے میں مستی سمو کر بولا۔
"کیا عشق میں نماز نہیں ہوتی ——؟"
"ہوتی ہے —— محبوب کو سامنے بٹھا کر آنکھوں سے سجدے کرنا میری نماز ہے...."
اب رملی کے لیے وہاں بیٹھنا واقعی مشکل ہو گیا۔ جلدی سے اٹھ کر کچن میں آ گئی۔
"آخر کیا کر رہی ہو تم جیدہ ——"
"بھئی میں نے سوچا آج تمہیں بھی اپنے ہاتھ کا پکا کھلا دوں۔ اسلیے جلدی جلدی تکے بنا رہی ہوں۔"
"رہنے دو میں کھانے کی اتنی شوقین نہیں ہوں۔"
اسی وقت باہر بیل ہوئی۔ جیدہ دوڑی گئی۔ رملی کے گھر سے ملازم آیا تھا۔ اور کہہ رہا تھا رملی بی بی کا فون ہے انہیں جلدی بھیجیں ——"
فون ——؟
رملی گھبرائی اور خدا حافظ کہے بغیر باہر نکل گئی۔ واپسی پر وہ ہزاروں میل کا راستہ چند منٹ میں طے ہو گیا۔ سامنے برآمدے میں امی جان معوذ کو کندھے سے لگائے بڑی سنجیدہ شکل بنائے کھڑی تھیں۔
"معاذ کی کراچی سے کال ہے ——"
رملی فون کے قریب پہنچ گئی۔
"یہ تو بند ہو گیا ہے۔"
"یہیں بیٹھ وہ دوبارہ کریگا۔ اتنی دیر سے تو میں نے ہولڈ کروایا ہوا تھا۔"
رملی وہیں کرسی پر بیٹھ گئی اور معوذ کی طرف دیکھ کر پوچھا،
"یہ جاگ گیا ہے ——؟"
"یہ تو تمھارے جاتے ہی جاگ گیا تھا۔ پتہ نہیں اس بچے کو کیا ہے۔ تم گھر پر ہوتی ہو تو سست ہو کر سویا رہتا ہے۔ ادھر تم گھر سے نکلیں ادھر یہ جاگ گیا۔ اور آج تم نے بھی غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا۔ تھوڑی سی دیر کا کہکر گئیں اور پورے دو گھنٹے لگا دیئے ——"
اف دو گھنٹے لگا دیئے۔ رملی کو کوئی جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔ اسی وقت فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے ریسیور اٹھا لیا۔ اور جواب دہی سے بچ گئی۔ دوسری طرف معاذ تھا۔
اسی طرح محبت میں ڈوبی ہوئی آواز —— چنتا سے چھلکا چھلکا لہجہ ——

توجہ کی حلیمی کے ساتھ ——
اُس نے بتایا کہ وہ آج شام نہیں آسکے گا۔ اور اب پرسوں شام کو آئیگا۔
معوذ کا حال پوچھ کے اس نے فون بند کر دیا۔
پرسوں آئے یا صدیوں بعد آئے —— ——
رملی نے ایک ٹھنڈی سانس چھوڑی ۔ وہ اس سے بہت دور نکل آئی تھی۔



معوذ کی عادت تھی کہ وہ دودھ پی کے سرِ شام ہی سو جاتا تھا. پھر اس کے بعد رملی کتابیں پڑھا کرتی - ٹیلی ویژن کا کوئی دلچسپ پروگرام دیکھ لیتی - یا معوذ کا کوئی کپڑا سینے لگ جاتی -

لیکن آج معوذ کو سلانے کے بعد ——— کوئی کام نہیں سوجھ رہا تھا - دل پر ایک ہی جنون سوار تھا ———

اور جنون نے ایک رستہ دیکھ لیا تھا -

دل کہتا چل ...... چل ..... محبوب کے دوارے چل ———

اس نے اپنے دل کو بہت ڈانٹا. لعنت ملامت کی ——— برا بھلا کہا ——— اپنی حیثیت کا احساس دلایا - مگر ایک چنگاری جو اس نے دامن میں باندھ لی تھی . باقاعدہ آنچ دے رہی تھی -

پہلے تو سامنے کوئی رستہ نہیں تھا - اس لیے سینے پر صبر کی سل رکھ کے بیٹھی تھی -
اور اب سامنے ایک ہرا بھرا پھولوں سے اٹا راستہ تھا - گو اس راستے پر ممنوع کا بورڈ لگا تھا مگر یہاں کون ٹریفک کے قوانین کی پابندی کرتا ہے ہر کوئی اپنا راستہ بنائے اندھا دھند چلا جاتا ہے -
ہاں کبھی کبھی ایک خوفناک حادثہ ہو جاتا ہے ———؟

حادثہ ——— اف ——— ابا جی ——— امی جی ——— بے جی اور معاذ ——— سب اس حادثے کی زد میں آجائیں گے -

نہیں نہیں ——— وہ اپنے دل کو منا لیتی اور کسی کام میں اپنے آپ کو مصروف کر لیتی -
پھر دل کے اندر سے دہائیاں اٹھنے لگتیں -

پگلی روتے روتے جیون بیت رہا ہے۔ ذرا سا مسکرالے۔ مسکراہٹ پر پہرے نہیں ہیں ——"

تو وہ بے چین ہو اٹھتی۔ کچھ دنوں میں وہ گھر واپس جانے والی تھی۔ پھر تو سب باتیں خواب کی طرح بکھر کر ختم ہو جائیں گی۔

وہ بے تاب ہو کر کھڑی ہو گئی۔

"امی جی! میں ذرا جدیدہ کے ہاں جا رہی ہوں۔"

"اس وقت ——؟" امی جی نے ناقدانہ انداز میں اسے دیکھ کر کہا۔

"ہاں مجھے اس سے کچھ رسالے لینا تھے۔ صبح تو آپ نے بلوا لیا تھا میں جلدی میں بھاگی آئی۔ رسالے نہ لے سکی ——"

امی جی نے نظریں جھکا لیں۔

"معوذ سو گیا ہے۔"

"جی امی —— اور آپ کو معلوم ہے وہ چھ سات گھنٹے سوئے گا۔"

"لیکن تم ذرا جلدی آ جانا۔"

"جلدی آ جاؤں گی امی —— معوذ کے کمرے میں جھانکتی رہیئے گا۔"

یہ کہہ کر رملیٰ نے جست لگائی اور دروازے سے باہر نکل گئی۔ سارا رستہ وہ سوچتی گئی وہ کیوں جا رہی ہے ——؟ اسے جانے کی جلدی کیوں ہے ——؟ اس کے آگے اس کا دل کیوں اڑا اڑا جا رہا ہے؟

دنیا میں کبھی کسی نے ناصح کی بات سنی ہے۔ جو رملیٰ کا دل اسکی کسی بات کو سنتا۔ جب اس نے صدر دروازے کی گھنٹی پر ہاتھ رکھا تو اردگرد کی آوازوں سے بے نیاز ہو گئی۔ جدیدہ نے خود آ کے دروازہ کھولا۔

"آ گئی ہو رملیٰ —— ہائے اچھا کیا ——"

"میں نے صبح تم سے کہا تھا نا؟ کہ میں دوبارہ آؤں گی۔"

واقعی اس وقت فون کال کا سن کر رملیٰ گھبرا گئی تھی جیسے معاذ کسی روزن سے بیٹھا اسے دیکھ رہا ہے اور اب اس نے اسکی گوشمالی کے لیے جھٹ سے فون کر دیا ہے۔ بوکھلائے ہوئے انداز میں جب وہ باہر نکلنے لگی تو جدیدہ نے کہا: "یاور کو تو خدا حافظ کہتی جاؤ۔"

"میں شام کو پھر آ کر معذرت کر لوں گی۔"

"اچھا آنا شام کو ——"

"ضرور آؤں گی ۔"

یہ کہہ کر رملیٰ گھر کی طرف بھاگ گئی تھی ۔

"آجاؤ ۔" جیدہ نے اس کے پیچھے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا ۔

"آج ہم بیڈ روم میں بیٹھے موسیقی سے لطف اندوز ہو رہے ہیں ۔"

رملیٰ ذرا سا جھجک گئی ۔ بچپن میں امی بتایا کرتی تھیں "منہ اٹھا کر کسی کے بیڈ روم میں چلے جانا اچھی بات نہیں ہوتی ۔"

"آجاؤ ـــــــ" جیدہ نے اسے رکتے ہوئے دیکھ کر کہا ۔

"آجاؤ بھئی ۔ ایسی تکلف کی کون سی بات ہے ـــــ ؟"

"کون ہے ـــــ ؟" یاور نے یوں بنکر پوچھا جیسے وہ نہیں جانتا کہ کون ہو سکتا ہے ۔

"بھئی کوئی خوبصورت بندہ ہے تو میں خود لینے آجاؤں ـــــــ"

یاور کی آواز سن کر رملیٰ کی ٹانگیں لرزنے لگیں ۔

آہستہ آہستہ چلتی اندر آگئی ۔

یاور بستر میں نیم دراز تھا ۔ اوپر ہو کر بیٹھ گیا ۔

"میری چھٹی حس کہہ رہی تھی ۔ کوئی خوشبودار شخصیت ہے ۔ اسی لیے تو معطر جھونکے اندر آرہے تھے ۔"

کیسٹ پلیئر پر گیت بج رہے تھے ۔

جیدہ نے آگے بڑھ کر آواز آہستہ کر دی ۔ رملیٰ ایک نرم سے سٹول پر بیٹھ گئی ۔

"ادھر آکے بستر پر بیٹھو نا ٹھیک طرح سے" جیدہ نے اس کا بازو پکڑا ۔ "ایسے بیٹھی ہو جیسے ابھی اٹھ کر بھاگ جاؤ گی ۔"

"نہیں میں یہیں ٹھیک ہوں" ۔ رملیٰ نے اس کے ڈبل بیڈ پر نظر ڈالی ـــــــ

بستر پر سلوٹیں تھیں ۔ کمبل الٹ پلٹ ہو رہا تھا ۔ تکیئے چرمرائے ہوئے تھے ۔ وہ دونوں غالباً صبح سے بستر میں بیٹھے تھے ۔ رملیٰ کے دل سے ایک ہوک اٹھی ۔ ساتھی دل پسند ہو تو آدمی دل پسند مشغلے اپنا سکتا ہے ۔ اب یہ میاں بیوی چھٹی کا دن کتنے رومانٹک انداز میں گزار رہے تھے ۔ بس ایک دوجے میں گم تھے ۔ رملیٰ کو یکایک جیدہ سے حسد محسوس ہونے لگا ـــــــ

"موسیقی کا لطف کچھ بستر میں بیٹھ کر ہی آتا ہے" ۔ جیدہ نے کہا ـــــ "دفتری کرسی پر بیٹھ کر موسیقی کا لطف نہیں آتا ۔ اور دیکھو یہ کتنا چھوٹا بیڈ روم ہے ایک صوفہ تک اور رکھنے کی گنجائش نہیں ہے واقعی یاور ـــــ اس نے یاور کی طرف دیکھا ۔ اگر کوئی مہمان آجائے بیڈ روم میں تو اسے کہاں بٹھائیں ۔"

"بیڈ روم میں ایرہ غیرہ تو نہیں آتا" یاور نے مستی بھری آواز میں کہا ——— جو مہمان بیڈ روم میں آتے ہیں انہیں دل میں جگہ دینی چاہیئے ——— "

جیدہ زور زور سے ہنسنے لگی۔ رملیٰ نے مسکرا کر یاور کی طرف دیکھا ——— ہمیشہ سے زیادہ خوبصورت لگ رہا تھا۔ وہی سویا سویا خمار تھا اس کے چہرے پر اور وہی ذہانت کی چمک جو بیک وقت اسے بیدار بھی اور خوابیدہ بھی ظاہر کرتی تھی۔

"جلدی سے بتاؤ کیا پیو گے تم لوگ" جیدہ بولی۔ "پھر میں ایک بار ہی اپنے بستر میں مِڈھ جاؤں۔"

"کچھ نہیں جیدہ ...... رملیٰ ایک دم بولی۔ میں تو کھانا کھا کے آئی ہوں اب کسی چیز کی حاجت نہیں ہے ——— "

"حاجت انہیں نہیں ہو گی کسی چیز کی ——— " یاور نے اپنے مستانہ ماہی والے انداز میں سگار کا کش لے کر کہا ...... ہمیں تو بہت سی چیزوں کی حاجت ہے۔ ہم تو بندے حاجت مند ہیں ...... ہم نہ تو دیوتا ہیں۔ نہ دنیا تیاگ کے بیٹھے ہیں۔ ان کی طرح ——— چپ کا روزہ رکھ لیں اور دل کی کھڑکیاں بند کر لیں اور کہہ دیں کہ بھئی ہم ہر ضرورت سے بے نیاز ہو گئے ہیں۔"

رملیٰ کا دل دھڑک اٹھا۔ کیا اس کے من کا چور اس کے چہرے پر لکھا ہے۔ رملیٰ نے سوچا کتنا خطرناک آدمی ہے۔ مگر کتنا ذہین ہے ......

"جاؤ ...... جاؤ ...... سبز قہوہ بنا کے لاؤ۔ سبز پری بیڈ روم میں آئے تو سبز قہوہ پیتے ہیں ——— "؟

رملیٰ نے بے اختیار اپنے سبز سوٹ اور بڑے بڑے پھولوں والے سبز دوپٹے کو دیکھا۔

جیدہ باہر نکل گئی۔ وہ پھر نیم دراز ہو گیا ———

اس کی گردن کے نیچے سنبل کے تڑے مڑے ہوئے تکیے تھے۔ اور سیدھا لیٹا چھت کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"باتیں آپ خوب بنا لیتے ہیں۔" رملیٰ نے جیسے دانت پیس کر کہا۔

"صبح سے بستر میں پڑا ہوں۔ مجھے ملے بغیر بھاگ گئی تھیں نا؟ کسی کام میں دل نہیں لگا۔ کہیں جانے کو دل نہیں چاہا ——— بے اختیار غصہ آ رہا تھا تم پر ——— کبھی کبھی جی چاہتا تھا۔ تمہاری یہ خوبصورت صراحی دار گردن جا کے مروڑ دوں۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری ——— "

انتہائی سنجیدہ شکل بنانے کے باوجود رملیٰ کو اس کے اس انداز پر ہنسی آ گئی۔ حسین لوگ اتنے سنگدل کیوں ہوتے ہیں ......

وہ کش لیکر بولا ———

اپنے حسن کیطرح بے حس ـــــــ
رملی احساسات کے سوا نیزے پر پہنچ گئی۔
تمہیں کیا حق ہے مجھ سے ایسی باتیں کرنے کا ــــــ یا کس نے یہ استحقاق دیا ہے تمہیں۔
اور پھر میں کیوں آؤں ــــــ کیوں آؤں ــــ کیا تمہاری اسیر ہوں میں ــــ تمہاری فقیر ہوں میں
ــــ کیا سمجھتے ہو اپنے آپ کو.......
دیکھ دیکھ .... رملی..... آگے بڑی پھسلن ہے۔ ادراک کے قدم وہاں تک نہیں
جاتے......
تو ایک شادی شدہ عورت ہے۔
اور یہ ایک شادی شدہ مرد ہے۔
اور جو دنیا نے اب تک برداشت نہیں کیا۔ تو وہ کرنے جا رہی ہے۔
"بھئی میری بات کا جواب دو ــــــ" یاور نے کمبل کے اندر اپنے پاؤں ہلائے تو رملی کا بے
اختیار دل چاہا۔ وہ ان قدموں پر اپنا سر رکھ دے اور چیخ چیخ کر روئے۔ اور کہے ــــــ
"یاور مجھے معاف کر دو۔ مجھے بخش دو ــــ مجھے خراب نہ کرو۔ یہ ضرور ہے کہ میرے خیال
تمھیں دیکھکر بھٹک گئے ہیں۔ مگر میں زیادہ دور تک تمہارے ساتھ جانے کے قابل نہیں ہوں۔ لہولہان
ہوں۔ زخمی ہوں ــــــ مجھے چھوڑ دو..... مجھ پر یہ مشقِ ستم نہ کرو۔"
"میری بات بری لگی ہے تمھیں"۔ یاور ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔
"ہاں ــــــ" رملی نے اثبات میں سر ہلایا۔
تو وہ جھپٹ کر بستر سے نکلا ــــــ جست لگا کے اس کے قدموں میں جا بیٹھا ــــــ
اس کے دونوں ٹھنڈے ٹھار پاؤں دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر چوم لیئے۔
پھر ان پر سر رکھ کر بولا۔
"پلیز مجھے معاف کر دو۔"
ذرا سی دیر میں رملی کے سر پر قیامت کی گھڑی آ ٹھہری۔ وہ خوف زدہ ہو گئی۔ دل دھڑکنے
لگا۔ بولی۔
"یہ کیا کر رہے ہیں آپ۔ خدا کے لیے میرے پاؤں چھوڑ دیں۔ جیدہ آ جائیگی۔ کیا....
کیا کہے گی ــــــ"
"جب تک تم مجھے معاف نہیں کرو گی۔ اور وعدہ نہیں کرو گی کہ میری بات کا کبھی برا نہیں مانو
گی۔ میں یونہی تمہارے پاؤں پکڑے بیٹھا رہوں گا۔ مجھے جیدہ کی پروا نہیں اور نہ میں اس دنیا سے ڈرتا

ہوں ——"

"میں وعدہ کرتی ہوں"۔ اس کا فقرہ ختم ہوتے ہی رملی بولی ——" آپ کی کسی بات کا برا نہیں مانوں گی ——"

یاور نے اس کے پاؤں چھوڑ دیئے۔ اور پھر آکے بستر میں گھس گیا۔ لیکن رملی اپنی کانپتی سراتی سانسوں پر قابو نہ پا سکی ——

اُف زندگی کا سب سے بڑا حادثہ ہونے چلا تھا۔

اسی وقت جیدہ قہوے کی پیالیاں اٹھائے کرے میں داخل ہوئی۔

اس نے پہلی پیالی رملی کو دی۔ مگر رملی کے چہرے پر ننھی ننھی شبنم کی بوندیں شاید اسے نظر نہیں آئیں۔ دوسری پیالی یاور کیطرف بڑھائی —— تو یاور مچل کر بولا۔

"ڈارلنگ آج تو تم قہوہ مجھے اپنے ہاتھ سے پلاؤ۔"

"کیوں جی ——؟" جیدہ نے اس کی پیالی سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی ——

"آج یہ دورہ کیوں پڑا ہے ——"؟

یاور نے جیدہ کی کلائی پکڑ لی۔

"تم جانتی ہو میں جانے نہیں دوں گا۔ پہلے مجھے قہوہ پلاؤ ——"

"اچھا بھئی اپنی پیالی تو پرے رکھدوں"۔

"نہیں اپنی پیالی یہیں رہنے دو۔ وہ میں تمہیں خود پلاؤں گا"۔

"یاور جب تم بچوں والی ضدیں کرتے ہو تو مجھے بڑا غصہ آتا ہے"۔ جیدہ پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گئی اور پیالی اٹھا کے اس کے منہ کے ساتھ لگا دی۔

"تم سے سو بار کہا ہے میں نے کہ مجھے گھر میں اپنا بچہ ہی سمجھا کرو"۔

"بس تمہارے ناز اٹھاتے اٹھاتے تو میں مر مٹ جاؤں گی"۔

"ڈارلنگ ایسی باتیں منہ سے نہیں نکالتے۔ دیکھو تمہاری سہیلی کیا کہے گی"۔

رملی آہستہ آہستہ قہوے کے گھونٹ پینے لگی اور یاور کی فطرت پر غور کرنے لگی۔

تھوڑی دیر کے بعد جیدہ نے اٹھ کر کہا۔

تم اپنی پسند بتاؤ رملی ہمارے پاس بہت اچھی COllECTION ہے۔

"میری کوئی پسند نہیں ہے"۔

"میں نہیں مان سکتی"۔ جیدہ نے کہا

"بھئی اصل میں مجھے تو در دبھرے گیت پسند ہیں۔ اور آج کے زمانے میں درد بھرے گیت کون سننا چاہتا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے تمھاری زندگی میں کوئی ٹریجڈی ہوگئی ہے۔ خدانخواستہ ——"
رملی کا دل دھڑک اٹھا۔ اسی وقت یاور بولا۔
"جو لوگ دوسروں کو غم دیتے ہیں۔ انہیں ہمیشہ دردناک گانے پسند آتے ہیں۔"
رملی خوشی اور غم کے درمیان معلق ہوگئی۔
کسی بات کی نہ تردید کرسکتی تھی نہ تائید ——
"اچھا پہلے میں یاور کی پسند کے گیت لگاتی ہوں" اس نے اٹھ کے نئی ٹیپ لگا دی۔
وہی عشق کا رونا وہی حسن کی بے نیازی ——
وہ لوگ تھوڑی دیر تک گانے سنتے رہے اور رملی رسالے الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی۔
ایک دم جیدہ نے اٹھ کر کیسٹ ریکارڈر بند کر دیا۔ اور کہنے لگی۔
"رملی کیا خیال ہے۔ آج یاور سے گیت نہ سنے جائیں ——؟"
"یہ.... یہ —— گاتے ہیں؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔
"ہائے ظالم بہت اچھا گاتا ہے۔ اس کی آواز نے ہی تو مجھے لوٹا تھا۔"
"بس کرو جیدہ ——" یاور ہلکی آواز میں بولا۔ "اب پرانی باتوں کو مت کریدو۔ ایک زمانے میں گالیا کرتا تھا۔ اب تو یاد بھی نہیں ——"
"دیکھا —— اس کا ثبوت دیکھ لو"۔ جیدہ نے رملی کی طرف دیکھکر کہا۔ "گانے والوں کیطرح یاور ہمیشہ پہلے نخرے بہت کرتا ہے۔ اور پھر منتیں بھی بہت کرواتا ہے...... اب تم جتنی منتیں کر سکتی ہو کرو —— میں تو آج منتیں نہیں کروں گی۔"
تھوڑی دیر تک وہ دونوں اسے تنگ کرتی رہیں۔ بالآخر یاور نے اپنی گمبھیر اور سر میں ڈوبی آواز میں ایک غزل گنگنانی شروع کر دی۔

رات گئے جب جھومتے جھامتے رند چلے میخانے سے
شمع لپٹ لپٹ کر روئی ادھ جلے پروانے سے

اس کی آواز میں لوچ تھا۔ سوز تھا۔ اور وہ بھی خوب ڈوب کر گا رہا تھا۔ دونوں ہی کھو گئی تھیں۔ یہ شعر تو اس نے بار بار سنایا۔

ہنستی آنکھیں جھک جاتی ہیں، گال گلابی ہو جاتے ہیں
اور نکھر آتا ہے تیرا حسن ترے شرمانے سے

غزل ختم ہوئی تھی کہ باہر سے گھنٹی کی آواز آئی۔ رملی جیسے ہوش میں آگئی۔
واقعی نوکر اسے بلانے آیا تھا۔ کہہ رہا تھا بڑی بیگم صاحب بلا رہی ہیں۔ رملی نے گھڑی دیکھی

اس وقت رات کے دس بج رہے تھے۔ اور وہ تھوڑی سی دیر کا کہہ کر آئی تھی۔ اس نے یادر اور جیدہ کو خدا حافظ کہا اور باہر نکل گئی۔

گھر پہنچی تو امی معوذ کو کندھے سے لگائے غصے سے ٹہل رہی تھیں۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں رملی ـــــ؟"

امی جان نے غصیلی آواز میں کہا۔ ذرا سی دیر کا کہہ کر گئی تھیں اور اتنی دیر لگا دی۔

"یہ کب جاگا ہے ـــــ؟"

اس نے امی جان کا جواب دینے کی بجائے۔ معوذ کو اٹھا لیا۔

"تمھارے جانے کے آدھ گھنٹے بعد ہی جاگ گیا تھا۔ اور رو رو کر اسکا حال برا ہو گیا ہے میں بہلاتے بہلاتے عاجز آ گئی۔ آخر اب نوکر کو بھیجکر بلوایا۔ تم اتنی غیر ذمہ دار تو نہیں تھیں۔"

رملی نے معوذ کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ اسکی ننھی ننھی سسکیاں اب بھی سنائی دے رہی تھیں اور مُصَفّا آنکھوں کے باہر آنسوؤں کے قطرے جمے تھے۔ حالانکہ لوگ کہتے ہیں اتنے معصوم بچے کے آنسو نہیں نکلتے ـــــ پتہ نہیں معصوم فرشتہ کس کرب سے رو دیا ہو گا کہ آنسو رخساروں پر جمے تھے۔

رملی اسے سینے سے چمٹا کے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

"میں صدقے جاؤں میرے بچے ـــــ"

رملی نے کرب سے سوچا ـــــ

"دوسری بار ایسا ہوا کہ میں اپنے بچے کو بھول گئی۔"

خدایا..... خدایا..... کس ڈگر پر میرا پاؤں جا پڑا ہے..... میری لاج تیرے ہاتھ میں ہے......

ہر عورت کی لاج اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے۔

اس کے دل نے جواب دیا۔ کیا تو نہیں جانتی تو ایک بچے کی ماں ہے ـــــ اور بچے کی ماں کو خواب دیکھنے کا حق نہیں ہوتا۔ اس کا ہر خواب بچے کے پنگھوڑے سے نکلتا ہے اور بچے کی صورت میں سما جاتا ہے۔

اس نے جھک کر معوذ کا چہرہ چوم لیا۔ ایسی خوشبو نکل رہی تھی اس کے چہرے سے جس پر قربان ہو جانے کو دل چاہتا ہے۔

معوذ! میرے بچے میرا دل دو ٹکڑے کیوں ہوا جاتا ہے ـــــ؟

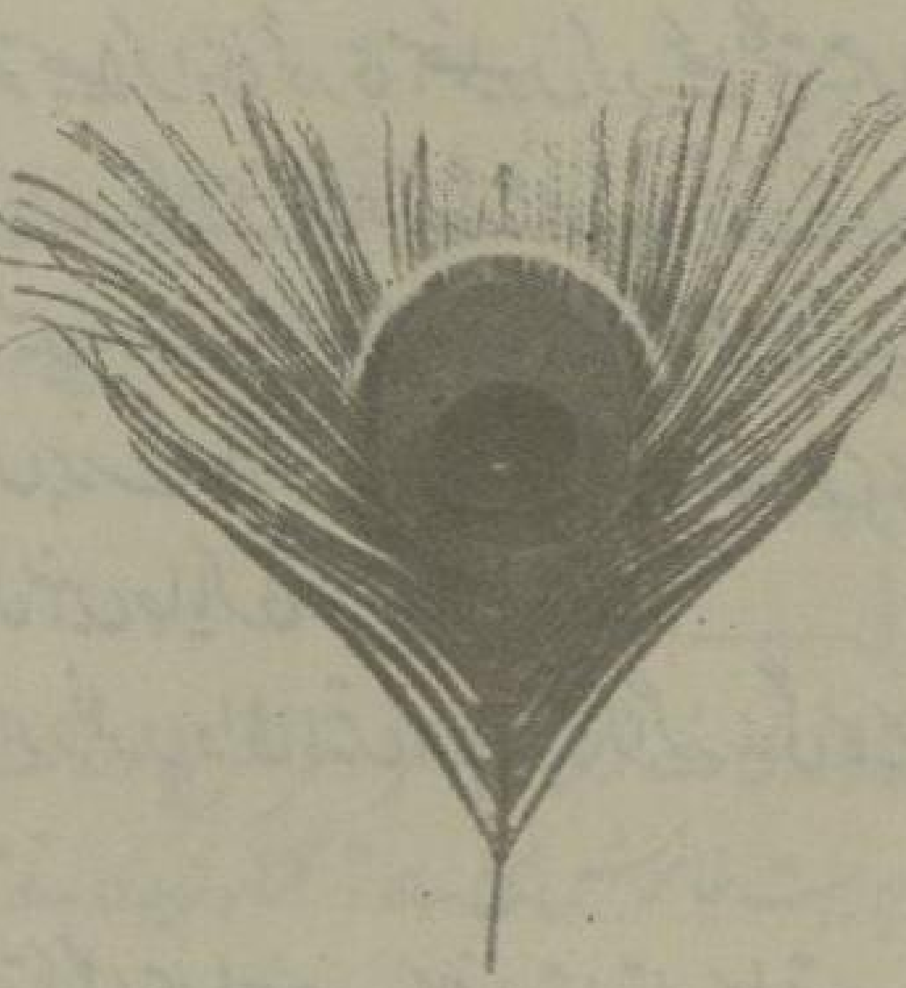
ایک ٹکڑا تیرے ہاتھ میں ہے۔ اور دوسرا ٹکڑا ـــــ

اور تو میرے دل کو مضبوطی سے تھام لے بیٹے ـــــ آخر اس گھمن گھیر آندھی میں ہر بار تیرا

ہاتھ مجھ سے کیوں چھوٹ جاتا ہے۔

نہیں نہیں.....

اس نے بے تاب ہو کر معوذ کو اپنے سینے میں بھر لیا۔ اور رونے لگی۔



رملیٰ جب معوذ کو نہلا دھلا کے صاف کپڑے میں لپیٹ کر باہر لائی تو بے جی اپنی محفل سجائے بیٹھی تھیں۔ اس وقت ان کے پاس محلے کی چھ سات تعلیم یافتہ اور فیشن ایبل خواتین بیٹھی تھیں چائے کی ٹرالی آگے رکھے بے جی انھیں مٹھائی پیش کر رہی تھیں۔ پچھلے ہفتے رملیٰ معاذ کے ساتھ اپنے گھر آ گئی تھی۔ ساری کالونی کی عورتیں بے جی سے اسقدر پیار کرتی تھیں کہ ہر روز کوئی نہ کوئی انھیں پوتے کی مبارکباد دینے آ جاتی۔ کوئی مٹھائی کا ڈبہ لا رہی ہے۔ تو کوئی خوشبوؤں میں بسا ہوا تحفہ۔

آج بھی یہ سب عورتیں مل کر بچے کی مبارکباد دینے آئی تھیں اور تھوڑی دیر پہلے بے جی نے رملیٰ کو آواز دے کر کہا تھا کہ وہ معوذ کو لیکر باہر آ جائے

رملیٰ نے جلدی سے معوذ کو نیم گرم پانی سے نہلا کے خوشبوؤں میں بسا دیا۔ اور اب اٹھا کر باہر لے آئی تھی۔

باہر نکلی تو ان عورتوں نے لپک کر معوذ کو اٹھا لیا۔ باری باری سب نے دیکھا اور پیار کیا۔ کسی نے تحفے کا پیکٹ دیا تو کسی نے پیسے دے دیئے ——

پھر بے جی نے معوذ کو گود میں لے لیا۔ اور تھپک تھپک کر سلانے لگیں۔ معوذ بے جی کی گود کا اتنا عادی ہو گیا تھا کہ ادھر وہ اسے گود میں لٹاتیں اور ادھر وہ انکی آغوش کی مہک پا کر آنکھیں موند لیتا۔ رملیٰ بھی چپ چاپ ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

مگر یوں بیٹھی جیسے اس کرسی پر کانٹے بچھے ہوں۔ چہرہ بہت اترا ہوا تھا۔ اور آنکھوں میں ڈس لینے والا اضطراب تھا۔ زبان کہیں گم صم ہو گئی تھی۔ مگر ذہن کشمکش کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

پتہ نہیں زندگی کے پہلو سے ہر بار نوکیلے کانٹے کیوں نکل آتے ہیں۔ کبھی وہ سامنے دروازے

کی طرف دیکھتی۔ اور کبھی ہاتھ پھیلا کر اپنی گوری ہتھیلیوں کو دیکھنے لگتی۔ جس پر بڑی مدھم مدھم لکیریں تھی۔ کالج کے زمانے میں بھی وہ ہمیشہ پین لے کر اپنی دل و دماغ اور زندگی کی لکیروں کو گہرا کر دیا کرتی تھی۔ بہت جینے کا ارمان تھا اس کے دل میں ——— اور اپنی زندگی کی مدھم سی لکیر سے بڑا ڈر لگتا تھا لیکن قسمت کی لکیر پر جو بالکل غیر واضح تھی۔ اس پر سارا دن پنسل چلایا کرتی اب اسے معلوم ہوا تھا کہ سارا دن قسمت کی لکیر پر پنسل چلانے سے تقدیر بدل نہیں جایا کرتی۔

افسانوں اور فلموں والی باتیں سوچا کرتی کہ اگر زندگی کا پھیر الٹا چلنا شروع ہو جائے تو کیا ہو ———؟

ہوا یوں تھا کہ کل ہی اسے جیدہ کا فون آیا تھا۔ پہلے تو جیدہ نے اس سے شکوہ کیا کہ وہ سسرال جا کر اسے بھول گئی ہے۔ پھر بولی۔

"کل شام ہم آئیں گے۔ ... تیرا گھر دیکھنے ——— ! تیرے شوہر سے ملنے ———؟"

اسے یوں لگا جیسے جیدہ کہہ رہی ہے۔

کل شام ہم تیرا مقتل دیکھنے آئیں گے ———

تیرا زنداں دیکھنے آئیں گے ———

تیرا تابوت دیکھنے آئیں گے ———

اور وہ آخری کیل بھی جو تیرے تابوت میں ٹھونکا گیا ہے۔

اور اس خیال سے ہی اس کے اندر محرومیوں کے ناگ سرسرانے لگے تھے۔

"ہم آئیں گے"۔

یعنی وہ اور یاور ———

کتنے دن ہو گئے تھے یاور کو دیکھے ہوئے۔ اس کا نام سنتے ہی اسے دیکھنے کی تڑپ جاگ اٹھی ... لیکن پھر ایک دم اپنی کھوکھلی زندگی کا خیال آ گیا۔

وہ جب معاذ کو دیکھے گا تو کیا کہے گا ———؟

کہ گلاب کی کلی ببول سے لٹک رہی ہے ———

اندھیرے سرنگ کے دہانے پر خوش رنگ شمع روشن ہے۔

سارے راز کھل جائیں گے ———

پتہ نہیں وہ ان کے آنے پر اپنے دل کی دھڑکنوں کو سنبھال سکے گی یا نہیں۔ ... اگر ڈگمگ ڈول گئی ———

اگر معاذ نے اسکی نگاہ کی چوری پکڑ لی ———

اگر بے جی کو شک ہو گیا ——— ؟

کتنی دانا و بینا ہیں بے جی ——— اڑتی چڑیا کے پر تول لیتی ہیں۔

اس وقت بھی گویا وہ کرسی پر نہیں بیٹھی تھی بلکہ کرچیوں پر چل رہی تھی۔

بے جی نے اسے چپ دیکھ کر کہا۔

"تم بھی کچھ لو نا دو ہٹی ——— ؟"

اچھا جی کہہ کر رملیٰ جلدی سے ٹرالی پر ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگی۔

"بے جی آپ کی بہو بہت خاموش طبع ہے۔" گلنار زیدی نے ہنس کر کہا۔ "اسے بھی باتیں کرنا سکھائیں نا ؟" ———

"اب سیکھ جائیگی باتیں کرنا۔" بے جی نے بھی ہنس کر جواب دیا۔

"کتنی بھی کم گو ماں کیوں نہ ہو ——— بچے اسے باتیں کرنا سکھا دیتے ہیں۔ بلکہ چیخنے چلانے کی عادت ڈال دیتے ہیں۔ تم لوگ تو اس تجربے سے گذری ہو۔

کتنا چیخنا پڑتا ہے ان بچوں کے ساتھ ———"۔

"اف . . . . . ." راضیہ آفریدی نے پیالی رکھکر کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"بے جی۔ جب میری شادی ہوئی تھی نا ؟ تو لوگ میری ساس سے بھی یہی کہتے تھے کہ کتنی کم آمیز ہے آپ کی بہو ——— جب اوپر تلے چار بچے ہو گئے تو سارا محلہ میری آوازیں سنا کرتا تھا۔ ایک بار میری ایک ہمسائی نے آکر کہا۔ "یوں لگتا ہے۔ آپ کے گلے میں مائیکروفون فٹ ہو گیا ہے۔"

اس پر ساری عورتیں قہقہہ لگا کر ہنسنے لگیں۔ رملیٰ ان کی دیکھا دیکھی بس ذرا سا مسکرائی بھلا اس میں ہنسنے کی کون سی بات تھی۔ اس نے دل میں سوچا۔ عورتیں پاگل ہوتی ہیں۔ خواہ مخواہ ہنسنے کے بہانے ڈھونڈتی ہیں۔

"ویسے ماشاء اللہ آپ کی بہو بڑی تابعدار ہے"۔ فریحہ شیخ نے رملیٰ کیطرف دیکھکر کہا۔

"ایک ہی بیٹا ہے آپ کا ——— اللہ نے آپ کو آپ کی خوش اخلاقی کا ثمر دیا ہے۔"

"تیرا بیٹا کیسا ہے۔ اب اسکول تو جاتا ہے نا ؟" ——— بے جی نے جھٹ پوچھ لیا۔

"جو لڑکا تین بہنوں کے بعد پیدا ہو۔ اس کی پرورش کرنا بہت مشکل کام ہے۔ تو ایک بیٹا اور ضرور پیدا کرنا ———"

"توبہ ہے بے جی ——— فریحہ شیخ نے کانوں کو ہاتھ لگائے" ایک نے ہی مجھے تگنی کا ناچ نچا رکھا ہے۔ تین لڑکیاں تو پھولوں کیطرح پل گئی تھیں۔"

"ہاں لڑکی ذات ہی ایسی ہے ———" بے جی نے ڈوب کر کہا۔

"بڑی میٹھی چیز ہوتی ہے بیٹی۔ اس کے پیدا ہونے پراتنی خوشی نہیں منائی جاتی۔ اس لیے بیچاری پیدائش کے بعد کوئی تکلیف نہیں دیتی۔ اسطرح شرمندہ شرمندہ بڑھنے لگتی ہے۔ جیسے بچھوڑ آئے کوئی بیل لگا دو تو اپنے آپ دیوار سے لپٹتی جاتی ہے۔ بڑھتی جاتی ہے۔ عورت کی فطرت میں اللہ تعالیٰ نے نرمی اور لچک رکھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نئے گھر اور نئے ماحول میں اپنے آپ کو کھپا لیتی ہے کیسے تلخ حالات کیوں نہ ہوں سمجھوتہ کر لیتی ہے۔ کیسا بھی مرد قسمت میں کیوں نہ لکھا ہو۔ دیوار کی معصوم بیل کیطرح اس سے لپٹ جاتی ہے ـــــ اس پر زندگی وار دیتی ہے ـــــ"

(یہ جھوٹ ہے بے جی ـــــ سب جھوٹ ہے ـــــ)

چائے پیتے ہوئے رملی کو اچھو لگ گیا۔ کھانسی کا بہانہ کرکے اٹھ گئی اور غسل خانے میں جا کر بیسن پر لگے شیشے کے آگے کھڑی ہو کر اپنی پریشان صورت دیکھنے لگی۔

(ہر لڑکی بیل نہیں ہوتی بے جی ـــــ اور کبھی آپ نے کالی چٹان کے سینے پر لپٹی کوئی بیل دیکھی ہے ـــــ؟ . . . . . .

یہ سب آپ جیسی بڑی بوڑھیوں کے مفروضے ہیں . . . . . .

لپٹنے کے لیے بیل کو ریشمی دیوار کا دلکش سینہ درکار ہے ـــــ

اندھیرے غار سے کوئی بیل نہیں پھوٹتی . . . . . .

اپنے بیٹے کی صورت دیکھیں . . . . . .

خوامخواہ لڑکی بچاری کے گرد فرسودہ روایات کی دیواریں نہ چنیں)

تھوڑی دیر بعد آنکھیں صاف کرکے ـــــ اپنے چہرے پر خوش دلی کا ماسک چڑھا کے وہ دوبارہ باہر آگئی۔

شکر ہے موضوع تبدیل ہو چکا تھا۔

"بے جی رابعہ آپ سے ملنے آئی ہے"؟ رانی بلوچ نے شوخی سے سوال کیا۔

"ابھی تو نہیں آئی" بے جی نے جواب دیا۔" کیا وہ ابوظہبی سے آگئی ہے"؟

"ہاں ہاں . . . . ". گلنار زیدی نے ہاں میں ہاں ملائی۔

"ابھی تو بچاری ہر روز نیا جوڑا پہن کر محلے والوں کو اپنی شاپنگ دکھاتی پھر رہی ہوگی۔ آئے گی آپ کے پاس بھی ـــــ"

"اللہ نے دے رکھا ہے تو کیوں نہ روز ایک جوڑا پہنے" بے جی نے ہمدردی سے کہا۔

"بے جی یہاں کون سی عورت ہے جو روز ایک جوڑا نہیں بدلتی۔" ویدہ منیر نے تنک کر کہا۔" خواہ مخواہ شو آف کرنے سے فائدہ ـــــ"؟

"مگر رابعہ تو جن دنوں ئی نئی ابوظہبی سے آئی ہے۔ روز دو جوڑے بدلتی ہے۔ نئے نئے پرنٹ پہن کر لوگوں کو للچاتی ہے۔ اس مرتبہ تو کہہ رہی تھی کہ وہ کسی کے لیے دو وی سی آر بھی لائی ہے اور بڑے فخر سے بتا رہی تھی کہ اسنے صرف چالیس ہزار روپے کی کسٹم ڈیوٹی ادا کی ہے ـــــ"؟ سویرا صادق نے تفصیلی بیان دیا۔

"اف چالیس ہزار روپے کی کسٹم ڈیوٹی اف۔۔۔۔" دیدہ منیر اپنے گلے پیٹنے لگی۔

"لوگوں کے پاس اتنی دولت کہاں سے آگئی ہے"؟

"تم لوگ ہی تو کہہ رہی ہو کہ پچھلے بیس سال سے اسکا خاوند ابوظبی میں محنت کر رہا ہے"۔ بے جی نے کہا۔

"تو اس کا یہ مطلب نہیں بے جی وہ ہمیں بن ٹھن کے دکھائے اور ہمارے اندر احساس محرومی پیدا کرے۔" شہلا فاروقی جواب تک خاموش بیٹھی تھی۔ جل کر بول اٹھی۔ "اگر اس کا خاوند اوور ٹائم لگا لگا کے اتنا پیسہ کما رہا ہے تو ہم کیا کریں۔ ہم اپنے شوہروں کو ڈاکہ ڈالنے کی ترغیب تو نہیں دے سکتیں ـــــ"۔

"جھلیو۔۔۔۔" بے جی نے معوذ کو اٹھا کے دوسرے گھٹنے پر ڈال لیا۔ اور بولیں "کیا پڑا ہے اس کپڑے زیور میں ـــــ مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے۔ میں دیکھتی ہوں ہماری عورتیں کپڑوں کے پیچھے دیوانی ہیں۔ ان کے جنون نے ہر شہر میں اسمگل شدہ کپڑوں کے چور بازار کھلوا دیئے ہیں۔ ہمارے زمانے کی عورت اچھی تھی بالکل سادہ پہناوا تھا۔ جس کی پہلوٹھی کی بیٹی ہو جاتی تھی وہ تو بالکل سادگی پر اتر آتی تھی۔ یہاں جوان بیٹیاں اور مائیں ایک سے ملبوسات پہن کر نکلتی ہیں۔ دراصل اب احترام بربنائے دولت ہو گیا ہے۔ حسب نسب کو کوئی نہیں پوچھتا۔ بس پہناوا دیکھتے ہیں۔ اسی لیے تو رذیلوں اور نجیبوں کا فرق مٹ گیا ہے ـــــ"

"سچ کہتی ہیں آپ بے جی ـــــ" دیدہ منیر نے حسب عادت جلدی سے بے جی کا ساتھ دیا۔

"بے جی ہم کیا کریں"؟ رانی بلوچ بولی۔ "کچھ ہوا ہی ایسی چل نکلی ہے۔ جو اچھا اور قیمتی لباس نہ پہنے اسے کوئی شریف سمجھتا ہی نہیں ـــــ"

"گڑیو! تم میرے پاس کیوں آ بیٹھی ہو ـــــ؟" بے جی نے سوال کیا۔

"بے جی آپ تو اتنی پیاری شخصیت ہیں۔۔۔۔ اور آپ کے پاس باتوں کا خزانہ ہے۔ سچ آپ کی باتیں سن کے بڑا مزہ آتا ہے۔ کبھی کبھی میرا شوہر بھی آپ سے جلنے لگتا ہے۔" سویرا صادق ایمانداری سے بولی۔

"میں تو خوش لباس نہیں ہوں"۔ بے جی بولیں: "لٹھے کی شلوار ململ کا دوپٹہ اور لان کی

لمیض پہنتی ہوں اور مجھے کبھی فرق بھی نہیں پڑا۔ ساری عمر سادہ لباس پہنا ہے۔ مگر زندگی سے سیکھنے کی کوشش کی ہے۔ گرلیو! دوسروں پر اپنی شخصیت کا رعب ڈالنے کے لیے کچھ سیکھو۔ علم حاصل کرو۔ کپڑے تو آج کل ڈومنیاں اور میراثنیں بھی بہت اعلیٰ پہننے لگ گئی ہیں۔"

"ہم سے اس عمر میں علم حاصل نہیں ہوتا بے جی"—— شہلا فاروقی نے بیزاری سے کہا۔ "بڑی مشکل سے اسکول اور کالج کے امتحانوں سے جان چھوٹتی ہے۔"

پھر ساری کی ساری ہنسنے لگیں۔

بے جی نے اٹھ کے معوذ کو اسکی کھاٹ میں لٹا دیا اور کھاٹ کے اوپر جالی کا دوپٹہ ڈال دیا پھر رملی سے بولیں۔

"چائے کے جھوٹے برتن اٹھالو——"

رملی نے پیالیاں ادھر ادھر سے اٹھا کر ٹرالی کے نچلے حصے میں جمائیں اور ٹرالی گھسیٹتی ہوئی باورچی خانے کیطرف لے گئی۔

"دیکھو! گرلیو!" بے جی دوبارہ پلنگ پر چوکڑی مار کے بیٹھ گئیں اور بولیں۔

"آج کل ہر کوئی اچھا کپڑا پہن سکتا ہے۔ اس لیے نہیں کہ ہر ایک کے پاس دولت آگئی ہے اسلیئے کہ ہر ایک کو پہننے کا شعور آگیا ہے۔ یا وبا چل نکلی ہے۔"

"مگر یہ اسراف ہے۔ میرا خیال ہے عورتوں کو چاہیئے اپنی عادات میں خود توازن پیدا کریں۔"

"بے جی——" رانی بلوچ جلدی سے بولی۔

"یہ جو بازار کپڑوں سے بھرے رہتے ہیں۔ ان کا کیا کریں۔ انہیں دیکھ دیکھ کر دل للچاتا ہے۔"

"اول تو اپنے دل کو مناؤ" بے جی نے محبت سے کہا۔ "شوہر بڑی محنت سے پیسے کماتے ہیں۔ اسے کسی اچھے کام میں لاؤ۔"

"یہاں مہینہ مشکل سے گذرتا ہے بے جی"—— فریحہ شیخ بولی۔ "اور آپ کہتی ہیں۔ پیسے کو کسی مصرف میں لاؤ۔"

"اور پھر ہر مہینے تو کپڑوں کا فیشن بدل جاتا ہے۔ ہم کیا کریں"۔ گلنار زیدی پھر بولی۔

"یہی تو میں کہہ رہی ہوں۔ یہ صرف تمھاری سوچ کا انداز ہے۔ بس اتنے کپڑے بنایا کرو۔ جتنے ایک انسان کیسلئے ضروری ہیں۔ اپنے اوپر جبر کر کے ایسا کرو۔ اور ایک دو جوڑے کم کر کے وہ پیسے کسی ضرورتمند کو دے دیا کرو۔ مثلاً تم سب کالونی کی عورتیں مل کر سال میں دو تین جوڑے کم کر دو۔ اور ان پیسوں کو جمع کر کے کسی غریب کسی یتیم لڑکی کی شادی کر دیا کرو۔ دیکھنا تمہیں کتنی خوشی ہوگی اور اس

فضل سے اللہ بھی خوش ہو گا۔۔۔۔۔

"لو اور سنو" ـــــ راضیہ آفریدی نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"پہلے تو کسی یتیم غریب لڑکی کو تلاش کریں۔ ڈھنڈورا پیٹیں ـــــ گلی گلی گھومیں اور پھر ـــــ ۔۔۔۔۔"

بے جی نے پیار سے جھڑکا۔ "ڈھنڈورا پیٹنے کی کیا ضرورت ہے۔ صرف اپنے اردگرد دیکھنے کی ضرورت ہے۔ محلے میں آس پاس۔ رشتہ داروں میں ـــــ بہت سے سفید پوش نظر آجاتے ہیں۔ وہ اول خویش والا محاورہ تم نے سنا ہے۔ کون سا خاندان ہے جس میں غریب رشتے دار نہیں ہوتے ـــــ مگر لوگ تو غریبوں کو رشتہ دار کہتے ہی نہیں اور دور دور جاکر مدد کرتے ہیں۔"

اس بات کا جواب ان عورتوں میں سے کسی کے پاس نہ تھا ـــــ

رملی برتن رکھ کر آئی تو پھر اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اب خواتین پھر موضوع بدلنا چاہتی تھیں۔ اسلیئے رانی بلوچ نے راضیہ آفریدی سے پوچھا۔

"تم نے نیا فلیٹ خرید لیا ہے ـــــ"

وہ بولی "ہاں خرید تو لیا ہے۔ مگر ابھی فرنش نہیں کیا۔"

"کب جا رہی ہو ـــــ!"

"دو مہینے تو لگ جائیں گے؟"

تم یہ گھر چھوڑ رہی ہو راضیہ۔ بے جی نے اس سے پوچھا۔

ہاں بے جی کرایہ بہت زیادہ ہے اور پھر اپنا گھر تعمیر کرنے کی ہمت بھی نہیں ہے اس لیے ہم نے بنا بنایا فلیٹ خرید لیا ہے۔"

"کمرے بہت چھوٹے ہیں ان اپارٹمنٹس کے ـــــ سویرا صادق نے کہا۔ میں نے دیکھے تھے۔ بھئی میرا دم گھٹنے لگا تھا۔"

"ظاہر ہے تمہاری اتنی بڑی ذاتی کوٹھی ہے تمہارا تو دم گھٹے گا ہی"۔ راضیہ نے طنزاً کہا۔

"مگر ان فلیٹوں کا ایک فائدہ بھی ہے" رانی بلوچ پھر شوخی پر اُتر آئی۔ "کم از کم رشتہ داروں سے نجات مل جاتی ہے۔ کوئی رہنے کے لیئے نہیں آتا"۔

ساری خواتین ایک دوسرے کو آنکھیں مار کے ہنسنے لگیں۔

"خصوصاً سسرالی رشتہ دار ـــــ" یہ گلنا زیدی تھی۔

بے جی بھی ہنسنے لگیں۔

پھر کہنے لگیں۔

"دیکھو کڑیو! زمانے کے تقاضے ہمارے دیکھتے دیکھتے بدل گئے ہیں۔ پتہ نہیں اسے انقلاب کہتے ہیں یا ارتقاء ــــــــ

"پہلے زمانے میں جب مہمان گھر میں آتے تھے تو انہیں باعث رحمت سمجھا جاتا تھا۔ اب انہیں مصیبت سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے زمانے میں بڑے خوبصورت دستور تھے۔ اور گھر بہت چھوٹے چھوٹے ہوا کرتے تھے۔ یعنی ایک گھر میں ہی ساس سسر دیورانیاں جیٹھانیاں رہا کرتی تھیں۔ بعض دفعہ صرف ایک کمرہ حصے میں آتا تھا اور ایک کمرے والے گھر میں جب کوئی عزیز رشتہ دار آ جاتا تھا تو بڑی خوشی منائی جاتی تھی ان کے لیے پلنگ بچھائے جاتے تھے بستر لگائے جاتے تھے کھانے پکائے جاتے تھے۔

"مگر اب میں دیکھتی ہوں۔ جدید گھروں میں بچوں کے بیڈ روم الگ الگ ہوتے ہیں۔ اور اگر فالتو مہمان آ جائیں تو انہیں ڈرائنگ روم کے فرش پر سلایا جاتا ہے اور وہ بھی بے چارے چور بن کر آتے ہیں۔ اور جہاں جگہ ملے سما جاتے ہیں۔

"ہم ہمیشہ اپنے بچوں کو زمین پر سلا دیتے تھے اور پلنگ مہمانوں کے حوالے کرتے تھے۔ اب گھر کشادہ ہو گئے ہیں اور دل تنگ ہو گئے ہیں۔

"آج کل کے بچے اور طرح کے ہیں بے جی" ــــــ شہلا فاروقی نے کہا۔ "ان کی کھانے کی کرسی پر کوئی مہمان بیٹھ جائے تو روٹھ جاتے ہیں۔"

"تم پڑھے لکھے لوگوں نے ان بچوں کو خود غرض بنایا ہے۔ اپنی ناآسودہ حسرتیں ان پر نکالتی ہو۔ یہ تن آسان اور لالچی ہو جاتے ہیں۔"

"ہاں بے جی ٹھیک کہہ رہی ہیں" سویرا نے فوراً تسلیم کر لیا۔ اس میں سب قصور ہمارا ہے۔"

"پہلے زمانے بھی عجیب ہوتے تھے" ــــــ بے جی نے اتنی حسرت سے کہا کہ سارے پرانے زمانے ان کی آنکھوں میں اتر آئے۔ لوگ لوگوں سے مل کر خوش ہوتے تھے۔ اب لوگ لوگوں پر برتری ثابت کر کے خوش ہوتے ہیں۔ بچوں کو پالنے کا ڈھنگ بھی نرالا تھا۔ بچے مہمانوں کا ادب کرتے تھے۔ اچھا کھانا مہمانوں کو پیش کرنے کا رواج تھا۔ اور جو جھوٹا موٹا بچ جاتا۔ وہ بچوں کو کھلا کر سلا دیا جاتا۔ بچے بھی بالکل احتجاج نہ کرتے تھے۔ اب تو بھئی نئے زمانے کے تقاضے ہماری سمجھ سے بالاتر ہیں۔ ہر ماڈرن ماں پہلے اپنے بچوں کو ٹھونس ٹھانس کر کھلا دیتی ہے۔ پھر جو بچ جاتا ہے مہمانوں کو پیش کر دیا جاتا ہے۔ میں نے بعض گھروں میں دیکھا ہے۔ ریفریجریٹر پھلوں سے

بھرا رکھا ہے اور کھانے کی میز پر کچھ مہمان آ گئے۔ اب بچہ ضد کر رہا ہے کہ آم کھاؤں گا تو ماں اسے ایک طرف لے جا کر کہتی ہے۔ جاؤ فریج میں سے نکال کے اپنے کمرے میں بیٹھ کے کھا لو۔ اس طرف مت لانا۔ مہمانوں کو کھلانا پڑ جائے گا۔

اس پر ساری عورتوں نے پھر قہقہہ لگایا۔ جیسے بے جی نے ان کے دل کی بات چرالی ہو۔

"بے جی ــــ کہیں یہ سب حد سے زیادہ مہنگائی کی وجہ سے تو نہیں" ــــ؟ وِیدہ منیر نے سنجیدگی سے کہا۔

"اے بی بی! بس رہنے دے ــــ کبھی کسی کو کھلانے سے بھی کمی واقع ہوئی ہے ہر آدمی اپنا نصیب لے کے آتا ہے ــــ"

"اچھا ایک بات تو بتائیں بے جی" ــــ رانی بلوچ پھر شوخی پر اتر آئی۔

"آپ تو کہتی ہیں آپ اگلے زمانے کی ناخواندہ عورت ہیں۔ پھر آپ کو اتنی باتوں کا پتہ کیسے چل جاتا ہے ــــ"؟

اب بے جی کے ہنسنے کی باری تھی۔ اچھی طرح ہنس کر بولیں۔

"آنکھیں اور دماغ تو رکھتے ہیں نا؟ ارد گرد جو کچھ ہوتا ہے۔ اس کا مشاہدہ تو کر سکتے ہیں۔ انسان کے اندر سے سوچ کی قوت نہیں ختم ہونی چاہیئے۔ آج کل کا تعلیم یافتہ طبقہ ہمیشہ دوسرے کے فلسفے کے حوالے دیتا ہے۔ اپنا ذاتی فلسفہ نہیں رکھتا۔ میرے خیال میں انفرادی سوچ نہ رہے تو انسان سب سے بڑا جاہل بن جاتا ہے ــــ"

"ہائے کتنی دیر ہو گئی ہے" وِیدہ منیر نے شرمندگی سے کہا "بے جی کی باتوں میں وقت کا پتہ ہی نہیں چلتا ــــ تم سب کا چلنے کا ارادہ ہے یا نہیں۔۔۔۔"

ابھی وہ آخری فقروں کا تبادلہ کر رہی تھیں کہ سامنے معاذ نمودار ہوا ــــ اس نے قریب آ کے سب کو سلام کیا۔ کسی نے بیٹے کی مبارکباد دی تو کسی نے کوئی شوخ فقرہ کہہ دیا۔ وہ سر جھکائے اندر چلا گیا ــــ

سب خواتین کھڑی ہوئیں تو رملی بھی کھڑی ہو گئی۔ پھر ان سب کو خدا حافظ کہہ کے وہ معاذ کے پیچھے ہی اپنے بیڈ روم میں آ گئی۔

معاذ نے ٹائی کی گرہ ڈھیلی کی۔۔۔۔ کوٹ اتارا ــــ اور تھکے ہوئے انداز میں صوفے پر بیٹھ گیا۔

رملی نے پوچھا ــــ "آپ کے لیے چائے لے آؤں ــــ؟"

"اگر تیار ہے تو لے آؤ"۔
باورچی خانے میں گرم چائے رکھی تھی۔ رملیٰ ایک پیالی بنا کر لے آئی۔
اس نے جب پیالی معاذ کے ہاتھ میں پکڑائی تو وہ رملیٰ کا چہرہ دیکھ کر بولا۔
"کب آرہے ہیں بھئی تمہارے مہمان ——"؟
رملیٰ کے دل نے ڈبکی لگائی۔۔۔۔۔۔ ایک ثانیے میں ڈوبا —— اور پھر ابھرا ——
اسے محسوس ہوا جیسے اسکا رنگ بھی تھوڑا سا اڑا ہے —— ایسے جیسے معاذ نے اسکے دل کی چوری پکڑ لی ہو۔

وہ ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی۔
"چھ بجے آئیں گے ——"
رملیٰ نے کل ہی معاذ کو بتادیا تھا کہ جیدہ اس کی بچپن کی دوست ہے۔ وہ اور اسکا شوہر کل معاذ سے ملنے آئیں گے۔ اسلئے وہ ذرا وقت پر گھر آجائے۔
معاذ نے ہنس کر اسکی آنکھوں میں دیکھا اور بولا۔
"میں وقت پر آگیا ہوں نا؟ —— ابھی صرف پانچ بجے ہیں"۔
"جی"۔ رملیٰ نے آہستہ سے کہا۔
"دیکھو میں کتنا فرمانبردار شوہر ہوں۔ ہے نا"؟
"جی ——"۔ رملیٰ نے آہستہ سے کہا۔
اس پر معاذ نے خوب اونچا قہقہہ لگایا۔ اور کھڑا ہو گیا۔
"اتنی سہمی ہوئی کیوں ہو —— ؟ میں کوئی تمہیں کھا جاؤں گا ——"؟
کھڑے ہوتے ہی معاذ نے اپنی کالی انگلی سے اس کے زرد رخسار کو چھوا۔
تو وہ ڈر کر ایکدم پیچھے ہو گئی۔
معاذ نے ایک لمبی سی انگڑائی لی۔ اور بولا۔
"میری شلوار قمیص نکال دو۔ نہا کر کپڑے بدل لوں۔ تمہاری سہیلی کو بن ٹھن کے بھی تو دکھانا ہے ——"۔
رملیٰ کا دل چاہا کہ وہ معاذ سے کہدے کہ وہ شلوار قمیص نہ پہنے۔
سوٹ میں پھر بھی کچھ اچھا لگتا تھا۔ مگر شلوار قمیض میں تو ایک دم جانور سا لگتا تھا۔
مگر اس نے کچھ نہیں کہا —— ہلکا جوگیا سوٹ نکال کر بستر پر رکھدیا۔
معاذ نے نہا کر کپڑے بدل لیے تو شیشے کے آگے کھڑے ہو کر اپنے گھنے بالوں میں

کنگھی کرنے لگا۔

وہ ان قطروں کو کھڑی دیکھتی رہی جو اس کے لہریئے بالوں میں سے نکل رہے تھے۔

ایک دم سے مڑ کر معاذ نے رملی کی جلتی بجھتی آنکھوں میں دیکھا اور بولا۔

"کہیں تمھاری سہیلی یہ نہ کہدے کہ تمھارا شوہر بدصورت ہے ــــ۔۔۔۔"

"اس لیے ذرا بناؤ سنگھار کر رہا ہوں ــــ"

رملی نے نظریں جھکا لیں۔ پتہ نہیں اسکی آنکھیں سارا راز فاش کر رہی تھیں۔ یا معاذ ویسے ہی مذاق کر رہا تھا۔

رملی ادھر ادھر سے برتن اٹھا کر باہر نکل گئی۔ باہر جا کر دیکھا تو معوذ اٹھ گیا تھا اور کھاٹ میں سے اس کے رونے کی آواز آرہی تھی۔ اور بے جی غالباً عصر کی نماز پڑھنے چلی گئی تھیں ــــ۔

رملی نے معوذ کو اٹھایا اور اپنے بیڈ روم میں آگئی۔ معاذ نے مڑ کر معوذ کو دیکھا تو جیسے اس کا سیاہ چہرہ روشن ہوگیا۔ آنکھوں میں محبتوں کی مشعلیں روشن سی ہوگئیں۔ بے تاب ہو کر اس نے معوذ کو رملی کے ہاتھوں سے لے لیا۔ اس کے ہاتھوں میں جاتے ہی معوذ پھر زور زور سے رونے لگا۔

"ارے۔۔۔۔ ارے۔۔۔۔ تجھے بھی اپنے ابو سے ڈر لگتا ہے۔"

معاذ نے ایسے لہجے میں کہا کہ رملی کا سارا خون چہرے پر آگیا۔ پتہ نہیں معاذ یہ سب معصومیت سے کہتا رہتا تھا۔ یا رملی کو کچھ کے لگانا مقصود تھا۔

رملی نے آگے ہو کر معوذ کو اس کے ہاتھوں سے لے لیا اور بولی۔

"یہ گیلا ہو رہا ہے۔ اس لیے رو رہا ہے ــــ"

اسی وقت نوکرانی نے آکر بتایا۔

"جی آپ کے مہمان آئے ہیں۔"

رملی کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ پھر ایک کٹھن گھڑی سامنے آکھڑی ہوئی تھی اور وہ لوگ ٹھیک وقت پر آگئے تھے۔ رملی نے معاذ کیطرف دیکھکر التجا آمیز لہجے میں کہا۔

"آپ ذرا چل کر ان سے ملیں۔ میں معوذ کا نیپی بدل کے آتی ہوں۔"

دراصل وہ معاذ کے ساتھ اندر جانا نہ چاہتی تھی اور نہ ہی اپنے منہ سے اپنے شوہر کا تعارف کرانا چاہتی تھی۔

معاذ باہر نکل گیا۔ تو اس نے ایک ٹھنڈی سانس چھوڑی اور معوذ کو لیکر غسل خانے میں چلی گئی۔



رملی جب ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو تعارف کا مرحلہ طے ہو چکا تھا۔ حسب عادت معاذ بڑی دلچسپ باتیں کر رہا تھا۔ جیّدہ حیرت سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی اور یاور —— یاور نے حسب معمول سگار میں پناہ لے رکھی تھی۔ اس کے چہرے کے ارد گرد بے تحاشہ دھواں تھا۔ بظاہر وہ معاذ کی باتیں بڑی سعادت مندی سے سن رہا تھا۔ رملی کے اندر آنے پر، معاذ اور یاور دونوں ایک ساتھ کھڑے ہو گئے —— یاور کے چہرے کے ارد گرد ٹھہرا ہوا سفید دھواں بل کھا کر اوپر کو جانے لگا —— جس میں خود رملی کو یاور کے اپنے جذبات کا ردِ عمل نظر آیا —— اس نے دونوں مردوں کو چھلتی سی نگاہ سے دیکھا اور سلام کر کے جھٹ بیٹھ گئی۔

"بھئی تمھارے میاں تو بڑے دلچسپ آدمی ہیں!"

جیّدہ نے اس کے بیٹھتے ہی کہا۔ جیّدہ کے لہجے میں کچھ تھا یا نہیں۔ مگر اس کے چہرے پر جو طنز تھا رملی نے اسے صاف محسوس کر لیا تھا۔ اور تھوڑی سی باتوں کے بعد اٹھ کر چائے کے بہانے باہر آ گئی۔

چائے بنانے اور لیجانے میں اس نے خاصی دیر لگائی۔ اندر بھی وہ زیادہ تر تواضع میں ہی لگی رہی —— جان بوجھ کر یاور کیطرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ مبادا دونوں کی نظر ٹکرا جائے۔ مگر آج تو یاور بھی انجان بنا بیٹھا تھا۔ نظریں جھکائے خاموشی سے سگار پی رہا تھا، کبھی کبھی نظر اٹھا کر معاذ کی طرف دیکھ لیتا اور پھر نظریں جھکا لیتا۔ البتہ جیّدہ پوری پوری سالی بنی ہوئی تھی۔ اور باتوں باتوں میں اس کی کھنچائی کر دیتی۔

رملی گھبرا کر باہر نکل آئی۔ اور بے جی سے بولی۔

"بے جی آپ اندر نہیں آئیں گی ——؟"

"کون آیا ہے ——؟"

"میری ایک سہیلی اور اس کا میاں آئے ہیں"۔

"اگر بہت قریبی دوست ہے تو میں آجاتی ہوں۔"

بے جی کی یہ عادت رملی کو بہت اچھی لگتی تھی کبھی کسی بات سے انکار نہیں کرتی تھیں۔ ہر وقت ہر ایک کا دل رکھنے کو تیار ——

"آجائیں آپ بھی ——"

آگے بڑھ کر رملی معوذ کو اٹھانے لگی تو بے جی نے اسے روک دیا۔ میں خود اسے لیکر اندر آجاؤں گی۔

پتہ نہیں آج رملی پناہیں کیوں ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔

وہ اور رملی آگے پیچھے داخل ہوئیں تو جیدہ نے بیٹھے بیٹھے ہی سلام کر دیا۔ البتہ یاور پھر کھڑا ہوا۔

یہ ——— رملی نے ہکلاتے ہوئے کہا۔۔۔ میری سا۔۔۔۔۔۔۔ یہ یہ معاذ کی امی ہیں۔ وہ ساس کہتے کہتے رک گئی۔ بے جی تو بالکل بھی ساس نہیں تھیں۔ وہ تو زندگی گذارنے کی میٹھی آس تھیں۔

وہی ہوا بیٹھتے ہی بے جی نے گھریلو قسم کی باتیں شروع کر دیں اور رملی کی جان چھوٹ گئی۔

ایک کونے میں معاذ اور یاور خالص کاروباری قسم کی باتیں کر رہے تھے اور دوسرے کونے میں بے جی رملی اور جیدہ خالص زنانہ قسم کی باتیں کر رہی تھیں۔

"کتنے سال ہوئے تیری شادی کو ——" بے جی نے پوچھا۔

"سات سال ۔۔۔"۔ جیدہ نے جواب دیا۔

"اور کتنے بچے ہیں ——"؟

"جی بچہ تو نہیں ہے"۔ جیدہ نے محرومی کے انداز میں سر جھکا کر کہا۔

"ہوا نہیں یا ہونے نہیں دیتے ——"

بے جی نے پھر بے تکلفی سے پوچھا۔

"بس جی ۔۔۔۔"۔ جیدہ نے نظر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا اور ٹھنڈی سانس لے کر بولی "اب تو یہی سمجھ لیں کہ قسمت میں نہیں ہے"

قسمت کا حال تو صرف اللہ جانتا ہے۔ بے جی نے وثوق سے کہا۔ اور اللہ سے کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ آج کل کے نوجوان جوڑے شروع میں کچھ غلطیاں کر لیتے ہیں۔ کیونکہ وہ اللہ کے کاموں میں دخل دینا چاہتے ہیں۔ اور پھر بعد میں مایوس ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔"

رملیٰ نے حیران ہو کر بے جی کی طرف دیکھا۔ بے جی کو اتنی گہری باتوں کا کیسے پتہ چل جاتا ہے۔

جیدہ کھسیا کر ہنسنے لگی۔ پھر بولی۔

"آپ بزرگ ہیں ـــــ آپ تو سب جانتی ہیں۔ آپ سے کیا چھپانا......"؟

"ہو گئی تھی ایک ایسی غلطی ـــــ"

"مگر اب ـــــ اب ساری زندگی اس کا خمیازہ بھگتنا ہے"۔

یہ کہتے ہی جیدہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

بے جی نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور بولیں۔

انشاءاللہ تمہارے بچہ ہو گا۔ انسان کو کسی حالت میں مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ اللہ مایوسی کو پسند نہیں کرتا۔ دوا کے ساتھ۔ دعا بھی کیا کرو۔ اور نماز پڑھا کرو اللہ کو اسطرح یاد کرنے کا طریقہ بہت پسند ہے۔"

جیدہ نے سر جھکا لیا۔ اسکی ٹھوڑی سینے سے جا لگی۔ اسے تو پتہ نہیں کتنا عرصہ ہو گیا تھا ـــــ کبھی نماز ہی نہیں پڑھی تھی۔ اللہ کو یاد نہیں کیا تھا۔ یاور کے ساتھ رہتے رہتے وہ نہ جانے کیسی ہو گئی تھی۔ کبھی پلٹ کر اس نے اپنی حالت پر غور نہیں کیا تھا۔

معوذ روشنی کے بلب کو دیکھ کر غوں غاں کرنے لگا اب وہ تقریباً دو مہینے کا ہو گیا تھا اور خوب پھول رہا تھا جب سے رملیٰ اپنے گھر آئی تھی اس کی ساری ذمہ داری بے جی نے سنبھال لی تھی اس کی خوراک کا خیال رکھتیں۔ روزانہ تازہ مکھن سے اسکی مالش کرتیں اور نیم گرم پانی سے نہلاتیں۔ شہد میں ملا کر تھوڑا سا مکھن چٹا بھی دیتیں ـــــ رملیٰ ہائے ہائے کرتی رہ جاتی۔ مگر وہ اپنے ٹوٹکے استعمال کرتی رہتیں۔ رات کو بے جی معوذ کو اپنے کمرے میں سلاتی تھیں۔

پہلے پہل معاذ نے بہت احتجاج کیا تھا۔ وہ کہتا۔

بے جی آپ بیمار رہتی ہیں، آپ کی آرام کرنے کی عمر ہے۔ سارا دن گھر کا کام کرتی ہیں۔ اور رات کو اس بچے کے ساتھ جاگیں گی۔

"تو کیا ہوا۔ کیا تیرے ساتھ نہیں جاگتی تھی"؟

"اس وقت کی اور بات تھی۔ آپ جوان تھیں اور پھر ہر ماں اپنے بچے کے لیے جاگتی ہے"۔

ارے یہ کیا کہہ رہا ہے پگلے۔ کیا معوذ میرا بچہ نہیں ہے۔
ہے توبے جی..... معاذ شرمندہ ہوگیا —— میں جو کہہ رہا ہوں۔ اسے سمجھنے کی کوشش کریں۔

چل بڑا آیا مجھے سمجھانے۔ تو کیا جانے اصل سے بیاج زیادہ پیارا ہوتا ہے۔

معاذ ہنسنے لگا۔ پھر بے جی کو اپنے ساتھ لپٹا کر بولا۔

"بے جی رملی کو ماں بننے دیں۔ اسے یہ تکلیفیں اٹھانے دیں۔ ایسا نہ ہو اسے آرام کی عادت پڑ جائے۔"

"ابھی وہ بھی بچی ہے تو کیا ہاتھ دھو کے اس کے پیچھے پڑا رہتا ہے۔ اسے کیا معلوم رات کو بچے کے ساتھ کیسا سلوک کرنا چاہیئے۔ کل رات وہ بار بار اُٹھ کے اس کو دودھ پلاتی رہی۔ اس طرح بچے کا پیٹ خراب ہو جائے گا۔ اصولاً رات کو سات بجے بچے کو دودھ پلا کر سلا دینا چاہیئے۔ اور پھر صبح چھ سات بجے بچے کو دودھ دینا چاہیئے۔ میں چند دنوں میں اسے ساری رات سونے کی عادت ڈال دوں گی۔ منہ اندھیرے تو بچاری اٹھ کر آ جاتی ہے۔"

"بے جی..... بے جی..... بیمار ہو کر کہیں مجھے مصیبت میں نہ ڈال دینا۔"

"نہیں ہوتی میں بیمار..... تو کہہ کہہ کے مجھے بیمار کر دے گا۔"

"بھئی ہمارے کمرے میں تو کچھ رونق ہونی چاہیئے۔ اس نے آخری پتہ پھینکا۔"

"اچھا ——" بے جی نے گھور کر اسے دیکھا۔ اور بولیں۔

"تم دونوں میاں بیوی اپنے لیے ایک اور بچہ پیدا کر لو —— جاؤ....."

اس بات پر معاذ بے تحاشا ہنسنے لگا۔

"حد کرتی ہیں آپ بے جی ——" یہ کہہ کر شرمندہ سا اٹھ کر چلا آیا۔

جیدّہ بچے کو ہاتھ پاؤں چلاتا دیکھ کر حیران سی ہو رہی تھی۔

"لے اٹھا —— اسے گود میں اٹھا۔" بے جی نے معوذ کو اس کی طرف بڑھایا۔

"چھوٹے بچوں کو اٹھایا کر۔ اس سے دل میں مامتا پیدا ہوتی ہے۔"

جیدّہ نے ڈرتے ڈرتے معوذ کو اٹھا لیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد واپس کر دیا۔

"ہائے یہ تو بہت نرم ہے۔ ڈر لگتا ہے....."

بے جی نے بچہ واپس لے لیا۔

اس میں سے کتنی اچھی خوشبو آتی ہے رملی۔ جیدہ ایک دم بولی۔ کیا ہر بچے سے ایسی ہی خوشبو آتی ہے۔

"ہاں ——" رملیٰ کی بجائے بے جی نے جواب دیا۔ "جب تک بچہ روٹی نہیں کھاتا اس کے جسم سے ایسی ہی خوشبو آتی ہے۔ یہ گندم کا خمار ہے جو بچے سے اس کی اصل خوشبو چھین لیتا ہے۔ ادھر گندم منہ کو لگی۔ ادھر انسانی علتیں پیدا ہونا شروع ہوئیں ——"

جیدہ کو یہ اتنی مشکل بات بالکل سمجھ میں نہیں آئی۔ رملیٰ کی طرف دیکھ کر بولی۔

"تو آج بہت تھکی تھکی لگ رہی ہے۔ رات کو کاکا جگاتا ہوگا ——"

"نہیں ——" رملیٰ اپنی سوگواری چھپا کر بولی —— "معوذ تو بے جی کے کمرے میں سوتا ہے۔"

"سچ ——" جیدہ نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کے پوچھا ——

"کتنی اچھی ہے تیری ساس —— ایک دم اس کے منہ سے نکل گیا۔ "میری اتنی اچھی ساس ہوتی تو میں یاور کی بالکل پروا نہ کرتی ——"

رملیٰ اور بے جی ہنس دیں . . . .

(اور تیرا خیال ہے میں معاذ کی پروا کرتی ہوں)

(اس عورت نے ہی تو میرے ارد گرد محبت کا جال بچھا رکھا ہے)

"ڈارلنگ!" ایک دم یاور کی آواز آئی۔

"آٹھ بجے ڈنر پر بھی جانا ہے"۔ اب اجازت لو۔

"ہاں سچ سچ . . . ." جیدہ کھڑی ہو گئی۔

"رمو اب ہمیں اجازت دو۔ اور اب تم معاذ بھائی کو لیکر ہمارے گھر آنا"۔

رملیٰ بھی کھڑی ہو گئی۔ اس کے ساتھ معاذ اور یاور بھی کھڑے ہو گئے —— جب الوداعی جملے کہے جا رہے تھے۔ رملیٰ نے چور نظروں سے یاور کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اسکی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور اس کی یہ نظر کہہ رہی تھی۔

"میں تمھارے دل کا درد جان گیا ہوں۔
تم جس کالے جادو میں اسیر ہو۔ اس کا توڑ ہے میرے پاس ——"

رملیٰ آج پھر بجھ گئی تھی۔ جلنا بجھنا تو اسکی قسمت میں لکھا تھا۔ مگر یاور اور جیدہ کے جانے کے بعد اس کے دل پر اتنی اوس گری کہ جی چاہنے لگا آج پھر اوندھے منہ جا کر بستر پر گر جائے یا منہ پر تکیہ رکھ کر اندھیرے غار میں چھپ جائے ——
مگر اب یہ بھی ناممکن لگ رہا تھا۔

جب سے معوذ پیدا ہوا تھا اس کی زندگی کا کوئی پہر اسکا اپنا نہ رہا تھا۔۔۔۔ ہر وقت چھوٹے چھوٹے کام اسے مصروف رکھتے اور چوبیس گھنٹے جان معوذ میں پھنسی ہوئی تھی ــــــ اچھا اسی لیے لوگ بچے کو سنہری زنجیر کہتے ہیں ؟

کبھی کبھی جی چاہتا ہے ناکہ تنہائیاں اپنی ہوں ــــــ

آس پاس کوئی نہ ہو ــــــ اور ساری دنیا سے منہ چھپا کے تھوڑی دیر رو لیا جائے۔

کیسی دنیا ہے یہ اس نے سوچا ــــــ یہاں رونے کا وقت نہیں ملتا۔ ازدواجی زندگی میں کیا کوئی لمحہ اپنا ہوتا ہے !

اور بچے کی پیدائش کے بعد واقعی ساری دنیا چھوٹ جاتی ہے۔

زبردستی وہ روزمرہ کے کام کرتی رہی۔ جب تک معوذ سو نہیں گیا بے جی کے کمرے میں بیٹھی رہی۔ کھانا کھانے کے بعد جب وہ اپنے کمرے میں آئی تو معاذ ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ وہ چپ چاپ بستر پر لیٹ گئی اور حسبِ عادت چہرے پر کہنی جما لی۔

"معوذ سو گیا ہے ؟" معاذ نے پوچھا۔

جی اس نے بند آنکھوں سے جواب دیا۔

"معوذ کتنی جلدی بے جی سے مانوس ہو گیا ہے۔"

"جی ــــــ" رملی نے پھر اسی انداز سے کہا۔

معاذ نے کتاب بند کر کے تپائی پر رکھدی اور اسکی طرف رخ موڑا۔

"میں بے جی کے کمرے میں چلی جاؤں ــــــ ؟"

اچانک رملی نے کہنی ہٹا کر پوچھا۔

"کیوں ــــ ؟" معاذ نے اسے گہری نظر سے دیکھکر کہا۔

"کہیں۔۔۔۔ کہیں رات کو معوذ روئے نہیں ــــــ"

معاذ ہنسنے لگا۔

"یہ خیال تمہیں آج اتنی راتوں بعد کیوں آیا ــــــ ؟"

"روز ہی آتا ہے۔"

"تو روز کیطرح چپ چاپ سو جاؤ۔۔۔۔۔"

رملی نے پھر کہنی چہرے پر ٹکالی۔

"رمو جانتی ہو بے جی کیا کہہ رہی تھیں ؟"

"کیا کہہ رہی تھیں ؟"

"کہہ رہی تھیں۔ معوذ مجھے دے دو۔ اور تم لوگوں کو اگر شوق ہے تو اپنے لیے اور بچہ پیدا کر لو"۔

"نہیں نہیں . . . .،" رملی سمٹ کر پرے ہو گئی۔

معاذ ہنسنے لگا۔

"کیا بہت خوفناک تجربہ ہے بچہ . . . . . ."؟

"نہیں . . . . ؟" وہ خوفزدہ انداز میں بولی۔

"اس دن . . . . آپ نے . . . . ہسپتال میں . . . . وعدہ کیا تھا نا؟ ــــ کہ جب تک میں اجازت نہ دوں گی آپ . . . . آپ . . . ."۔

"ہاں ــــ" معاذ بولا۔ "مجھے اپنا وعدہ یاد ہے۔ میرا وعدہ وقتی وعدہ نہیں تھا۔ نہ میں نے تمھارا دل رکھنے کے لیے کیا تھا۔"

"ابھی تو معوذ بس دو مہینے کا ہے ــــ"

"اور تم کتنا وقفہ چاہتی ہو؟"

"کم از کم پانچ سال ــــ"

پانچ سال . . . . . . معاذ نے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا کر تکیہ بنایا اور اس پر اپنے گھنے بالوں والا سر رکھ دیا اور چھت کی طرف دیکھنے لگا۔ "پانچ سال تو ایک فیشن ایبل طبقے کا سلوگن ہے۔"

"پانچ سال بہت زیادہ عرصہ ہے رملی ــــ"

"پہلے بچے اور دوسرے بچے میں اتنا وقفہ نہیں ہونا چاہیئے ــــ پہلے بچے کو ویسے بھی بہت زیادہ توجہ مل جاتی ہے۔ جو اسے خراب کرتی ہے۔ پھر ہم تین افراد ہیں اس گھر میں پیار کرنے والے ــــ پہلے بچے اور دوسرے میں صرف دو سال کا وقفہ ہونا چاہیئے. . . ."

"نہیں . . . . ." رملی سمٹ کر اور پرے ہو گئی۔

"دو بچوں کو سنبھالنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اب . . . اب آپ . . . . ."

"نہیں میں تمھاری مرضی کے خلاف کچھ نہیں کروں گا۔" معاذ نے بڑی محبت سے کہا "تمھیں معلوم ہے رملی میں تمھاری مرضی کے بغیر کچھ بھی نہیں کرتا۔ معلوم ہے نا؟"

"جی ــــ"

"پھر تم اس طرح ڈری سہمی اور سکڑی سمٹی کیوں رہتی ہو ــــ"!

رملی نے ایک دم سر اٹھایا۔ اور دروازے کی طرف دیکھ کر بولی۔

"شاید معوذ رو رہا ہے۔"

دونوں تھوڑی دیر چپ رہے۔ کوئی آواز نہیں آئی۔ تو معاذ بولا۔

"تمھارا وہم ہو گا۔ ورنہ بے جی تمھیں بلا لیتیں۔"

رملی نے اپنا سر تکیے پر رکھ دیا۔

"میں نے بے جی سے بہت کہا تھا۔ میں رات کو ان کے کمرے میں سو جایا کروں۔ وہ مانتی نہیں ہیں۔" رملی نے جان بوجھ کر دوبارہ یہ موضوع شروع کر دیا کیونکہ تھوڑی دیر پہلے معاذ نے جس قسم کا سوال کر دیا تھا۔ اس سے رملی کے پسینے چھوٹ گئے تھے۔

"ان کے کمرے میں جانے کی بجائے تم معوذ کو کیوں نہ اپنے کمرے میں لے آؤ۔"

"آپ یہ سب شور شرابا برداشت کر لیں گے۔"

"کون سا شور شرابا ——"؟

"یہی بچہ جو رات کو اٹھتا ہے۔ روتا ہے۔ آپ ڈسٹرب تو نہ ہوں گے"؟

"یہ تمھیں کس نے کہہ دیا ہے رملی ——" معاذ نے اسکی طرف چہرہ کر کے کہا۔

"اپنے بچے کی آواز تو کسی مرد کو ڈسٹرب نہیں کرتی۔ میرا ایمان ہے کہ جس کمرے سے رات کو بچے کے رونے کی آواز آتی ہے۔ اس کمرے میں زندگی کی ساری خوشیاں ہوتی ہیں ——"؟

(نہیں —— رملی کا دل چاہا کہے —— نہیں ——

ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔

اس کمرے میں کبھی کبھی ایک بے ہاکی ماری ماں کا دل بھی روتا ہے ......)

مگر وہ جلدی سے بولی

"میں نے سنا ہے بعض مردوں کو راتوں کو بچے کی آوازیں بری لگتی ہیں۔ اس لیے وہ الگ کمرے میں سونے لگتے ہیں۔"

اچانک بالکل اچانک رملی کو شان بھائی یاد آ گئے ——

"بڑے بدنصیب مرد ہوں گے۔ جو بچے کی وجہ سے الگ کمرے میں جا سوتے ہوں گے۔"

"یہ ضرور ہے رمو کہ مرد اپنی نیند کے معاملے میں خود غرض ہے اور ماں کے قدموں میں اسی لیے جنت رکھی گئی کہ وہ اپنی رات کی نیند اور دن کا چین اپنے بچے پر وار دیتی ہے۔ مگر میں ان مردوں میں سے نہیں ہوں۔ جس طرح نیک عورت مرد کا کیریئر بنانے میں مدد دیتی ہے اسی طرح محبت کرنے والے مرد کو بچے کی پرورش کا کچھ بوجھ اٹھانا چاہیئے۔ اس سے بیوی کی عمر بڑھ جاتی ہے۔"

رملی نے ایک دم تڑپ کر معاذ کی طرف دیکھا۔ یوں پوری آنکھیں کھول کر پہلی مرتبہ اس نے معاذ کو دیکھنے کی جرأت کی تھی ـــــ معاذ بھی مسکرا کر اسکی آنکھوں میں دیکھتا رہا ـــــ معاذ کی آنکھیں گو بہت چھوٹی تھیں۔ مگر بالکل صاف ستھری تھیں ـــــ اتنی چمکدار اتنی صاف ستھری جس طرح مسجد کا صحن ـــــ

رملی نے اتنی صاف ستھری آنکھیں اس سے پہلے نہیں دیکھی تھیں۔ گو لال ڈوروں والی آنکھیں اسکی کمزوری تھیں۔ مگر معاذ نے تو پلک نہیں جھپکی تھی۔ یوں ٹک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔ جیسے اس کے دل میں کوئی کھوٹ نہیں ـــــ اس کے اندر کوئی جھول نہیں ـــــ اسے دنیا سے کچھ نہیں چھپانا۔

(کیا ـــــ کیا اس آدمی کو واقعی معلوم نہیں ہے۔ کہ یہ بدصورت آدمی ہے)

"اس طرح حیران ہو کر کیوں دیکھ رہی ہو ـــــ"؟ معاذ کا لہجہ محبت سے بہکنے لگا۔

"میں نے کوئی بہت عجیب بات کہہ دی ہے ـــــ ؟"

اسکی سانسوں سے ایک گرم مگر خوشبودار بھاپ نکلی . . . . . .

"میں اتنا خوبصورت مرد نہیں ہوں۔ مجھے اسطرح نہ دیکھا کرو . . . . . . مجھے غلط فہمی ہو جائیگی۔"

رملی کا دل دھک سے رہ گیا ـــــ غیرارادی طور پر اس نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔

"رمو . . . . " معاذ تھوڑی دیر رک کر بولا۔

"بچے کی پیدائش کے بعد میں تم میں ایک عجیب تبدیلی دیکھ رہا ہوں۔" رملی کے دل کا چور ادھر ادھر سر پٹکنے لگا۔

"گم صم تو تم پہلے بھی رہا کرتی تھیں۔ میرے ساتھ زیادہ باتیں کرنے کی تمہیں عادت کبھی بھی نہیں تھی۔ مگر جب سے تم میکے سے آئی ہو۔ مجھ سے بہت سمٹ کر رہتی ہو ـــــ پہلے تمہارا دماغ تمہارا ساتھ نہیں دیتا تھا۔ اب تمہارا جسم بھی تمہارا ساتھ نہیں دیتا۔"

رملی تڑپ کر سیدھی ہو گئی اور اپنے دھڑکتے دل پر ہاتھ رکھ لیا۔ کیا وہ اتنی بدسلیقہ ہے ذرا سی بات بھی نہیں چھپا سکی . . . . . .

(کم بخت یہ ذرا سی بات ہے ؟)

"آپ بھی کبھی کبھی کتنی عجیب بات کہہ دیتے ہیں"۔ رملی نے مصنوعی ہنسی ہنس کر کہا۔

"تم بھی کبھی کبھی بہت عجیب ہو جاتی ہو۔ مجھے یوں لگتا ہے۔ جیسے میں شوق کی انتہا پر بھاگتا ہوا تمہاری طرف آتا ہوں اور تم برف کے تودے کی طرح اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوتیں۔"

(یہ فریب بھی دینا پڑے گا)

رملی نے باقاعدہ رخ اس کی طرف پھیر لیا۔ مگر اس سے کچھ بھی نہیں کہا گیا۔ اپنی انگشت شہادت کا ناخن دانتوں میں ڈال کے کاٹنے لگی ——

"برا مان گئی ہو۔"؟ تھوڑی دیر بعد معاذ نے پوچھا۔

"نہیں تو ——" رملی اسی طرح بولی۔ "میں آپ کی کسی بات کا برا نہیں مانتی۔"

اس کا جواب تو یہ تھا کہ تم رسان سے کہہ دو۔

"میں آپ کو مانتی ہی نہیں ......" یہ کہہ کر معاذ ہنسنے لگا۔

(اُف ...... کیسے نکل گئی دل سے یہ بات)

رملی کو شام کے واقعات یاد آنے لگے۔ اس نے تو یاور سے ملتے وقت بہت احتیاط کی تھی۔ اس سے کوئی بات بھی نہیں کی تھی۔ سارا وقت جیدہ کی طرف متوجہ رہی تھی ——

پتہ نہیں معاذ آج ایسی باتیں کیوں کر رہا تھا۔

"رمو جب ہم کسی سے کہتے ہیں۔ میں تمھاری کسی بات کا برا نہیں مانتا۔ تو اس کے بس دو ہی مطلب نکلتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہم نے اس ہستی کو احترام کی آخری حد پر بٹھا دیا ہے۔ یا پھر اسے درخور اعتنا نہیں جانتے۔ اس قابل ہی نہیں سمجھتے ......"

(اف ... اف ..... رملی نے دانتوں سے اپنے ہونٹ کاٹے)

"آپ یہ سمجھ لیجئے ..... کہ میں آپ کا بے حد احترام کرتی ہوں۔"

"میاں بیوی میں صرف احترام کا رشتہ نہیں چلتا ....." وہ بولا۔

"کیوں کہ اس رشتے میں دوئی نہیں ہوتی۔ اس لیے یہ رشتہ عشق کا رشتہ ہونا چاہیئے —— عشق میں بے خودی بھی ہوتی ہے —— غلط فہمیاں بھی اور گستاخیاں بھی —— محبت میں گستاخی بہت اچھی لگتی ہے۔ مرد چاہتا ہے محبت میں کبھی کبھی گستاخی کی جائے —— بیوی اس کے ساتھ تو تڑاخ کرے۔ اس کو لڑائی میں سخت سست کہے۔ لڑ جھگڑ کر اپنی بات منوائے —— مرد عجیب جانور ہے ——" معاذ نے بھی رخ اس کی طرف پھیر لیا ——

"مرد ہر چیز چھین کے لینا چاہتا ہے —— لیکن کبھی کبھی —— جب بیوی چھینا جھپٹی کرتی ہے۔ تو اسے بہت اچھا لگتا ہے۔ اکھاڑے میں مار گرانے والا کبھی کبھی چت ہونا چاہتا ہے۔ اس عورت کے ہاتھوں جس سے وہ محبت کرتا ہے۔ یا جو اس کی محبوب بیوی ہے.....

"تم میری بات سمجھ رہی ہو نا؟ ....."

رملی پھر دانتوں سے اپنی انگلی کا ناخن کاٹنے لگی۔

شوہر اٹھتے بیٹھتے جو بیوی کو برا بھلا کہتا رہتا ہے تو یہ دراصل اسکا اعتراف شکست

ہوتا ہے کہ ایک ذراسی عورت اس کی حاصل زندگی ہوگئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سارا دن جو اس کی خامیاں گنواتا ہے تو اس کی کسی باطنی خوبی نے شوہر کو جکڑ رکھا ہوتا ہے ——

"شادی کے بعد مرد کو اظہار محبت سے گھن آتی ہے۔ اس لیے وہ ہر دم اپنی برتری ثابت کرکے اپنی محبت کا اظہار کرتا رہتا ہے اور یوں کہتا رہتا ہے۔ میں تمھارے لیے لازم و ملزوم ہوں۔ میں تمھاری ضرورت ہوں۔ تمھارا آسرا ہوں —— وغیرہ وغیرہ ——

"اور جواب میں بیوی بھی یہ کہتی رہتی ہے۔ مجھے تمھاری پروا نہیں —— پل میں تمھیں چھوڑ کے میکے چلی جاؤں گی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تم سمجھتے کیا ہو اپنے آپ کو —— مگر جاتا کوئی بھی نہیں —— رمو یہ آڑھا ترچھا —— انداز —— میاں بیوی کا محبت کرنے کا انداز ہے ——

"مگر تم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"تم سو گئی ہو" ——؟

"نہیں تو" ——؟ رملی نے ابھی تک انگلی دانتوں میں ڈال رکھی تھی۔

"یہ کیا کر رہی ہو ——"؟ معاذ نے ہاتھ بڑھا کر رملی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ دانتوں سے ناخن کاٹنا مجھے بہت برا لگتا ہے۔ بالکل پرائمری کلاس لڑکیوں والی حرکت ہے۔

رملی نے آج پہلی مرتبہ معاذ کے ہاتھ کو دیکھا۔ جس نے اسکا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ ایک کالے ہاتھ میں ایک گورا ہاتھ تھا۔ مگر ذرا بھی عجیب نہیں لگا اسے —— ہر کالی رات کے ساتھ ایک گورا دن ہوتا ہے۔ سفید چہرے پر سیاہ بال ہوتے ہیں۔

رملی غور سے اس کا ہاتھ دیکھتی رہی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر آج اس نے ہاتھ چھڑایا نہیں —— بالکل اچانک اسے یاور کے ہاتھ یاد آ گئے۔ بہت خوبصورت تھے یاور کے ہاتھ —— انگلیاں مخروطی اور ناخن چمکدار تھے۔ سگار پیتا ہوا بہت اچھا لگتا تھا۔ اور سگار کا دھواں چھوڑتا ہوا اور بھی اچھا لگتا تھا —— رملی زمین اور آسمان کے درمیان معلق ہوگئی —— ایک طرف پھولوں بھرا راستہ تھا۔ مگر وہاں ممنوع کا بورڈ لگا تھا —— دوسری طرف کانٹے ہی کانٹے تھے۔ مگر وہاں اکی اجازتوں کی گلیاں تھیں —— ایک طرف اپنے دل کی خوشی تھی —— دوسری طرف فرض کے بھاری پتھر تھے —— پتہ نہیں زندگی کے ہر موڑ پر دوراہا کیوں آ جاتا ہے۔ کیا وہ یاور کے ملنے سے پہلے خوش تھی ——؟

اور اب —— یاور سے ملنے کے بعد ——؟

ہاں ایک خواب مجسم ہو گیا ہے۔ وہ اس خواب کو آنکھوں میں سجا کر معاذ کے ساتھ چل سکتی ہے۔

کیا یہ بد دیانتی نہ ہوگی ۔؟

اس اندھیرے غار میں اس روشنی کے بغیر چلا نہیں جاتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ معاذ نے ابھی تک اسکا ہاتھ پکڑا ہوا تھا اور پھر جیسے اس کی پور پور وائرلیس بن گئی تھی۔

آج معاذ کی باتوں سے رملی کو بہت ڈر آنے لگا تھا اور محبت انسان کو شاطر بنا لیتی ہے ——

رملی کے اندر کوئی احساس جرم بیدار ہوا —— اس کے ذہن کے سنگھاسن پر کوئی نامحرم آبیٹھا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ذرا سی دیر کو وہ اس راستے پر چل پڑی تھی ۔ جس کا آخری پڑاؤ گناہ ہے ۔ ۔ ۔ ۔

یہ گناہ اور ثواب کیا ہوتا ہے ۔؟

اس نے تو کچھ بھی نہیں کیا تھا ۔

ایسے ہی دو آنکھوں کو ایک خوبصورت آدمی نظر آگیا تھا —— وہ خوبصورت آدمی دل کو بھا گیا تھا اور گہرے پانیوں کی طرح آ کے ذہن میں رہنے لگا تھا ۔ اب ذہن میں تو کئی باتیں رہتی ہیں ۔ کیا ذہن کی پٹاری میں بہت سی باتوں کو سینت سینت کر رکھنا گناہ ہے ۔؟

وہ کون سا اس کے ساتھ فرار ہو رہی ہے ——؟

یونہی کبھی کبھی تپتی راہ گذر پر جب تلوے جلنے کا احساس ہونے لگے تو وہ اس سائے کا ہاتھ تھام کے دوبارہ چل پڑنا چاہتی تھی ——

شوہر کا ہاتھ —— ہاتھ میں ہو اور پھر ایک سائے کو پہلو میں لیکر چلنا بد دیانتی ہے ۔

یہ مرد بھی تو کئی بد دیانتیاں کرتے ہیں ۔

دفتر سے گھر آنے تک راستہ میں کتنی عورتوں کو دیکھتے ہیں ——؟

اور ہر گناہ اپنی آنکھوں سے کر لیتے ہیں ۔

بے وقوف ! مرد اور عورت میں یہی بنیادی فرق ہے ؟

معاذ کے گرم ہاتھ میں اس کا نرم ہاتھ کانپنے لگا —— وہی مشکل ترین گھڑی پھر سرہانے آکھڑی ہوئی تھی ——

اور معاذ کی صاف ستھری آنکھوں میں شک کے سائے لہرا رہے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

دیکھ !

یہ گھڑی پہلے سے بھی کٹھن ہے ۔ پہلے کوئی خوف نہ تھا ۔ اب ایک خوف ہے ۔

خوف مجسم بھی ہے —— !

اور معاذ کو مطمئن کرنا بھی ضروری تھا ——

تب اس نے اپنے ذہن کے دریچے کھول دیے ـــــ اور بولی! یادر! تمھاری مدد کے بغیر میں اس مشکل مقام سے نہ گذر سکوں گی۔

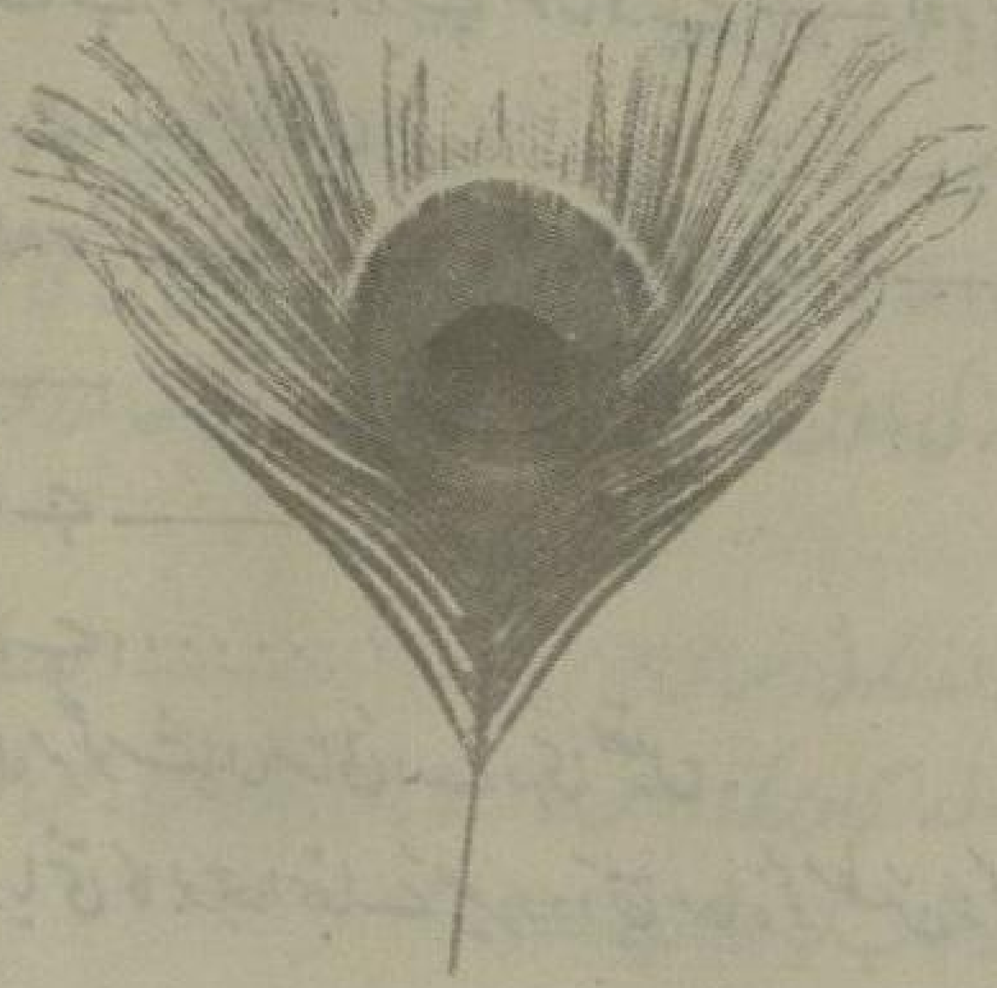
اس نے بے دھڑک یادر کو اپنے خیالوں میں آنے دیا ـــــ حتیٰ کہ سارا کمرہ یادر کے وجود سے بھر گیا ـــــ

یہ بد دیانتی ہے ـــــ

یہ بد دیانتی ہے......

ضمیر کی ننھی ننھی سرگوشیاں سنائی دے رہی تھیں۔

مگر اس بد دیانتی کا بوجھ اٹھائے بغیر وہ آج معاذ کو مطمئن نہ کر سکتی تھی۔



"تمھارا فون آیا ہے رملیٰ ——؟"

بے جی نے آکر کہا تو وہ چونک گئی۔ ابھی استری لگا کے معوذ کے نیپکن استری کرنے بیٹھی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر بٹن آف کر دیا۔ اور کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

"کون ہے بے جی ——؟"

"شاید تمھاری اس دن والی سہیلی ہے۔ کیا بھلا سا نام تھا اس کا —— ہاں —— جیّدہ —— جیّدہ ہی ——!"

رملیٰ کا دل دھڑک اٹھا۔

اس دن جیّدہ مل کر گئی تھی تو پھر دوبارہ نہ ملاقات ہوئی نہ فون پر کوئی بات ہوئی ——؛ نہ ہی رملیٰ نے کوشش کی ——

معاذ کی محبت نے ایک بار پھر رملیٰ کا راستہ روک لیا تھا۔ اور اس رات کے بعد اس نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ ایسے اچھے شوہر کو وہ ہرگز دھوکا نہیں دے سکتی۔ صبح کو معاذ اتنا مسرور اور مشکور تھا کہ رملیٰ کو خود اپنے آپ سے شرم آنے لگی۔ اس نے ہر خیال کو جھٹک کر اپنے آپ کو معوذ اور معاذ میں گم کرنے کی کوشش کی تھی اور وہ اس میں کامیاب بھی ہو چلی تھی۔

مگر آج پھر اچانک جیّدہ کا فون آگیا تھا۔

پتہ نہیں اب اسے جیّدہ کے نام سے خوف کیوں آنے لگا تھا۔

ہیلو! اس نے ریسیور تھاما تو دوسری طرف سے واقعی جیّدہ تھی۔

"بے وفا کبھی تو بھی فون کر لیا کر ——؟"

جیدہ نے تڑپ کر کہا۔

"جیدہ تو جانتی ہے نا چھوٹے بچے کے ساتھ کتنی مصروفیت ہوتی ہے۔ پتہ ہے سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی۔"

"ہاں ہاں ابھی ایک بچہ ہے تو تمھارا یہ حال ہے۔ دو چار ہو گئے تو تو دنیا جہان سے جائیگی ــــ"؟

رملی ہنسنے لگی۔

"بس اس کے جواب میں میں صرف اتنا کہہ سکتی ہوں کہ اللہ تجھے جلدی بچہ دے دے اور تجھے ہر بات کا جواب مل جائے۔"

"ایسی ناممکن دعا نہیں دیتے ــــ"

جیدہ نے لمبی سانس چھوڑ کر کہا۔

"تجھے اس دن بے جی نے کیا کہا تھا کہ مایوسی کا کلمہ منہ سے نہیں نکالتے ــــ"

یہ کہتے ہی بے اختیار رملی نے گردن گھما کے دیکھا۔ بے جی اس کے پیچھے کھڑی اپنی قمیص کو بٹن لگا رہی تھیں۔

"واقعی یار! تیری ساس بڑی نیک عورت ہے۔ اس دن ان سے مل کر مجھے بڑی خوشی ہوئی تھی۔"

"بے جی بھی تجھے اکثر یاد کرتی ہیں"

"اور تو نہیں کرتی گدھی ــــ"

توبہ ــــ میں تو رات کو جو تھک ہار کے سوتی ہوں تو صبح یوں آنکھ کھلتی ہے۔ جیسے ابھی پلک لگی تھی ابھی اٹھ گئی ہوں . . . . . .

"اور کیا حال چال ہیں ــــ"

"بار بار کیا بتاؤں ــــ"؟

"اور تیرے شوہر کا کیا حال ہے ــــ"

رملی کا دل پھر عجیب انداز میں دھڑکا۔ اس کی چھٹی حس نے کہا ــــ اب یہ کوئی کچھو کا لگائیگی ــــ کوئی برچھی مارے گی ــــ تیزاب کے چھینٹے پھینکے گی۔ تاکہ اسکی مطمئن زندگی کا چہرہ مسخ ہو جائے۔

"ٹھیک ہیں وہ بھی ــــ"

رملی نے مری ہوئی آواز میں جواب دیا۔

جیدہ نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ تھوڑی دیر چپ رہی۔ پھر آواز کو سرگوشی بنا کر بولی۔
"کم بخت! یاور تجھے اتنا مس کرتا ہے کہ کیا بتاؤں ——"
یاور . . . . . یاور . . . . یاور . . . .
ٹیلی فون کے سارے تار بج اٹھے۔
دشمن —— دشمن —— دشمن!
میرے سکون کا —— میرے دل کا —— میرے گھر کا ——"
پتہ نہیں اتنی آوازیں ان برقی تاروں کے اندر سو رہی تھیں یا اس کے دل کے اندر سے اٹھ رہی تھیں۔

رملیٰ نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا ——
"آکے دیکھ تو سہی تو نے میرے شوہر کا کیا حال کر دیا ہے ——"
بھلا اس بات کا کیا جواب ہو سکتا تھا۔ وہ گم صم کھڑی رہی . . . . .
"بس یاور تو کہتا ہے۔ لڑکی میں نے ایک ہی دیکھی ہے زندگی میں —— رملی —— اس سے دلکش چہرہ آج تک کوئی نظر سے نہیں گذرا —— اٹھتے بیٹھتے تیرا اتنا ذکر کرتا ہے کہ میں اب تجھ سے جلنے لگی ہوں۔
"بکواس نہ کر ——" رملیٰ نے بجھے ہوئے دل سے بس اتنا کہا۔
ہم دونوں تجھے برابر یاد کر رہے ہیں اور تجھ سے اتنا نہ ہو سکا کم از کم فون ہی کر لیتی ——؟
"کہہ تو دیا ہے کہ مصروف تھی ——"
"اور ماڈل ٹاؤن بھی تو نہیں آئی شاید ——"؟
"ایک دن میں اور رمعا آئے تھے ذرا سی دیر کو —— بس یونہی کھڑے کھڑے ——"
"اور کھڑے کھڑے ہمارے ہاں بھی آجاتے۔ اس دن میں تمھارے شوہر سے کہہ کے آئی تھی ——"
"بھئی کھڑے کھڑے کوئی تم سے چھٹکارا حاصل کر سکتا ہے؟"
رملیٰ نے کہا۔
"ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔ مگر تم کبھی اپنے شوہر کو لیکر آؤ نا ——؟
"آؤنگی ——"
رملیٰ نے پھر بے یقینی سے جواب دیا . . . . .
"سنو . . . . ." جیدہ نے پھر اپنی آواز کو سرگوشی بنا لیا . . . .

"یاور آگیا ہے۔ تم سے بات کرنی چاہتا ہے ___ لو اس سے بات کرو۔۔۔۔"
پیشتر اس کے کہ وہ انکار کرتی یا احتجاج کرتی جیدہ نے یہ کہکر یاور کو ریسیور تھما دیا۔
"یاور تم رملی سے گپ لگاؤ۔ ذرا اسکی خبر لو۔ میں کچن میں ہنڈیا دیکھنے جا رہی ہوں۔۔۔۔"
یاور نے غالباً ریسیور تھام لیا ___
مگر کوئی آواز نہیں آئی۔ آواز سنے بغیر ہی رملی کا دل پسلیاں توڑنے لگا۔
اس کا سارا خون چہرے پر آگیا اور سارے جسم پر ہلکی ہلکی لرزش طاری ہونے لگی۔۔۔۔
"رملی۔۔۔۔۔"
اس نے اپنی پرسوز اور گھمبیر اور گہری آواز میں آہستہ سے اسکا نام یوں لیا۔ جیسے جاں بلب مریض کو ہوش آگیا ہو ___
رملی نے پھر فوراً مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ اب بے جی جا چکی تھیں۔ مگر اسے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ گھر کے در و دیوار آنکھیں کھولے اسے دیکھ رہے ہیں اور کان کھولے اسکی باتیں سن رہے ہیں۔۔۔۔
"رملی۔۔۔۔۔"
یاور کی آواز دوبارہ آئی۔
"تم اتنی خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ اتنی سنگدل بھی ہو؟"
رملی کو یوں محسوس ہوا جیسے سگار کا سارا دھواں ٹیلی فون کے ریسیور میں سے نکل نکل کر اس کے حلق میں جا رہا ہے۔ اور اسکے حلق میں دھوئیں کے بگولے بنتے جا رہے ہیں۔۔۔۔ آگے پیچھے دھواں ہی دھواں ہے کچھ بھی نظر نہیں آتا ___
مگر وہ بولنے کی بجائے ___ بار بار مڑ کے پیچھے دیکھتی۔۔۔۔۔ اپنے کمرے کی طرف دیکھتی ___ باہر کھلنے والے دروازے کی طرف دیکھتی ___۔۔۔۔۔
"رملی۔۔۔۔۔"
اس کی تیسری آواز اتنی میٹھی تھی کہ رملی کے سارے ارادوں سارے وعدوں کو خاکستر کر گئی۔ اس کے اندر پھر الاؤ بھڑکنے لگے ___ پھر سرخ آندھیاں چلنے لگیں۔ تناور درخت جڑوں سے اکھڑنے لگے۔
پچھلے پندرہ دنوں سے وہ کتنی پرسکون تھی۔ کتنی مطمئن تھی۔ سمجھ رہی تھی کہ اسے صبر آگیا ہے اس نے اپنے دل کو منا لیا ہے۔ اپنے دل کا راز پا لیا ہے۔ مگر دل تو ابھی تک لاینحل گتھی بنکر کھڑا تھا۔
اس ظالم کی آواز تھی یا ___ صورِ اسرافیل۔
ساری مردہ تمنائیں انگڑائی لیکر بیدار ہو گئی تھیں۔ تیار ہو گئی تھیں۔ ایسے جیسے وہ آجتک

اسکی یاد میں جیتی آئی ہو۔ اسکی آس میں مرتی آئی ہو ـــــ

محبت کی مستی سے چھلکتی آنکھیں ـــــ اور محبت کے سوز میں جلتے ہونٹ ایک دلکش چہرہ لیکر اسکی آنکھوں کے آگے آگئے۔ اسکا ریسور والا ہاتھ کانپنے لگا۔ جیسے وہ برابر محسوس کر رہی تھی۔

"میں کئی دنوں سے تمھارا انتظار کر رہا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ تم آئیں کیوں نہیں ـــــ ہوا کے اجنبی جھونکے کیطرح آؤ ـــــ اور آکر میرے قریب سے نکل جاؤ میں تمھیں دوبارہ پکڑ بھی نہ سکوں ـــــ مگر آؤ تو ۔ ۔ ۔ ۔ " " تو مجھ سے خفا ہے تو زمانے کے لیے آ ـــــ "

"آؤ ۔ ۔ ۔ آؤ ۔ ۔ ۔ ۔ آؤ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

رملیٰ کی آنکھوں میں پھر کڑوا کڑوا پانی جمع ہونے لگا۔ دکھ کی ندیا سے جو پانی کشید ہو کے نکلتا ہے وہ کڑوا ہو جاتا ہے ـــــ

رملیٰ نے دانتوں تلے اپنا نچلا ہونٹ دبایا ـــــ

پھر سارے گھر میں بے تابانہ نظر دوڑائی۔ بے جی کی آواز باورچی خانے سے آ رہی تھی۔ وہ کچھ کہہ سکتی تھی ـــــ مگر کیا کہتی ـــــ

یکایک سارے الفاظ بے معنی ہو گئے تھے ـــــ اور سارے مفہوم پھیکے پڑ گئے تھے۔

مگر کیا کہتی ـــــ

ایک تو ضمیر کا دربان ہر وقت لاٹھی چارج کرنے میں مصروف رہتا تھا۔

"رملیٰ ـــــ کچھ بولو تو سہی ـــــ اور کچھ نہیں دے سکتی ہو۔ تو مجھے اپنی آواز ہی سنوا دو ـــــ وہ رسیلی آواز جو سنانے میں تم بے حد بخیل ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

رملیٰ کا دل چاہا کہ وہ ایک جھوٹ موٹ کی ڈانٹ یاور کو پلائے اس کو دھمکائے کہ وہ کسی شریف آدمی کی بیوی سے اسطرح گفتگو کیوں کر رہا ہے ـــــ ؟

مگر اس نے محسوس کیا وہ یاور کو جھوٹ موٹ بھی نہیں ڈانٹ سکتی۔ اسے پتہ چلا کہ آج اتنے دنوں کے بعد اسے یاور کی آواز سننا بہت اچھا لگ رہا ہے ـــــ اور یہ کہ یاور آج بھی اس کے دل کے قریب دھڑک رہا ہے ـــــ

اس کی قربت کے احساس سے سارے جسم میں قمقمے سے روشن ہو گئے ہیں۔ اس کی کیفیت ہی بدل گئی ہے۔ جیسے وہ محسوسات کی ایک سلگتی بھٹی میں کود گئی ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

شاید ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ۔

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ۔

رملی کا رواں رواں گنگنانے لگا۔ آج اتنے دنوں بعد ایک عجیب طرح کا انکشاف اس پر ہوا
انکشاف کی یہ بجلی دن دہاڑے اس پر گری تھی۔ کہ وہ بھی سچ مچ یاور سے محبت کرنے لگی ہے۔
محبت کرنا جرم نہیں ——
اور محبت تو آپ ہی آپ ہو جاتی ہے ——
اس منہ زور جذبے کو کون روک سکا ہے؟
محبت —— محبت —— بڑی پیاری چیز ہے محبت —— ہر چیز کا مفہوم ہی بدل جاتا ہے۔

وہ شادی شدہ تھی۔ زندگی کے اسرار جان گئی تھی۔ مگر جو کیفیت اس کی اب ہوئی تھی وہ پہلے کبھی نہ ہوئی تھی ——

"رملی میری آواز سن رہی ہو تو پلیز کوئی جواب تو دو ——"

جی۔۔۔۔ جی۔۔۔۔۔ اس خوف سے کہ وہ فون نہ بند کر دے۔ رملی پہلی بار بولی ——
جی۔۔۔۔ کیا کہوں ——؟

بس کچھ نہ کہو۔۔۔۔۔ یونہی جی۔۔۔۔۔ جی۔۔۔۔ کرتی رہو —— میں جی اٹھوں گا میری زندگی اسی جی جی میں ہے —— یہی کہہ رہی ہو نا تم —— تم چاہو گی تو میں ضرور جیوں گا۔ تمھارے لیے جیوں گا —— تمھارے انتظار میں جیوں گا۔ میری زندگی صرف اپنے محبوب کو ایک نظر دیکھ لینا ہے۔ تمھیں ایک نظر دیکھ لینے کے لیے جیوں گا ——

پھر سے کہو رملی —— پھر سے کہو۔۔۔۔۔

"جی۔۔۔۔ میں۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ سمجھ نہیں پائی۔۔۔۔۔ وہ ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی۔"

"آپ کیا کہہ رہے ہیں"؟

تم سب سمجھ رہی ہو۔ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ اور جو تم نہیں کہہ رہی ہو۔ وہ میں سمجھ رہا ہوں بلکہ میں تو تمھارا گھبرایا ہوا لجایا ہوا چہرہ بھی صاف دیکھ رہا ہوں۔ تمھاری مقدس پیشانی پر شبنم کے قطرے محسوس کر رہا ہوں ——

رملی نے بے اختیار اپنے ماتھے کو چھولیا۔ اسکی پوریں گیلی ہو گئیں ——
پھر آپ ہی آپ —— رملی کے ہونٹوں پر ایک دلفریب مسکراہٹ آگئی۔
اس نے دھیرے سے ریسیور رکھ دیا۔ وہ اپنی کیفیت چھپا نہیں سکتی تھی۔ اور بتانا بھی نہیں چاہتی تھی ——

اور بس دل کے لیے اتنا ہی پیغام کافی تھا ——

اور ریسیور رکھ کر وہ اڑتی ہوئی اپنے کمرے میں آگئی۔ اور گنگناتی سانسوں کے ساتھ دھپ سے زمین پر بیٹھ گئی . . . . . .

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی . . .

اک . . . . آگ . . . . . سی . . . . . ہے . . . . . سینے . . . کے . . . . اندر . . . لگی . . . . ہوئی . . . .

اس نے استری کا بٹن آن کر دیا۔ سبز لائٹ محبوب کے دلکش اشارے کی طرح روشن ہوگئی۔

استری کا بٹن جل اٹھا —— استری لو دے اٹھی —— کپڑوں کی سلوٹیں آپ ہی آپ دور ہونے لگیں ——

اسی طرح محبت کے دل میں اترنے سے مایوسیوں کی سلوٹیں آپ ہی آپ دور ہونے لگتی ہیں . . . . . .

استری کرتے کرتے جانے وہ کس جہاں میں پرواز کر گئی . . . . .

اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی!

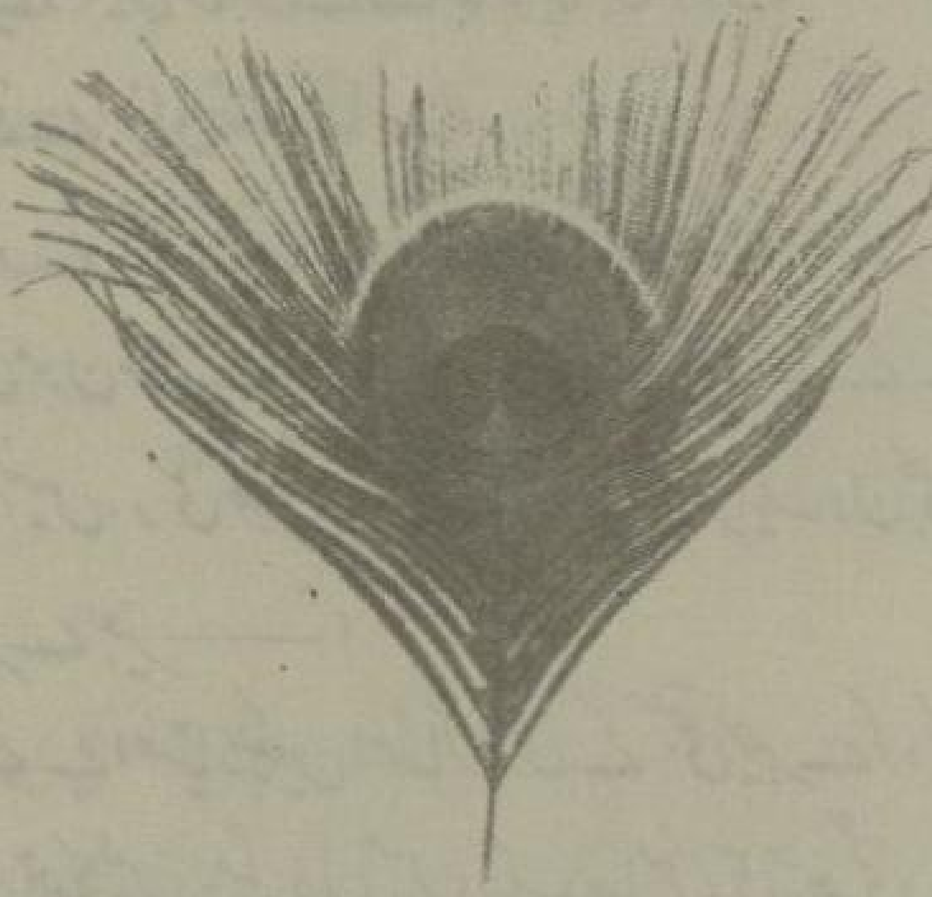
جب بے جی کمرے میں آئیں تو وہ نیپکن پر استری رکھے سامنے نظر بس جمائے . . . . .! بے خودی کے عالم میں مدہوش سی بیٹھی تھی —— ہونٹوں پر کیف آگیں مسکراہٹ تھی اور آنکھوں کے پیمانے چھلکے چھلکے تھے . . . . . .

وہ ایسی بے سدھ بیٹھی تھی کہ اسے بے جی کے اندر آنے کا پتہ ہی نہ چلا ——

بے جی نے اس کے نئے چہرے کو غور سے دیکھا۔ پھر ایک دم چلّائیں . . . .

"دو ہٹی . . . . دو ہٹی . . . . کہاں گم ہو —— ؟ بچے کا نیپکن جل رہا ہے ؟"

اس نے ڈر کر استری کی طرف دیکھا۔ جانے کب سے استری کو نیپکن پر رکھے سراب کی وادیوں میں کھو گئی تھی۔ استری کے چاروں طرف کالا سیاہ دھواں پھیل رہا تھا —— اور بچے کے سفید نیپکن پر بیدرد استری کا سیاہ کالا چھاپا لگ چکا تھا۔



"یورپ چلوگی میرے ساتھ رملیٰ ــــ"؟

معاذ نے ہنس کر کہا تو رملیٰ ایک دم گھبرا گئی۔ نہ ہاں کہہ سکی نہ نہ کہہ سکی۔ بس ہونقوں کی طرح معاذ کا چہرہ دیکھنے لگی۔

معاذ ہنستا رہا پھر بولا ــــــ

"چلو چل کے ہنی مون منا کے آئیں ــــ"

اب ــــ؟ رملیٰ نے بمشکل کھینچ کر آواز نکالی۔

اب کون سا موسم ہے ــــ؟

بھئی اب ہی تو موقع ملا ہے۔ معاذ محبت سے بولا۔ شادی کے فوراً بعد تو ڈاکٹروں نے تمھیں سفر کرنے سے منع کر دیا تھا۔ اب تم فارغ ہو چکی ہو، معوذ بھی کافی سنبھل گیا ہے۔ چلو یورپ چلتے ہیں۔؟

"آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں، جیسے یورپ بس چار قدم پر ہے"۔

"رملیٰ جان! اب تو دنیا سمٹ کر چھوٹی ہو گئی ہے۔ اور سفر آسان ہو گئے ہیں"۔

رملیٰ کو ایسے لگا جیسے وہ کسی جال میں پھنس گئی ہے۔ جتنا ہاتھ پاؤں مارتی ہے، اتنا ہی اس میں الجھتی جاتی ہے۔

اس کو کشمکش میں مبتلا دیکھ کر معاذ پھر ہنسنے لگا اور تفصیل بتاتے ہوئے کہنے لگا۔

"مجھے دفتر کی طرف سے چھ ماہ کے لیے یورپ بھیجا جا رہا ہے۔ میں نے سوچا تمھیں بھی اپنے ساتھ لے چلوں۔ ذرا ہم بھی دنیا کو دوسری آنکھ سے دیکھ لیں"۔

"چھ ماہ کے لیے" ــــ رملیٰ بے اختیار چیخی ــــ

"اسی لیے تو تمھیں ساتھ لے کے جانا چاہتا ہوں۔"

معاذ نے بے خیالی میں کہا۔

"اتنے چھوٹے بچّے کے ساتھ ——"

"بھئی ہنی مون منانے جائیں گے تو بچہ کیوں ساتھ لے کے جائیں گے۔"

"نہیں نہیں۔ رملیٰ گھبرا گئی۔ میں معوذ کے بغیر ایک دن بھی نہیں رہ سکتی۔"

"اور میرے بغیر ——"؟

رملیٰ نے بے اختیار پلکیں اٹھا کر اس کے ملتجی چہرے کو دیکھا۔ ان آنکھوں میں جانے کیا تھا۔ رملیٰ نے نظر بس جھکا لیں۔ مگر دل میں ایک پھانس سی چبھ گئی۔ خدا جانے کہاں سے یادرکی بے باک، طرار چلبلی چبھتی گستاخ آنکھیں نکل آئیں رملیٰ نے اپنا نچلا ہونٹ اپنے دانتوں سے اس قدر زد سے کاٹا کہ اسکی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"اتنی سی بات پر رو رہی ہو۔" معاذ نے اسکا ہاتھ تھام لیا۔

"اتنی سی بات ——" رملیٰ اندر سے تھرا اٹھی۔ اس نے دو کشتیوں میں قدم رکھ لیے تھے۔ نیچے ٹھاٹھیں مارتا دریا تھا اور دو کشتیوں کا سوار کبھی صحیح و سالم کنارے پر نہیں اترتا۔

"میں ڈوب جاؤنگی۔ میں ڈوب جاؤں گی۔"

اس نے آنکھیں بند کرلیں اور باقاعدہ رونے لگی۔

پگلی! معاذ نے بڑھ کے اس کے آنسو صاف کیے۔

"آج کل کی لڑکیاں ملک سے باہر جانے کو بیقرار رہتی ہیں۔ بہانے ڈھونڈتی ہیں اور تم ——"

تم شاید بڑی نازک مزاج ہو رملیٰ —— ہے نا؟

رملیٰ نے سر جھکا لیا۔

"حالاں کہ معوذ بے جی سے بہت مانوس ہے۔ اور تم جانتی ہو وہ اس کا بے حد خیال رکھیں گی"

"لیکن کیا ہم معوذ کو ساتھ نہیں لے جاسکتے؟"

"ہاں ساتھ لے جاسکتے ہیں۔ مگر پھر تمھیں سارا وقت ہوٹل کے کمرے میں بند رہنا پڑے گا۔ رات کا وقت ہی تو ملیگا۔ گھومنے پھرنے کے لیے —— اور اس وقت ہم کہیں بھی نہیں جاسکیں گے۔"

"نہیں شاید مجھ میں حوصلہ نہیں معوذ کو چھوڑ کر جانے کا ——"؟

معاذ نے بڑی حسرت سے رملیٰ کے چہرے کو دیکھا۔ آنسو گرنے سے اس کے رخسار گیلے

ہو رہے تھے۔ مگر اسکا رنگ زرد ہو گیا تھا۔ پتہ نہیں اس لڑکی کو کیا روگ ہے۔ معاذ نے دل میں سوچا —— کبھی کھل کر نہیں ہنستی کبھی دل کی بات نہیں کہتی۔ وہ اب اسے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ تاکہ دن رات اس کے ساتھ رہے اور اس بند گٹھڑی کو کھول کر دیکھے۔ لیکن اس کے ساتھ باہر جانے کا سن کر رملیٰ اور بھی خوفزدہ ہو گئی تھی۔

معاذ کو اس پر ترس آ گیا۔

کہنے لگا۔

"رملیٰ جان! میری تو خواہش ہے کہ ہم دونوں دنیا کا سفر کریں۔ دنیا کی خوبصورتیاں دیکھیں لیکن اگر تم ابھی ذہنی طور پر آمادہ نہیں ہو تو میں تمھیں مجبور نہیں کروں گا۔ اس وقت بہت اچھا موقع تھا خیر تم سوچ لو —— ظاہر ہے میں اپنے جذبات کی خاطر کسی معصوم ماں پر تو ظلم نہیں کر سکتا۔"

یہ کہہ کر معاذ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

رملیٰ نے شرمساری سے گردن جھکا لی اور اپنے آپ سے پوچھا۔

"سچ بتا! تو اپنے شوہر کے ساتھ یورپ کیوں نہیں جانا چاہتی —— ؟

کیا تجھے شوق نہیں تھا بیرون ملک جانے کا —— تو نے بھی دوسری لڑکیوں کی طرح یہ خواب دیکھے تھے۔ جہازوں پر گھومنا —— شاپنگ کرنا دنیا دیکھنا ——

مگر اب تجھے کیا ہو گیا ہے —— ؟

دل پہلے سے زیادہ باغی ہو گیا ہے۔"

اندر سے آواز آئی۔

"وہ کمبخت یاور اگر زندگی میں نہ آتا تو یہ گاڑی یونہی چلتی رہتی۔ صبر آ ہی جاتا ——

اور اب وہ اتنے عرصے کے لیے معاذ کے ساتھ چلی جائے —— یاور سے دور ہو جائے —— خوابوں کا جھروکہ بند کر دے —— ؟

کون ہے یہ یاور اور تیرا کیا لگتا ہے —— ؟

دنیا میں سینکڑوں خون کے رشتے ہوتے ہیں۔ جنھیں آدمی غصے یا نفرت میں جھٹک کر توڑ کے آگے نکل جاتا ہے —— ایک رشتہ عجیب ہے۔ اس رشتے کا کوئی نام نہیں —— یہ دل کا رشتہ ہے یا روح کا —— یا کوئی جادوئی رشتہ ہے —— قریب آتا ہے۔ تو سارے اگلے پچھلے رشتے توڑ کے رکھ دیتا ہے۔

یاور کی شخصیت واقعی جادو بھری تھی۔ ایسے لگتا جیسے وہ خوابوں کے جہاں کا شہزادہ ہے۔ اسے دیکھ کر بہک جانے کو دل چاہتا تھا —— بغاوت کرنے کو دل چاہتا تھا۔ اور بارہا اس کے

دل میں یہ خیال آیا ——— کہ زندگی تو ایک ہی بار ملتی ہے۔ جوانی تو ایک ہی بار آتی ہے۔ پھر اس زندگی اور اس جوانی پر انسان کو مکمل اختیار کیوں نہیں دیا گیا۔ اسے اپنی مرضی کا راستہ چن لینے کی اجازت کیوں نہیں ہے ...... اور اگر پہلا راستہ کانٹوں سے اٹا پڑا ہے تو وہ دوسرا راستہ کیوں نہیں اختیار کر سکتا۔ آخر کیوں ؟



جس دن معاذ یُورپ گیا۔ رملا چُپ چُپ تھی۔ معاذ بھی بہت اداس تھا۔ رملا کو تو یونہی احساسِ جرم ستا رہا تھا۔ اُسے بے جی نے بھی سمجھایا تھا، اور کہا تھا:

"وہٹی! تم بے فکر ہو کے جاؤ۔ موجو کو میں سنبھال لوں گی خیر سے اب تین ماہ کا ہے، اور اس کی کھانے پینے کی عادتیں پختہ ہو گئی ہیں۔ اس عمر میں بچّہ ماں کی دوری کو برداشت کر لیتا ہے، ذرا سیانا ہو جائے گا تو ہمیں باقاعدہ پہچاننے لگ جائے گا ___ جوں جوں بچّہ بڑا ہوتا جاتا ہے اس کے کام بھی بڑھ جاتے ہیں۔ تم اللہ پر بھروسہ کر کے جاؤ!"

مگر رملا بیٹھی زمین کی طرف دیکھتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے سر اُٹھایا۔ اور بولی: "بے جی! میں جانتی ہوں، آپ معوّذ کا مجھ سے زیادہ خیال رکھیں گی، مجھے اللہ پر بھروسہ ہے۔ آپ پر یقین ہے۔ مگر اپنے دل کا بھروسہ نہیں..... میں... میں... کہیں وہاں جا کر معاذ کے لئے کوئی مشکل نہ پیدا کر دوں، آپ سمجھ رہی ہیں نا___"

"ہاں" بے جی ایک دم ہنس پڑی۔

"یہ کم بخت ممتا بُری بلا ہے۔ دنیا میں ممتا عورت کو کمزور کر دیتی ہے۔ مفلوج کر دیتی ہے......"

یہ کہہ کے بے جی اپنے خیالوں میں مگن ہو گئیں، تھوڑی دیر بعد سر اُٹھایا، تو کہنے لگیں:

"ٹھیک ہے، اگر تمہارا دل نہیں مانتا تو مت جاؤ، میں معاذ کو سمجھا دوں گی،

وہ تو آتا جاتا رہتا ہے۔ پھر کبھی چلی جانا ــــــ"

بے جی نے معاذ کو پاس بٹھا کے سمجھا دیا تھا، اور معاذ بالکل خاموش ہوگیا تھا۔ پتہ نہیں خاموش تھا کہ اداس ۔ رملیٰ کو اس کے چہرے سے کچھ بھی پتہ نہیں چل رہا تھا۔ اس چہرے کو اس نے پہلے کبھی غور سے دیکھا ہوتا تو اس کے تاثرات کو پہچاننے کے قابل ہوچکی ہوتی۔ کبھی کبھی رملیٰ کو خیال آتا کہ اُسے اپنے شوہر کے جذبات کا خیال کرنا چاہیئے، دنیا بھر کی اچھی بیویاں اپنے آپ پر شوہر کے جذبات کو ترجیح دیتی ہیں، اپنی خوشیاں ان پر وار دیتی ہیں۔ ہر اچھے گھر کے اندر ایک ایسی عورت رہتی ہے، جو لمحہ لمحہ ایثار کے لئے تیار رہتی ہے، اور معاذ نے تو پہلی مرتبہ اپنی کسی دلی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ قانون، شرع، معاشرہ، سب کی نظر میں شوہر کا درجہ مقدم ہے۔ بس ایکبار نا، کرچکی تھی، ہزار منانے کے باوجود اپنے آپ کو جانے پر آمادہ نہ کرسکی۔

اس کے بعد معاذ نے بھی کچھ نہیں کہا: بس جاتے وقت اتنا کہا:

"رملیٰ! بے جی کا خیال رکھنا۔ انھیں اپنی ہمّت سے زیادہ کام کرنے کی عادت ہے، اور یہ زیادہ عرصہ تنہا رہیں تو گھبرا جاتی ہیں ــ"

رملیٰ نے بہت چاہا۔ ہنس ہنس کر معاذ کا سامان سمیٹے۔ مسکرا مسکرا کر اس کی تیاری میں مدد دے اور جاتے وقت محبوب بیویوں کی مانند کوئی مشکوک سا فقرہ کہے ــــ آخر وہ یورپ جا رہا تھا

اور جب بیویاں باہر جانے والے شوہروں کو ہلکا سا کچوکا لگاتی ہیں، یہ کہہ کر ــــ

"وہاں تمہیں ہماری یاد کہاں آئے گی ــــ؟"

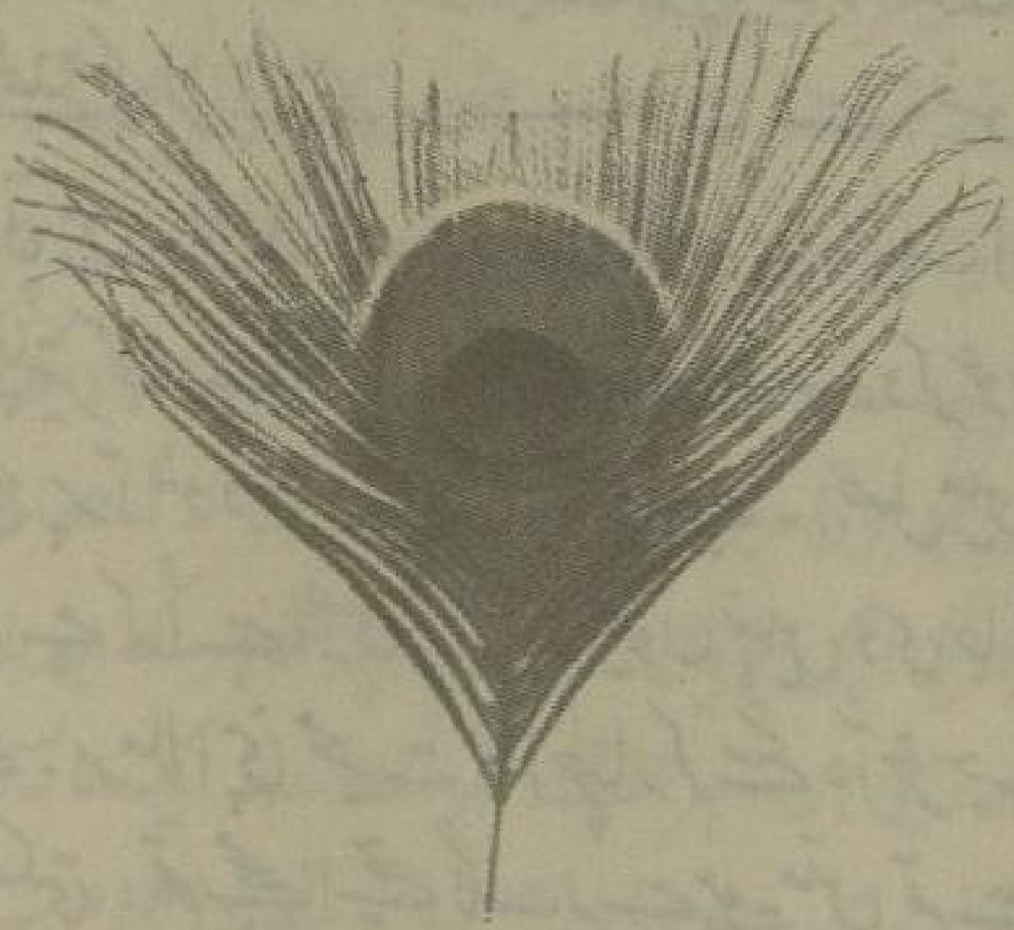
"کہاں فرصت ہوگی تمہیں خط لکھنے کی ــــ؟" یا

"عیش کرنے جا رہے ہو؟"

تو دراصل وہ ــــ شوہر پر اپنے استحقاق کی مہر پختہ کرنا چاہتی ہیں۔ انھیں بتانا چاہتی ہیں کہ تم صرف میرے ہو۔ اور اس بات کو ہمیشہ یاد رکھنا۔

بہت سی بیویوں کو اظہارِ محبّت کا سلیقہ نہیں آتا۔ ان کے اندر شوہر کی محبّت قطرہ قطرہ جمع ہوتی رہتی ہے۔ پھر ایک دن کوئی سا بہانہ پاکے وہ پھٹ پڑتی ہیں ۔ ایسی عورتیں محبت کے بوجھ سے تھک جاتی ہیں۔ جس دن شل ہوجاتی ہیں۔ اس دن انھیں لڑنے کا کوئی بہانہ مل جاتا ہے ۔ شوہر بھی دوبدو میدان میں

اتر آتے ہیں، کیونکہ وہ اس قسم کے اظہارِ محبّت کو جنگ کا اعلان سمجھتے ہیں۔
دو تین گھنٹے کی لڑائی کے بعد—— بہت سے آنسو بہانے کے بعد ایسی عورتیں شانت ہو جاتی ہیں۔ لڑائی کے دوران آنسو بہانا ایک اور اظہارِ محبت ہے۔ جس کو مرد ہمیشہ ایک چلتر سمجھ کے نظر انداز کر دیتا ہے۔ رو کر عورت ہلکی ہو جاتی ہے، اسی رات وہ اپنی سیج پر آسودگی کی نیند سو جاتی ہے۔ اصل میں وہ لڑتی نہیں——
وہ الجھتی ہے کہ اُسے ایسی تربیت کیوں نہیں دی جاتی کہ وہ کھلم کھلا اپنے جذبات کا اظہار کر سکے۔ برملا اپنی محبت کا اظہار کر سکے۔ آخر جب اس کا دل چاہے تو وہ کہہ کیوں نہیں سکتی، تم مجھے اچھے لگ رہے ہو۔ میں تم سے پیار کرتی ہوں، اور میری آنکھیں دم آخر تک تمہاری حفاظت کریں گی۔"
کتنی بار تو معاذ نے خود رملی سے کہا تھا، کہ عام بیویوں کی طرح تم مجھ سے لڑتی کیوں نہیں ہو—بات بات میں اعتراض کیوں نہیں کرتی ہو۔ میاں بیوی اٹھتے بیٹھتے ایک دوسرے کے عیب بیان کرتے رہتے ہیں۔ مگر رملی نے تو اس کا کوئی عیب کبھی بیان نہیں کیا تھا۔ بس رملی کو معاذ میں ایک ہی بہت بڑا عیب نظر آیا تھا۔ صورت کا عیب——
صورت کے اندھیرے غار میں اُتر کر اُس نے دل کی روشن اور چکا چوند وادی دیکھنے کی کوشش ہی نہ کی تھی۔
اور شاید کرتی یہ کوشش پر کم بخت یاور بیچ میں آگیا تھا اور آتے ہی... اظہارِ محبت بھی کر بیٹھا تھا۔
رملی نے بڑی کشمکش کے درمیان معاذ کو خدا حافظ کہا—— جاتے جاتے معاذ نے اس کا نرم ہاتھ، ہاتھ میں لے کر دبایا۔ اور کہا:
"خط لکھتی رہنا، اور معوذ کی خیریت کی اطلاع دیتی رہنا——"
رملی نے بڑی خوش دلی سے سر ہلایا۔ مگر اسی وقت وہاں کھڑے کھڑے سوچا——
"میں خط میں کیا لکھا کروں گی آخر——؟"



کتنے دن تو رملی بس اپنے کمرے میں پڑی رہی عجیب طرح کا ڈپریشن تھا جب معاذ قریب تھا تو وہ چاہتی تھی وہ جلد سے جلد دور ہو جائے کہیں چلا جائے۔ دن رات کا ساتھ تو چھوٹے ...... ہر وقت اپنے آپ کو سنبھال سنبھال کے وہ تھک گئی تھی اور اپنے جذبات کو قابو میں رکھنا بھی اس کے لیے مشکل ہو گیا تھا۔ اور اب —— جب معاذ اس سے ہزاروں میل دور چلا گیا تھا تو اسے عجیب قسم کی بے چینی اور پچھتاووں نے گھیر لیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آر ہا تھا کہ وہ کیا کرے؟

حالاں کہ اسے کچھ بھی نہیں کرنا تھا۔

اس کی شادی اسکی مرضی کے خلاف معاذ سے ہو گئی تھی۔ یہ ایک فعل تھا جو سرزد ہو چکا تھا۔ بس اس کے بعد کچھ ہونا باقی نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا کروڑہا عورتوں کی طرح اب اسے بچے پیدا کرنے ہیں اور اپنے گھر کو گھر بنانا ہے اور پھر معاذ کے پاس کیا نہیں تھا؟ ایک عورت کو آرام دہ گھر۔ گھر کی آسودگی اور عزت نفس ہی تو درکار ہوتی ہے۔ ایک شریف خاندان سے نکل کر وہ دوسرے شریف خاندان میں آچکی تھی۔ کسی بھی بھٹی میں پکی ہوئی اینٹ ہو۔ جس دیوار میں لگ جاتی ہے۔ زندگی بھر اسی دیوار میں لگی رہتی ہے۔

پھر اسے اپنے دل کی بے قراری کا مطلب سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ جب تک یاور سے نہیں ملی تھی۔ بس دل پژمردہ رہا کرتا تھا۔ امنگیں ختم ہو گئی تھیں اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ باقی عمر وہ کس طرح گزارے —— معوذ پیدا ہوا تو روشنی کی ایک درز زندگی میں در آئی ——

مگر اچانک یاور اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ راستہ میں آکھڑا ہوا تو ساری زندگی مضطرب ہو گئی۔ دل کی بیقراریاں جاگ اٹھیں۔ پھر تڑپنے اور پھڑکنے کا موسم شروع ہو گیا۔

ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔ اس نے کئی بار سوچا کہ اس کے خیالوں میں یاور جیسا ایک خوبرو آدمی رہا کرتا تھا۔ جو آنکھوں میں جذبے سمو کر باتیں کرنے کا گر جانتا تھا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا——؟

اب جب کہ یاور اس کی عزیز سہیلی کا شوہر تھا اور وہ کسی شریف آدمی کی عزت تھی۔ ازدواجی زندگی گڑیا گڈے کا کھیل نہیں ہوتی۔ اب تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

پھر اسے صبر کیوں نہیں آجاتا تھا۔ پھر وہ دھک دھک کرتے سینے پر پتھر کیوں نہیں رکھ سکتی تھی۔

معاذ جیسے اچھے شوہر کو کیوں دھوکا دے رہی تھی؟

بس ایسے ہی خیالات نے رملیٰ کو کچل کے رکھ دیا تھا۔ معاذ کے جانے کے بعد وہ زیادہ تر معوذ کے ساتھ لگی رہتی اور جب فارغ ہو جاتی تو اپنے کمرے میں پڑی رہتی۔ کبھی رسالے اور کتابیں پڑھتی ورنہ اوندھی لیٹ کے آنسو بہایا کرتی۔

بے جی اس کی اس کیفیت کو کوئی اور ہی نام دے رہی تھیں۔ اس لیے ایک دن اس کے کمرے میں آکر بولیں۔

"اے دوہٹی! کیوں اس طرح اوندھی لیٹی ہے——؟"

"کچھ نہیں بے جی۔ بس سر میں درد ہو رہا ہے۔"

اٹھ کے کوئی دوائی لی ہوتی۔"

"بے جی۔ ان گولیوں سے آرام نہیں آتا۔"

رملیٰ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ پچھلے آٹھ دنوں سے اس کے سر میں ہلکا ہلکا سا درد رہنے لگا تھا۔ شاید سوچ سوچ کر——

"اٹھ کے نہاؤ دھو، کپڑے بدلو۔ اور ذرا اپنی امی کی طرف چلی جاؤ۔"

بے جی نے پیار سے کہا۔ بے جی کا خیال تھا۔ معاذ کے چلے جانے سے رملیٰ بے طرح اداس ہو گئی ہے۔

لیکن امی جان کے گھر جانے کے خیال سے ہی رملیٰ کو جھرجھری آگئی۔ جیدہ نے دو تین بار فون کر کے اسے بلایا تھا۔ اور اس کے نہ آنے کا سبب بھی دریافت کیا تھا۔ مگر وہ کیا بتاتی——؟ کہ اس نے آگ کے الاؤ سے دور ہو جانے کا تہیہ کر لیا ہے۔ اس نے سوچ لیا تھا۔ نہ وہ امی کے گھر جائے گی نہ جیدہ اور یاور سے ملاقات ہو گی۔ اب جو بے جی نے اتنے پیار سے کہا تو وہ آگے کچھ بھی نہ بول سکی۔ وہ تو ہمہ وقت امی جان کے گھر جانے کو تیار رہتی تھی۔ اگر اب انکار کر دیتی تو بے جی جانے دل میں کیا سوچ لیتیں——؟

اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

بے جی نے اس کے بکھرے بالوں اور سوجی ہوئی آنکھوں کو غور سے دیکھا۔ پھر کہنے لگیں۔

"ایک ہفتہ اپنی امی کے گھر رہ آؤ۔"

"بے جی ـــــ آپ یہاں اکیلی رہیں گی ؟"

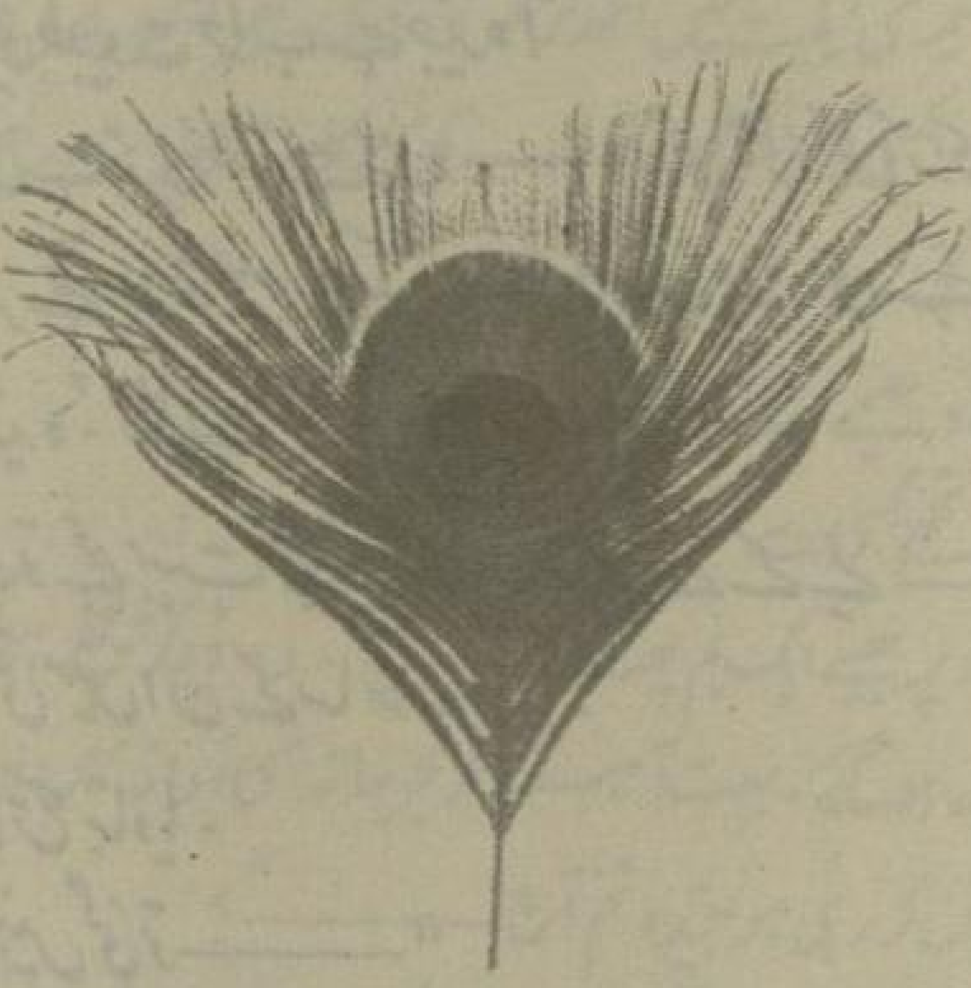
"ارے میں اکیلی کہاں ہوں۔ گھر میں نوکر چاکر ہیں۔ اور پھر ضرورت ہوئی تو تمھیں بلا لوں گی۔ جاؤ ـــــ تم ذرا بہن بھائیوں سے مل کر ہنس کھیل آؤ۔"

بے جی نے اتنی محبت سے کہا کہ رملی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اپنے آپ کو گھسیٹ کر وہ غسل خانے میں لے گئی۔ آئینے کے آگے کھڑے ہو کر اس نے اپنی آنکھیں صاف کیں اور سوچنے لگی۔

بے جی آپ کو نہیں معلوم آپ مجھے کس ڈگر پر بھیجنا چاہ رہی ہیں۔

لیکن تو اتنی کمزور کب سے ہو گئی رملی ! ـــــ"

اس کا دل اس سے پوچھتا۔ تو ایک باشعور لڑکی ہے۔ اور تجھے معلوم ہے حد بندی لائن کہاں پہ لگتی ہے۔ قدغن کی ڈور تیرے اپنے ہاتھ میں ہے۔ دنیا میں بہت سے لوگ دیکھنے میں اچھے لگتے ہیں۔ مگر اسکا یہ مطلب تو نہیں کہ ان اچھے لوگوں کے لیے انسان اپنا گھر برباد کرلے۔



رملیٰ آنے کو تو امی جان کے گھر آ گئی۔ مگر جی کی بیقراری یہاں بھی سائے کیطرح ساتھ چلی آئی۔ سارا دن معوذ کو لیکر اندر کمرے میں ہی لیٹی رہتی۔ کوئی نہ کوئی رسالہ اٹھا کر پڑھتی رہتی۔ نہ کسی سے بات کرتی اور نہ باہر نکل کر ہر آئے گئے سے گپ لگاتی۔ ایسے لگتا جیسے رملیٰ چھپ جانا چاہتی ہے۔

مگر ایک دن جیدہ اسے ڈھونڈتی ہوئی آ گئی۔

"اے کمینی! چار دن سے آئی ہے اور ہمیں اطلاع ہی نہیں دی ——"

رملیٰ نے اسے دیکھا تو خوف کے مارے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے۔ جیدہ بولی۔ نامراد عاشقوں والی صورت بنا کے لیٹی ہوئی ہو۔ اور لوگوں کے شوہر بھی ملک سے باہر جاتے ہیں۔ مگر وہ تیری طرح دنیا تیاگ کر جوگ نہیں لے لیتے —؟"

رملیٰ بوکھلا گئی۔ پتہ نہیں جیدہ کیا کہہ رہی تھی۔ اور اسکا اشارہ کس طرف تھا۔ رملیٰ کے دل کے چور نے اسے بولنے نہ دیا۔

"سچ بتا ——" جیدہ پھر بولی۔ کیا تجھے اپنے شوہر سے اتنا عشق ہے؟

رملیٰ کو یوں محسوس ہوا جیسے جیدہ کہہ رہی ہے۔

"کیا تو اتنی بے وقوف ہے۔ اتنی کم عقل ہے۔ ایک بے حد بھونڈے شخص کی محبت میں مبتلا ہو چکی ہے ——"

"اری کچھ تو بول ——" جیدہ نے اسکا کندھا ہلایا اور پلنگ پر نیم دراز ہو گئی۔ کیا چپ کا روزہ رکھا ہے؟!

رملیٰ جھوٹی ہنسی ہنس دی۔

"بس میری طبیعت خراب ہے جیدہ!"

"کیا خرابی ہے تیری طبیعت میں —— ؟ اچھی بھلی نظر آ رہی ہے۔"

"تیرا شوہر تجھے ساتھ نہیں لیکر گیا۔ اسکا سوگ منا رہی ہے۔"

"نہیں جیدہ"۔ رملیٰ نے جلدی سے کہا۔

"انھوں نے تو مجھے بہت مجبور کیا تھا ساتھ جانے کے لیے —— بلکہ میرا ٹکٹ بھی لے آئے تھے۔ ان کی خواہش تھی میں ان کے ساتھ جاؤں۔"

رملیٰ نے سچ سچ بتا دیا۔

"اور کیوں نہیں گئی تو ——"

"بس —— رملیٰ رکی —— پھر ایک دم بات بنا ڈالی۔ "میں معوذ کو چھوڑ کر نہیں جا سکتی تھی۔"

"اری جانے دے —— تیری ساس اتنی اچھی ہے۔ اتنا خیال تو تیری امی بھی نہیں رکھ سکتیں جتنا بچّے کا خیال بے جی رکھتی ہیں۔ تو بے وقوف ہے۔ بڑی تسلی سے بچہ ان کے پاس چھوڑ کے جا سکتی تھی —— مگر شاید تو معاذ کے ساتھ جانا نہیں چاہتی تھی ——"

رملیٰ کا دل دھڑک اٹھا۔

"ہاں —— مگر اس میں تیرا قصور نہیں ہے۔ میں تیری جگہ ہوتی تو میں بھی معاذ کے ساتھ نہ جاتی۔ جس شوہر کو عورت دل سے قبول نہ کرے۔ اسے پسند نہ کرے بھلا اس کے ساتھ تفریحی سفر پر کیسے جا سکتی ہے —— ؟"

اف رملیٰ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا . . . . .

مری ہوئی آواز میں بولی۔

"تجھے کس نے کہہ دیا ہے جیدہ کہ میں اپنے شوہر کو پسند نہیں کرتی ؟"

"تو نے ——"

جیدہ نے آرام سے کہہ کے —— زور سے قہقہہ لگایا۔ اور پھر کتنی دیر تک ہنستی رہی۔

رملیٰ حیرت اور صدمے کے مارے اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

جیدہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور بولی۔

"رملیٰ تیرا خیال ہے۔ ہم اس دنیا میں نہیں رہتے —— ؟"

"کیا آنکھیں نہیں رکھتے —— سمجھ نہیں رکھتے یا تجربہ نہیں رکھتے —— ؟"

رملیٰ نے اپنے سوکھے ہونٹوں پر زبان پھیری ——

جیدہ سراسیمہ سی کیفیت میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ پھر اس نے یونہی سارے کمرے کا چکر لگایا۔ کسی کتاب کو کھولا ——— کسی دراز کو چھوا ——— کھڑکی کا پٹ بجایا۔ اور گھوم گھام کے حیران و ششدر بیٹھی رملیٰ کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

اور بڑے دھیمے لہجے میں بولی۔

"رملیٰ کیا تجھے کسی سے عشق ہو گیا ہے ———"؟

رملیٰ کے اوپر جیسے ایک بم پھٹا آ کر ...... وہ ڈر کر پیچھے ہو گئی۔ خوفزدہ ہو گئی۔ اسکا رنگ اڑ گیا۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے۔ بہت آہستہ مگر مجرمانہ سی آواز میں بولی۔

"کیسی باتیں کر رہی ہو جیدہ تم آج ———"؟

"اری تو نے حلیہ ہی عاشقوں والا بنا رکھا ہے۔ دیکھ تیری لٹیں گلے میں جھول رہی ہیں آنکھیں ویران ہیں۔ رنگت زرد ہو رہی ہے ——— چہرے کا ایک ایک نقش کہہ رہا ہے کہ تو گرفتارِ عشق ہے۔ دنیا سے بیزار ہو کر اندر پڑی ہوئی ہے۔ کسی شے میں تیرا دل نہیں لگتا۔ کیوں اپنے آپ کو فریب دے رہی ہے ———"؟

رملیٰ نے اپنا سر اپنے گھٹنوں پہ رکھ لیا۔ کتنی بودی نکلی وہ ——— اگر جیدہ یہ سب بھانپ سکتی ہے تو کوئی اور کیوں نہیں سمجھ سکتا۔ اے کاش وہ اعتراف کر لیتی کہ اپنے شوہر کے جانے سے اس کی یہ حالت ہو گئی ہے۔ اے کاش وہ معاذ کے ساتھ ہی چلی جاتی۔ شاید تب یہ کیفیت نہ ہوتی۔

اچھا ..... اچھا ———

جیدہ ایک دم مڑی اور اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔

اور بولی ———

"میں تو یونہی مذاق کر رہی تھی۔ اٹھ کے تیار ہو جا۔ کہیں گھوم پھر آئیں۔"

"میں سڑک پر سے گذر رہی تھی۔ تمہارا نوکر مل گیا۔ اس سے تمھارے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ تم آئی ہوئی ہو۔ میں اندر آ گئی ——— خالہ جان ملیں تو انھوں نے بتایا تمھیں آئے ایک ہفتہ ہو گیا ہے۔ مگر کمال ہے۔ تم نے ایک ہفتے میں ہمیں بالکل اطلاع نہیں دی۔ کیا ہم اتنے برے ہو گئے۔ یہ ایک ہفتہ جو تم نے ہم سے چھپ کر گذارا ہے۔ اس کی ہم تمھیں سزا دیں گے۔ اور آج ہم تمھیں اپنے ساتھ فلم دیکھنے لے جائیں گے۔

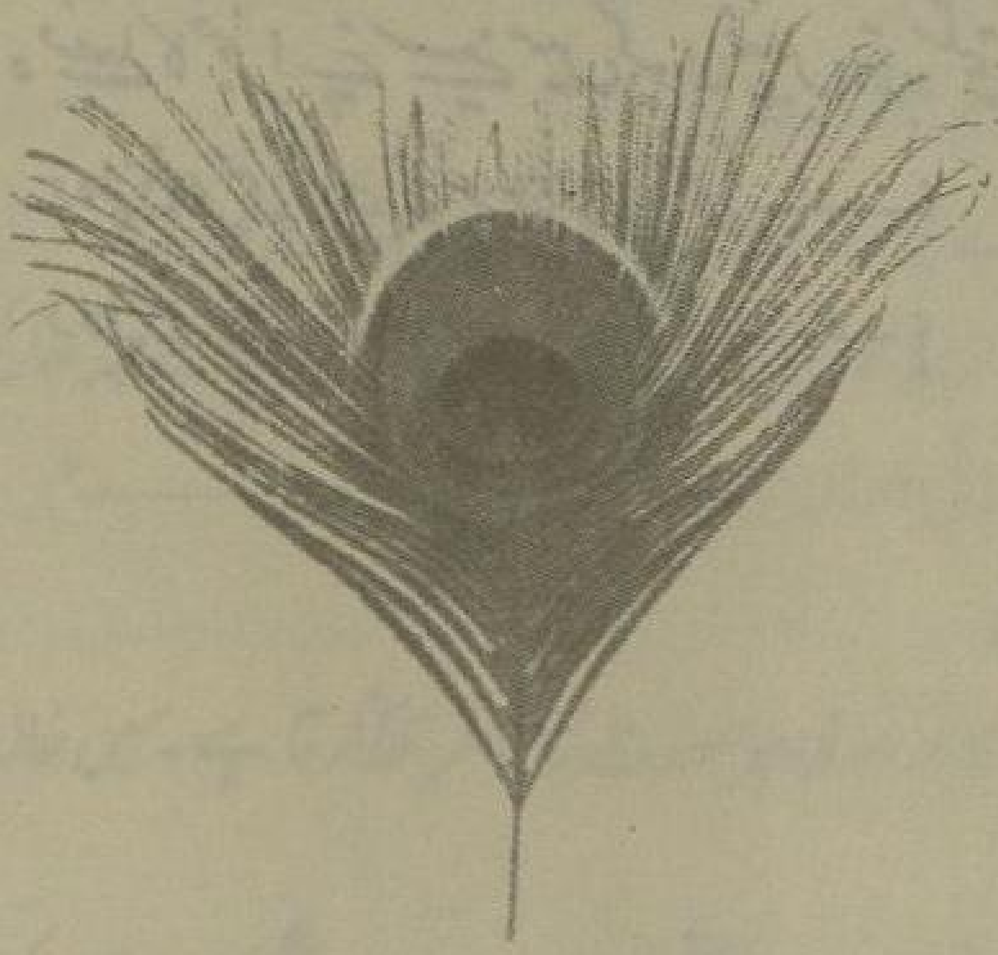
نہیں جیدہ ———

رملیٰ نے ایک دم سر اٹھایا۔ "میں نہیں جاؤں گی ———"

"کیوں نہیں جائے گی تو ———" جیدہ نے اسی طرح پلٹ کر پوچھا۔

کیا وجہ ہے تیرے نہ جانے کی ——"
"بھئی میرا بچہ چھوٹا ہے۔"
"کیا چھوٹے بچوں والی مائیں سیر و تفریح بند کر دیتی ہیں۔"
"مجھے سیر و تفریح کا شوق نہیں ہے۔ دنیا میں بچے سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوتا جیدہ!"
"بس اب نانی اماں بن کے مت دکھا۔ رملیٰ ——"
جیّدہ بولی۔
"دل زندہ ہو تو آدمی ہر صورت میں تفریح کرتا ہے۔ میں خالہ جان سے بات کرتی ہوں۔ وہ معوذ کو سنبھال لیں گی۔"
ابھی جیّدہ کھڑی ہی ہوئی تھی کہ امی جان اندر آگئیں۔ جیّدہ کھل اٹھی جھٹ بولی۔
"خالہ جان! میں رملیٰ سے کہہ رہی ہوں۔ ہمارے ساتھ سینما چلے۔ مگر یہ انکار کیے جا رہی ہے۔"
امی جان نے غور سے رملیٰ کو دیکھا۔
کیسی اجاڑ لگ رہی تھی۔ سارے زمانے کی اداسیاں اس کے چہرے پر آ کر ٹھیر گئی تھیں۔ شادی کے بعد اسے چپ لگ گئی تھی۔ یہی رملیٰ تھی۔ شادی سے پہلے جس کی زبان ایک منٹ کو بھی نہ رکتی تھی۔
ایک پل کو بھی اسے قرار نہیں آتا تھا
اور اب کیسے ملنگ سی بنی بیٹھی تھی۔
امی جان کی ساری ممتا ان کی آنکھوں میں آگئی۔
اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولیں۔
بیٹی چلی جاؤ۔
"امی جان!" رملیٰ نے تڑپ کر سر اٹھایا۔
"معوذ کیسے رہے گا اتنی دیر ——؟"
"میں اسے سنبھال لوں گی۔" امی جان نے پیار سے کہا۔
"جب سے آئی ہو۔ اندر گھسی پڑی ہو۔ اٹھو کپڑے بدلو۔ ذرا گھوم پھر کے آؤ۔"
امی جان کا بھی یہی خیال تھا کہ رملیٰ نے معاذ کے جانے کو اسطرح سے محسوس کیا ہے۔
رملیٰ کا دل چاہا وہ چیخے چلائے۔۔۔۔ واویلا کرے —— اور کہے۔
آخر اسے تنہا کیوں نہیں چھوڑ دیا جاتا۔ اسے اپنے آپ سے لڑنے کی اجازت کیوں نہیں

دی جاتی ۔ وہ فیصلے کا خنجر اپنے سینے میں کیوں نہیں اتار سکتی ۔
وہ اپنی مرضی سے جی کیوں نہیں سکتی ــــــ ؟
وہ اپنی مرضی سے مر کیوں نہیں سکتی ــــــ ؟



ہنستی ہوئی رملیٰ اپنے گھر میں داخل ہوئی تو سامنے ہی برآمدے میں طوبیٰ آپا بیٹھی ہوئی تھیں۔ انھوں نے بڑی تنقیدی نظروں سے رملیٰ کا جائزہ لیا اور بڑی کڑی نگاہ اس کے سراپے پہ ڈال کے بولیں۔

"اس وقت کہاں سے آرہی ہو رملیٰ ـــــ؟" اور اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر جلے بھنے لہجے میں کہنے لگیں۔

"کہاں سے نکل آئی ہے تمھاری اتنی عزیز سہیلی کہ جس کے ساتھ رنگ رلیاں منانے میں تمھیں گھر والوں کا ہوش بھی نہیں ہے۔"

رملیٰ ٹھٹھک گئی۔ اس کی ہنسی یوں غائب ہوئی جیسے اچانک بجلی چلی جائے تو اندھیرا چھا جاتا ہے۔

اس نے اپنے بکھرے ہوئے بال سمیٹے اور ڈری سہمی نظروں سے طوبیٰ آپا کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ طوبیٰ آپا چونکہ سب بہنوں میں بڑی تھیں۔ اس لیے شروع سے ان کے انداز اور تیور جارحانہ تھے: بچپن میں بھی اسے طوبیٰ آپا سے بہت ڈر لگتا تھا۔ مگر اب تو اسے یوں لگا کرتا جیسے وہ بال برابر پل صراط پر چل رہی ہے۔ کسی بھی لمحے عذاب کے جہنم میں جا گرے گی۔

اس روز جیدہ اسے مجبور کر کے پکچر دکھانے کو لے گئی تھی اور امی جان نے بھی اسے زبردستی بھیج دیا تھا۔ حالانکہ اس نے تہیہ کیا تھا کہ وہ اب جیدہ کے گھر نہیں جائے گی۔ کبھی بھی یاور کا سامنا نہیں کرے گی۔ وہ ایک اچھی بیوی اور اچھی ماں بن کر رہنا چاہتی تھی۔ مگر امی جان اس کے دل کی حالت

کو کیا جانتی تھیں۔ انھوں نے بڑے خلوص سے اسے بھیج دیا۔ اس دن کوئی عجیب بات بھی نہیں ہوئی۔ فلم دیکھتے ہوئے یاور نے نہ تو عجیب نظروں سے اسے دیکھا۔ اور نہ کوئی انگارے کی طرح سلگتا ہوا فقرہ اس کی جھولی میں ڈالا۔ بڑے اچھے ماحول میں بڑی اچھی فلم دیکھی۔ بعد میں انھوں نے آئس کریم بھی کھائی اور پھر جیدہ اور یاور اسے اس کے گیٹ پر اتار کر چلے گئے۔ اس روز اس نے دل میں سوچا وہ تو ناحق ڈر رہی تھی۔ زندگی میں ہزارہا لوگ ملتے ہیں۔ بعض لوگ اچھے لگنے لگتے ہیں۔ اچھا لگنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم انھیں حاصل کرنا چاہتے ہیں یا ان کے دل میں رہنا چاہتے ہیں۔ اتنی بڑی دنیا ہے۔ اتنے بے تحاشا انسان ہیں۔ ہر انسان کی صفت جدا ہے۔ بس اچھے انسانوں سے مل کر خوش ہونا چاہیئے۔ اس روز اسے معلوم ہوا کہ پسندیدہ لوگوں کی صحبت میں بیٹھ کر بس اپنے آپ کو خوش رکھنا ہی سب سے بڑی بات ہے وہ اپنی پیاری سہیلی کا گھر نہیں اجاڑنا چاہتی تھی۔ یاور دیکھنے میں اس کو اچھا لگتا تھا اسکی باتیں اچھی لگتی تھیں —— بس اتنا ہی کافی تھا۔ زندگی خوش رہنے کے لیے ہے۔

اور خوشی کے چند لمحے زندگی کے قریب آئیں تو انھیں ٹھکرانا نہیں چاہیئے ان سب باتوں کا ادراک اسے یاور کے شریفانہ رویّے نے دیا تھا۔ اس لیے وہ بے خوف ہو گئی تھی۔

اس کے بعد جب بھی میکے آتی۔ بے دھڑک جیدہ کو ملنے چلی جاتی۔ بے جی نے جب دوبارہ اس کا کھلا ہوا چہرہ دیکھا۔ تو ہفتے میں دو دن کے لیے اسے میکے بھیج دیا کرتیں۔ امی جان نے بھی جب اسے زندگی کے ساتھ مگن دیکھا تو ہر روز اسے جیدہ کے ساتھ گھومنے پھرنے کی اجازت دے دی۔ جب بھی وہ میکے آتی تو۔ پہلے سے جیدہ کو فون کر دیتی اور وہ دونوں میاں بیوی کوئی سا پروگرام بنا لیتے۔ آج بھی وہ لوگ ایک نئے ریستوران میں کھانا کھانے گئے تھے۔ ریستوران دیہات کی طرز پر بنایا گیا تھا۔ اس کے اندر اور ارد گرد سارا دیہاتی ماحول تھا۔ یہ ریستوران ان لوگوں کو پسند آیا تھا اور کھانا بھی بہت اچھا لگا تھا۔ خصوصاً تنوری روٹیاں ——

اور اب وہ جھومتی جھامتی گھر میں داخل ہوئی تھی تو طوبیٰ آپا سامنے خونخوار بنی بیٹھی تھیں۔ پہلے تو رملی کو طوبیٰ آپا کی باتیں سن کر بہت ڈر لگا۔ لیکن پھر وہ دل ہی دل میں کھولنے لگی۔ پتہ نہیں طوبیٰ آپا ہر ایک کی گارڈین بننے کی کوشش کیوں کرتی تھیں۔ جب کہ گارڈین کی صورت میں امی جان موجود تھیں۔ اور وہ ہمیشہ امی جان کی اجازت سے باہر جاتی تھی۔ رملی کے ماتھے پر بل پڑ گئے طوبیٰ آپا کا پوچھنے کا انداز ہی ایسا دل جلا دینے والا تھا۔

وہ مناسب جواب سوچنے لگی۔

طوبیٰ آپا اس کی خاموشی سے بگڑ کر بولیں۔

"پچھلے دو مہینوں سے میں جب بھی آتی ہوں یہی خبر ملتی ہے کہ رملی آئی ہوئی ہے مگر

اپنی سہیلی کے ساتھ باہر گئی ہے۔ کون ہے تمھاری یہ سہیلی جس کی محبت میں تم اپنے بچے کو بھی بھول گئی ہو!
رملی نے بے اختیار نظریں اٹھا کر سامنے اپنے کمرے کی طرف دیکھا۔ جس میں معوذ کو سلا کر گئی تھی۔

آج ساری شام تمھارا بیٹا رو تا رہا ہے۔ اور امی بچاری اسے سنبھال کر تھک گئی ہیں۔ کیا سمجھ رکھا ہے تم نے اپنی ماں کو —— تمھیں معلوم ہے امی بیمار رہتی ہیں اس عمر میں وہ تمھاری آیاگیری نہیں کر سکتیں۔ ہم نے بھی بچے پالے ہیں۔ اور بچوں کے لیے اپنے آپ کو فنا کیا ہے تم میں کیا سرخاب کے پر لگے ہیں —— !

انھوں نے لمبی تقریر کر کے ذرا دم لیا۔ تو رملی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اپنے کمرے میں آگئی۔

معوذ آرام سے سویا ہوا تھا اور امی جان اس کے ساتھ لیٹی ہوئی تھیں۔ امی جان کے کے چہرے پر بہت تھکاوٹ تھی۔ مگر اکتاہٹ نہیں تھی۔ اس نے اپنا پرس میز پر رکھا۔ اور کپڑے بدلنے کے لیے غسل خانے میں چلی گئی۔ طوبیٰ آپا کے بولنے کی آواز ابھی تک آرہی تھی۔

"کتنی خودسر ہو گئی ہے یہ رملی۔ جواب تک دینا گوارا نہیں کیا —"؟

"پتہ نہیں اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہے۔ دو گھنٹے سے اس کے انتظار میں بیٹھی ہوں۔ اب ملکہ کی سواری آئی ہے۔ مگر دیکھو میرے پاس سے یوں گزر گئی۔ جیسے اسے میری پروا ہی نہیں — یوں بھی اس نئی نسل کا خون سفید ہے ——"؟

رملی کپڑے بدل کر باہر نکل آئی۔ امی جان کمرے سے اٹھ کر جا چکی تھیں اور اب طوبیٰ آپا کی آواز بھی نہیں آرہی تھی۔ شاید امی جان نے باہر جا کر انھیں چپ کرا دیا تھا۔

"کتنا فرق ہوتا ہے ماں اور بہن میں ——" رملی نے سوچا اور بستر پر دراز ہو گئی۔

آج وہ لوگ بہت ہنسے تھے۔

اس لیے اب دل پر گھٹائیں چھا رہی تھیں۔

پتہ نہیں یاور کی صحبت میں وہ اتنی خوش کیوں رہتی تھی۔ یاور کے پاس کوئی طلسمی طاقت تھی۔ اس کے قریب بیٹھنے سے سارے مایوس کن خیالات ادھر ادھر بھاگ جاتے تھے۔

وہ لوگ جب بھی کھانا کھانے یا تفریح کے لیے باہر جاتے تھے موٹر ہمیشہ جیدہ چلاتی تھی۔ جب موٹر جیدہ چلاتی تھی تو پھر رملی کو اس کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھنا پڑتا تھا۔ تب یاور ہمیشہ پچھلی سیٹ پر بیٹھتا تھا۔ اور پیچھے بیٹھا ہوا اسطرح دھیمی دھیمی باتیں کرتا رہتا جیسے ان کی طرف پھول اور پتیاں پھینک رہا ہو۔

جب پہلے دن وہ موٹر کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ تو رملی نے مڑ کر اسے دیکھا اور کہا۔
"پلیز آپ آگے آکر جیدہ کے پاس بیٹھ جائیں۔"
"نہیں نہیں تم آگے بیٹھو رملی۔ میں تمھارے پیچھے بیٹھکر خوشی محسوس کروں گا۔"
"آپ کو اپنی بیوی کے پاس بیٹھنا چاہیئے۔" رملی نے بودے پن سے کہا۔
"میں تو بیچارہ زن مرید سا شوہر ہوں۔" یاور سگار کا کش لے کر بولا۔
دو خوبصورت لڑکیوں کے پیچھے بیٹھ کر راحت محسوس کر رہا ہوں۔"
"تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ دو خوبصورت لڑکیوں نے بچارے کو دبا رکھا ہے۔"
جیدہ نے موڑ کاٹتے ہوئے کہا۔
"نہیں —— لوگ بلکہ مجھے رشک سے دیکھ رہے ہیں اور سوچ رہے ہیں۔ دو خوبصورت لڑکیاں اس کو چلا رہی ہیں۔"
اس پر جیدہ نے زور دار قہقہہ لگایا۔
"یاور! دراصل تم تن آسان ہوگئے ہو۔ اب موٹر چلانا نہیں چاہتے۔"
"ہاں ——" وہ اپنی نشہ آور آواز میں بولا" جب کوئی خوبصورت لڑکی میرے آس پاس بیٹھی ہو۔ تو میرے ہاتھ کانپنے لگتے ہیں۔ ایسے میں میں موٹر چلانے سے ڈرتا ہوں کہ کہیں کوئی حادثہ نہ ہو جائے۔۔۔"
"تم موٹر چلاؤ تو کوئی حادثہ نہیں ہو سکتا یاور ——"
جیدہ نے سٹیرنگ گھماتے ہوئے کہا۔
پتہ نہیں دونوں میاں بیوی کے تعلقات کیسے تھے؟ رملی اکثر سوچا کرتی۔ بظاہر وہ عاشق و معشوق جیسی باتیں کرتے رہتے۔ مگر یاور کی نظریں کچھ اور ہی کہتی رہتیں۔
ایک دن موقع دیکھ کر رملی نے یہی سوال کر ڈالا۔
اس روز رملی تیار ہو کر ان کے گھر گئی۔ تو یاور بالکل تیار بیٹھا تھا۔ مگر جیدہ غسل خانے میں تھی۔ باتوں باتوں میں ایک دم رملی نے جرأت کرکے پوچھ لیا۔
"آپ نے اب تک کتنے عشق کئے ہیں۔"
یاور زور سے ہنسا۔ اور پھر سنجیدہ ہو گیا۔
اور کہنے لگا۔
"رملی تم میرے بارے میں ایسا سوچ سکتی ہو۔ مگر میں تمھیں کیا بتاؤں کہ انسان کیا چیز ہے ——؟ انسان قدرت کی عجیب تخلیق ہے۔ زندگی بھر اپنے آپ کو نہیں سمجھ سکتا۔ اب یہی دیکھو میں باتیں

برس کا تھا جب مجھے جیدہ سے عشق ہو گیا تھا۔ بائیس برس کی عمر بھی کوئی عمر ہوتی ہے۔ اس عمر میں سب تجربے جلد بازی کے ہوتے ہیں۔ اب میں بتیس برس کا ہوں۔ عشق و محبت کا مفہوم اب سمجھ میں آیا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ پہلا عشق کر کے میں پچھتا رہا ہوں۔ ہاں اگر میرا وہ عشق ناکام ہو جاتا۔ تو بھی اب میں اپنے ان جذبوں کی ہنسی اڑا رہا ہوتا۔ مرد کی زندگی میں بہت سے مرحلے آتے ہیں۔ مرحلے پڑاؤ نہیں ہوتے۔ یہ تو مرد بھی نہیں جانتا کہ اسے کب، کس عمر میں سچی محبت ہو جائے گی۔ اس لیے جو چہرہ قریب آتا ہے۔ اسکا محبوب بن جاتا ہے۔ پھر ایک دن . . . . . "

یہ کہہ کر اس نے سگار کا کش لیا۔ تھوڑی دیر تک خلاؤں میں گھورتا رہا . . . . . ـــــــــ

پھر اس کی سلگتی آنکھوں میں آنکھیں پھنسا کر بولا ـــــــــ

زندگی کی ڈگر پر وہ ظالم اور سفاک چہرہ نظر آجاتا ہے۔ جس پر ہمارے دل کی کہانی لکھی ہوتی ہے۔ جسے دیکھنے کے بعد یوں محسوس ہوتا ہے کہ پچھلی ساری زندگی یونہی رائیگاں گئی وہی چہرہ حاصل زندگی بن جاتا ہے ـــــــــ

تم نے وہ شعر سنا ہے ؎

تمام عمر ترا انتظار ہم نے کیا . . . .

اس انتظار میں کس کس سے پیار ہم نے کیا ؟ "

رملی کا دل دھڑک اٹھا۔ مگر اس نے گھبرا کر کلائی کی گھڑی دیکھی۔ اور بولی۔

جیدہ نے بہت دیر لگا دی ہے !

"تم بات بدلنا خوب جانتی ہو۔" یاور نے دانت پیس کر کہا۔

"آپ اسطرح سے کہہ لیں۔ ورنہ جو بات میری سمجھ میں نہ آئے اس کا میں کیا جواب دوں ـــــ؟"

" رملی !" یاور نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔ "تم اسطرح کیوں پوز کرتی ہو۔ جیسے تم دنیا کی سب سے زیادہ معصوم عورت ہو۔

رملی ہنسنے لگی۔

" اگر آپ کے خیال میں میں پوز کرتی ہوں تو آپ اسے سچ نہ مانا کریں مجھے بے حد مکار عورت سمجھتے رہیں۔"

"نہیں ـــــ" یاور سگار کی راکھ جھٹک کر بولا۔

مکار عورتیں تمھاری طرح نہیں ہوتیں۔ تم واقعی معصوم ہو۔ مگر کبھی کبھی مجھے تمھاری معصومیت پر غصہ آتا ہے۔"

رملیٰ کا دل چاہا وہ پوچھے ——
"آپ کو کیوں میری معصومیت پر غصہ آتا ہے یا غصہ کرنے کا کیا حق ہے؟
مگر اس نے بات کو بڑھانا مناسب نہ سمجھا۔
"رملیٰ!" یاور نے تھوڑی دیر بعد بڑی نرمی سے کہا۔
"مجھے حسرت ہے میں تمھارے خیالات سنوں۔ مگر تم بہت کم باتیں کرتی ہو۔ کیا تم مجھے خط نہیں لکھ سکتیں ——؟
خط ——؟ اسی وقت اسے یاد آیا کہ اس نے اس مہینے معاذ کے خط کا جواب نہیں دیا۔
رملیٰ ہنسنے لگی: "بھئی کس سلسلے میں ——؟"
بس ایسے ہی جیسے قلمی دوستوں کو لکھے جاتے ہیں۔ یا جس طرح دو بالغ افراد ایک دوسرے سے خط وکتابت کرتے ہیں۔
"اچھا تو آپ مجھے اس طرح سے مروانا چاہتے ہیں۔ کوئی خط دیکھ لے تو یہ کہے کہ شادی شدہ ہو کر ایک نامحرم کو خط لکھتی ہے۔"
"کون دیکھے گا بھئی ——؟ جیدہ کو تو میں بتا دوں گا۔ پھر کون اعتراض کرنے والا ہے اگر تمھیں شک ہے کہ تمھارے خط ادھر ادھر گر جائیں گے۔ یا کسی کے ہاتھ لگ جائیں گے۔ تو اسکا بھی بندوبست ہو سکتا ہے۔
رملیٰ چپ رہی۔
تھوڑی دیر بعد وہ خود ہی بولا۔
"میرا ایک دوست بینک میں مینجر ہے۔ اس کی معرفت بینک میں ایک لاکر لے لوں گا۔ اور اس میں تمھارے خط رکھ دیا کروں گا۔"
رملیٰ کو یہ بات بہت عجیب لگی۔ حیران ہو کر یاور کا چہرہ دیکھنے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر خطوں کی اس ضمن میں کیا ضرورت پیش آ گئی۔ جب کہ وہ اکثر ان لوگوں سے مل لیتی ہے مل سکتی ہے —— اس نے تو معاذ کو بھی بڑی مشکل سے خط لکھا تھا۔ اور شاید اسے خط لکھنا آتا بھی نہیں تھا ——
کیا سوچ رہی ہو .... یاور نے آہستہ سے کہا۔ میں نے اتنی مشکل بات کہہ دی ہے۔ میں نے سوچا تھا —— زندگی گذارنے کے لیے کچھ تو زادِ راہ ہونا چاہیئے۔ کبھی کبھی جب زندگی سے تھک جایا کروں گا تو تمھارے خطوط نکال کر پڑھ لیا کروں گا ——"

ابھی رملیٰ کچھ جواب نہ دے پائی تھی کہ دروازہ کھلا اور بنی سنوری جیدہ باہر نکل آئی۔

"آہا تو نیلم پری آئی بیٹھی ہے"۔ اس نے رملیٰ کے نیلے کپڑوں پر نظر ڈال کر کہا۔

"تم نے دیر کر دی جیدہ ——— میں تو آدھے گھنٹے سے تمھارا انتظار کر رہی ہوں"۔

"چلو چلو پکچر کا وقت نکل جائے گا"۔

جیدہ نے اپنا پرس اٹھا کر کہا اور تینوں باہر نکل آئے۔

پھر ایک دن جب رملیٰ اپنے سنہری چمکدار لمبے بال اگلی سیٹ کی پشت پر پھیلائے بیٹھی تھی۔ تو یاور نے پچھلی سیٹ پر سے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور بولا۔

"جیدہ! تمھیں معلوم ہے جن عورتوں کے لمبے اور خوبصورت بال ہوں وہ انہیں کھلا کیوں چھوڑ دیتی ہیں؟ ———"

"نہیں ...."۔ جیدہ ہنس کر بولی "بھئی میں نہیں جانتی۔ میرے تو کبھی لمبے بال نہیں تھے۔ میں کیا جانوں ———"؟

"تاکہ اپنے پیچھے تڑپنے والوں کا نظارہ نہ کر سکیں ———"

رملیٰ کے دل نے پھر ڈبکی لگائی۔ اسے احساس تھا۔ اس کے بال بہت خوبصورت ہیں اور جو کوئی اسے پیچھے سے دیکھ لیتا تھا۔ آگے آکر اس کا چہرہ ضرور دیکھنا چاہتا تھا۔

"ایک اور خاصیت بھی ہے لمبے بالوں والی عورتوں کی ———"؟

یاور پھر بولا۔

"رملیٰ آج روئے سخن تمھاری طرف ہے۔" جیدہ نے ایک آنکھ بند کر کے کہا۔

رملیٰ صرف مسکرا کر رہ گئی۔

"لمبے بالوں والی عورتیں اپنے جذبات چھپا کر رکھتی ہیں۔ اپنے جذبات پر بھی بالوں کی تہہ جما دیتی ہیں ———"؟

اس بار رملیٰ مسکرائی۔

"یاور!" جیدہ شوخی سے بولی۔ "اب کچھ چھوٹے بالوں والی عورت کے بارے میں بھی کہو؟ مجھے تو حسد ہونے لگا ہے رملیٰ سے ———"

اس پر تینوں نے ایک قہقہہ لگایا......

رملیٰ نے بیقرار ہو کر کروٹ بدلی۔ بہت سارے دن بہت اچھی طرح گذر گئے تھے۔ وہ اپنے گھر میں بھی مگن رہتی تھی اور امی کے گھر میں بھی خوش رہتی تھی۔ یوں لگتا تھا۔ تھوڑے دنوں کے لیے وہ قید سے چھوٹ کر آگئی ہے اس کے لاشعور میں کہیں تھا کہ واپس اسی قید خانے میں جانا ہوگا۔ اس لیے وہ

چاہتی تھی چند دن ہنس کھیل کر گذارلے۔ صرف ہنسنے کھیلنے کے سوا اسکا کوئی اور مقصد بھی نہیں تھا۔ مگر طوبیٰ آپا کو دیکھو۔ مزے سے الزام کا ٹوکرا اٹھا کے اس کے سر پر دے مارا تھا۔ آخر اس نے کیا برا کیا تھا۔ ہفتے میں ایک بار ہی تو ادھر آتی تھی اور ایک شام اچھی گزار جاتی تھی۔ جس شام کا نشہ سارا ہفتہ اس کے اعصاب پر رہتا تھا۔

پر آج رات جیدہ نے کتنی عجیب بات کہہ دی تھی۔

آج وہ ایک ریستوران میں کھانا کھانے گئے تھے۔ ابھی آخری نوالے کھا رہے تھے کہ جیدہ بولی "یاور تم بل دے کر رملی کے ساتھ باہر آجانا۔ میں پہلے جاکر گاڑی اسٹارٹ کرلوں۔ آج دھکا لگوانا پڑے گا۔

جیدہ باہر آگئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں بل ادا کر کے باہر نکلے۔ جیدہ موٹر اسٹارٹ کئے ان کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ یاور نے پہلے ہوٹل کا دروازہ کھولا اور رملی باہر آگئی۔ پھر دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے موٹر تک آئے اسی طرح یاور نے موٹر کا اگلا دروازہ کھولا۔ رملی آگے بیٹھ گئی۔ پھر یاور نے پچھلا دروازہ کھولا اور خود پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ جیدہ نے موٹر آگے بڑھائی اور ہنس کر بولی۔

"تم دونوں کی جوڑی بہت اچھی لگ رہی تھی"۔

رملی کا سارا خون چہرے پر آگیا۔

کار چلتی رہی جیدہ مسکراتی رہی ..... سامنے دیکھتی رہی۔ پھر اسی انداز میں بولی۔

"ابھی جب تم دونوں ہوٹل کا دروازہ کھول کر باہر آئے تھے تو بہت شاندار لگ رہے تھے جیسے ایک دوسرے کے لیے پیدا کیے گئے ہو"؟

رملی نے تڑپ کر پہلے جیدہ کے چہرے کو دیکھا اور پھر پیچھے مڑ کر یاور کا ردِعمل دیکھا۔

جیدہ کے چہرے پر کچھ بھی نہ تھا۔ ایک مسکراہٹ تھی۔ لپ اسٹک سے رنگی ہوئی۔ اور یاور —— جیسے سگار کے ساتھ اسے پی رہا تھا۔

رملی کو ایک پراسرار چپ نے ڈس لیا۔ اگر رملی کے دل میں یاور کا چور نہ ہوتا تو وہ بھی کوئی مزے دار سی پھبتی کس دیتی مگر اسے فوری کوئی جواب نہ سوجھا —— اور ساتھ ساتھ وہ یہ بھی سوچتی رہی۔ اس کے چپ رہنے سے جیدہ کو غلط فہمی بھی تو ہو سکتی ہے اس لیے بہت ٹھہر ٹھہر کر اور بہت رک رک کر بولی۔

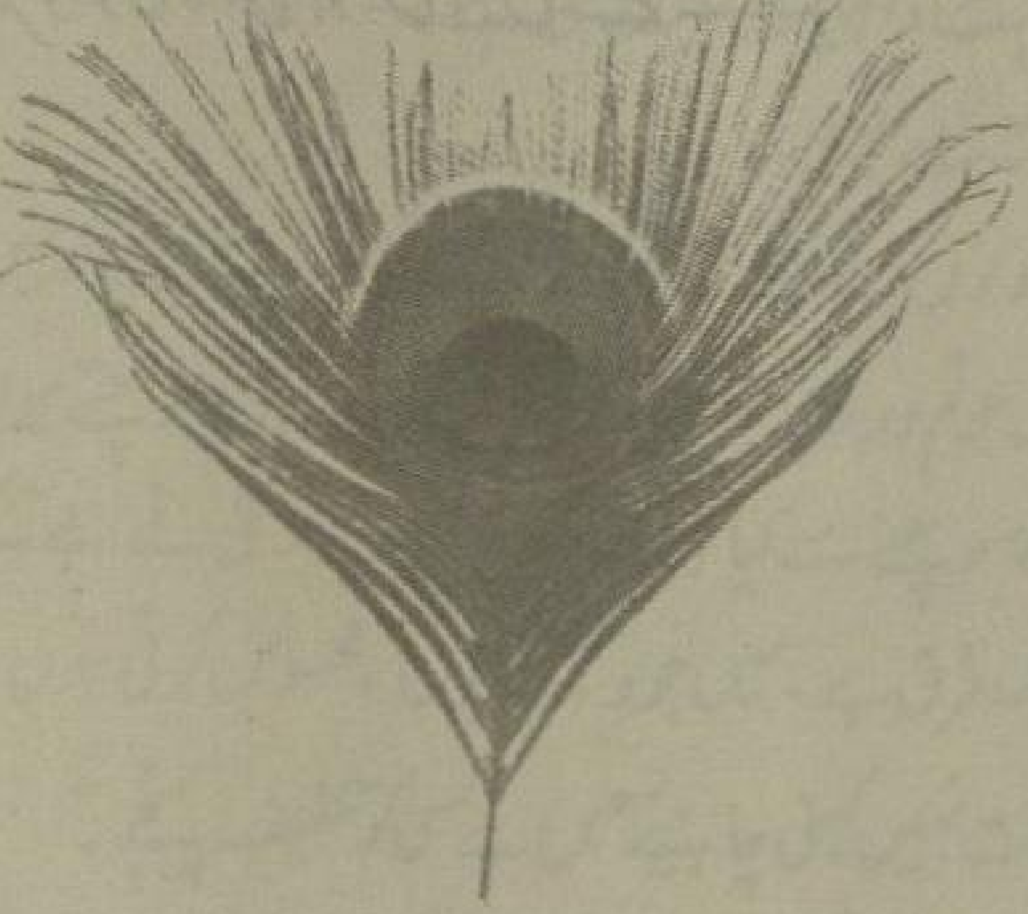
"جیدہ کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے کہ تم دونوں میاں بیوی کا دماغ چل گیا ہے ——"

جیدہ ویسے ہی سامنے دیکھتی رہی اور مسکراتی رہی۔ مگر یاور نے زوردار قہقہہ لگایا۔

"تم یہ بتاؤ"۔ جیدہ بولی۔ "میں نے سچی بات کہی ہے یا جھوٹی ——؟"

"تم نے بہت واہیات بات کہی ہے ـــــــ"
رملیٰ آہستہ سے بولی۔
بھئی تم دونوں آتے ہوئے اتنے اچھے لگ رہے تھے کہ میں تو بس دیکھتی ہی رہ گئی۔
اسی طرح دوسرے لوگ جو تم دونوں کو دیکھتے ہوں گے ایسا ہی سوچتے ہوں گے۔
"ان کے سوچنے سے کیا ہوتا ہے ــــ"؟ رملیٰ نے بے تکے پن سے کہا۔
"ہاں ایک فرق ہے۔ میں جو دیکھتی ہوں۔ محسوس کرتی ہوں۔ فوراً کہہ بھی دیتی ہوں ـ"؟
"ایسی بات نہیں کہنی چاہیئے جس سے کسی کو تکلیف پہنچے۔"
رملیٰ کے منہ سے نکل گیا۔
اس پر جیدہ نے پہلی مرتبہ مڑ کے رملیٰ کا چہرہ دیکھا۔ رملیٰ کے چہرے پر کرب کے سائے تھے۔
"تمہیں اس بات سے تکلیف پہنچی ہے رملیٰ ــــ؟"
جیدہ نے پوچھا ـــــ
اور پھر اسی انداز میں بولی۔ "یاور اتنا برا آدمی تو نہیں ہے۔"
"بات اچھے برے کی نہیں ہے جیدہ"۔ رملیٰ نے کہا۔ اور ساری دنیا تمھاری طرح وسیع
الخیال بھی نہیں ہے۔
یاور! تم کیوں چپ بیٹھے ہو ــــ؟
جیدہ نے شیشے میں سے یاور کا چہرہ دیکھا۔ جو سادھوؤں کی طرح سیٹ پر آلتی
پالتی مارے بیٹھا تھا۔
"تم بھی اس بارے میں کچھ کہو ـــــ"
"ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے ـــــ"
دو خوبصورت مگر بے وقوف لڑکیاں میرے بارے میں گفتگو کر رہی ہیں اور میں
لطف لے رہا ہوں۔ اپنی ذات زیر بحث ہو تو کون پھولا نہیں سماتا۔ میں کیوں بولوں چپ چاپ
سنتا کیوں نہ رہوں ـــــ"
پھر اس کے بعد گفتگو کا موضوع ہی بدل گیا۔۔۔۔۔۔
اور اب اپنے بستر پر لیٹے ہوئے لمحہ بھر کو رملیٰ نے دل میں سوچا ـــــــــ
واقعی یاور اس کے ساتھ چلتا ہوا کتنا اچھا لگتا ہوگا۔۔۔۔۔۔
اور اس سوچ کے ساتھ ہی اسے طوبیٰ آپا کا جلتا ہوا فقرہ یاد آگیا۔۔۔۔۔۔
"کہاں سے نکل آئی ہے تمھاری اتنی عزیز سہیلی کہ جس کے ساتھ رنگ رلیاں

منانے میں تمھیں گھر والوں کا بھی ہوش نہیں ہے ——"



طوبیٰ آپا نے جو رملی کو ڈانٹ پلائی تھی تو رملی اس سے کچھ محتاط ہو گئی تھی اس لیے دو تین ہفتے دانستہ امی جان کے ہاں نہیں گئی۔ اپنے گھر میں رہی اور اپنے بچے میں لگی رہی۔ کل رات امی جان نے فون کر کے اسے بلایا تھا۔ اب امی جان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ بظاہر وہ چلتی پھرتی رہتیں گھر کے کام کرتی رہتیں۔ مگر ان پر ایک گم صم سی سطح کا غلاف چڑھا رہتا۔ بیٹھے بیٹھے وہ کھو جاتیں اور خالی خالی نظروں سے کسی کونے میں دیکھنے لگتیں۔ البتہ رملی آجاتی تو ان میں زندگی کے آثار پیدا ہو جاتے۔ تین ہفتے وہ نہیں آئی تو امی جان نے خود فون کر کے اسے بلایا۔

صبح اٹھ کر وہ معوذ کے کاموں میں لگی رہی۔ اب وہ دودھ پی کے سویا تھا۔ اور وہ تھوڑے سے کپڑے دھونے کا پروگرام بنا رہی تھی کہ ایک دم جیدہ آ گئی۔

"تو پچھلے تین ہفتے کیوں نہیں آئی ہے؟"

اس نے آتے ہی سوالات شروع کر دیئے۔

"بس ——" رملی کھڑی ہو گئی۔ "بے جی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ معوذ بھی دانت نکال رہا ہے نا؛ تو یہ بھی ٹھیک نہیں رہتا۔

کم از کم ٹیلی فون تو کیا ہوتا؟ ——

بس سوچتی رہی اور فون نہ کر سکی۔

"پچھلے ہفتے ہم نے تمہارا بہت انتظار کیا۔"

"ہاں پچھلے ہفتے میں طوبیٰ آپا کے گھر چلی گئی تھی۔" اس دن وہ خفا ہو گئی تھیں نا! تو ان کو منانا بھی ضروری تھا۔

رملی کھڑی ہوئی تو جیدہ آرام سے اس کے بستر پر لیٹ گئی۔

"تو کیسے صبح صبح ٹپک پڑی ہے آج ——" رملی نے پوچھا۔
"مجھے رات ہی پتہ چل گیا تھا کہ تو آگئی ہے۔ یاور آفس چلا گیا۔ تو میں ادھر آگئی۔ سوچا آج تمھارے ساتھ گپ شپ ہو جائے۔"
"اچھا کیا......"، رملی ادھر ادھر سے معوذ کے کپڑے سمیٹ کر بولی۔ میں یہ کپڑے ذرا مائی کو دے آؤں وہ دھو دے گی۔ پہلے تو میرا دھونے کا ارادہ تھا۔ اب تم آگئی ہو تو میں تمھارے ساتھ گپ لگاؤں گی۔
رملی کپڑے دے کر واپس آئی تو اس نے ہاتھ میں چائے کی دو پیالیاں بھی پکڑی ہوئی تھیں۔ ایک پیالی جیدہ کو پکڑا کر وہ سامنے ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔
"تیرا شوہر کب آرہا ہے ——" جیدہ نے ایک گھونٹ بھر کر پوچھا۔
"تاریخ کا تو علم نہیں مگر اگلے مہینے تک ——"
"خطوط نہیں لکھتی تو ——"
"ایک دو لکھے ہیں۔ مگر وہ تو ہر ہفتے وہاں سے فون کر لیتے ہیں۔"
"بڑے پیسے خرچ کر رہا ہے تیرا شوہر۔ جانتی ہے ایک کال پر کتنے روپے لگتے ہیں۔"
"بھئی میں نے تو انھیں پیسے خرچ کرنے کو نہیں کہا۔"
"کم بخت بیوی خوبصورت ہو تو شوہر کو فکر لگا رہتا ہے۔ اگر میں تیری جگہ ہوتی تو صاف کہہ دیتی ہر ہفتے فون کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہی پیسے بچا کر میرے لیے شاپنگ کر لائیں؛
رملی ہنسنے لگی۔
"پاگل دنیا کی ہر خوشی خرید و فروخت سے نہیں ملتی۔"
جیدہ نے چائے ختم کر کے پیالی نیچے فرش پر رکھ دی اور چت لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر چھت کو دیکھتی رہی۔ پھر بڑی گمبھیر آواز میں کہنے لگی۔
"رملی! میں آج تجھ سے ایک بہت ضروری بات کہنے آئی ہوں۔"
رملی نے بھی پیالی خالی کر کے رکھ دی اور اٹھ کے اس کے پاس پلنگ پر آکے بیٹھ گئی۔
"کہو۔"
"بہت دن میں نے اس بات پر سوچا ہے۔ بالآخر میرا یہی فیصلہ ہے کہ میں تمھیں بتا دوں۔"
رملی کا دل دھڑکنے لگا۔
"میرا شوہر تیرے عشق میں مبتلا ہو چکا ہے رملی ——"

بغیر توقف کئے جیدہ نے اگلا فقرہ کہہ دیا۔ رملیٰ کا دل اچھل کر حلق تک آ گیا۔ اس کو ایک دھچکا لگا۔ وہ جہاں بیٹھی تھی سن ہو گئی۔ اپنی پوزیشن درست بھی نہ کر سکی۔" اور مجھ سے اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ وہ اندر ہی اندر گھل رہا ہے۔ اتنا عرصہ ہو گیا میری شادی کو مگر میں نے اس کی ایسی حالت کبھی نہیں دیکھی تھی ......" یہ کہتے وقت جیدہ رملیٰ کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ بلکہ اس نے دیوار کی طرف منہ پھیرا ہوا تھا۔ اور اڑی ہوئی رنگت کے ساتھ رملیٰ یک ٹک اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ جس پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ ایک پھیکا سا چہرہ —— جیسے ردی کا کاغذ جس پر کچھ بھی نہ لکھا گیا ہو۔

یہ بات جیدہ غصے سے کہہ رہی ہے۔ گلے سے —— یا نفرت سے —— رملیٰ کو تو کچھ بھی اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ بس اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ جیسے اسے پھانسی کے تختے کے قریب لے جایا جا رہا ہو.......

"میں اپنے شوہر کو آزردہ نہیں دیکھ سکتی......"

جیدہ پھر بولنے لگی۔

میں اسے ہمیشہ خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔ اس لیے میں نے سوچا ہے آج میں تم سے یہ بات ضرور کروں گی۔

یہ کہہ کر اس نے باقاعدہ رملیٰ کی طرف دیکھا۔ رملیٰ نے جھٹ نظریں جھکا لیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ جیدہ اس سے کیا کہنا چاہتی ہے؟

جیدہ تھوڑی دیر اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ پھر بڑے بیدرد لہجے میں بولی ——

"اور شاید تم بھی ——"

"جیدہ ——؟" رملیٰ نے تڑپ کر سر اٹھایا۔

"جیدہ ——؟"

"ہاں تم بھی اس سے محبت کرنے لگی ہو رملیٰ۔ یاور میں طلسمی کشش ہے۔ جو لڑکی اسے دیکھتی ہے۔ اس سے محبت کئے بنا رہتی نہیں۔"

"یہ جھوٹ ہے جیدہ ——"

" رملیٰ نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ اگر میں تم لوگوں کے ساتھ گھومتی پھرتی ہوں ہنس بول لیتی ہوں۔ تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ "——

"صفائی کیوں پیش کر رہی ہو رملیٰ۔ جیدہ نے ذرا نرمی سے کہا۔ میں تم سے گلہ تو کرنے نہیں آئی۔ پہلے میری بات تو سنو۔

"مگر تم جانتی ہو تم کیا کہہ رہی ہو؟ خوف زدہ لہجے میں رملیٰ نے پوچھا۔

"ہاں جانتی ہوں۔۔۔۔۔۔ تم میری دوست ہو۔ آج اگر دردِ دل تم سے نہیں کہوں گی تو کس سے کہوں گی۔ پہلے خاموشی سے میری بات سن لو۔

رملیٰ خاموش ہو گئی۔

جیدہ نے ایک ٹھنڈی سانس چھوڑی۔

پھر کہنے لگی۔"رمو! تو جانتی ہے میرا بچہ نہیں ہے۔ ڈاکٹروں نے بہت پہلے بتا دیا تھا کہ میرے بچہ نہیں ہو سکتا۔ اور یادر کو بچے کی بڑی آرزو ہے۔ کبھی کبھی مجھے احساس جرم ہونے لگتا ہے۔ کہ میں یاور کو بچّہ تو دے نہیں سکتی۔ مگر اس کے ساتھ چمٹی ہوئی ہوں۔ اب تم دونوں کی حالت دیکھ کر میرے دل میں ایک خیال آیا ہے۔ تم اسے حل کہہ سکتی ہو ــــــ"!

رملیٰ کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے۔ وہ کسی نئے حملے کے لیے تیار ہو گئی۔

"تم۔۔۔۔ تم ایسا کرو۔ یاور سے شادی کر لو ــــــ"

"جیدہ ــــــ"؟

رملیٰ اتنے زور سے چیخی کہ کاٹ (COT) میں سویا ہوا معوذ ڈر کر جاگ اٹھا اور پھر سسک سسک کر رونے لگا۔

رملیٰ چھلانگ لگا کر اس کے بستر کے قریب گئی۔ اور دھیرے دھیرے اسے تھپکتی رہی۔ تھوڑی دیر سسک کر اور کسمسا کر معوذ دوبارہ سو گیا مگر رملیٰ بت کی طرح بیٹھی اسے تھپکتی رہی۔ اس کا چہرہ دیکھتی رہی اس کے ہونٹ دیکھتی رہی جو سوتے میں کبھی بسور رہے تھے۔ کبھی مسکرا رہے تھے۔ اس کے رخسار پر ایک تنہا آنسو رہ گیا تھا۔ اس کو دیکھتی رہی۔۔۔۔ اپنا ہاتھ اس کے نرم و ملائم جسم پر پھیرتے ہوئے وہ سوچتی رہی۔ محبت کی اصل کیا ہے ــــ؟ یہ معوذ کون ہے ــــ؟ کون ہے یہ دل کا ٹکڑا اور کہاں سے آ گیا ــــــ؟

کس نے بخشا یہ لعل ــــ؟

یہ موتی سیپ میں کیسے اترا ــــــ؟

کیا موتی سیپ سے باہر آ کر بے مول ہو جاتے ہیں۔

اتنا بڑا آسرا تھا اس کے پاس ــــــ وہ کیوں بے آبرو ہوئی؟

کتنی دیر تک وہ یونہی گم صم۔۔۔۔ بیٹھی اس کو تھپکتی رہی۔ معوذ کے پاس سے اٹھ کر جانے کا حوصلہ نہ ہو سکا۔ معوذ کے آس پاس اس کی ساری طاقت جمع تھی۔

کافی دیر کے بعد جیدہ نے سر اٹھایا اور پوچھا۔

"کیا معوذ سو گیا ہے ——؟"

"ہاں ———"

یہ کہہ کر رملیٰ کھڑی ہو گئی اور مرے ہوئے قدموں سے چلتی ہوئی آئی۔ مگر اس بار جیدہ کے پاس پلنگ پر بیٹھنے کی بجائے وہ سامنے صوفے پر بیٹھ گئی اور بیٹھتے ہی کہنے لگی۔

"جیدہ! میں نے تمھیں ایک بار کہا تھا نا کہ تم دونوں میاں بیوی پاگل ہو۔"

"پاگل تم ہو ——؟"

جیدہ نے ایسے کہا۔ جیسے اس کے منہ پر طمانچہ مارا ہو۔

"ایک اتنی بڑی حقیقت کو جھٹلا رہی ہو۔"

"کیا حقیقت ہے جیدہ ——؟" رملیٰ نے غصے سے پوچھا۔

"یہ کہ تم اور ریاور ایک دوسرے سے محبت کرتے ہو۔"

"ذرا ہوش کی دوا کرو۔ میں ایک شادی شدہ عورت ہوں۔ میرا شوہر ہے۔ میرا بچہ ہے۔ کوئی سنے گا تو کیا کہے گا ——؟"

"ہاں ٹھیک ہے کہ تم شادی شدہ ہو۔ مگر تم اپنے شوہر کو ناپسند کرتی ہو۔ اپنی شادی سے خوش نہیں ہو۔"

"تم سے کس نے کہا ہے ——؟"

"تمھارے چہرے پر لکھا ہے۔ شاید تم اس وقت اپنا چہرہ نہیں دیکھ سکتیں جب تمھارا شوہر تمھارے سامنے ہوتا ہے۔ کاش تم دیکھ سکو۔ اس وقت تمھارے چہرے پر کتنی نفرت اور بیزاری ہوتی ہے۔ ایسے لگتا ہے تم اپنے آپ سے جنگ کر رہی ہو۔ لڑ رہی ہو۔ سانس بھی کھینچ کھینچ کر لے رہی ہو۔ ظاہر ہے جو بھی تمھیں اس عالم میں دیکھے گا۔ تم سے ہمدردی کرے گا —— تم کو بچانا چاہے گا۔ تم سے محبت کرے گا۔ تم اپنی ناکام اور ناخوش زندگی کا چلتا پھرتا اشتہار خود ہو۔"

رملیٰ بے بسی سے رونے لگی۔ بس اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ آج اسے اپنی ناکامیوں اور کوتاہیوں کا خیال بری طرح آنے لگا تھا۔ اندر اتنی کشمکش ہونے لگی کہ آنسوؤں کی ایک بوچھاڑ آئی اور اس کا سارا چہرہ بھگو گئی۔ تھوڑا سا رو کر وہ بولی۔

"جیدہ! آج کے بعد میں تم سے کبھی نہیں ملوں گی۔ اور تم بھی مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کرنا میں نے پہلے بھی دو چار مرتبہ یہ تہیہ کیا تھا۔ مگر تم کسی نہ کسی طرح راہ میں آجاتی تھیں۔ اب جب کہ بات کھل گئی ہے۔ تو میں اپنی ازدواجی زندگی کو بچانا چاہتی ہوں۔

مجھے کسی کی پروا نہیں ہے۔ خبردار آج کے بعد مجھ سے ملنے کی کوشش ہرگز نہ کرنا۔"

جیدہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور زور زور سے ہنسنے لگی۔ پھر رملیٰ کے پاس صوفے پر جا بیٹھی اور اسے گلے سے لگا لیا۔

رملیٰ میں تمھیں طعنے دینے کے لیے نہیں آئی۔ نہ تمھیں تکلیف پہنچانے آئی ہوں میں تو ایک تجویز لیکر آئی تھی۔ ذرا سہیلی بن کے میری بات سنو۔

رملیٰ خاموش بیٹھی رہی۔

جیدہ کہنے لگی۔

"تمھیں معلوم ہے میری زندگی میں ایک خلا ہے۔ تم بھی اپنی زندگی سے خوش نہیں ہو۔ اگر تم معاذ سے طلاق لیکر یاور سے شادی کرلوگی۔ تو وہ مجھے نہیں چھوڑے گا۔ تم اسے بچے دے سکتی ہو۔ اور ہم دونوں مل کر رہ لیں گے۔ ظاہر ہے اگر وہ تمھارے علاوہ کسی دوسری عورت سے شادی کرلے گا تو وہ مجھے اپنے پاس نہیں رکھے گا۔ مجھے یاور سے محبت ہے۔ میں اسے چھوڑنا نہیں چاہتی۔ تم میری سہیلی ہو۔ یہ ظلم تو مجھ پر نہ کروگی۔"

رملیٰ نے اپنی گیلی گیلی آنکھوں سے جیدہ کے چہرے کو غور سے دیکھا اور بولی۔

"جیدہ کیا تم نے شادی کو تماشا سمجھ رکھا ہے! کتنی آسانی سے اتنی بڑی بات کہہ رہی ہو۔"

"اس دنیا میں کیا نہیں ہوسکتا رملیٰ ——؟ اور طلاق کا حق تو عورت کو شریعت بھی دیتی ہے۔ یہ تو معاشرے کے ٹھیکیداروں نے عورتوں کے سارے حقوق غصب کر رکھے ہیں۔"

"تم جانتی ہو نا! ایک طلاق کے مرحلے سے گذرتے ہوئے خاندان کے خاندان تباہ ہو جاتے ہیں۔ ذرا میرے والدین کے بارے میں سوچو۔ میں انھیں اس عمر میں اتنا بڑا صدمہ کیوں دوں ——؟ ذرا بے جی کے بارے میں سوچو۔ ان کا کیا قصور ہے؟ اور پھر معاذ نے مجھے کون سی تکلیف دی ہے ——؟"

"اگر تمھیں کوئی تکلیف نہیں ہے تو کرب کی ایک لکیر ہمیشہ تمھارے ماتھے پر کیوں رہتی ہے؟ کیوں ایسے لگتا ہے کہ جیسے تمھیں کسی نے صولی پر لٹکایا ہوا ہے۔ تم حواس باختہ کیوں رہتی ہو ——! تم خوش کیوں نہیں رہتیں؟"

"یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔" رملیٰ نے کہا۔

"اب اس میں ایک دوسرا شخص بھی شامل ہو گیا ہے ——"

"کون ہے وہ دوسرا شخص ——؟" رملیٰ نے غصے سے کہا۔

"وہ میرا شوہر ہے۔"

"تو اپنے شوہر کو سنبھال کے رکھو۔ میں نے پہلے بھی کہہ دیا ہے کہ میں آج کے بعد تم لوگوں سے نہیں ملوں گی۔"

رملی جان! جیدہ نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"پھر خفا ہو گئی ہو۔ جان! میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ ذرا ٹھہرو۔ سوچو ــــــ میں کوئی بری بات نہیں کہہ رہی۔ مجھے بھی تم سے ہمدردی ہے۔ میں کہتی ہوں۔ تم ساری زندگی عذاب میں کیوں گذارو۔ جب کہ ایک راستہ ہے۔ اس عذاب سے نکلنے کا ــــــ"

"اگر یہ عذاب ہے تو میں اس عذاب سے نکلنا نہیں چاہتی۔"

"نہیں رمو! تمھارے سامنے ایک راستہ ہے تم فیصلہ کر سکتی ہو۔ یاور کو تم سے بے پناہ محبت ہے۔ یاور تمھیں کیا نہیں دے سکتا۔ تم اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتی ہو۔ یاور کی اور تمھاری جوڑی کتنی بھلی لگتی ہے۔ خدا کے واسطے میری بات مان جاؤ۔ میں تمھاری کنیز بن کے تمھارے گھر میں رہوں گی تمھارے بچوں کو کھلایا کروں گی۔"

"کاغذ کا گھروندا نہ بناؤ جیدہ ــــــ کاغذ کے گھر میں تو چولہا بھی نہیں جل سکتا۔"

"رمو! زندگی تو ایک بار ملتی ہے۔ جوانی تو ایک بار آتی ہے۔ عورت کو بھی خوش رہنے کا حق ہے۔ اور ہماری شریعت میں بھی صاف لکھا ہے کہ اگر عورت کسی وجہ سے اپنے شوہر سے ناخوش ہو یا اسے ناپسند کرتی ہو تو طلاق لے سکتی ہے۔ تمھیں تو صرف ایک دن فیصلہ کرنا ہے۔ فیصلہ کر کے دل کڑا کرو۔ اور اسی طرح ایک دن معاذ سے کہہ دو جس طرح آج میں نے تمھیں کہہ دیا ہے کہ تم اس سے طلاق لینا چاہتی ہو۔ اگر معاذ کو تم سے محبت ہو گی۔ تمھیں خوش دیکھنا چاہے گا تو ضرور تمھیں طلاق دے دے گا۔ جس طرح میں اپنے شوہر سے محبت کرتی ہوں اور اسے ہر حالت میں خوش دیکھنا چاہتی ہوں اور جب میاں بیوی میں یہ معاملہ طے پا جائے۔ تو پھر گھر کے اور لوگ اس میں دخل اندازی نہیں کر سکتے۔"

رملی چپ بیٹھی رہی۔

جیدہ پھر بولی۔

"یہ مرد کی بنائی ہوئی دنیا ہے۔ تم نے دیکھا نہیں۔ یہاں شوہر بغیر وجہ کے بیوی کو طلاق دے دیتا ہے۔ اس کی فریاد نہیں سنتا۔ اس پر ترس نہیں کھاتا۔ بس جب اس کا دل کسی دوسری عورت پر آتا ہے۔ جھٹ طلاق کے کاغذات اپنی بیوی کے منہ پر دے مارتا ہے۔

اس سے کوئی نہیں پوچھتا کہ بھئی تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟ اس غریب کا کیا قصور رہے؟ یا نئی بیوی کے ساتھ اس کو بھی گوارا کر لو اس کے بھی حقوق ادا کرتے رہو...... اگر مرد ایسا کر سکتا ہے۔ تو عورت کیوں نہیں کرتی؟"

"میں ایسی عورت نہیں ہوں،" رملیٰ نے آہستگی سے کہا! میں نے معاذ سے علیحدہ ہونے کے بارے میں کبھی نہیں سوچا ——"

"لیکن لاشعوری طور پر ہمہ وقت اس سے الگ رہتی ہو. اس کے ساتھ کہیں جاتی نہیں ہو. کسی سے اسے ملوانہیں سکتی ہو. تمھارے اندر ہر وقت ٹوٹ پھوٹ ہوتی رہتی ہے"!

"یہ میرا ذاتی معاملہ ہے،" رملیٰ نے روہانسی آواز میں دوبارہ کہا۔

"بے وقوف! میں بھی تو تمھاری ذات کے لیے کہہ رہی ہوں"!

"جیدہ! اب تم جاؤ۔" رملیٰ نے اپنی آنکھوں کے آنسو پونچھ کر کہا۔

"رمو! میں تیری عزیز سہیلی ہوں. تیری دشمن نہیں ہوں. میں تجھے سوچنے کا موقع دیتی ہوں. دوسری شادی آج کے معاشرے میں کوئی عیب نہیں ہے۔ تو اتنی نوخیز ہے. اور تیرے سامنے ساری عمر کا سوال ہے ——"

جیدہ تھوڑی دیر کے لیے رکی —— پھر کہنے لگی۔

"اور اگر تجھے یہ خوف ہے کہ سارے گھر والے تیرے مخالف ہو جائیں گے تو ہم میاں بیوی تیرا ساتھ دیں گے۔ ہم تیرا مقدمہ لڑیں گے اور تجھے اپنے گھر میں پناہ دیں گے ——"

"بس . . . . . . بس . . . . ." رملیٰ زور زور سے رونے لگی! "بہت ہو چکی جیدہ! اب تم جاؤ۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہ کہو میں اپنی نظر میں آپ گر چکی ہوں۔ پتہ نہیں تم نے مجھے کس قماش کی لڑکی سمجھ لیا ہے۔ بس —— اب تم جاؤ۔ پلیز جاؤ۔ میں اور نہیں سن سکتی۔"

جیدہ پھیکی ہنسی ہنس کر کھڑی ہو گئی۔

"تم اس وقت جذباتی ہو رہی ہو رملیٰ! کیونکہ پہلے پتھر کی چوٹ کچھ زیادہ ہی لگی ہے. میں بھی تمھاری جگہ ہوتی تو میرا بھی یہی حال ہوتا. . . . کوئی بات نہیں —— ابھی تمھارے شوہر کے آنے میں بہت دن ہیں. تم سوچ سکتی ہو. فیصلہ کر سکتی ہو. اور ہاں . . . . . . جو فیصلہ کرو —— مجھے ضرور بتا دینا۔ میری دوستی میں کوئی فرق نہیں آئے گا ——"

یہ کہہ کر جیدہ باہر نکل گئی۔

رملیٰ جی بھر کر روتی رہی اسے آج اپنی حالت پر غصہ بھی بہت آیا. اور ترس بھی آیا۔ جیدہ نے کتنی عجیب بات کہہ دی تھی. کیا کبھی شرفاء میں بھی ایسا ہوا ہے۔ دنیا کیا کہے گی ——؟ زمانہ کیا سوچے گا ——؟ کیا اپنی نظروں میں گر کر بھی کوئی جی سکا ہے۔ اور جیدہ نے اسے کیا سمجھ کر ایسی بات کہہ دی ہے۔

سارا دن اس کا جی کھولتا رہا. بار بار اپنے آپ پر غصہ آتا رہا. . . . . . . رات کو وہ

گھر واپس آگئی۔ بے جی نے اس کا چہرہ اترا ہوا دیکھا تو پوچھا ——

"کیا بات ہے دو ہٹی ——؟"

"کچھ نہیں بے جی ......" وہ بہت آہستہ سے بولی "آج سارا دن میرے سر میں بہت درد ہوتا رہا۔"

یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس نے غور سے اپنے خوبصورت کمرے کو دیکھا۔ اٹھارہ مہینے میں تو آدمی ایک کمرے سے بھی مانوس ہو جاتا ہے۔ شاید اسے بھی اس کمرے میں چپ چاپ رہنے اور دن رات سلگنے کی عادت پڑ گئی تھی۔

بے جی اس کے پیچھے چلی آئیں ....

غور سے اس کا اداس چہرہ دیکھتی رہیں۔ جب رملی نے استفسارانہ انداز میں ان کی طرف دیکھا تو بولیں۔

"میں یہ بتانے آئی ہوں۔ آج دوپہر کو معاذ کا فون آیا تھا" ......

رملی ایک دم اچھل پڑی۔ جس دن ایسی ویسی کوئی بات ہو جائے معاذ کا ٹیلی فون ضرور آتا تھا۔ پتہ نہیں یہ کیسا رشتہ ہے۔ اس نے دل میں سوچا —— ایک دروازہ بالکل بند ہے۔ اور ساری روشنی دوسرے دروازے سے آرہی ہے۔

"جی کیا کہا ہے انھوں نے ......؟"

اس نے اپنی سوچ میں ڈوبی آنکھیں اٹھا کر بے جی سے پوچھا۔

"خوشخبری ہے تمھارے لیے ...... اگلے ہفتے آرہا ہے ——؟"

"اگلے ہفتے ——؟"

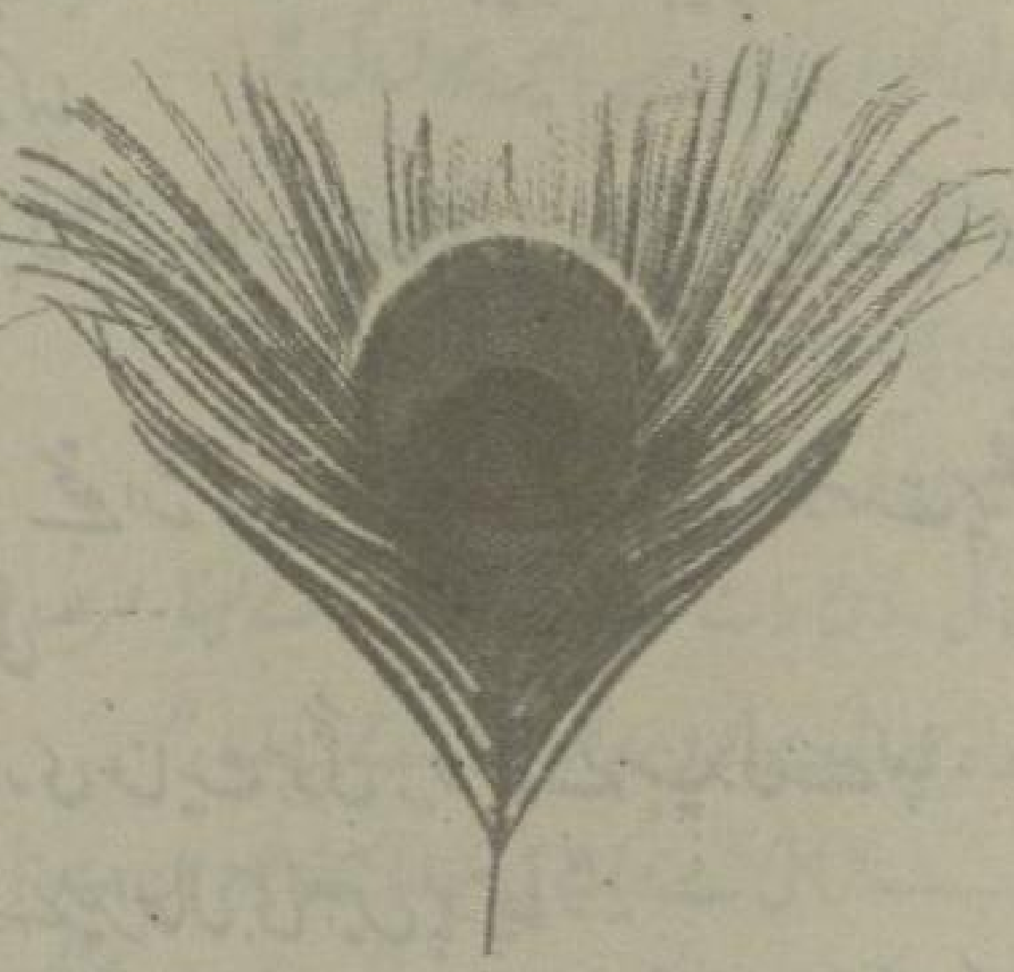
رملی نے اس طرح پوچھا کہ بے جی کو اندازہ نہ ہوا۔ یہ حیرت تھی یا خوشی۔

"ہاں کہہ رہا تھا۔ میرا کام ختم ہو گیا ہے اور میں وقت سے پہلے آجاؤں گا۔ تمھارا اور معوذ کا بھی پوچھ رہا تھا ——؟"

دو چار اور باتیں کر کے بے جی باہر نکل گئیں۔

تو رملی نے وہاں کھڑے کھڑے اپنے دل سے پوچھا ——

کیا فیصلہ ہے تمھارا ——؟



فون کی گھنٹی بجی تو رملی نے دوڑ کر اٹھایا۔ دوسری طرف جیدہ تھی۔
بڑے پیار سے بولی۔
"رملی تو مجھ سے خفا ہو گئی ہے۔"؟
رملی نے پہلے اپنے لہجے پر قابو پایا۔ اور پھر آہستہ سے کہا۔
"نہیں ——"؟
"تو پھر اس دن کے بعد سے آئی کیوں نہیں؛ فون بھی نہیں کیا"۔
"دراصل جیدہ! اسی ہفتے معاذ آ گئے تھے"!
"اچھا۔ مگر تو تو کہہ رہی تھی اگلے مہینے آئیں گے"۔
"بس وہ آ گئے۔ کہہ رہے تھے۔ کام ختم ہو گیا۔ تو چلا آیا۔"
"تیرے لیے اداس ہو گیا ہو گا۔ واقعی تیرا پریمی ہے"۔
رملی کو اس دن کی باتیں یاد آنے لگیں۔ اور اپنے آپ سے شرم آنے لگی۔
جیدہ بولی۔
۔"رمو! مجھے تجھ سے معافی بھی مانگنا تھی"۔
کس بات کی ——؟ رملی نے پوچھا۔
۔"اس روز جانے میں کیا اول فول بکتی رہی۔ تیرے جیسی معصوم اور وفاشعار بیوی کے ساتھ مجھے ایسی باتیں نہیں کرنی چاہیے تھیں۔ مگر تو نہیں جانتی کبھی کبھی میں فرسٹریشن کا شکار ہو جاتی ہوں۔ پھر فضول باتیں کرنی لگتی ہوں۔ میں نے شاید اس دن تمہارا دل دکھایا تھا۔ گھر آ کر بھی مجھے بہت افسوس

ہوتا رہا۔ رمو! خدا کے لیے مجھے معاف کر دے۔ پلیز... پلیز.....‘‘
رملی نے کہا۔
’’اگر تجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے تو پھر سمجھ لے کہ میرے دل کی خفگی بھی دور ہو گئی۔‘‘
’’رمو! تجھے اللہ خوش رکھے۔ مجھے تجھ جیسی دوست پر فخر ہے۔ قسم خدا کی پھر کبھی تجھے ایسی بات نہ کہوں گی۔‘‘
’’یہ تمھاری عنایت ہو گی!‘‘ رملی نے بیدلی سے کہا۔
’’رمو! تو نے میرا حال ہی نہیں پوچھا۔‘‘
جیدہ نے بڑی لگاوٹ سے کہا۔ ’’میرا خیال ہے تو ابھی تک مجھ سے ناراض ہے۔‘‘
’’کیا ہوا ہے تجھے ——؟‘‘ رملی نے فوراً پوچھ لیا۔
’’پچھلے دس دنوں سے سخت بیمار ہوں۔ ڈاکٹروں نے بستر پر رہنے کا مشورہ دیا ہے۔‘‘
’’اچھا بات کیا ہے؟‘‘
اب سب کچھ فون پر کیسے بتاؤں۔ دس دنوں سے پڑی سلگ رہی ہوں تم سے ملنے کو دل تڑپ رہا تھا۔ بڑی مشکل سے فون تک آئی ہوں۔ ظالم تھوڑی دیر کے لیے آ کے مجھے مل جا۔‘‘
’’اب..... اس وقت ———‘‘ رملی نے چونک کر کہا۔
’’ہاں آجا!‘‘
’’اس وقت میں نہیں آ سکتی۔ بے جی یہاں کسی ہمسائے کے گھر گئی ہیں۔ نوکرانی بھی آج چھٹی پر ہے۔ دوپہر کا کھانا میں ہی پکا رہی ہوں۔ اس وقت تو میں نہیں آ سکتی۔‘‘
’’اچھا.....‘‘ جیدہ نے مایوسی سے کہا۔
’’اگر میں چلنے کے قابل ہوتی تو خود آ جاتی۔ کیا تم شام کو آ سکتی ہو؟‘‘
’’شام کو تو بالکل بھی نہیں آ سکتی۔‘‘ کیونکہ آج کل معافے ملنے کے لیے بہت سے لوگ شام کو آتے رہتے ہیں۔‘‘
’’رملی خدا کے لیے مجھے مل آ کر۔ میرے دل پر ایک بوجھ سا ہے۔ تم سے مل کر میں یہ بوجھ ہٹانا چاہتی ہوں۔‘‘
رملی نے کہا۔
’’کوشش کروں گی۔‘‘
’’نہیں رمو!‘‘ جیدہ پیار سے بولی۔ ’’تو کل مجھ سے صبح ملنے کے لیے آ ——‘‘
’’کل کس وقت ———؟‘‘

"یہی کوئی دس اور گیارہ کے درمیان۔ اس وقت یاور تو دفتر چلا جاتا ہے۔ میں گھر پر اکیلی ہوتی ہوں۔ خوب دل کھول کے تم سے باتیں ہوں گی۔"

"اچھا ــــــ"

"بیدلی سے اچھا نہ کہہ ــــ بلکہ وعدہ کر ــــ"

"بھئی دیکھوں گی ــــ"؟

"کیا دیکھے گی۔ آج رات معاذ سے اجازت لے لینا۔ صرف دو گھنٹے کے لئے آ جانا۔ اگر تو کہے تو میں شام کو معاذ بھائی سے فون پر اجازت لے دوں۔"

"نہیں ــــ" رملی نے ایک دم کہا۔ "میں خود ان سے بات کر لوں گی۔"

"رمو! بس ایک بار تو مجھے مل جا۔ اس کے بعد تجھے کبھی تکلیف نہ دوں گی۔ تیرا دل چاہے تو مجھے ملنا ورنہ مجھے ہمیشہ کے لیے چھوڑ دینا۔ لیکن صرف ایک مرتبہ مجھے آ کر مل جاؤ۔"

"ٹھیک ہے"۔ رملی نے کہا۔

"کل میں انتظار کروں ــــ"

"ہاں میں آ جاؤں گی۔"

"ضرور رمو! میری آنکھیں دروازے پر لگی رہیں گی۔"

رملی نے آہستہ سے فون رکھ دیا۔

اسے جیدہ پر ترس آنے لگا۔ جیدہ کی عجیب زندگی تھی۔ ماں باپ کی مخالفت مول لے کر اس نے یاور سے شادی کر لی تھی۔ بلکہ بعض لوگ تو یہ بھی کہتے تھے کہ جیدہ یاور کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی تھی۔ یہ ملک سے باہر چلے گئے تھے۔ اب پتہ نہیں بے چاری کس قسم کے حالات سے دوچار تھی۔ بظاہر تو خوش و خرم ہی نظر آ رہی تھی۔

لیکن جب سے معاذ آیا تھا۔ رملی بہت محتاط ہو گئی تھی۔ رملی محتاط تو جیدہ کی باتیں سن کر ہو گئی تھی طوبی آپا نے بھی اسے بہت طعنے دیئے تھے۔ اس کا مطلب ہے۔ کوئی بات تھی جو اس کے چہرے پر لکھی تھی۔ اور اپنے ہی چہرے سے اسے ڈر آنے لگا تھا۔

اس پر ایک اور غضب ہو گیا۔

جس روز معاذ واپس آیا اس کے لیے اور بچے کے لیے بے شمار تحائف لایا۔ گھر میں پھر ایک بار شادی کا سا سماں ہو گیا۔ اس روز رملی نے زبردستی ہنسنے مسکرانے کی کوشش کی۔ معاذ سے باتیں بھی کیں۔ وہ چاہتی رہی کہ وہ اپنے رویے سے ظاہر کرے آج عرصۂ دراز کے بعد اس کا شوہر گھر آیا ہے۔

شوہر جب پردیس سے آتے ہیں تو بیویوں کے سوئے ہوئے جذبات جاگ اٹھتے ہیں۔ ان

کے ارمان دولہن بنتے ہیں۔ دل کے اندر جگمگ دیئے روشن ہوتے ہیں۔ وصل کی ایک خوبصورت رات کا اجالا ان کی آنکھوں سے چھن چھن کر نکلنے لگتا ہے۔ جتنی دیر کے بعد شوہر آتا ہے۔ اتنا ہی پیارا لگتا ہے۔ جتنے فاصلے طے کر کے آتا ہے۔ طلب اتنی بڑھ جاتی ہے۔ ارمان لوہے کی طرح تپ جاتے ہیں اور پھر سانسوں کی ذرا سی آنچ شعلے بھڑ کا دیتی ہے ——

مگر نہ جانے رملی کو کیا ہوا ——؟

پہلے اس کا دل نہیں چاہا کرتا تھا۔

مگر وہ اس روز خوف زدہ تھی۔ اپنی ہر بات سے خوف زدہ تھی۔ مسکراتی تو ڈر جاتی کہ ہونٹوں کی لہروں میں شاید کوئی چور دریچہ کھل گیا ہے۔ بات کرتی تو نظریں جھکا لیتی کہ نظریں راز فاش کر رہی تھیں۔ قریب آ کے بیٹھتی تو ڈر جاتی کہ کہیں اس میں سے کسی نامحرم کی خوشبو نہ آ جائے —— آگے بڑھنا چاہتی تو رک جاتی ——

کہ معاذ کیا کہے گا ——؟

کس بات پہ پردہ ڈالنے کے لیے وہ پیش قدمی کر رہی ہے۔ اپنے آپ کو اس نے اپنے ہی واہموں میں جکڑ لیا تھا ——

اور وصل کا لمحہ چراغ جلائے بغیر گذر گیا تھا۔

معاذ تھوڑی دیر تو چپ لیٹا رہا۔ پھر بولا۔

"رمو! میں وہاں جتنا عرصہ رہا۔ میں نے اپنے آپ کو تمھاری امانت سمجھا۔ شادی سے پہلے کی اور بات ہوتی ہے۔ شادی سے پہلے مرد اس جانور کی طرح ہوتا ہے جس کے گلے میں کسی کی ملکیت کا پٹہ نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ ہر میدان میں چر لیتا ہے۔ مگر شادی کے بعد بعض مرد شادی کے اصولوں کا احترام کرتے ہیں۔ مجھے ان پانچ مہینوں میں تمھارے سوا کسی عورت کا خیال نہیں آیا۔ یہ مرد کے اندر کی بات ہے۔ بھوک تو آدمی کسی سستے ہوٹل سے کھا کر بھی مٹا سکتا ہے۔ مگر مردوں کو اپنی بیوی کی رسوئی کا کھانا اتنا نفیس لگتا ہے کہ وہ باہر بھوکا رہنا پسند کرتے ہیں۔ اور گھر آ کر ہی پیٹ بھر کر کھاتے ہیں۔"

رملی نے ایک لمبی سانس چھوڑی اور دل میں سوچا ——

"اتنے بدصورت آدمی کو بھلا باہر کون عورت منہ لگاتی ہوگی۔ ظاہر ہے اسے اپنی بیوی کے پاس آنا پڑتا ہے۔"

اسی وقت معاذ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

سرہانے پڑا ہوا سگریٹ کا ڈبہ اٹھایا۔ اس میں سے ایک سگریٹ نکال کے سلگایا اسے منہ میں رکھ کر کش لگایا۔ دھواں فضا میں چھوڑا ...... پھر لیٹی ہوئی رملی کی بڑی بڑی خالی نظریں

میں اپنی اداس سرخ اور گہری نظریں گاڑدیں۔

رملی نے پہلی بار محسوس کیا۔ معاذ کی آنکھیں بہت خوبصورت تھیں۔ پتہ نہیں کیسی آنکھیں تھیں۔ بس وہ ایک دم آنکھیں لگ رہی تھیں۔ گو وہ جذبوں کو آنکھوں میں سمیٹ کر باتیں نہیں کر رہا تھا۔ مگر اس کی آنکھیں احساسات کا گہرا کنواں لگ رہی تھیں۔ سفید چمکدار ——— جن میں کہیں کہیں تھکاوٹ کے ڈورے تھے ——— منڈیروں پر ایک انجانی سوچ اداسی کا غلاف اوڑھے بیٹھی تھی۔ اور گھنی پلکیں مڑی ہوئی تھیں۔ عام طور پر مردوں کی پلکیں نہ گھنی ہوتی ہیں نہ خم دار ہوتی ہیں۔ رملی نے معاذ کے سارے چہرے سے اس کی آنکھیں الگ کر دیں۔ اور ان میں دیکھتی رہی...

کوئی ایسی بات تھی ان میں ——— کوئی ایسی بات..... جس سے بدن کے بجھے ہوئے دیئے ایک ایک کر کے روشن ہونے لگے تھے اس کے گھنے بالوں کا ٹوکرا سا بن گیا تھا۔ یہ بال رملی کو بہت برے لگتے تھے۔ مگر اس وقت اس نے اس کے گھنے بالوں پر نظریں جما کر سوچا ——— مرد کے اتنے گھنے بال اس نے کبھی نہیں دیکھے ——— عجیب طرح بکھرے ہوئے تھے۔ جیسے دور سے گھنے جنگلوں کا اندھیر اجھرمٹ ———

دور سے گھنے جنگلوں کا اندھیر اجھرمٹ بہت پر اسرار نظر آتا ہے۔ ایک دم اس کے اندر گھس کر نئے راستے تلاش کرنے کو جی چاہتا ہے۔

رملی نے سوچا ——— وہ ان بالوں میں ہاتھ پھنسا کر دیکھے تو یہ بال کیسے لگتے ہیں؟

اس خیال کے ساتھ اس کی ہتھیلیوں میں سرسراہٹ ہونے لگی۔ اس کی انگلیاں مچلنے لگیں..... روئیں روئیں نے ایک انجانا سوال پوچھا ———

اسی وقت معاذ اپنی گہری اور بوجھل آواز میں بولا۔

"تم یہ نہ سمجھنا کہ میں خوش شکل نہیں ہوں۔ اس لیے دوسری عورتوں کی مراعات حاصل نہیں کر سکتا ———"

"دنیا میں مرد کے لیے خوش شکل ہونا ضروری نہیں۔ اس کے پاس صرف پیسہ ہونا چاہیئے یا حیثیت ———

"بکاؤ عورتیں ——— وہ کسی بھی ملک کی ہوں۔ بس جیب پر نظر رکھتی ہیں۔.... اور دنیا میں جتنے مرد احساس کمتری کا شکار ہیں۔ بازاری عورتوں کے پاس جاتے ہیں۔ وہ ان کی انا کو مجروح نہیں کرتیں اپنے چہرے کے کسی زاویے سے یہ ظاہر نہیں کرتیں کہ وہ انھیں پسند نہیں کرتیں۔"

رملی کا دل دھڑک اٹھا۔

اس نے نظریں جھکالیں۔

اپنی سانس روک لی ——

معاذ نے دو تین کش لگائے۔ رملی جانتی تھی۔ معاذ عام طور پر سگریٹ نہیں پیتا تھا۔ مگر جن دنوں ذہنی طور پر پریشان ہو یا کام کا بوجھ ہو تو پھر چند سگریٹ پی لیا کرتا تھا۔

اس نے حسب عادت پورا سگریٹ نہیں پیا بلکہ تھوڑا سا حصہ پی کر سگریٹ بجھا دیا۔ اپنے گھنے اور الجھے ہوئے بالوں میں ہاتھ پھنسایا۔ اور ایک اداس سی مسکراہٹ چہرے پر لاکر بولا۔

"مرد اگر عیاشی کے راستے پر چلنا چاہے۔ تو کوئی بات اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتی مرد کے لئے ہر راستہ کھلا ہے اور رہر راہ گذر کو روندنے کا اس کے پاس جواز ہے ——

میں ذرا اور طرح کا مرد ہوں۔

مجھے کوئی احساس کمتری بھی نہیں ہے۔

بات صرف اتنی ہے کہ میں نے جس قسم کی بیوی کا تصور کیا تھا۔ وہ مجھے مل گئی ہے۔ بالکل ایسی ہی —— نازک کومل، معصوم و مصفا عورت میرے ذہن میں رہا کرتی تھی۔

تم جانتی ہو۔ وہ ہنسا اور اس کے بہت سفید دانت ایک دم نمایاں ہوئے۔

ہر بدصورت آدمی کسی خوبصورت عورت سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ تاکہ اگلی نسل خوبصورت ہو۔ . . . ."

رملی کا دم سینے میں گھٹنے لگا۔

"لیکن دنیا میں عورت کو کیا چاہیئے —— اس بات کا اندازہ کبھی نہیں ہو سکا ——؟

کہنے کو تو یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عورت کو صرف مرد کی محبت درکار ہوتی ہے

لیکن . . . .

وہ چپ ہو گیا . . . . . .

لیکن . . . . . .

پھر وہ آرام سے لیٹ گیا۔

اور چھت کی طرف دیکھتا ہوا کہنے لگا۔

لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا —— تصور میں رہنے والی عورت بازوؤں میں کیوں نہیں رہ سکتی ——!"

چھن !

رملی کے اندر شرمندگی بھرا ایک فانوس ٹوٹ کر گرا۔ سارا بستر کرچیوں سے بھر گیا۔

معاذ نے کروٹ بدل لی —— سائیڈ لیمپ بجھا دیا۔

کمرے میں ایک ہلکی سی روشنی رہ گئی۔

رملیٰ نے محسوس کیا۔ ایک ہلکی سی روشنی اس کے دل میں بھی تھی.......

معاذ کے وجود سے بڑی اچھی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ وہ خوشبو جو اپنی تھی۔

اس کا دل چاہا وہ آج رات روٹھے ہوئے معاذ کو منائے۔ اس کا دل چاہا وہ پچھلے گذرے ہوئے دنوں کی تلافی کرے ـــــ

معاذ نے اتنا کچھ کہا ہے وہ بھی کچھ کہے ـــــ معاذ تھکا ہوا ہے۔ وہ اس کی تھکن اتار دے ـــــ عورت کی محبت کا انداز مرد کی جنم جنم کی تھکن کو اتار دیتا ہے۔ عورت کی محبت بھری مسکراہٹ اس کے ذہن کا سارا بوجھ ہلکا کر دیتی ہے۔ ایک زمانے سے لڑکر آتا ہے وہ ـــــ مگر محبوب بیوی کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا ہے ـــــ

بیوی کو چاہیئے کہ اسے اٹھا کے کلیجے میں رکھ لے۔ ملن کی رات اس کا اسطرح سے سواگت کرے کہ اپنی اک اک سانس کی پتیاں بنا کر اس کی سیج پر بچھا دے۔

بھاگتا دوڑتا...... ہانپتا..... کانپتا..... زندگی کے راستے پر لڑتا ہوا مرد۔ جھگڑتا ہوا مرد ـــــ بکھرا ہوا مرد، بپھرا ہوا مرد ـــــ اپنے گھر اپنی سیج پر دم لینے کو رکتا ہے۔ بیوی ایک ٹھنڈی میٹھی آبجو ہے۔ جس کا کام پیاس بجھانا ہے۔ بیوی ایک گھنا سایہ ہے۔ جس کے دامن تلے چین کی نیند آجاتی ہے۔

اور دنیا میں کیا نہیں مل جاتا ؟ ـــــ

پیسہ ہو تو آدمی سب کچھ خرید لیتا ہے۔ بناوٹی محبت کرنے والیاں بھی مل جاتی ہیں۔

شادی کو خوشی کیوں کہا گیا ہے ـــــ ؟

اور اس خوشی کو قائم رکھنا کس کے ذمے ہے ؟

شاید بیوی ہی کے ذمے ہے.....

رملیٰ کے سرہانے ادراک کی بارش ہونے لگی۔

مگر معاذ گہری نیند سو چکا تھا۔ شاید بہت طویل سفر کر کے آیا تھا۔ رملیٰ کافی دیر تک کروٹیں بدلتی رہی۔

صبح اٹھی تو دل کی تہہ میں وہی پتھر پڑے تھے۔

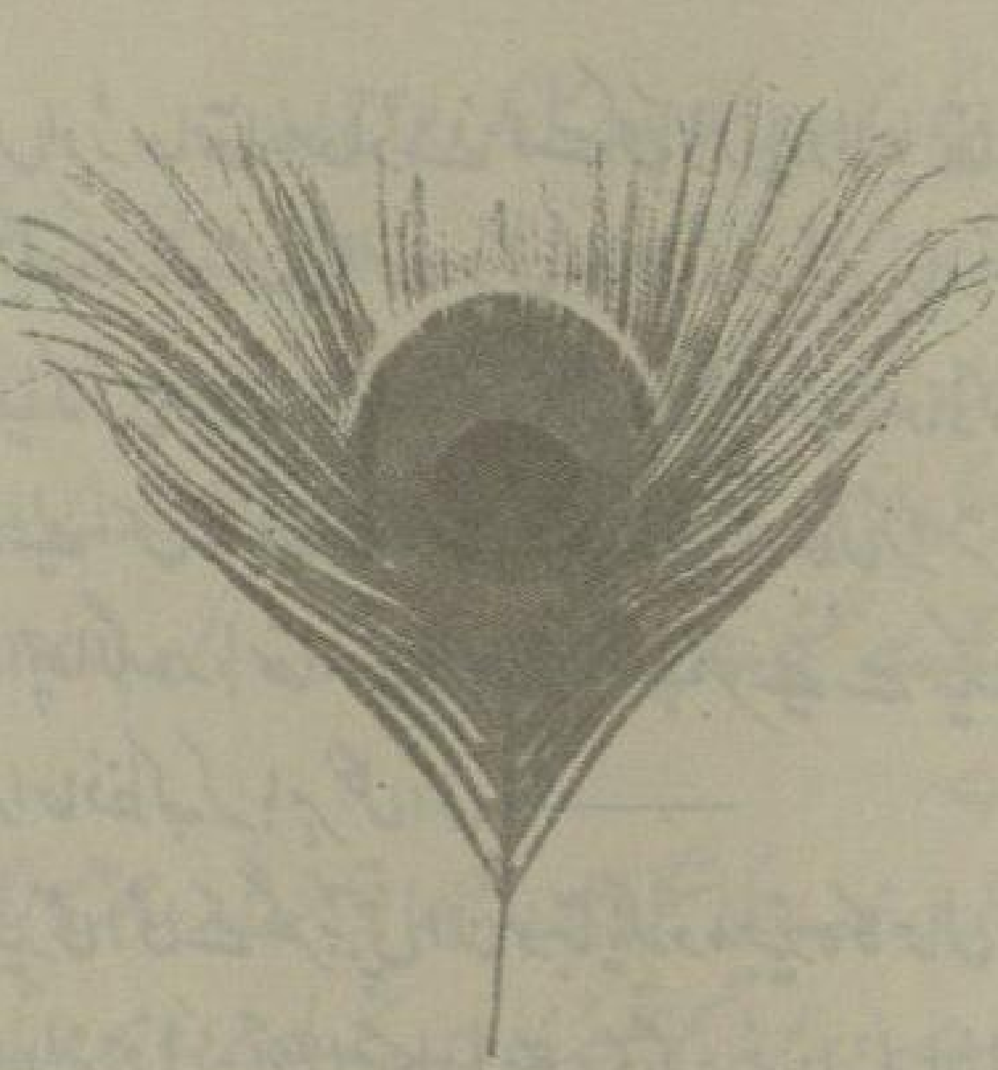
ایک لمحہ جو ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ وہ بڑی مشکل سے دوبارہ ہاتھ آتا ہے۔ کئی دنوں سے وہ اسی ایک لمحے کی منتظر تھی۔ معاذ آتے ہی مصروف ہو گیا تھا۔

اور آج جیدہ کے فون نے پھر اسے ہلا کر رکھ دیا۔

اس روز جیدہ نے جو کچھ اسے کہا تھا۔ وہ سب اسے برا لگا تھا۔ مگر جی میں کہیں کہیں کرب کی آندھیاں اٹھی تھیں۔ کہنے کو یہ خواب اچھا تھا۔ یوں ہو جاتا تو ———

مگر صاف لگ رہا تھا ایسی باتیں ناممکن ہوتی ہیں پھر وہ بہت دن تک اپنے آپ کو لعنت ملامت کرتی رہی تھی۔ اور اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ کبھی یاور کا خیال دل میں نہیں لائے گی بچپن کے ایک خوبصورت خواب کی طرح اس کو بھول جائیگی۔ اور ان لوگوں سے ملے گی بھی نہیں ——— ملنے سے تعلقات گہرے ہوتے ہیں اور کچھ بھی نہیں ہوتا۔

اور آج جب جیدہ نے اتنی منتیں کر کے بلایا تھا۔ تو اسے سب گذری باتیں ایک ایک کر کے یاد آنے لگیں۔



صبح دس بجے کام سے فارغ ہو کر رملی کپڑے استری کر رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔ دوڑ کر گئی۔ اس طرف جیدہ تھی۔

"ظالم تو ابھی تک آئی نہیں —— میں تیرا انتظار کر رہی ہوں۔"

"بس ابھی فارغ ہوئی تھی۔ اب تیار ہو رہی ہوں۔"

"اچھا ——" جیدہ خوش ہو گئی "کتنی دیر میں پہنچ جائے گی۔"

آدھا گھنٹہ لگے گا ہی ——

"میں گھر میں اس وقت اکیلی ہوں۔ دروازہ کھلا ہے۔ سیدھی اندر آ جانا۔"

"بہت اچھا ——"

رملی نے آہستہ سے فون رکھ دیا۔

اس نے کل شام معاذ کو بتا دیا تھا کہ جیدہ بیمار ہے۔ اور وہ اسے پوچھنے جائے گی۔

معاذ نے بڑی خوش دلی سے کہا تھا۔

"اگر تم شام کا پروگرام بنا لیتیں تو میں بھی تمھارے ساتھ چلتا اور اس کا گلہ جاتا رہتا۔"

"آپ پھر کسی روز چلے جائیے گا۔ اور شام کو تو مجھے فرصت ہی نہیں ملتی۔"

معاذ اس کی ہر بات مان لیتا تھا۔

البتہ بے جی کو اس نے صبح اٹھ کر بتایا تھا کہ وہ ذرا امی جان کے ہاں جا رہی ہے۔ بس ایک گھنٹے کے بعد آ جائے گی۔ اس لیے وہ معوذ کا خیال رکھیں۔ اس نے کپڑے بدلنے کے لیے الماری کھولی تو سامنے وہی دوپٹہ پڑا تھا۔ جو پچھلی مرتبہ معاذ کراچی سے اس کے لیے لایا تھا۔ دوپٹے کی زمین سفید تھی۔ مگر اس پر بڑے بڑے سرخ پھول تھے۔ اور پھولوں کے کناروں پر سفید دودھیا ستارے ٹکے تھے۔ رملی

نے ایک بار بھی یہ دوپٹہ نہیں اوڑھا تھا۔ معاذ نے اسے کئی بار یاد دلایا تھا۔ آج یہ دوپٹہ روٹھے ہوئے محبوب کی طرح الماری کے ایک کونے میں پڑا تھا۔ رملی کو اس دوپٹے پر پیار آگیا۔ اس نے اسے کھول کر دیکھا۔ پھر ایک دم فیصلہ کر لیا کہ آج وہ یہ دوپٹہ ضرور اوڑھے گی۔ صرف معاذ کو خوش کرنے کے لیے اسے شام تک پہنے رکھے گی۔ اس لیے اس نے سلک کا ایک سفید سوٹ نکال کر استری کیا۔ اس کے ساتھ سرخ پھولوں والا یہ دوپٹہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ تیار ہوئی۔ خوب قرینے سے میک اپ کیا۔

بے جی کو خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آئی ——

ٹیکسی لیکر سیدھی امی کے گھر پہنچی ان کو بتایا کہ وہ جیدہ کا حال پوچھ کر ابھی آجائے گی اور پھر پیدل ہی جیدہ کے گھر روانہ ہوئی۔ آج اسکا دل چوری کرنے والے انداز میں نہیں دھڑک رہا تھا بلکہ وہ سوچ رہی تھی کہ آج وہ جیدہ سے دو ٹوک بات کر کے اسے بتا دے گی کہ وہ ان لوگوں سے مزید تعلقات استوار نہیں رکھ سکتی۔

صدر دروازہ کھلا ہی تھا۔ اس لیے وہ اندر ہی چلی گئی سیدھی جیدہ کے بیڈ روم میں۔

جیدہ اس وقت بستر پر نہیں تھی۔ مگر یوں معلوم دے رہا تھا۔ ابھی ابھی کوئی اس بستر سے اٹھ کر گیا ہے۔ جیدہ جیدہ اس نے دو تین آوازیں دیں تو غسل خانے سے پانی چلنے کی آواز بلند ہوگئی۔ تب اسے معلوم ہو گیا کہ اس وقت جیدہ غسل خانے میں ہے۔ اس لیے اس نے ایک رسالہ اٹھالیا۔ اور اس کے پلنگ پر نیم دراز ہو کے اس کی ورق گردانی کرنے لگی۔ ورق گردانی کرتے کرتے وہ چونکی۔ کیا جیدہ ایسے رسالے پڑھتی ہے؟ جن میں حیا سوز تصویریں چھپتی ہوں اور اخلاق سوز مواد چھپتا ہو۔

بہت حیران اور پریشان ہو رہی تھی اور سوچ رہی تھی شاید اتنا عرصہ انگلینڈ میں رہنے سے اسے یہ عادتیں پڑ گئی ہیں۔

ابھی وہ کچھ اور سوچ نہ پائی تھی کہ ایک دم غسل خانے کی چٹخنی کھلنے کی آواز آئی۔ رملی نے رسالہ منہ پر سے ہٹا کر اسطرف دیکھا۔ غسل خانے کا دروازہ کھلا۔ مگر جیدہ کی بجائے یاور باہر نکل آیا۔

"آپ ——؟"

رملی مارے حیرت کے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

یاور نے نہا کر ایک بڑا سا تولیہ اپنے گرد لپیٹا ہوا تھا۔ اس کے بالوں میں سے پانی کے قطرے گر رہے تھے۔ اس نے اپنے بال جھٹک کر رملی کی طرف دیکھا۔ رملی کو وہ ایک بدلا ہوا آدمی نظر آیا۔ خوف کی ایک لہر رملی کے پاؤں سے اٹھی اور سر تک دوڑ گئی ——

مگر اس نے رملی کو سنبھلنے کا موقع نہ دیا۔

بھیڑیئے کیطرح لپک کر باہر نکلا اور رملی کو دبوچ لیا۔
حیرانی، خوف، صدمہ، ندامت، پچھتاوا —— ان سب باتوں نے ملکر رملی پر حملہ کر دیا۔
اس کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ جسطرح اچانک بجلی کا کرنٹ لگنے سے انسان کے اندر سے ایک اجنبی، اندوہناک مگر دلخراش سی چیخ نکلتی ہے۔ اپنی چیخ ہونے کے باوجود انسان اس کو پہچان نہیں سکتا۔ خدا جانے گلے سے نکلتی ہے یا ذہن سے . . . . . کن پاتالوں سے ہو کر آتی ہے کہ اپنے کانوں کو نامانوس لگتی ہے۔

اپنے خیالی دیوتا کو درندے کی شکل میں دیکھا تو شدید جھٹکا لگا۔ بجلی کا جھٹکا ایک دم سارے جسم کی جان نکال دیتا ہے۔ اور پورا جسم تھوڑی دیر کے لیے مردہ ہو جاتا ہے۔ مردہ جسم احتجاج کے قابل نہیں ہو سکتا —— مگر پچھلے کچھ دنوں سے جو ایک روشن دریچہ کھل گیا تھا۔ اس نے اس وقت بڑا سہارا دیا ——

وہ جنبش بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی جدوجہد بھی ناکام جا رہی تھی —— اس پر بے خبری میں حملہ کیا گیا تھا ——
مورچے میں بیٹھنے والا اپنے شکار پر نظر رکھتا ہے اور ایسے وقت میں حملہ کرتا ہے جب شکار مدافعت نہ کر سکے —— حملہ آور کا داؤ بالکل ٹھیک تھا۔
زندگی اور موت میں فاصلہ ہی کتنا ہے —— ؟
ایک ثانیے میں رملی نے اپنے ذہن کو جگایا۔ اس کے علاوہ اور کوئی تدبیر کارگر نہ ہو سکتی تھی۔
"پلیز مجھے چھوڑ دیجئے ——"
اپنی اجنبی آواز میں رملی نے پہلے تو التجا کی ——
وہ مکروہ انداز میں ہنسا اور بولا ——
"بہت دن تک تم نے مجھے ادائیں دکھائی ہیں۔ اتنی دیر میں نے کسی لڑکی پر نہیں لگائی۔ جتنی تم پر لگائی ہے۔ میں جلدی اپنا حساب بے باق کر لیا کرتا ہوں۔ زیادہ دن تک تم پارسائی کا دعویٰ نہ کر سکو گی ——" ؟

اف . . . . رملی نے اپنی قہر بھری نظروں سے اس حسین شہزادے کو دیکھا۔ جس نے اس کے خوابوں میں آگ لگا دی تھی۔ اسوقت وہ دنیا کا بدصورت ترین انسان دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی زندگی کی ساری خباثت اس کے چہرے پر تھی۔ اس کی آنکھیں سوّر کی آنکھوں کی طرح چڑھی ہوئی تھیں۔
اس کے چہرے کے نقوش بگڑے ہوئے تھے۔ وہ انتہائی مکروہ انسان نظر آ رہا تھا۔

اُف..... رملی نے سوچا اتنے گھٹیا انسان کو وہ اپنے شوہر پر ترجیح دے رہی تھی۔

"ڈرو نہیں —— قہقہہ لگا کر بولا۔ میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں ایک راستہ محبت کرنے والوں کے لیے کھلا رہتا ہے..... باقی یہ شادی، نکاح —— طلاق —— سب ڈھونگ ہیں۔ اچھی زندگی گذارنا چاہتی ہو تو میرے اشاروں پر چلتی رہو ——"

رملی نے نفرت سے منہ پھیرا تو اچانک دروازے کی طرف دیکھ کر زور سے بولی۔

"جیدہ! مجھے بچاؤ ——"

شاید مقبولیت کی گھڑی تھی۔ یاور نے گھبرا کر اسے چھوڑ دیا۔ حالانکہ تھوڑی دیر پہلے اس نے جیدہ کو خود بھیجا تھا۔ مگر اس کے بازو کھل گئے۔ رملی دروازے کی طرف دوڑی۔ وہ اس کی چال سمجھ گیا اس کے پیچھے دوڑا۔ اور لپک کر رملی کا سرخ پھولوں والا دوپٹہ پکڑ لیا۔ رملی نے اس وقت دوپٹہ چھڑوانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ دوپٹے سے زیادہ اس کی عزت قیمتی تھی۔ بھاگ کر کوریڈور میں آئی تو باہر والا دروازہ در دعا کی طرح ابھی تک کھلا ہوا تھا۔ اچھے وقتوں کی طرح جسے وہ بند کر کے نہیں گئی تھی ——۔

اپنی زندگی کی پوری طاقت سے دوڑتی ہوئی دروازے سے ٹکرائی اور باہر نکل گئی۔ باہر اور باہر...... امی جان کے گھر کی باڑھ کے قریب پہنچ کر اس نے مڑ کر دیکھا یاور اپنے صدر دروازے میں کھڑا تھا۔ غصے سے پھنکتا ہوا۔ اس کے ہاتھ میں رملی کا دوپٹہ تھا۔ اس نے دوپٹہ رملی کی طرف اچھالا اور بلند آواز میں بولا۔

"اگر دوپٹہ واپس لینا چاہتی ہو۔ تو اسی وقت لوٹ آؤ..... ورنہ یہ دوپٹہ تمھیں بہت مہنگا پڑے گا ——"

بلا سے —— رملی نے اپنے دھک دھک کرتے سینہ پر ہاتھ رکھا اور باہر نکل گئی۔

باقی کا راستہ بھی اس نے دوڑ کر ہی پار کیا۔ امی جان کے گھر کے باہر رک کر اس نے سانس کو درست کیا۔ اس کے بال بکھر گئے تھے۔ ذرا سی دیر کو جو قیامت اس پر گذر گئی تھی وہ اس کے حلیے سے نظر آ رہی تھی۔ حلیے کے علاوہ اس کے ذہن کا بہت برا حال تھا۔ وہ چلا چلا کر رونا چاہتی تھی چیخنا چاہتی تھی۔ فریاد کرنا چاہتی تھی۔ منہ اٹھا کر آسمان کو کوسنا چاہتی تھی کہ آج اس کے ساتھ کیا ظلم ہونے جا رہا تھا۔

مگر اسوقت کچھ بھی نہ کر سکتی تھی۔

بہت سکون کے ساتھ اندر جانا تھا۔ اندر جا کر چہرے پر بشاشت پیدا کرنی تھی۔ سب سوالوں کے جواب سکون سے دینا تھے۔ اور یہ کسقدر مشکل تھا ——

کسی شخص کے اوپر سے ریل گاڑی گذر جائے اور وہ صحیح سلامت رہے۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے ——— ؟

اپنے قیمہ قیمہ ہوتے وجود کو اٹھا کر اندر چلی گئی۔ امی سامنے ہی برآمدے میں بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھیں اسی طرح سینے پہ دونوں ہاتھ رکھے جب ان کے قریب سے گذرنے لگی تو امی جان نے سر اٹھا کر دیکھا اور بولیں ———

"آج تو بڑی جلدی آگئی ہو ——— ؟" وہ تیز تیز قدموں سے گذرتی گئی۔

وہ اس کی طرف غور سے دیکھ کر بولیں۔

"دوپٹہ کہاں ہے تمھارا ——— ؟"

دوپٹہ کہاں ہے تمھارا ——— ؟

دوپٹہ کہاں ہے تمھارا ——— ؟

زمین و آسمان سے یہی آوازیں آنے لگیں۔ وہ دوڑ کر اپنے کمرے میں گھس گئی اور ایک دم بستر پر چت گر گئی۔

ہر عضو سلگ رہا تھا جس جس جگہ اس بدبخت کے ہاتھ اور بازو لگے تھے۔ اس اس جگہ سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں ایسے لگتا تھا رگوں میں زہر پھیل گیا ہے۔ اپنے وجود سے اسے گھن آرہی تھی ———

اپنے آپ کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کو دل چاہ رہا تھا ———

اور ابھی کچھ نہیں ہوا تھا ———

کچھ بھی نہیں بگڑا تھا ———

مصیبت کی گھڑی پر شاید والدین کی دعائیں سایا بنکر کھڑی ہو گئی تھیں . . . . . .

کسی بزرگ کی دعا نے اسے غلاظت میں گرنے سے بچا لیا تھا۔ ڈوبتے ڈوبتے وہ تر گئی تھی ——— مرتے مرتے بچ گئی تھی ———

لیکن اگر . . . . . اگر . . . .

پھر ایک تیز رفتار بوچھاڑ آنسوؤں کی آئی۔ جسے آنا ہی تھا ——— دونوں ہاتھوں سے اپنا کلیجہ پکڑ کے وہ الٹی ہو گئی ——— اور آنسوؤں کی طغیانی اس کو بھگوتے ہوئے گذرنے لگی ———

اس مرحلے سے بھی جلدی نکلنا تھا۔ اگر امی اندر آجاتیں۔ اگر پوچھ لیتیں کیا ہوا ہے تو ——— ؟

اف ———

اک ذرا سی لغزش کی اتنی بڑی سزا۔ کہ اپنی ندامتوں پر رونے کو بھی وقت نہیں تھا۔ اپنے آپ کو ذرا سا ہلکا کر کے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ غسل خانے میں گئی۔ منہ پر خوب ٹھنڈے

پانی کے چھینٹے لگائے —— جتنا ٹھنڈا پانی ڈالتی۔اندر سے اتنا گرم پانی نکلتا آتا۔۔۔۔

دنیا میں کوئی ایسی دوا نہیں جو آنسوؤں کو پھوٹنے سے روک سکے ——

وہ اسی طرح باہر نکل آئی۔ تولیے سے چہرہ اور آنکھیں صاف کرکے آئینہ دیکھا صاف لگ رہا تھا کہ روئی ہے اور خوب روئی ہے —— مگر اب گھر بھی جانا تھا۔ اس لیے کمرے کی الماریاں کھول کے کھڑی ہوگئی۔ کبھی کبھی وہ اپنے کپڑے یہاں چھوڑ جایا کرتی تھی تاکہ اگلی مرتبہ ساتھ لانے پڑیں ان کپڑوں میں سے کھڑی کوئی دوپٹہ تلاش کر رہی تھی کہ امی جان اندر آگئیں۔

"رمو! کیا کر رہی ہے اندر —— انہوں نے اتنے پیار سے کہا کہ رملیٰ کا دل چاہا ان سے صاف کہہ دے کہ اپنا کالا منہ چھپا رہی ہوں۔ مگر اس نے الماری میں سے چہرہ باہر نہیں نکالا۔اندر ہی سے جواب دیا۔

"امی میں پچھلی بار اپنے کپڑے چھوڑ گئی تھی۔ وہ لے رہی ہوں۔"

"دوپٹہ کہاں ہے تمھارا —— ؟"

امی نے پھر پوچھا ——

"امی۔۔۔"۔ رملیٰ نے ذرا کی ذرا ان کو مڑ کر دیکھا اور بولی۔"وہ جیدہ نے نمونے کے لیے رکھ لیا ہے۔ ویسا بنوانا چاہتی ہے۔"

"تو تم اس کا دوپٹہ اوڑھ کے آجاتیں ——"

"وہ تو دے رہی تھی۔میں نے کہا یہاں کپڑے پڑے تو ہیں۔یہیں سے کوئی نکال لوں گی۔"

"کیا تمھیں زکام ہو رہا ہے رملیٰ —— ؟"

امی نے اس کی آواز سے اندازہ لگا کر کہا۔

"جی امی ——" رملیٰ نے منہ اندر ہی رکھا۔

"میں ڈاکٹر امجد کو دکھانے جا رہی ہوں۔تم بھی چلو میرے ساتھ ——"

"نہیں امی ——" رملیٰ نے جان بوجھ کر اپنے پرانے کپڑے سمیٹ لیے تھے جیسے ان کو آج لے جانا بہت ضروری ہو۔ انہیں پلنگ پر رکھ کر اس نے ایک کالا دوپٹہ نکالا اور اوڑھ لیا بولی

"امی اب گھر چلوں گی۔معوذ کو سلا کر آئی تھی۔بے جی انتظار کر رہی ہوں گی۔"

اپنی صحت کا خیال رکھا کرو بیٹا"۔امی نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

تب رملیٰ نے نظریں اٹھا کر امی جان کیطرف دیکھا اور اس کا دل ہل گیا۔

امی جان کا چہرہ اترا ہوا تھا۔اور وہ صدیوں کی مریض لگ رہی تھیں۔

"امی: اب آپ کا کیا حال ہے ــــــ"؟

"ٹھیک ہوں بیٹا" انھوں نے بیدلی سے کہا۔

"دوائی تو باقاعدہ کھا رہی ہیں نا؟ ــــــ"

"ہاں . . . ." ان کی آواز میں بڑی مایوسی تھی۔ "دوائی بھی کھا رہی ہوں۔ ڈاکٹر کو بھی دکھا رہی ہوں۔ مگر یہ سب باتیں صرف تم لوگوں کی تسلی کے لیے ہیں۔ اصل میں . . . . ."

پھر وہ چپ ہو گئیں۔

رملیٰ نے باہر قدم بڑھائے۔ وہ بولیں۔

"رملیٰ میں تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ بیٹی . . . . . اگر تمھارے پاس وقت ہو تو رک جاؤ ــــــ"

"اس وقت نہیں امی جان ــــــ رملیٰ نے فوراً کہا۔ پھر کسی وقت آجاؤں گی۔"

"پھر کسی وقت ــــــ"؟

امی جان چپ کر کے کرسی پر بیٹھ گئیں۔

"امی میں پھر آجاؤں گی۔ اسوقت میرا جانا بہت ضروری ہے۔"

وہ امی سے یہ نہ کہہ سکتی تھی کہ بھیڑیے کی اس نگری سے میں جلد از جلد دور ہو جانا چاہتی ہوں ــــــ ابھی مجھے بہت سارونا ہے۔ بہت سا پچھتانا ہے ــــــ

اپنا ماتم آپ کرنا ہے . . . . . .

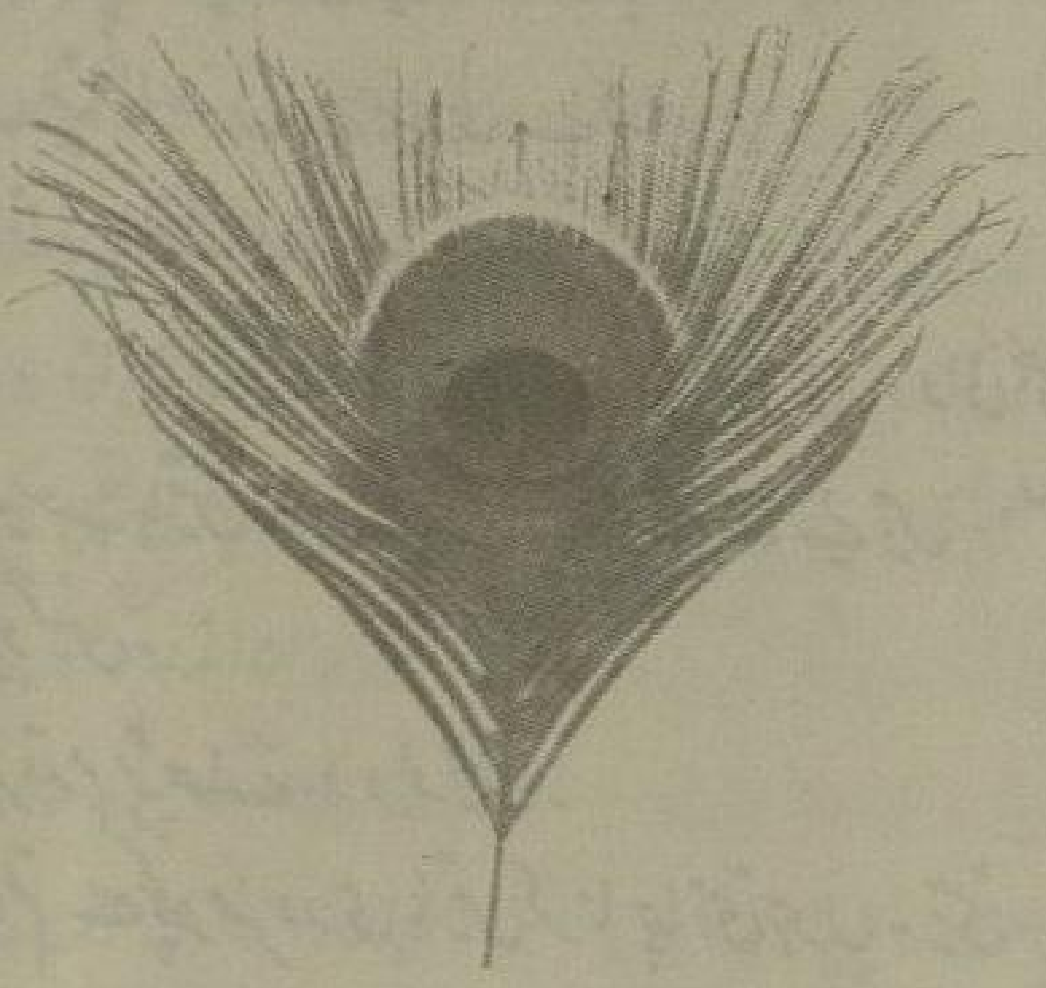
اچھا . . . . . پتہ نہیں امی نے اتنی مایوسی سے کیوں کہا۔

"امی: میں جان محمد کو ساتھ لے جاؤں ــــــ"؟

رملیٰ نے پوچھا۔

"کیوں ــــــ؟" امی جان پھر حیران ہوئیں۔

"بس ٹیکسی میں اکیلے جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔" واقعی آج تو رملیٰ کو ہواؤں سے بھی ڈر لگ رہا تھا۔ ایسے لگ رہا تھا۔ ہر چوراہے پر ہر موڑ پر ایک یادر اسکا دوپٹہ لیے کھڑا ہے اور اسے دھمکا کے واپس بلا رہا ہے۔



رملی نے گھر کے باہر ٹیکسی رکوائی اور جان محمد کو واپسی کے پیسے دیکر جلدی جلدی اپنے گھر کے اندر داخل ہوئی۔ آج اسے اپنے گھر کے اندر داخل ہونے کی بہت جلدی تھی۔ اور جلدی میں وہ بھول گئی کہ جاتے وقت اس نے سرخ دوپٹہ اوڑھا ہوا تھا۔ اور اب بے خیالی میں سیاہ دوپٹہ اوڑھ کے آگئی ہے ـــــ بے جی برآمدے میں بیٹھی اپنی چادر کو لیس لگا رہی تھیں اور محلے کی ایک عورت ان کے پاس بیٹھی تھی۔ اس وقت اس عورت کی موجودگی کو رملی نے غنیمت جانا۔ ورنہ اسے بہت غصہ آیا کرتا تھا کہ ہر وقت بے جی کے پاس کوئی نہ کوئی عورت آئی رہتی ہے۔

سلام کر کے جلدی سے گذرنے لگی۔

تو بے جی نے سر اٹھایا۔ پھر عینک اتار کر حیرت سے بولیں۔

"اے وو ہٹی ـــــ دوپٹہ کس کے ساتھ بدل کے آئی ہو ـــــ"؟

"جی ـــــ"؟ زمین نے رملی کے پاؤں پکڑ لیے اور احساس جرم نے اس کی زبان جکڑ لی۔ فوری طور پر جواب نہ دے سکی۔

جی وہ ۔۔۔۔۔ میری ـــــ اور پھر اسے یاد آیا کہ وہ بے جی کو بتا کر ہی نہیں گئی۔ تھی کہ وہ حمیدہ کے ہاں جا رہی ہے ـــــ

"جی وہ ـــــ اس نے کچھ کہنے کے لیے زور لگایا۔ اور کچی کچی آواز میں بولی۔

"جی وہ باجی خضری آئی ہوئی تھیں۔ وہ نمونے کے لیے لے گئی ہیں۔"

"اچھا ۔۔۔۔۔ اچھا ـــ یہ کالا دوپٹہ اتار دے جا کر ـــــ" بے جی نے پھر عینک لگالی۔ "میں نے تمھیں پہلے بھی منع کیا تھا کہ یہ کالا منحوس رنگ نہ پہنا کرو۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ صبح جب

گئی تھی چاند کیطرح تیرا چہرہ چمک رہا تھا۔ اب دیکھ کیسی زرد اور سنولائی سی لگ رہی ہے۔ دفع کر اس دوپٹے کو ——"

رملی اپنے بیڈ روم میں چلی گئی معوذ ابھی تک سو رہا تھا۔ اس نے گلے میں سے سیاہ دوپٹہ اتار کریوں پرے پھینکا جیسے سیاہ ناگ کو اپنے سے جدا کیا ہو —— اپنے پرانے کپڑوں کی گٹھڑی صوفے پر دے ماری اور جھپاک سے غسل خانے میں گھس گئی۔

ٹونٹی کھولی اور نل کے نیچے بیٹھ گئی۔

اسی رفتار سے اس کے آنسو رواں ہو گئے۔

روتے روتے اسے خیال آیا۔ نہ اس نے کپڑے اتارے ہیں۔ نہ بال کھولے ہیں۔

—— ہائے ——

کتنا عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ جیسے وہ لمحہ بھر کو گٹر میں گر گئی تھی۔

غلیظ کیچڑ کا لباس پہن لیا تھا اس نے ——

اس کے جسم پر کوڑھ ہو گیا تھا —— یا —— یا اس کے ایک ایک عضو پر لعنتوں کا مینہ برستا رہا ہے۔

اف وہ کمینہ آدمی —— اف اسکا وہ شیطانی چہرہ —— اس کے وہ جارحانہ انداز اور بے ہودہ کلمات ——

کیا لوگ اپنے اوپر اسطرح ماسک چڑھا لیتے ہیں —— کیا خوبصورت چہروں کے اندر اتنے گھناؤنے دل ہوتے ہیں —— کیا متعفن لوگ خوشبوئیں اوڑھ کر رہتے ہیں۔

پتہ نہیں اسے رونا کس بات پر آ رہا تھا۔

اس کے خوابوں کا شیش محل چکنا چور ہو گیا تھا —— اس کا البیلا شہزادہ بھیانک دیو میں تبدیل ہو گیا تھا۔ یا —— ذرا سی دیر کو اس کے خیالات بھٹک گئے تھے۔ اور راسے انجانی راہوں پر لے گئے تھے۔

پانی چلتا رہا ..... اور وہ بھی دھواں دھار روتی رہی۔ کبھی کبھی اس کا دل چاہتا اپنے وجود کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔ اس نے کتنے غلط لوگوں پر بھروسہ کیا۔ جیدہ صورت سے کتنی معصوم اور مسکین نظر آتی تھی۔ اس پر جان چھڑکتی تھی۔ کیسی لچھے دار باتیں کرتی تھی کیا وہ بھی اتنی بے غیرت ہے۔ کیسی چالاکی سے اس نے رملی کو پھنسانے کی چال چلی تھی۔

شاید بے جی کی دعاؤں سے وہ بچ گئی۔

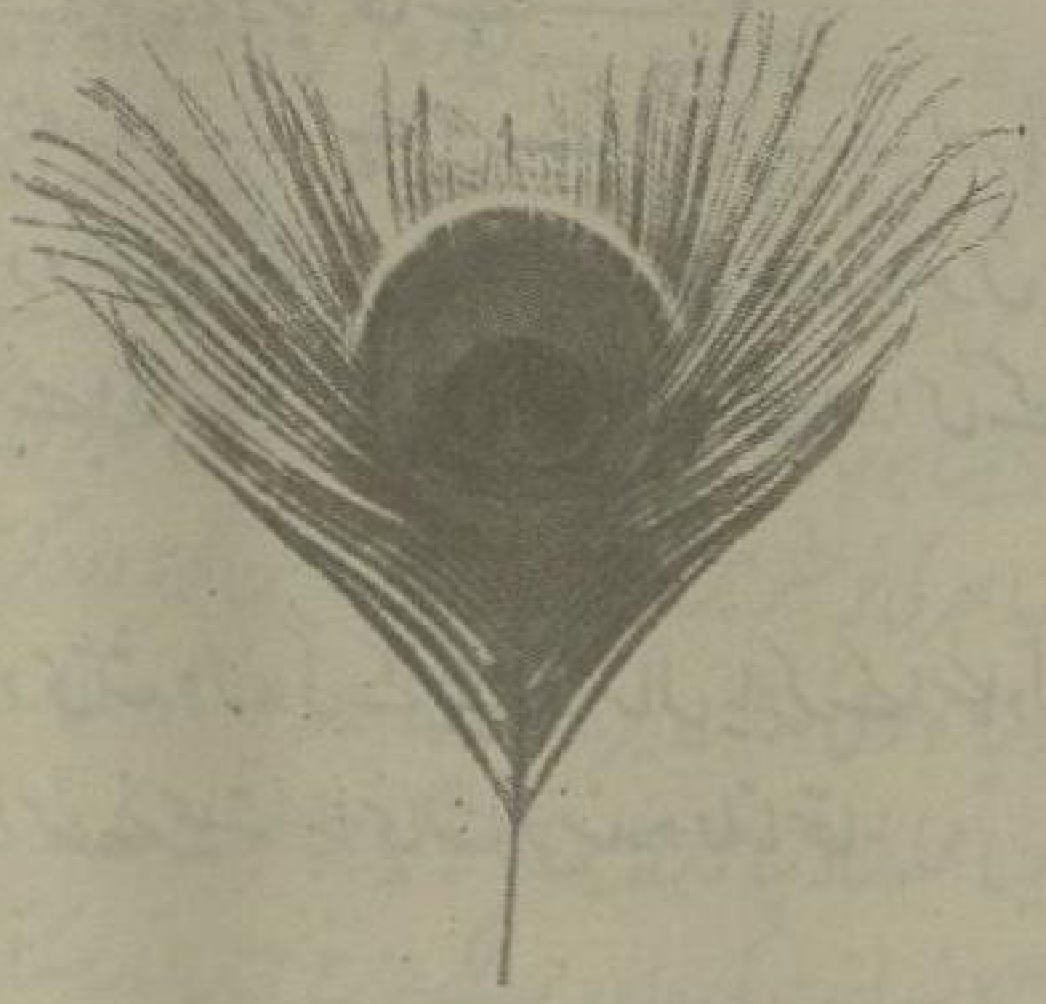
ورنہ اس وقت اسکا کیا حال ہوتا ——؟

کیا حال ہوتا اس کا ـــــــ کیا وہ اس واقعے کے بعد جینے کے قابل رہ جاتی ؟
کیا وہ معاذ سے نظر ملا سکتی ـــــــ ؟ اس کی پرورش کیسے نیک والدین کی گود میں ہوئی ہے ـــــــ ! کس طرح اس کے قدم ایک غلط ڈگر پر جا پڑے۔
رملی! اگر ایسا ہو جاتا تو دنیا کے سارے دریا مل کر تیری گندگی کو نہ دھو سکتے۔
رملی! دنیا بھر کی خوشبوئیں تیرے وجود کے تعفن کو نہ دور کر سکتیں۔
رملی! دنیا کا کوئی صابن تیرے تن کا میل نہ اتار سکتا ـــــــ
رملی! ایسا محلول دنیا میں نہیں تیار کیا گیا جو عصمت کے ٹوٹے ہوئے شیشے کو جوڑ سکے۔
کوئی ٹوٹکا نسوانیت کی چادر پر لگے داغ نہیں اتار سکتا۔
اک ذرا سی ٹھیس لگتی ہے تو ثابت شیشہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ ٹوٹے ہوئے شیشے میں تو اپنا چہرہ بھی پورا نظر نہیں آتا ـــــــ
ٹوٹے ہوئے چہرے کے ساتھ تو بھلا کب تک جی سکتی ؟
اک ذرا سی ٹھیس سے اس شیشے کو بچانے کے لیے عورت پر روایات کی چادریں ڈالی جاتی ہیں۔
اور عورت کی عصمت تو اس کے ساتھ قبر میں جاتی ہے ـــــــ سنا تو نے !
یہ مرد بہت بہت بڑا ہے رملی ـــــــ
اس کی بہت سی طاقتیں ہیں رملی ـــــــ
عورت کی بس ایک ہی طاقت ہے !
عورت کی بس ایک ہی پونجی ہے۔
وہ لٹ جائے تو عورت کنگال ہو جاتی ہے۔ مفلس ہو جاتی ہے۔ قلاش ہو جاتی ہے
شکر کر تو کنگال ہونے سے بچ گئی۔ تو نے اپنے خزانے کی حفاظت نہیں کی تھی ـــــــ
مگر قدرت کو تجھ پر ترس آ گیا تھا۔
کردار کی ناداری سب سے بڑی بد نصیبی ہے۔
اور تیرا وجود برف کی ڈلی نہیں کہ پانی تلے رکھنے سے گھل جائے۔ آنکھیں کھول کے چل. . . . . اس ٹھوکر سے سنبھل ـــــــ
اور پھر اچانک اسے شان بھائی یاد آ گئے۔ اور وہ رات بھی ـــــــ
وہ اور بھی شدت سے رونے لگی۔ اسے اپنی حماقتوں پر رونا آنے لگا۔ سمجھنے کے لیے تو وہ ایک رات بھی کافی تھی۔ آخر اس کی آنکھیں کیوں نہ کھلیں۔

رملی تیرے چہرے پر کیا لکھا ہے ——؟

اس نے زور زور سے اپنے چہرے کو رگڑا —— اور پانی کی تیز و تند دھار کے نیچے رکھ دیا۔ جیسے آج وہ اس پانی میں اپنے چہرے کے سارے نقوش بہا دینا چاہتی ہو —— اور پھر اسے اپنی شادی کی پہلی رات بھی یاد آئی اور اس کے ساتھ وابستہ ہر بات بھی یاد آئی۔

اپنی شادی شدہ زندگی کے پچھلے دو سال یاد کر کے اسکا دل چاہا۔ اسی پانی میں ڈوب کر مر جائے۔ جس پانی کو اس نے ہمیشہ اپنا نجات دہندہ جانا تھا۔



اسے معلوم تھا جو کچھ ہو چکا ہے۔ اسے بھول جانا ہے۔ وہ بھول بھلیوں سے باہر نکل آئی۔ اب توبہ کر کے سیدھی ڈگر پر چلنا ہے۔ اس لیے سارا دن وہ اپنے آپ کو نارمل رکھنے کی کوشش کرتی رہی۔ آج پہلی بار اس نے معوذ کو بہت پیار سے نہلایا۔ اس کے ساتھ کھیلتی رہی۔ باتیں کرتی رہی۔ بار بار بے جی کے پاس جا کر بیٹھی۔ ہمسایوں کے بارے میں ڈھیر سارے سوالات کرتی رہی اپنے آپ کو مصروف رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اس حادثے سے گذر کر سنبھلنے کا ہر داؤ استعمال کیا۔

شام کو جب معاذ آیا۔ تو وہ بہت اچھی طرح سے تیار تھی۔ مگر نظر اٹھا کے معاذ کی طرف دیکھنے کا اسے حوصلہ نہیں ہوا۔ معاذ نے پہلی نظر اس پر ڈال کر پوچھا۔

"کیا کہیں جا رہی ہو——؟"

"نہیں تو——" اس نے نظریں جھکا لیں۔ معاذ نے اسے شرم سے تعبیر کیا۔

معاذ اسے تھوڑی دیر بڑی گرم نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔

"اسی طرح بن ٹھن کے رہا کرو۔ مجھے اچھی لگتی ہو——"

"رہوں گی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آج کے بعد رہوں گی۔ ۔ ۔ ۔ ۔" رملی کے دل سے آواز نکلی مگر اس کے ہونٹ لرز کر رہ گئے۔ صبح والا واقعہ نظروں میں گھوم گیا۔ وہ دانتوں سے اپنا نچلا ہونٹ کاٹنے لگی۔ جیسے اس واقعے کو کھرچ کر پھینک دینا چاہتی ہو۔

"اسطرح ہونٹ نہ کاٹو"۔ معاذ نے شرارت سے کہا۔ "رات ابھی بہت دور ہے——"

تب بے اختیار رملی کا دل چاہا معاذ کے کندھے پر سر رکھ کر رونا شروع کر دے۔

ادراک کے دریچے ٹھوکر لگنے پر ہی کیوں کھلتے ہیں؟ باتیں تو معاذ ہمیشہ سے ایسی

ہی کرتا تھا۔ آج اس کی باتیں سمجھ میں کیوں آ رہی تھیں۔ وہ اس کی صورت دیکھنا چاہتی تھی۔ مگر آنکھوں میں دو آنسو مجرم بنے کھڑے تھے۔ اس لیے ذرا سی پلک اٹھا کے گرا لی اور بولی۔

"میں آپ کے لیے چائے لاؤں ــــــ؟"

"لاؤ بھئی.... چائے لاؤ.... چاہت لاؤ.... کچھ بھی لاؤ ــــــ"

معاذ ہنسا ــــــ رملیٰ نے مڑتے مڑتے دیکھا۔ اس کے سفید دانت نمایاں ہوئے تھے۔ اسی انداز میں جب کبھی وہ پہلے ہنستا تھا تو اسے کتنی کراہت آتی تھی۔ جیسے کالے دیو کے سفید دانت نظر آ رہے ہوں۔ مگر آج اسے ایسا محسوس نہیں ہوا۔ بلکہ معاذ کے چہرے پر جو ایک خوشی کا رنگ بکھر گیا تھا۔ وہ رملیٰ کو بہت اچھا لگا۔

دوڑ کر چائے لے آئی۔

"ویسے ہو تم بڑی خدمت گذار بیوی ــــــ" معاذ نے پیالی اس کے ہاتھ سے پکڑ لی۔

"اچھی ہو یار تم بھی ــــــ بس ذرا لیے دیئے میں رہتی ہو۔ اصل میں مجھے شوخ و شنگ اور بالتونی عورتیں پسند ہیں۔ میں دفتر سے آؤں تو سارا وقت میرے کان کھاتی رہے۔ اپنے بیڈ روم میں جب تک بیوی بے شمار لایعنی باتیں نہ کرے تو بیڈ روم میں سناٹے کا گمان ہوتا ہے۔ مرد ایک تھکے ہوئے بیل کیطرح گھر آتا ہے ــــــ یہ ملازمت سارا لہو نچوڑ لیتی ہے۔ پھر دل صرف سننے کو چاہتا ہے۔ جب تم نہیں بولتی ہو تو پھر میں موسیقی سننے لگتا ہوں۔"

رملیٰ چپ کھڑی رہی۔

اس کا دل چاہا ــــــ کہہ دے معاذ میں اب بولنے کی کوشش کروں گی۔ اب چپ نہیں رہوں گی۔ چپ کا سناٹا اندھیری راہوں پر لے جاتا ہے۔ مگر اس سے تو کچھ بھی نہیں کہا گیا۔ اس نے سوچا کاش کوئی ایسا آلہ ایجاد ہوتا جو دل میں اٹھنے والے تمام جذبات کو ادا کر سکتا یا اسے تھوڑی بہت گفتگو کی عادت ہوتی۔ اس وقت کچھ تو کہہ سکتی۔

اتنے میں معوذ پاؤں پاؤں چلتا ہوا کمرے میں آ گیا اور معاذ پیالی چھوڑ کے اس کی طرف لپکا ــــــ معاذ کی جان اپنے بیٹے میں پھنسی رہتی تھی۔ اس کو دیکھتے ہی بے تاب ہو اٹھتا۔ گو معوذ ابھی باتیں نہیں کر سکتا تھا۔ مگر بے جی کی کوششوں سے وہ ابو ابو کہنے لگا تھا۔ وہ بھی معاذ کو دیکھتے ہی اس کی طرف لپک کر آتا۔ تب رملیٰ سوچا کرتی۔ یہ ماں باپ کی محبت بھی کیسی شے ہے ــــــ؟ نہ تو بچے کو والدین کی بدصورتی کا احساس ہوتا ہے اور نہ والدین کو بچہ بدصورت لگتا ہے۔ ایک ہی رشتہ ہے جس میں پیار اندھا ہوتا ہے۔ مگر آج وہ ان دونوں کو اور ہی زاویئے سے دیکھ رہی تھی۔ تب اس کی سمجھ میں آیا کہ محبت کی نگاہ دنیا میں سب سے وسیع نگاہ ہے۔ اگر محبت کی نظر گہری نہ ہوتی تو بس دنیا

میں صرف حسین لوگ ہی چاہے جاتے اور پھر اسے تعجب بھی ہو رہا تھا کہ ایک دن میں ہی اسکا نقطۂ نظر بدل گیا تھا۔

شام حسب معمول لوگوں کے آنے جانے میں گذر گئی۔ وہ معمول کے مطابق ہر کام کرتی رہی۔

معوذ جب بے جی کے کمرے میں سو جاتا تھا تو وہ بلاناغہ اسے ایک نظر دیکھنے جاتی تھی۔ بے جی سے دو چار باتیں کر کے آجاتی تھی۔ آج بھی جب وہ اپنے کمرے میں آئی تو رات کے دس بج رہے تھے معاذ کپڑے بدل کر بستر میں لیٹ چکا تھا۔ مگر سائیڈ لیمپ جلا کے ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ پہلے رملی نے کمرے میں پھیلے ہوئے معوذ کے کھلونے اور کپڑے اٹھا کر سلیقے سے الماریوں میں رکھے۔

پھر سونے کے لیے آکر بستر پر بیٹھ گئی۔ معاذ نے نگاہ بھر کے اسے دیکھا تو وہ خود ہی مسکرا دی۔ معاذ کی نگاہ میں جو کچھ تھا۔ اس کا مفہوم اس نے پالیا تھا اور سوچ رہی تھی۔ آج پہلی بار وہ پیش قدمی کرے گی۔ آج کے بعد معاذ کو گلہ نہیں رہے گا اس کی بے حسی کا۔ گو اس مقام سے گذرنا اس کے لیے بہت مشکل تھا مگر ہر مشکل کو پہلی بار دل کڑا کر کے عبور کیا جاتا ہے۔ ——

آج تو کتنی ہی باتوں نے اس کے دل میں ہلّہ بول دیا تھا۔

آج اس کے اندر طوفان اٹھ رہے تھے آج وہ بہت سی باتیں کرنا چاہتی تھی۔ اس پل صراط سے جلدی گذر جانا چاہتی تھی۔۔

معاذ نے کتاب ہاتھ سے رکھدی اور اس کی طرف رخ پھیر لیا۔ اور پھر اس کے ساتھ باتیں کرنے لگا۔ بڑے دھیمے لہجے میں —— اس کے لہجے کا سوز رملی پہلی بار محسوس کر رہی تھی۔ اور ٹکٹکی اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی اس نے ایک پل کے لیے بھی معاذ کے چہرے سے نگاہیں نہیں ہٹائیں۔ یہی وہ چہرہ ہے۔ جسکی جانب دیکھنے سے وہ کتراتی تھی۔ خوف کھاتی تھی۔ اسے ابکائی آجاتی تھی مگر آج اس نے اپنی پلک نہیں جھپکی اور بڑی توجہ سے اس کی باتیں سننے لگی۔

اسی وقت فون کی گھنٹی بجی ——

تو معاذ نے کہا۔ "جاؤ رملی تم سن کے آؤ۔" اگر میرا فون ہوا تو کہہ دینا میں سو چکا ہوں۔"

رملی جانتی تھی معاذ نے ایسا کیوں کہا ہے۔ اس لیے ننگے پاؤں دوڑتی ہوئی گئی اور ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا۔ بھاگ کر آئی تھی۔ اس لیے اپنی سانسوں پر قابو پا کر بولی —— "ہیلو۔۔۔ ہیلو۔۔۔۔۔"

اس کے دو دفعہ ہیلو کہنے کے بعد ادھر سے ایک بڑی گمبھیر اور پر اسرار آواز آئی۔

رملی۔۔۔۔۔

رملی سن ہو گئی۔

اس آواز کو وہ پہچانتی تھی۔ ایک بار اس آواز نے اسکا سکونِ دل لوٹا تھا۔ اب یہ آواز اس کا گھر اجاڑنا چاہتی تھی۔

"رملی..... !" وہ عجیب انداز میں بولا۔

"تم سمجھتی ہو گی۔ تم میرے چنگل سے بچ کر نکل گئی ہو۔ مگر یہ صرف تمھارا خیال ہے۔ اگر اپنا دوپٹہ لینا چاہتی ہو تو ایک بار آؤ۔ دوپٹے کی قیمت ادا کرو۔ ورنہ یہ دوپٹہ اپنی قیمت آپ چکالے گا اور تم پسند نہیں کروگی کہ یہ دوپٹہ اپنی داستان تمھارے شوہر کو سنائے ـــ..."

رملی کو ایسا محسوس ہوا۔ اچانک اس کے چاروں طرف شعلے نکل آئے ہیں اور وہ بچاؤ کے لیے کسی کو پکار بھی نہیں سکتی۔

اس کو چپ دیکھکر وہ پھر بولا۔

"میں اپنا قرض معاف نہیں کیا کرتا ـــــ سیدھے سیدھے سمجھوتہ کرلو۔ ورنہ تمھاری زندگی جہنم بنادوں گا ـــــ"

رملی کا سارا جسم لرزنے لگا۔ جیسے کھڑے کھڑے کسی نے اس کا لہو نچوڑ لیا ہو۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ بس اس نے آہستہ سے ریسیور رکھدیا۔ اسے کافی دیر ہوگئی تھی۔ اور جاکر معاذ کو جواب دینا تھا۔ معاذ جوشوق کی شمع جلائے اس کا منتظر تھا۔

وہ اپنے آپ کو گھسیٹتے ہوئے کمرے میں آئی۔

معاذ نے پوچھا۔

کس کا فون تھا ـــــ؟

بولی ـــــ "رانگ نمبر تھا۔"

یہ کہتے وقت اس نے آواز اسطرح نکالی جیسے ذبح ہوتی ہوئی مرغی آخری بار حلق سے آواز نکالتی ہے۔

معاذ نے نظر اٹھاکر دیکھا۔ رملی کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا اور اس سے ٹھیک طرح سے چلا بھی نہیں جارہا تھا۔

وہ اسے حیران ہوکر دیکھتا رہا۔ اور رملی گھسٹتی ہوئی غسل خانے میں گھس گئی۔ اندر سے چٹخنی چڑھالی اور اپنا پیٹ پکڑ کے بیٹھ گئی۔ پیٹ میں ایک دم مروڑ اٹھنے لگے تھے۔ دل ڈوبا جارہا تھا۔ اپنی بربادی کا نقشہ سامنے نظر آرہا تھا اور کوئی راہ نجات نہ تھی۔ ہاں ایک راستہ تھا۔ جو وہ کمینہ انسان خود دکھارہا تھا۔ کیا اس راستے پر چل کر وہ اپنی ازدواجی زندگی بچالے گی؟ اس خبیث کے ہاتھ میں آئے کاربن کے کیا وہ اپنے شوہر کو منہ دکھانے کے قابل رہے گی۔ ایک دوپٹے کی خاطر کیا وہ اپنی عزت

کا سودا کر لے ——؟

مگر یہ بھی تو دیکھ تیری بات کا کون اعتبار کرے گا۔ اگر وہ ذلیل انسان یہ دوپٹہ ثبوت کے طور پر پیش کر دے تو کون اس کی بات کا یقین نہیں کرے گا۔ جبکہ دوپٹے کے بارے میں امی جان نے بھی پوچھا اور بے جی نے بھی استفسار کیا تھا —— اور معاذ اچھی طرح سے پہچانتا ہے کہ یہ دوپٹہ تیرا ہی ہے۔ اور اسی نے تجھے لا کر دیا تھا۔

کون تیری بے گناہی کا یقین کرے گا؟

کس کس کے آگے قسمیں کھائے گی ——؟

اور پھر شوہر ——

جو ہمہ وقت بدگمان ہونے کے بہانے ڈھونڈتا ہے

معاذ کو تو اس نے کبھی اپنی محبت کا ثبوت ہی نہیں دیا تھا۔ معاذ نے تو ہمیشہ اس کی گم صم کیفیت پر اعتراض کیا تھا۔ معاذ تو اس کی بے حسی کا شاکی رہا تھا ——؟

اپنی پاک دامانی ثابت کرنے کا اس کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا ——؟

ایک طرف کھائی تھی اور دوسری طرف اندھا کنواں ——

موت دونوں طرف یقینی تھی۔

اس نے بڑی مشکل سے اپنی آنکھوں میں آئے آنسو سنبھالے۔ اس وقت رو کر جاتی تو معاذ پوچھ لیتا کہ کیا ہوا ہے ——؟

معاذ باہر اس کا انتظار کر رہا تھا۔

معاذ کے دل میں آج اس نے آگ لگائی تھی۔

محبت کو پہلی آنچ دکھائی تھی ——

زیادہ دیر اندر بھی نہیں رہ سکتی تھی۔

اپنے آپ کو آمادہ بھی کرنا تھا۔ باہر بھی نکلنا تھا۔ پھولوں کی سیج بھی سجانا تھی مگر دل میں الاؤ سلگ رہے تھے۔

لمحے بھر کو اس کے دل میں خیال آیا کہ ساری بات معاذ کو بتا دے۔ شوہر سے بڑھ کر کوئی نہیں ہوتا۔ اس وقت معاذ ہی اسے اس مصیبت سے بچا سکتا ہے۔

لیکن پھر —— اسے شروع سے لے کر آخر تک سارے واقعات بتانے پڑیں گے۔

کتنی شرم آئے گی سب بتاتے ہوئے ——

پھر اس نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ شوہر اس معاملے میں بڑے متعصب ہوتے ہیں۔ خود

تو بڑے سے بڑا گناہ کر کے معافی کے طلبگار ہوتے ہیں۔ مگر بیوی کی ذرا سی خطا بھی معاف نہیں کر سکتے

میں کیا کروں ——؟

میں کیا کروں ——؟

کشمکش نے رملی کو ادھ مُوا کر دیا۔ اس نے کلائی پر بندھی گھڑی میں دیکھا۔ اسے غسل خانے میں بیٹھے آدھ گھنٹہ ہو گیا تھا۔

اف ——

وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

جلدی سے پورا نل کھول دیا اور منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارنے لگی۔ منہ دھو کر تولیے سے صاف کرتی ہوئی باہر نکل آئی۔

معاذ نے بتی بجھا دی تھی۔ اور تکیے پر چہرہ رکھ کر اوندھا لیٹا ہوا تھا۔ ڈرتی ڈرتی رملی آئی اور بالکل سیدھی لیٹ گئی۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ پیٹ پر رکھا ہوا تھا ——

معاذ آنکھیں کھول کر تھوڑی دیر اسے دیکھتا رہا۔ پھر آہستہ سے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا تو رملی ڈر کر پرے سمٹ گئی۔ اس کے منہ سے ہلکی سی سسکی بھی نکلی۔

"کیا ہوا ہے رمو ——"؟

معاذ نے سر اٹھایا اور ہلکی روشنی میں اسکا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی۔

"کچھ نہیں —— رملی نے لرز کر کہا۔ بس . . . . میرے پیٹ میں شدید درد ہو رہا ہے ——"

معاذ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"کیوں ہو رہا ہے ——؟ میں کوئی دوا لا دوں تمہیں ——؟" اتنا شدید درد تو نہیں کہ ڈاکٹر کو دکھانا پڑے۔"

نہیں نہیں . . . . . . رملی اور بھی خوف زدہ ہو گئی۔

"پلیز آپ سو جائیں۔ میں خود ہی ابھی ٹھیک ہو جاؤں گی۔ پلیز آپ سو جائیں ——

رملی نے اسطرح چیخ کر کہا کہ معاذ لیٹ گیا۔

رملی کراہتی رہی۔

وہ اسے دیکھتا رہا۔ اور پھر شاید سو گیا ——

لیکن رملی کو نیند نہیں آئی۔ وہ تڑپتی رہی اور کروٹیں بدلتی رہی۔

لیٹے لیٹے اس کے کانوں میں ٹیلی فون کی گھنٹی کی دلخراش آوازیں آنے لگیں۔

آہ ـــ آج سے پہلے اسے فون کی گھنٹی اتنی بھیانک نہ لگی تھی۔ اسے یوں لگتا۔ فون ساری رات بجتا رہے گا۔ اور اس کے کرتوت کی کہانی ساری دنیا کو سناکر رہے گا۔ جب اس کی طبیعت بہت بے چین ہوئی تو وہ بستر سے اٹھ گئی۔ مبادا بار بار کروٹیں بدلنے سے معاذ ڈسٹرب ہو یا اس کے اضطراب کو پڑھ لے۔ اس لیے اٹھ کر قالین کے اوپر لیٹ گئی۔

اور جب قالین پر لیٹی تو اسے یوں محسوس ہوا کہ وہ آسمان سے زمین پر آرہی ہے اس خیال سے اس کے آنسو بہتے رہے اور وہ بے تحاشا روتی رہی۔ اسے اپنے بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔ یہ بات تو طے ہو گئی تھی کہ وہ یاور کی ہوس کا نشانہ نہیں بنے گی۔ نہ کٹھ پتلی بن کے اس کے اشاروں پر ناچے گی۔ کیونکہ اس نے اس قسم کی بلیک میلنگ کے کئی قصے پڑھ رکھے تھے۔ یہ ایک مرتبہ والی بات نہیں تھی۔ بلکہ ایک مرتبہ جانے کا مطلب تھا۔ وہ ہمیشہ کے لیے اپنے آپ کو اس کے جال میں پھنسا لے ـــــ

یہ تو ٹھیک ہے۔ اس نے فیصلہ کر لیا۔ کہ وہ یاور کی دھمکیوں سے ڈر کر دوبارہ اسے ہرگز نہیں ملے گی۔

لیکن یاور اس سے کس قسم کا انتقام لے گا؟ یہ سوچ کر وہ لرز جاتی اب اس کا پورا کردار کھل کر رملیٰ کے سامنے آرہا تھا۔ اسی لیے وہ اکثر رملیٰ کو مجبور کرتا رہا کہ رملیٰ اس کو خط لکھے تاکہ اس کے خطوط کے ذریعے وہ رملیٰ کو بلیک میل کر سکے۔

خط تو رملیٰ نے نہ لکھے مگر اس کی چال میں پھنس گئی۔

کبھی اسے امی ابا کا خیال آتا۔ ان کو کتنی اذیت پہنچے گی۔ کبھی بے جی کی طرف دھیان آتا۔ انہوں نے تو بارہا اس کو کہا تھا۔ تو نیکوں کی اولاد ہے۔ کیا نیکوں کی اولاد ایسی ہوتی ہے۔ ممکن ہے اس کی وجہ سے اس کی ہنستی بستی بہنوں کی زندگی اجیرن ہو جائے۔ کچھو باجی کو تو شان بھائی طعنے دے دے کر مار ڈالیں گے۔ اف وہ کیسے ننگِ خاندان بن گئی۔

آج کی رات اسے بہت بھاری نظر آرہی تھی۔

آج کی رات ہی فیصلہ کرنا تھا۔

کیونکہ آج تو اتفاق سے رملیٰ نے فون سن لیا تھا۔ کل کوئی اور بھی یہ فون سن سکتا ہے۔

آج تو اس نے رانگ نمبر کہہ کر بات بنالی تھی۔ کل کیا بات بتائے گی ـــــ

ندامت نے اسکا برا حال کر دیا ـــــ

اس نے سوچا صبح اٹھ کر وہ اپنا مکروہ چہرہ کسی کو نہ دکھا سکے گی۔ اور ذلت کی زندگی سے تو موت ہی بہتر ہے ـــــ

ایک جھٹکے کے ساتھ وہ اٹھی ـــــــ
معاذ کے سرہانے لگا ہوا ٹیبل لیمپ اٹھایا۔ اس کا سوئچ نکالا اور اسے سٹڈی میں لے گئی۔
ایک جنون سا اس پر سوار ہو گیا۔
اس نے لیمپ کا پلگ کھول کر بجلی کی تاریں ننگی کر دیں۔ اس کو کچھ علم نہیں تھا کہ ہذیانی انداز میں وہ کیا کر رہی ہے۔
بس اسے اس وقت ہوش آیا جب اسے ایک دھچکا لگا اور وہ دور جا گری۔ اس کے منہ سے ایک بے اختیار سی چیخ بھی نکلی تھی۔
سنبھلتے ہی اس نے دیکھا۔ معاذ اس کے سر پر کھڑا تھا۔ اور بہت غصے سے اسے گھور رہا تھا۔
اسی بات سے وہ ڈرتی تھی۔ اس کی نفرت کا سامنا کرنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔
وہی بات ہو کر رہی۔
معاذ نے اس کے ہاتھ سے تار کھینچ کر لیمپ کو سمیٹ کر ایک طرف رکھ دیا ـــــــ پھر اس کے دونوں بازو زور سے پکڑ لیے اور اسے اسطرح جھنجھوڑا جیسے وہ کوئی تناور درخت ہو جسے وہ جڑوں سمیت اکھیڑنا چاہتا ہو۔ اس ایک جھٹکے میں رملی کو معاذ کی فولادی قوت کا اندازہ ہو گیا۔ اس نے سہمے ہوئے انداز میں معاذ کے غصے سے تنے ہوئے چہرے اور پھنکارتی ہوئی آنکھوں کی طرف دیکھا۔ پتہ نہیں ان آنکھوں میں اس وقت کیا تھا۔ ایک بدصورت آدمی ستارے کی طرح ٹوٹا اور جا کے اس کے دل میں جاگزیں ہو گیا۔ چبھ گیا۔ بیٹھ گیا۔ . . . . . پھانس کی تازہ تازہ چبھن جان نکال لیتی ہے۔
"ہمیں بدنام کرتی ہو۔ ہمیں رسوا کرتی ہو۔ تاکہ تم تو قبر میں جا کے سو جاؤ۔ اور میں زندگی بھر بھگتتا رہوں۔"
معاذ نے غرا کر کہا۔
"بتاؤ کیا ہوا ہے ـــــــ؟"
"اور وہ رات کو کس کا فون آیا تھا۔ جس کے بعد تمھاری ایسی حالت ہو گئی ہے کہ ایک پل کو تمھیں قرار نہیں آیا ـــــــ"
وہ بدصورت آدمی جسے اس نے کبھی درخود اعتنا نہ جانا تھا۔ تمام تر بدگمانیوں کا اسیر ہو چکا تھا۔ بدگمان ہوا تو کتنا دور۔ کتنا اجنبی نظر آیا۔ اسی لمحے رملی کو خیال آیا کہ بس یہی ایک انسان تو دنیا بھر میں اس کا اپنا تھا۔ جسے اس نے کبھی اپنا نہ جانا تھا ـــــــ آج یہ ہمیشہ کے لیے کھو جائیگا۔ تو اس کے کھو جانے پر دل میں درد سے کیوں جاگ رہے ہیں۔ تم نے اسے کیا دیا ہے ـــــــ؟ جو وہ

آج کی رات لوٹائے گا ——————

رملی سسکیاں بھر بھر کے رونے لگی۔

ابھی تک معاذ نے اپنے مضبوط ہاتھوں سے اسے پکڑا ہوا تھا۔ پھر اسے پکڑ کے ایک صوفے پر بٹھا دیا۔ باہر گیا۔ ایک گلاس ٹھنڈے پانی کا بھر کر لایا۔ اسے پلایا۔

رملی نے اپنی آنکھیں صاف کیں۔ چہرہ صاف کیا۔ اور معاذ کی طرف نظر بھر کر دیکھا۔ پھر بولی۔

"بیٹھ جائیں میں آپ کو سب کچھ بتا دیتی ہوں۔"

معاذ اسی طرح تنا تنا سا سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

رملی اس طرح بولنے لگی۔ جسطرح پھانسی کے تختے پر جانے والا مجرم تھوڑی دیر پہلے اپنی آخری خواہش کا اظہار کرتا ہے۔

"میں جو کچھ آپ کو بتاؤں گی۔ اس میں میرا اپنا قصور ہے۔ آپ معاف کر سکیں تو کر دیں کیونکہ آپ عالی ظرف ہیں اور ایک عظیم ماں کے بیٹے ہیں۔ مجھے بچانا چاہیں تو اس مصیبت سے بچا لیں۔ لیکن میرے لیے طلاق کی سزا تجویز نہ کریں۔ اسی خوف سے میں اپنے آپ کو ختم کرنے لگی تھی کہ میرے ماں باپ میری طلاق کو برداشت نہ کر سکیں گے۔ خصوصاً جس دن میری ماں نے سنا مجھے طلاق ہو گئی ہے، وہ مر جائے گی۔ میں اپنی ماں کو اپنی وجہ سے مارنا نہیں چاہتی ...... اس کے علاوہ آپ جو بھی سزا تجویز کریں مجھے منظور ہو گی۔"

معاذ چپ بیٹھا رہا۔

رملی نے پھر اسے غور سے دیکھا ——————

ایک ٹھنڈی سانس چھوڑی۔ اس کے چہرے سے کچھ بھی پتہ نہیں چل رہا تھا۔ اور آج اس کی زندگی کا فیصلہ اس مکروہ صورت آدمی کے ہاتھ میں تھا۔ جو اس کی تقدیر بنا بیٹھا تھا۔

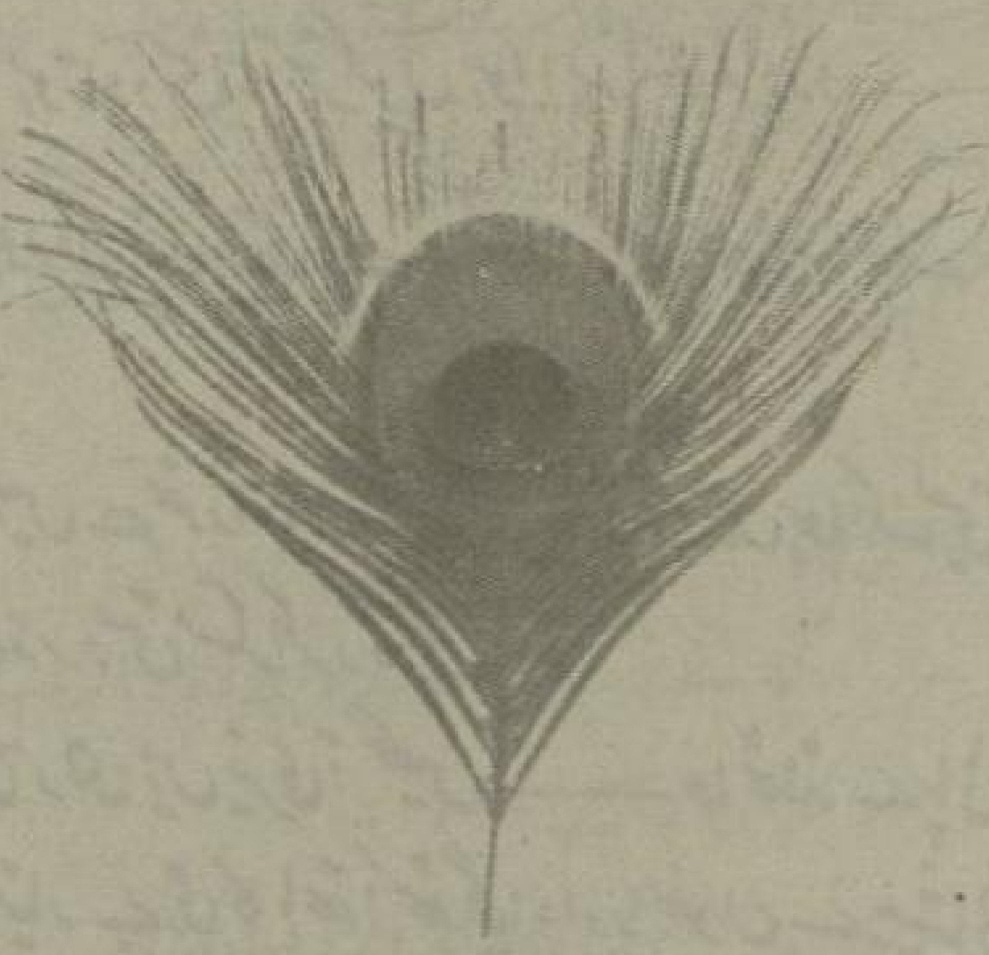
"معاذ!"

رملی نے اسطرح اس کا نام لیا۔ جیسے مرتا ہوا آدمی اپنے اللہ کو پکارتا ہے۔

"معاذ!

میں صرف آپ کی گنہگار ہوں ....."

اور پھر اس نے شروع سے لیکر آخر تک ساری کہانی معاذ کو سنا دی۔



رملی کی آنکھ کھلی تو اٹھ کر بستر پر بیٹھ گئی۔ بیٹھی تو سر کو زور سے چکر آیا۔ اس نے پاؤں نیچے لٹکا دیئے۔ تو یوں لگا۔ صدیوں سے ہواؤں میں دوڑتی آ رہی ہے۔ اس کے پاؤں اس حد تک پھول گئے ہیں کہ اب زمین پر نہیں ٹک سکتے ——— شکستہ پائی کے احساس سے مغلوب ہو کر اس نے جھک کر اپنے دونوں پاؤں دیکھے اور پھر یاد کرنا چاہا کہ وہ رات بھر کہاں سرگرداں رہی۔ تو اسے رفتہ رفتہ سب یاد آنے لگا۔ اس نے رو رو کر اور چیخ چیخ کر ہذیانی انداز میں اپنی نادانی کی ساری سرگذشت معاذ کو سُنا دی تھی۔ اور اس کا گریبان پکڑ کر اس طرح روئی تھی کہ جیسے اپنے آپ کو ختم کر دینا چاہتی ہو۔ پھر معاذ نے اسے ویلیم کی ایک گولی کھلائی تھی اور اسے اس کے بستر پر ڈال دیا تھا۔ اس کے بعد اسے کچھ بھی یاد نہیں رہا تھا ———

نظر اٹھا کر اس نے دروازے سے باہر دیکھا۔ سارے صحن میں دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ اور معوذ بھاگ بھاگ کر مرغی کے بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ جب کہ بے جی رات کی باسی روٹیاں کتر کتر کے مرغیوں کے آگے ڈال رہی تھیں۔ وہ ہمت کر کے کھڑی ہو گئی۔ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی باہر نکل آئی اسے دیکھ کر بے جی کا ہاتھ رک گیا۔

"بسم اللہ ——— دوہٹی اب کیسی ہے تو ———"؟

آنکھیں ملتی ہوئی ننگے پاؤں چلتی ہوئی رملی آ کر بے جی کے پاس آلتی پالتی مار کے فرش پر بیٹھ گئی۔

"صبح معاذ مجھے بتا کے گیا تھا کہ تمھارے پیٹ میں تمام رات درد رہا ہے۔ تم ساری رات نہیں سو سکیں۔ اس لیے جب تک تم خود نہ اٹھو تمہیں میں نہ جگاؤں ———"؟

رملی نے بس اثبات میں سر ہلایا۔

"مجھے جگا لیا ہوتا وہٹی۔ آخر کیوں ہوا ایسا ظالم درد —— میری چھوٹی الماری میں ہر وقت اجوائن پڑی رہتی ہے۔ اگر اس میں تھوڑا سا نمک ملا کے پھانک لیتیں تو فوراً آرام آجاتا۔

("رات تو کہیں سے تھوڑا سا زہر بھی مل جاتا تو میں پھانک لیتی بے جی")

رملی صرف زبردستی مسکرا کر رہ گئی۔

"کیسی سوج رہی ہیں تیری آنکھیں —— جا ٹھنڈے پانی سے نہا کے آ۔ اور اپنے بال سمیٹ ——" بے اختیار بے جی کا ہاتھ اُٹھ گیا۔ اور انھوں نے پیشانی پر سے رملی کے بال پیچھے ہٹانے شروع کر دیئے۔ جونہی پیشانی کو چھوا چونک گئیں۔

"اے وہٹی: تیری تو پیشانی تپ رہی ہے۔"

رملی نے اپنے ہاتھ کی پشت اپنی پیشانی پر رکھی تو اسے کچھ بھی احساس نہیں ہوا۔ ایک آگ اس کے دل میں لگی ہوئی تھی۔ اس لیے باہر کی تپش اسے بالکل بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

بے جی نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر اٹھایا اور اندر بستر پر لے گئیں۔

"تجھے تو سخت بخار ہے وہٹی ......"

"میں معاذ سے کہہ کر ڈاکٹر کو بلواتی ہوں۔ تو لیٹ جا——"

رملی پھر سیدھی کی سیدھی بستر پر دھم سے گر گئی۔ ایک رات کی دہشت اتنی زیادہ تھی کہ اسے بخار آگیا تھا۔

یہ بخار پچیس دن تک رہا۔

پچیس دن معاذ نے اس کی خوب تیمار داری کی۔ اور بے جی دم درود کر کے اسے پھونکتی رہیں۔

پچیس دن میں جب کبھی ہوش کی گھڑی آئی۔ اس نے مرنے کی دعا کی پچیس دن بہت تھے پچھتانے اور غم کرنے کے لیے —— گذرے دنوں کا ماتم کرنے کے لیے —— اپنی غلطیوں پر اپنے آپ کو کوسنے کے لیے ....

اس روز اس کا جی اچھا تھا۔

اٹھ کر نہائی دھوئی کپڑے بدلے۔ کنگھی بھی کی اور آ کر بستر پر بیٹھ گئی۔ اسی وقت بھاگتا ہوا معوذ آیا اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ رملی کو اس پر ٹوٹ کر پیار آیا پچیس دن اس نے اپنے بچے کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ اگر بے جی نہ ہوتیں تو اس کے بچے کا کیا حشر ہوتا۔ یہ سوچتے ہی اس نے معوذ کو

دونوں بازوؤں میں سمیٹ لیا اور پھر اس کا منہ چومنے کے لیے جب اس کا چہرہ اٹھایا۔ تو ایک دم اسکی چیخ نکل گئی۔ معوذ کے چہرے پر بے شمار چھوٹے چھوٹے دانے نکلے ہوئے تھے۔

دودھ کا گرم پیالہ لیکر اندر آتی ہوئی بے جی نے اس کی چیخ سن لی تھی۔ دوڑ کر آئیں اور بولیں۔

"کیا ہوا ہے دولہنی ——"؟

"بے جی ——" رملی نے بڑے خوف زدہ اور دردناک لہجے میں کہا۔

"یہ دیکھیں معوذ کا چہرہ دیکھیں ......"

"ہاں دیکھ رہی ہوں۔" انہوں نے اطمینان سے کہا۔

"کہیں ...... کہیں ... میرے بچے کو بھی چیچک نہ نکل آئے۔ کہیں اسکا چہرہ بھی ——"

پھر وہ کہتے کہتے ایک دم رک گئی۔ وہ کیا کہنے چلی تھی پگلی۔

بے جی نے دودھ کا پیالہ اس کی تپائی پر رکھ دیا۔ اور معوذ کو پکڑ کے اپنے دوپٹے سے اس کا چہرہ صاف کر دیا۔

پھر اسے گود میں لے کر سامنے صوفے پر جا بیٹھیں۔ بے جی کے چہرے پر ایک سانولا بادل لہرایا تھا۔ بے جی نے شاید رملی کے خدشے کو پا لیا تھا۔ ان کے لہجے میں کچھ لوٹ گیا تھا۔

انہوں نے معوذ کو اپنی گود میں بٹھالیا۔ اور کہنے لگیں۔

"ڈرو نہیں ...... یہ چیچک کے دانے نہیں ہیں۔ پرسوں رات سپرے نہیں کرایا تھا۔ تو مچھروں نے اسے کاٹ لیا۔ صبح اٹھ کر اس نے کھجا لیا اس لیے دانوں کی صورت اور ہو گئی ہے ان دانوں کو چھیڑنا نہیں چاہیئے۔ خود بخود سوکھ جائیں گے۔"

شرمندہ سی رملی نے دودھ کا پیالہ اٹھایا اور آہستہ آہستہ پینے لگی ——

معوذ چھلانگ لگا کر بے جی کی گود سے اترا اور باہر بھاگ گیا۔ بے جی تھوڑی دیر رملی کا اترا ہوا چہرہ دیکھتی رہیں۔ پھر بڑی اداس لے میں کہنے لگیں۔

"دولہنی! ہمارا زمانہ مجبوریوں کا زمانہ تھا۔ میری ساس بہت سخت گیر خاتون تھیں۔ اللہ بخشے گھر میں ان کا ڈنڈا چلتا تھا۔ جب معاذ پیدا ہوا اور ہم نے اسے چیچک کا ٹیکہ لگوانا چاہا تو انہوں نے سختی سے منع کر دیا۔ وہ ٹیکوں اور اسپتالوں کے سخت خلاف تھیں۔ انہوں نے حکم دیا کہ اتنی چھوٹی جان کو کوئی ٹیکہ نہیں لگوایا جائے گا۔ جب بڑا ہو گا تو دیکھا جائے گا میری عمر بھی چھوٹی تھی۔ ان باتوں کی کچھ سمجھ بھی نہ تھی۔ نہ اتنی تعلیم تھی۔ اور میں ان سے ڈرتی بھی بہت تھی۔ اس لیے دوبارہ خیال ہی نہ آیا۔ اسی زمانہ میں ہمارے گاؤں میں چیچک کی وبا پھیلی اور میرے بیٹے کو بھی نکل آئی —— ......؟

رملی نے سر نہیں اٹھایا۔ آہستہ آہستہ دودھ پیتی رہی۔

بے جی نے ایک ٹھنڈی سانس چھوڑی۔

اور دوبارہ گویا ہوئیں۔

"وہیٹی: ویسے تو ہر ماں کو اپنا بچہ چاند ہی لگتا ہے۔ مگر جب میرا معاذ پیدا ہوا تھا تو بالکل موجو کی طرح تھا۔ (بے جی معوذ کو پیار سے موجو کہتی تھیں) گورا چٹا۔ خوبصورت صحت مند ــــــ مگر تمام اتفاقیہ حادثے اس کی قسمت میں لکھے ہوئے تھے۔ اسے چیچک اتنی بری طرح سے نکلی۔ آنکھوں کے اندر باہر اتنے دانے نکل آئے کہ آنکھیں سکڑ گئیں۔ رنگ جل کر سیاہ ہو گیا شیطان بھی بہت تھا۔ معاذ ایک بار کھیلتا کھیلتا ایک کنوئیں میں گر گیا تھا اور کئی دن تک بے ہوش رہا ــــــ بچپن میں اس پر کئی بیماریوں نے حملہ کیا۔ دوبار اسے ٹائیفائڈ ہوا تھا۔ میں تو بس اللہ سے ہمیشہ اپنے بچے کی زندگی مانگتی رہی۔ اور میرے مولا نے ہر بار بچہ مجھے لوٹا دیا ــــــ"

وہ کھڑی ہو گئیں۔ . . . .

"اور ماں کو بچے کی صورت کب نظر آتی ہے ــــــ"؟

"میں جانتی ہوں وہیٹی میرا بیٹا بدصورت ہے۔ مگر میں نے اس کی تربیت اتنے اچھے انداز میں کی ہے کہ صورت کا اس پر کبھی اثر نہیں پڑ سکتا۔ یہ میں جانتی ہوں میرا بیٹا کیا ہے ــــــ"؟

رملی نے دودھ کا پیالہ خالی کر کے واپس تپائی پر رکھ دیا تھا۔ اور شرم کے مارے اس کی گردن جھک گئی تھی۔

بے جی نے آگے بڑھ کر پیالہ اٹھا لیا۔ اور کہنے لگیں۔

"لیکن تو نے تو ابتدا ہی میں موجو کو ٹیکہ لگوا لیا تھا ــــــ"؟

"جی ــــــ"

رملی نے بہت آہستہ سے کہا۔

"پھر اتنی خوفزدہ کیوں ہے ــــــ"؟

رملی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"انشاءاللہ یہ اسی طرح خوبصورت رہے گا۔ اللہ اسے نظرِ بد سے بچائے۔ اور خواہ مخواہ کے وہم بھی دل میں نہ رکھا کر . . . . صورت تو بالکل ایک عارضی چیز ہے وہیٹی۔ انسان کے دل سے پیار کرنا سیکھو ــــــ"

بے جی نے ٹھیک کہا تھا۔ مگر رملی کیا کرتی۔ اس کا خدشہ اس کے منہ سے نکل گیا تھا۔

بے جی کو پتہ نہیں کیا سوجھا۔ دوبارہ بیٹھ گئیں۔

اور کہنے لگیں۔

"دوہٹی! تم لوگ خوش قسمت ہو۔ اس زمانے کی پیداوار ہو۔ اور آزادی کی فضا میں سانس لے رہی ہو۔ جو چاہو کر سکتی ہو۔ ہمارے زمانے میں ہر قسم کی پابندیاں تھیں اور گھروں میں بزرگوں کا سکہ چلتا تھا۔

"یہی وجہ ہے کہ مجھے روایتی ساس بننے سے ہمیشہ نفرت رہی۔ میرا خیال ہے بزرگوں کو اپنی نئی نسل کے ساتھ چلنا چاہیئے۔ اسی لیے تو میں ہر بات سیکھنے کی کوشش کرتی ہوں، زمانے کا ادراک رکھتی ہوں۔

نئے تقاضوں کو قبول کر لیتی ہوں۔ مجھے خواہ مخواہ کا بزرگ بننے سے نفرت ہے ——"۔۔۔۔

"اچھا اب تم آرام کرو۔" وہ پھر کھڑی ہو گئیں۔

"اور خواہ مخواہ اپنے دل کو پریشان نہ کرو۔ کوئی بات ذہن کو پراگندہ کر رہی ہو تو مجھے بتا دیا کرو۔ اپنے آپ کو بیمار نہ کرو۔ اس عمر میں لگے ہوئے روگ ساری عمر نہیں جاتے ——"

بے جی باہر نکل گئیں۔

اور رملی کے کانوں میں ان کے آخری فقرے کی بازگشت رہ گئی۔

"اس عمر میں لگے ہوئے روگ ساری عمر نہیں جاتے . . . . ."

پتہ نہیں روگ کیا ہے ——؟

رملی نے نظر اٹھا کے سامنے دیکھا تو ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اسے اپنی صورت نظر آ گئی۔

کسقدر بدل گئی تھی رملی —— جسطرح کسی کچے رنگ کے دوپٹے کو دھونے سے اس کا رنگ اتر جائے اور وہ بدرنگ ہو جائے۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ رخسار زرد ہو گئے تھے ہونٹ سیاہ پڑ گئے تھے۔ اس کی صورت ہی بدل گئی تھی۔

اسی صورت پر اسے ناز تھا۔

بے جی سچ کہتی تھیں۔ صورت ایک عارضی شے ہے۔ جس چیز پر کسی کا اختیار نہ ہو۔ اس پر کوئی اترائے کیوں ——؟

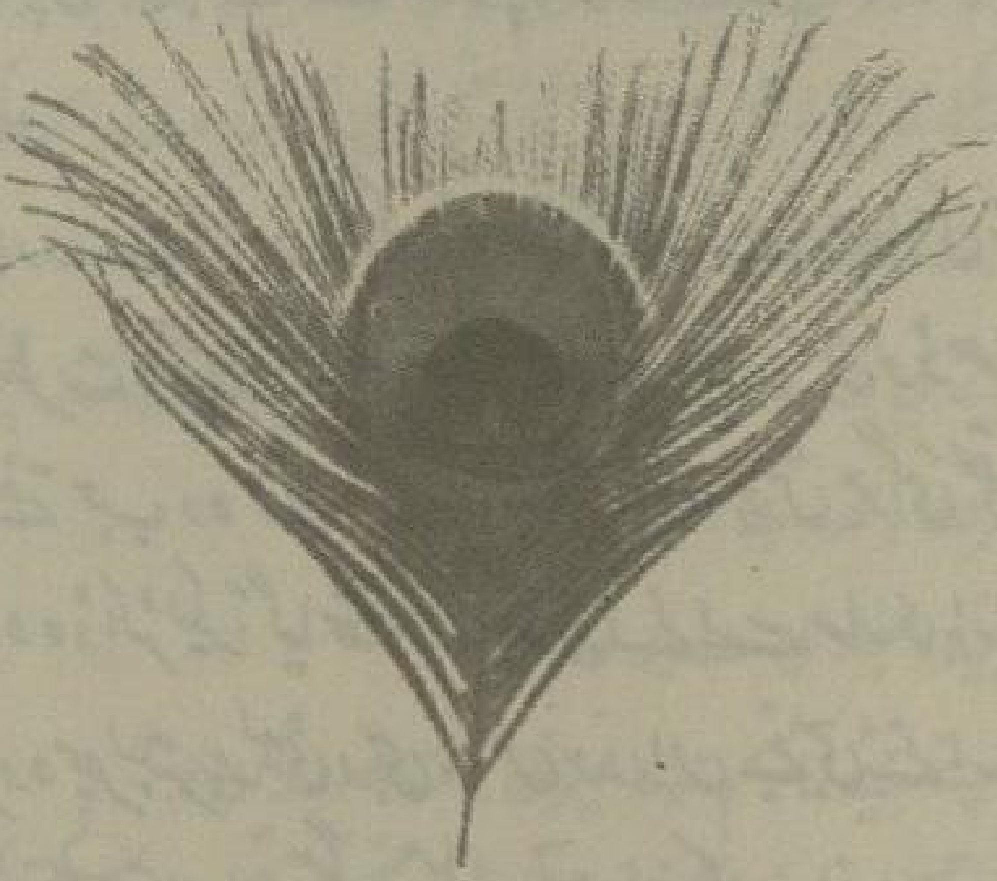
اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور بستر پر لیٹ گئی۔ سوچنے کی ہمت نہیں تھی۔

اس رات کے بعد کیا ہوا ——؟

کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ ایک دم دل میں معاذ کو دیکھنے کی خواہش مچل رہی تھی۔ یہ تو اس نے بیماری ہی میں محسوس کر لیا تھا کہ معاذ دفتر سے آ کر اس کی بہت تیمارداری کرتا تھا۔ اور رات گئے

بار اٹھکر اسے دیکھنے آتا تھا۔ کیونکہ جب سے وہ بیمار ہوئی تھی۔ معاذ نے اپنا بستر سٹڈی میں لگا لیا تھا۔
پتہ نہیں اب کیا ہو ——؟

اسے تو یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے اپنی ساری ہمت راستے میں ہی لٹا بیٹھی ہے۔
اور آج تو بے جی کو بھی پتہ لگ گیا تھا کہ اسے معاذ کی صورت پسند نہیں ——
اور یہ کہ —— وہ جی کو کوئی روگ لگائے بیٹھی ہے۔
وہ لیٹی سوچوں کے دوش پر اڑ رہی تھی کہ ایک دم بے جی کی آواز اس کے کان میں آئی۔
"دو ہٹی! تمہارا فون ہے۔ اگر آ کر سن سکتی ہو تو آؤ ——"
رملی کھڑی ہو گئی۔ پاؤں میں چپل پہنے۔ چلنے کو قدم بڑھایا تو آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ شاید بہت دن بعد چلنے کی کوشش کی تھی۔ اس لیے چند قدم چلنے سے اس کا دل دھڑکنے لگا اور چہرے پر پسینہ آ گیا۔ کرسی کی پشت پکڑ کے اس نے ریسیور اٹھا لیا۔
"ہیلو!" اس نے بہت آہستہ سے کہا۔
"رملی ——"
ادھر سے ایک آواز سنائی دی۔
اور بس ایک آواز سن کر ہی رملی کے ہاتھ سے ریسیور گر گیا۔ دور سے بے جی نے ریسیور گرتا ہوا دیکھا۔ جب تک وہ قریب آئیں۔ رملی بے ہوش ہو کر فرش پر ڈھیر ہو چکی تھی۔



ٹیلی فون کی گھنٹی سن کر رملی کا دل کیوں ڈوبنے لگتا ہے۔ اور وہ بار بار بے ہوش کیوں ہو جاتی ہے۔ اس بات پر رملی کو کئی بار غصہ آیا تھا۔ اس نے اپنے دل کو تسلی دی تھی کہ وہ سب کچھ اپنے شوہر کو بتا چکی ہے، اب کس بات کا ڈر ہے ——؛ مگر اب بھی اسے شوہر کے ردعمل کا تو پتہ نہیں تھا۔ وہ تب سے بیمار پڑی تھی۔ اور معاذ اور بے جی ہر وقت اس کا دھیان رکھتے تھے۔ ڈاکٹروں کو دکھایا جا رہا تھا۔ باری باری سب بہنیں اور امی ابا بھی دیکھنے آئے تھے۔ امی جان نے بہت مجبور کیا تھا کہ وہ چل کر کچھ دن ان کے پاس رہے۔ مگر رملی نے صاف انکار کر دیا تھا۔ اور تو اور —— کچھو باجی کا پنڈی سے فون آیا تھا۔ انہوں نے بھی اسے پنڈی آنے کی دعوت دی تھی مگر وہ کہیں نہیں جا سکتی تھی۔ امی کے ہاں یاور رہتا تھا اور پنڈی میں شان بھائی تھے اور وہ ان رستوں سے گزرنا نہیں چاہتی تھی۔ جہاں یہ دونوں تھے۔ اپنے گھر میں کتنا سکون تھا۔ کتنا آرام تھا۔ طمانیت تھی۔ اپنائیت تھی —— اپنے گھر کا احساس اسے پہلی بار ہوا تھا۔ یہاں ہر چیز اس کی اپنی تھی —— اپنی صرف اس لیے کہ اس گھر کے آدمی سے اس کا ایک اٹوٹ ناتا تھا۔ وہ اس گھر کا ایک مہرہ تھی۔ اس دیوار کی ایک اینٹ تھی۔ اس چھت کی ایک کڑی تھی۔ اس گھر کے مقابلے میں اسے امی کا گھر بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس گھر میں وہ مہمانوں کی طرح جاتی اور چلی آتی، مگر اس گھر سے اسے کوئی بیدخل نہیں کر سکتا تھا۔

حیران ہوتی کہ اس بات کی سمجھ اتنی دیر بعد کیوں آئی ——؟ لیٹے لیٹے جب معاذ کے بارے میں سوچتی تو گذری ہوئی تمام باتیں ایک ایک کر کے یاد آنے لگتیں۔
تو وہ اپنے آپ پر نفرین بھیجنے لگتی۔

اس نے اپنی کسی بات سے معاذ پر ثابت نہیں کیا تھا کہ وہ اسے پسند کرتی ہے۔ محبت کرنا تو دور کی بات ہے۔

اور اس روز بے جی نے ٹھیک کہا تھا۔ انہوں نے معاذ کی تربیت بہت اچھے انداز میں کی تھی۔ معاذ کی فطرت کا حسن فوراً کھل جاتا تھا۔ وہ اس حسن کو ڈھونڈنے کے قابل کیوں نہ ہوئی۔

پچھلے ہفتے جب وہ فون کی آواز سن کر بے ہوش ہو گئی تھی تو بے جی نے فوراً معاذ کو دفتر فون کر کے بلوا لیا تھا۔ وہ ڈاکٹر لیکر آ گیا تھا۔ اور بے جی نے اسے ساری بات بتا دی تھی۔

ہفتہ بھر وہ پھر بستر پر لیٹی رہی۔ اس دوران بے جی نے اسے دو مرتبہ آ کر بتایا کہ تمھاری سہیلی جیدہ تمھیں فون پر بلا رہی ہے۔ مگر رملیٰ نے صاف کہہ دیا۔

"اس سے کہہ دیں۔ ابھی میں چل کر نہیں آ سکتی۔ جب طبیعت ٹھیک ہو گی تو خود فون کر لوں گی۔"

اور بے جی نے نہایت معصومیت سے اسے بتا بھی دیا تھا۔ کہ پچھلے ڈیڑھ مہینے سے رملیٰ بیمار ہے۔ اور بستر پر ہے۔

رملیٰ کو اپنے بیمار ہونے پر بھی شرم آتی۔ حالانکہ گھر میں کوئی اس کی بیماری پر اعتراض نہیں کرتا تھا۔

آج پھر اس نے چلنے پھرنے کی کوشش کی۔ موجو کی انگلی پکڑ کر باہر نکل گئی۔
مرغیوں کے بچوں کو دیکھا۔ کوارٹروں تک گئی۔ نوکروں کا حال پوچھا ———
تھوڑی دیر چلنے سے طبیعت کو بہت تقویت ملی ———
پھر اندر آ کے تخت پر بیٹھ گئی۔

ابھی سانس درست کر رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجنا شروع ہو گئی۔ اس کی آواز سے رملیٰ پھر ڈر گئی۔ اس کا دل دھڑ دھڑانے لگا۔ رنگ اڑنے لگا۔ مگر اس میں ہمت نہیں ہوئی ریسیور اٹھانے کی۔ جب گھنٹی بہت دیر تک بجتی رہی تو پھر بے جی نے اپنے کمرے سے نکل کر جھانکا۔ رملیٰ فون کے پاس بیٹھی تھی ———

اس لیے وہ واپس چلی گئیں۔
رملیٰ نے مرے ہوئے ہاتھوں سے ریسیور اٹھا لیا۔
"ہیلو. . . . . ." اس سے بھی مری ہوئی آواز میں بولی۔
"ہیلو رملیٰ میں جیدہ بول رہی ہوں۔"
یہ سنتے ہی رملیٰ نے ریسیور واپس رکھ دیا۔ تھوڑی دیر بعد گھنٹی پھر بجنے لگی۔ اسے معلوم

تھا یہ جیدہ ہی ہے۔ اگر وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی جاتی تو یقیناً بے جی فون اٹھا کر اسے بلانے آجاتیں اور اب وہ فون تک نہ آسکنے کا بہانہ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ جیدہ نے اس کی آواز سن لی تھی۔

"وہ ہٹی: فون کیوں نہیں اٹھاتی ہو——"؟

اچانک بے جی نے باہر نکل کر کہا اور پھر باورچی خانے میں چلی گئیں۔ رملی نے اپنا ہاتھ اس طرح بڑھایا جیسے مردہ ہاتھ ہے اور چونگا اٹھا لیا۔

"رملی! جیدہ جلدی سے بولی۔"

"تمھیں اپنے بیٹے کی قسم ہے۔ میری بات ضرور سن لو۔"

رملی کا سارا جسم لرزنے لگا۔ وہ اتنی بڑی قسم کی متحمل نہ ہو سکتی تھی۔

ایک دم اس نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا جیسے کسی درد کی لہر کو روکنا چاہتی ہے۔

"اور اگر اب بھی تو فون رکھدے گی تو میں پھر سارا کچا چٹھا تیری ساس کو کھول کے سنا دوں گی۔"

رملی کا فون والا ہاتھ کانپنے لگا اور اس نے اپنی پشت دیوار کے ساتھ لگا لی۔

"بہت دنوں سے تو بیماری کا بہانہ کر کے بستر پر پڑی ہے۔"

جیدہ کے لہجے میں نفرت ہی نفرت تھی۔

"تیرا یہ مکر تیرے شوہر اور ساس پر چل سکتا ہے۔ مجھ پر نہیں ——"

رملی نے سانس روک لی۔

"بولتی کیوں نہیں۔ کیا تجھے سانپ سونگھ گیا ہے ——"

اس نے پھر غصے سے کہا۔ "بتا تو سہی تو فون سن بھی رہی ہے یا نہیں —— ورنہ جو بھی سن رہا ہے۔ میں اس سے ساری بات کہہ دوں گی رملی نے بڑی مشکل سے اپنے حلق سے آواز نکالی اور بولی۔

"تمھیں جو کچھ کہنا ہے۔ کہہ دو۔ میں صرف سنوں گی ——"

"ذلیل، کتیا، کمینی —— جیدہ نے دانت پیس کر کہا۔ "جب تو میرے شوہر پر ڈورے ڈال رہی تھی۔ تجھے پتہ نہیں تھا کہ اس کا کیا انجام ہوگا —— ؟ تمھیں غیرت نہیں آئی کہ میں تمھاری سہیلی تھی۔ سہیلیاں بھی بہنوں کے برابر ہوتی ہیں۔ کیا تو اپنی بہن کا گھر اجاڑ سکتی ہے —— ؟ کیا اپنے بہنوئی سے عشق کر سکتی ہے —— ؟

"یہ ہوتی ہیں آج کل کی سہیلیاں، سہیلیوں کے شوہروں پر نظر رکھتی ہیں۔ اور انہیں غیرت نہیں آتی۔ اگر تو اپنے گھر میں ناآسودہ تھی تو ذلیل عورت کوئی اور آدمی تلاش کیا ہوتا۔ تیرے

جیسی عشوہ طراز عورت کو کئی تیرے جیسے مل جاتے۔ جو اپنے چہرے پر معصومیت کا نقاب چڑھا کے رہتی ہیں۔ مگر دوسروں کے شوہر لوٹ لیتی ہیں۔ ہاں اگر میں ہر روز تیرے شوہر کو بن ٹھن کے دکھاتی۔ اس کو ناز نخرے دکھایا کرتی۔ اس کو طرح طرح سے گھائل کیا کرتی تو پھر تجھے پتہ چل جاتا۔ تیرے دل پر کیا گذرتی ہے۔"

"آوارہ عورت! میں سب اپنی آنکھوں سے دیکھتی رہی اور برداشت کرتی رہی ——— اور یہ سوچتی رہی کبھی تو تجھے عزت آئے گی ——— تو ایک بار سوچے گی کہ یاد رتیری سہیلی کا شوہر ہے۔"

جیدہ نے ذرا سا دم لیا۔

رملیٰ کی آنکھوں میں ڈھیر سارے آنسو اکٹھے ہو گئے۔ پلکیں جھپکا کر جنھیں اس نے رخساروں پر انڈیل دیا۔ اور پھر دوسرے ہاتھ سے اپنا دوپٹہ پکڑ کے رخساروں کو صاف کرنے لگی۔

"سن رہی ہے یا مر گئی ہے۔" جیدہ نے غصے سے پوچھا۔

تو پتہ نہیں رملیٰ میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی۔ بولی

"تمھیں جو کچھ کہنا ہے۔ کہتی جاؤ۔ آج میں تمھاری ساری بات سنوں گی۔"

کہنے کو تو رملیٰ کا دل چاہا ——— کہ اسے کہے۔ تم نے مجھ سے انتقام لینے کے لیے جو حرکت کی تھی۔ وہ میری زندگی ختم کرنے کو کافی تھی۔ تم نے جو منصوبہ بنایا تھا۔ جس جال میں مجھے پھنسانا چاہا تھا اس سے میرے اللہ نے مجھے نکال دیا ہے۔ اب اور کیا چال چلنا چاہتی ہو۔ مگر رملیٰ اپنے منہ سے کچھ بھی نہیں کہہ سکتی تھی ———!

بے جی ادھر ادھر آ جا رہی تھیں۔ آج اسے صرف سننا تھا۔ اپنے دل کا غصہ ہونٹ کاٹ کاٹ کے پینا تھا۔ اس لیے ریسیور کان سے لگائے بیٹھی رہی۔

"کتیا! تو سننے کے سوا اور کیا کہہ سکتی ہے۔ تیرے پاس کہنے کو ہے کیا؟ میرا دل چاہتا ہے تو میرے سامنے ہو اور میں تیرے بال نوچ لوں۔ تیرا یہ حسین چہرہ جس پر تجھے بہت ناز ہے۔ اپنے ناخنوں سے لہولہان کر دوں۔ تیری گردن دبا دوں۔"

جیدہ نے اسطرح دانت پیسے جیسے واقعی اس کے ہاتھ رملیٰ کی گردن کی طرف بڑھ رہے ہوں۔

"مگر افسوس صد افسوس ——— میں کچھ بھی نہیں کر سکتی ——— کچھ بھی نہیں کر سکتی ———"

یہ کہتے ہوئے جیدہ کی آواز بھر آ گئی۔ ...... رملیٰ کو اس پر ترس آنے لگا۔ شاید وہ غصہ کرنے میں حق بجانب تھی۔ اپنے شوہر کو دوسری کے قبضے میں کون سی عورت دیکھ سکتی ہے۔ رملیٰ سے غلطی ہو گئی تھی۔ اس نے خمیازہ بھگتا تھا۔ وہ اور خمیازہ بھگتنے کو بھی تیار تھی۔ وہ چاہتی تھی۔ جیدہ آج

ہی اپنے غصے اور اپنی نفرت کا اظہار کردے۔ تاکہ اسے پھر کبھی فون کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہو۔

"کہتے ہیں۔ ڈائن بھی سات گھر چھوڑ دیتی ہے اور تجھے مجھ پر رحم نہ آیا۔ تو نے میرے ہی گھر کو تاڑا۔ تو نے میری سیج اجاڑ دی۔ میں پہلے کون سی خوش تھی ——"

یہ کہتے ہی جیدہ کی آواز ٹوٹ گئی۔ شاید اس پر بھی آنسوؤں نے حملہ کر دیا۔ غصے اور رنج کے موقع پر بھی اسی طرح آنسو نکلے چلے آتے ہیں۔ اس نے پھر اپنی آواز پر قابو پایا۔

"حرافہ! تو اس روز بچ کے آگئی۔ پتہ نہیں کسطرح بچ کے آگئی ——؟ ورنہ میں بھی روز تیرے سلگنے کا تماشا دیکھا کرتی ——"

رملی کو جھر جھری آگئی۔ تو اس منصوبے میں جیدہ بھی شامل تھی۔ اور اگر واقعی ایسا ہو جاتا تو یہ دونوں مل کر اسے کسطرح بلیک میل کر رہے ہوتے؟

جیدہ تھوڑی دیر روتی رہی۔ کیونکہ وہ دوبارہ بولی تو اس کی آواز بدلی ہوئی تھی۔

"مگر اب میں نے سوچا ہے۔ شاید تیری تقدیر مجھ سے اچھی ہے۔ شاید اللہ کو تیری بہتری مقصود ہے۔ شاید تجھ پر تیرے ماں باپ کی دعائیں سایہ فگن ہیں۔ شاید تیری ساس تجھ پر دم پھونکتی رہتی ہے۔ اس لیے تجھ پر آنچ نہ آئی اور جال تڑا کر باہر نکل آئی ——"

رملی نے فوراً گردن موڑ کر دیکھا۔ بے جی پالک کے پتے اٹھا کے سامنے برآمدے میں آ بیٹھی تھیں اور ایک ایک پتے سے ڈنڈی الگ کر رہی تھیں۔ اور معوذ بھی ان کی دیکھا دیکھی پتے توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔

بے جی نے ایک بار نظر اٹھا کر دیکھا۔ رملی ریسیور کان سے لگائے توجہ سے سن رہی تھی وہ پھر اپنے کام میں مگن ہوگئیں۔

جیدہ کو رونے سے شاید قرار آگیا تھا۔

دوبارہ بولی تو اس کی آواز میں قدرے نرمی تھی۔

رملی! میں نے تجھے جو کچھ کہا ہے۔ اس کے لیے مجھے معاف کر دینا۔ اگر تو میری جگہ ہوتی تو بتا کیا کرتی —— سوچ ذرا سوچ ——

"سن رہی ہے یا نہیں ——؟" اس نے پھر پوچھا۔

"سن رہی ہوں۔" رملی نے جواب دیا۔

"پھر جواب کیوں نہیں دیتی۔"

"کیا جواب دوں جیدہ! تجھے حق پہنچتا ہے۔ جو بھی کہہ لے —— میں تو ڈیڑھ مہینے سے اپنے آپ کو ہر طرح کی اذیت دے رہی ہوں۔ لیکن جسطرح تیرا دل خوش ہوتا ہے تو بھی کر لے ——"

رملی نے اتنی آہستہ آواز میں کہا۔ جسے بے جی نہ سن سکیں۔

"رملی"۔ جیدہ بولی۔

"ہر شے کی حقیقت وہ نہیں جو تجھے نظر آتی ہے۔ گو میں تیری صورت نہیں دیکھنا چاہتی تجھ سے سخت نفرت کرتی ہوں۔ مگر آج تجھے اپنی زندگی کی چند باتیں ضرور بتاؤں گی۔ صرف تمہیں ـــ کیونکہ مجھے معلوم ہے تم طبعاً شریف النفس ہو اور اس واقعے کے بعد مجھے تم سے کوئی خطرہ بھی نہیں۔"

بے جی ٹرے اٹھا کے ذرا اور قریب آگئی تھیں۔ کیونکہ برآمدے میں دھوپ آگئی تھی اس لیے رملی نے بہت محتاط انداز میں کہا۔

"ہاں ضرور کہو ـــ" جسے بے جی نے بھی سن لیا اور انہیں پتہ چل گیا کہ اس طرف سے کوئی بات سنائی جا رہی ہے۔

"رملی تو نہیں جانتی میری شادی کس طرح ہوئی تھی ـــ؟ میں جب یاور کے جال میں پھنسی اس وقت میری عمر سترہ سال کی تھی۔ یاور نے اپنے اوپر ایک دلکش شخصیت کا ماسک چڑھا رکھا ہے۔ یہ میں نہیں جانتی تھی۔ مجھے بس دنیا میں یاور کے سوا کوئی نظر بھی نہیں آتا تھا۔ میرے ماں باپ نے یاور کے ساتھ میری شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن یاور کے کہنے پر ایک روز میں یاور کے ساتھ بھاگ گئی۔ یاور نے اپنے چند دوستوں کی موجودگی میں مجھ سے نکاح کر لیا۔ پھر ہم شہر شہر گھومتے رہے ـــ اور ایک دن ملک سے باہر چلے گئے۔

انگلینڈ جا کر مجھ پر یاور کی فطرت کھلی ـــ"..

یہاں پر رک کر اس نے ایک ٹھنڈی سانس چھوڑی اور کہنے لگی۔

"لیکن اس وقت کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے یاور کا آلۂ کار بننا پڑا۔ اس کے اشاروں پر ناچنا پڑا۔ اس کی کارکردگیوں میں اس کا ساتھ دینا پڑا ـــ

جانتی ہو کیوں ـــ؟

تھوڑی دیر رک گئی پھر بولی۔

"اس لیے کہ یاور نے سچ مچ میرے ساتھ نکاح نہیں کیا تھا۔ بلکہ وہ سارا فراڈ تھا۔ اب میرے لیے کوئی جائے پناہ نہ تھی۔ دنیا والوں کی نظر میں ہم میاں بیوی تھے۔ یہ بھانڈہ میں نہ پھوڑ سکتی تھی نہ اپنے گھر والوں تک اپنی فریاد پہنچا سکتی تھی۔ انہوں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ یاور اچھا آدمی نہیں ہے۔"

"پھر ـــ" رملی نے اس کے لیے اپنے دل میں ہمدردی محسوس کرتے ہوئے بے اختیار پوچھا۔

"بس ـــ اب اتنے لمبے قصے کیا بتاؤں ـــ"

جیدہ نے اداسی سے کہا۔

"تم یوں سمجھو کہ یہ ایک ایسی دلدل تھی جس کے اندر میں دھنستی چلی گئی پھر یاور نے ایک اور ظلم بھی مجھ پر کر دیا تھا۔ جس کا علم مجھے بہت بعد میں ہوا۔

یہ کہہ کر جیدہ رونے لگی۔

"جیدہ روؤ نہیں پلیز۔ رملی نے آہستہ سے کہا۔ مجھے بتاؤ۔ اپنے دل کی ہر بات مجھے بتاؤ ——"

"دکھاوے کی شادی کے بعد جب میری کوکھ ہری ہوئی تو ——" جیدہ پھر بے اختیار رونے لگی......

تو اس ظالم آدمی نے مجھے طرح طرح سے ورغلانا شروع کیا۔ محبت کے ایسے ایسے سبز باغ دکھائے اور میرے راستے میں اتنی چاندنیاں بچھادیں کہ مجھے یقین آ گیا۔ بچہ محبت کے راستے کا روڑہ ہے اور فی الحال ہمیں بچہ پیدا نہیں کرنا چاہیئے۔ سو میں نے یاور کے مجبور کرنے پر حمل ضائع کروا دیا۔ اور میری حماقت دیکھو۔ بہت عرصہ بعد مجھے اس بات کا پتہ چلا کہ انہی دنوں یاور نے آپریشن کروا کے میری ہری بھری کھیتی جلا دی تھی۔ مجھے پانچ سال بعد پتہ چلا کہ میں کبھی ماں نہیں بن سکتی۔"

جیدہ رونے لگی۔

رملی کو اپنے دل میں درد سا محسوس ہوا اور یاور کا چہرہ بھیانک روپ دھار کے اس کی آنکھوں کے آگے آ گیا۔ اف دنیا میں کیسے کیسے گھناؤنے لوگ ہیں۔

جیدہ روتی رہی.... چیخ چیخ کر ہذیانی انداز میں روتی رہی —— اور رملی چپ چاپ اس کی چیخیں سنتی رہی ——

کاش یہ باتیں جیدہ نے اسے پہلے بتا دی ہوتیں تو وہ کتنی محتاط ہو جاتی۔

جب جیدہ اچھی طرح رو چکی تو اپنی بھاری آواز میں پوچھا۔

"رملی تم سن رہی ہو ——"؟

"ہاں جیدہ! میں سب سن رہی ہوں۔ تم اطمینان سے کہتی جاؤ ——"

بے جی نے سر اٹھا کر رملی کی جانب دیکھا۔ وہ بڑے انہماک سے چونگا کان کو لگائے سن رہی تھی۔

"رملی! میں بڑی گنہ گار ہوں۔" جیدہ نے پھر کہنا شروع کیا۔

"اصل میں، میں نے اپنے والدین کا دل دکھایا تھا۔ اور میرا ایمان ہے۔ والدین کا دل دکھانے والے بچے زندگی میں کبھی خوش نہیں رہ سکتے۔ دنیا میں ان کے لیے اذیت کے سوا کچھ نہیں ہے —— لیکن دعا کرو کہ یہ عذاب صرف اسی دنیا کے ہوں۔ اگلی دنیا میں میں چھوٹ

جاؤں ——"؟

"لیکن جیدہ ——" رملی نے بڑی ہمت کر کے کہا۔ تم اب بھی ان سے مل کے معافی مانگ سکتی ہو۔ ماں باپ کا دل بڑا ہوتا ہے۔ وہ اپنی اولاد کی ہر خطا معاف کر دیتے ہیں"؟

"ہاں . . . . . "جیدہ پھر دھواں دھار رونے لگی۔"میں جانتی ہوں۔ اگر میں ان کے قدموں پر سر رکھ دوں تو وہ مجھے معاف کر دیں گے۔ مگر میں اب ایسا نہیں کر سکتی ——"

"کیوں —— ؟" رملی نے پوچھا۔

رملی! میں اپنی سیاہ کاریوں کی داستان کہاں تک سناؤں —— ؟ میں نے تجھے بتایا تھا۔ میں ایک عرصے سے یاور کی آلۂ کار بن چکی ہوں۔ یاور ایک خوبصورت مہکتا ہوا شہزادہ نظر آتا ہے۔ اس کا اندروں بہت گھناؤنا ہے۔ نہ ہی اس کا کوئی ذریعۂ معاش ہے۔ یہ خوبصورت لڑکیوں کو اپنے جال میں پھنساتا ہے۔ پھر انہیں بلیک میل کر کے روزی کماتا ہے۔ میں اس سازش میں اس کے ساتھ شریک ہوتی ہوں۔ اس نے کئی لڑکیوں کو خراب کیا ہے۔ کئی کے گھر اجاڑے ہیں۔ کئی بار میں خود کسی بھاگی ہوئی لڑکی سے اس کی شادی کروا چکی ہوں۔ کئی لڑکیاں اس کی وجہ سے خودکشی کر چکی ہیں۔ جو لڑکیاں پھنس جاتی ہیں۔ یہ ان کی کمائی کھاتا ہے۔ مگر تم نے دیکھا شکل سے کتنا خوبصورت اور معصوم دکھائی دیتا ہے . . . . یہ مجھے اپنے والدین سے ملنے کی اجازت نہیں دیتا اگر میں زبردستی چلی گئی تو یہ انہیں کسی مصیبت میں پھنسا دے گا۔"

"اف . . . . رملی کے سر کو زور سے چکر آیا۔ اس نے ریسیور اپنے دوسرے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اور خوف سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

"جیدہ . . . . . . جیدہ"! وہ خوفزدہ انداز میں کچھ کہنے لگی تھی۔ مگر اس سے کچھ بھی نہیں کہا گیا —— "ہاں میں چاہتی تھی کہ تو اس کے جال میں نہ پھنسے۔ میں تیرے والدین کو جانتی ہوں مگر میں مجبور ہو گئی تھی۔ یاور مجھے قتل کی دھمکیاں بھی دے رہا تھا۔ اس لیے ہم تیرے اردگرد جال بنتے رہے۔ اور تو اتنی بے وقوف ہے۔ احمق ہے ——"

"ہاں . . . . " رملی نے بس اتنا کہا اور پھر اپنی گلوگیر آواز پر قابو پا لیا۔

"یہ شادی والی بات بھی میں نے یاور کے کہنے پر تم سے کہی تھی۔ کیونکہ تم کسی طرح بھی زیادہ قریب آنے پر راضی نہیں ہو رہی تھیں اور جب تم شادی کی بات سن کر بدک گئیں تو اس دن یاور نے دوسرا منصوبہ بنایا۔ مجھ سے تمھیں فون کروا دیا۔ اور پھر مجھے گھر سے باہر بھیج دیا ——"

اس روز میرے ضمیر نے مجھے بہت کچو کے لگائے۔ اس روز میں نے بھی اللہ سے بہت دعائیں کی تھیں کہ تم گھر سے نہ نکل سکو۔ حتیٰ کہ یہ دعا بھی مانگی تھی کہ راستہ میں تمھارا ایکسی ڈنٹ

ہو جائے۔ اور تم یاور تک نہ پہنچ سکو ـــــ یاور نے کمرے میں ایک کیمرہ فٹ کیا ہوا تھا۔ وہاں ٹیپ ریکارڈر بھی موجود تھا۔ وہ بلیک میل کرنے کے سارے ہتھکنڈے جانتا ہے۔ بڑا کمینہ اور خطرناک انسان ہے۔"

رملی کا دل چاہا ریسیور ہاتھ سے رکھ دے اور ابھی یہیں سجدے میں گر جائے کہ اللہ نے اسے ایک خبیث انسان کی خباثت سے بچا لیا تھا۔

"رملی" جیدہ پھر بولی۔

"شاید تجھے یقین نہ آئے۔ میں جب جلتی کڑھتی واپس آئی اور مجھے پتہ چلا کہ تو بچ کے چلی گئی ہے۔ مجھے روحانی خوشی نصیب ہوئی۔ سینکڑوں لڑکیاں ہم نے تباہ کی ہوں گی۔ مگر تیرے بچ جانے سے میرا دل بہت مسرور تھا۔ اگر تو پھنس جاتی تو شاید میں اپنے آپ کو معاف نہ کرسکتی....

"بعد میں کیا ہوا کچھ مت پوچھ ـــــ یاور اپنی شکست برداشت نہیں کر سکتا میں نے اسے بہت سمجھایا تھا کہ تیرا خیال چھوڑ دے ـــــ اب تو ہاتھ نہیں آئے گی۔

مگر اس نے بھی قسم کھائی تھی کہ تجھے تباہ کر کے رہے گا ـــــ"

رملی کو خوف سے ایک جھرجھری آگئی۔ سر کو چکر آیا اور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔

بڑی دیر کے بعد رملی اپنے آپ کو سنبھال کر بولی۔

جیدہ.... جیدہ....

"اب تجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے رملی"۔ جیدہ بولی۔

"پہلے میں بھی تجھ سے نفرت کرتی تھی۔ مگر کل رات میں نے فیصلہ کیا تھا کہ تجھے فون کر کے سب کچھ بتا دوں گی۔ اس لیے کہ خود قدرت کو تیری بہتری منظور ہے۔ تجھ پر اللہ کا کوئی خاص کرم ہے۔ شاید تو اس کے پسندیدہ بندوں میں سے ہے۔ اس لیے وہ تجھے صاف بچا لے جاتا ہے ـــــ"؟

رملی کچھ بھی نہیں بول سکی۔ بے جی سامنے بیٹھی تھیں۔

تو جیدہ دوبارہ گویا ہوئی۔

"رملی تجھے تو علم نہیں ہوگا۔ کل رات تیرا شوہر ہمارے گھر آیا تھا"

"کیا ـــــ؟" رملی کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

"پہلے ساری بات سن لے۔

"کل رات دس بجے کے قریب باہر کی گھنٹی بجی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو معاذ وہاں کھڑا تھا۔ اس نے اپنی رعب دار آواز میں صرف اتنا پوچھا۔ یاور کہاں ہے" میں نے کہا بیڈروم میں ہے"۔ نہ اس نے اجازت طلب کی اور نہ مزید کچھ کہا۔ آگے بڑھ کے یاور کے کمرے میں گھس گیا یاور بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ اس نے یاور کا گریبان پکڑ کے اسے کھڑا کر دیا۔ اور پھر مکے اور تھپڑ مار مار کے

اس کا چہرہ بگاڑ دیا۔ یاور اس اچانک حملے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ویسے بھی جرائم پیشہ لوگوں میں دم خم تو ہوتا نہیں۔ اور جب یاور کی اچھی طرح مرمت کر چکا تو ایک فیصلہ کن انداز میں بولا۔

"میری بیوی کا دوپٹہ دے دو۔ میرا خیال ہے تمھارے لیے آج اتنا ہی کافی ہے۔"

یاور نے اپنی مقفل الماری میں سے دوپٹہ نکال کے اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

معاذ نے دوپٹہ جھپٹ کر لیا اور پھر غرا کر کہنے لگا۔

"رملی ایک عزت مند آدمی کی بیوی ہے اگر تمھارا یہ خیال ہے کہ اس واقعے کے بعد میں اس سے بدگمان ہو جاؤں گا۔ اور وہ تمھاری آلۂ کار بن جائے گی۔ تو بالکل غلط خیال ہے۔ میں تمھیں قانون کے حوالے بھی کر سکتا ہوں۔ تم جیسوں کو مزہ چکھانا خوب جانتا ہوں۔ مگر اس طرح تمھارے نام کے ساتھ میری بیوی کا نام بھی آ جائیگا۔ اس کو اس روحانی اذیت سے بچانے کے لیے آج میں خود آ گیا ہوں۔ مجھے امید ہے آج کے بعد تم اپنی گندی زبان ـــــ سے رملی کا نام بھی نہیں لوگے اور کبھی فون کرنے کی زحمت نہیں کروگے۔ بلکہ یہ شہر ہی چھوڑ جاؤ تو تمھارے حق میں بہتر ہے۔ ورنہ نتائج کے ذمہ دار تم خود ہو گے۔"

یہ کہا اور اسطرح گردن اٹھا کر باہر نکل گیا۔ جسطرح وہ دنیا کا طاقتور ترین اور ناقابل تسخیر مرد ہے۔ اس کے قدموں کی دھپ دھپ مجھے دیر تک سنائی دیتی رہی۔ یاور اپنے جبڑے پکڑ کر بیٹھ گیا اور میں دروازے کا پٹ پکڑے اسے دیکھتی رہ گئی۔

جیدہ رونے لگی۔ . . . .

"رملی پہلی بار میں نے تجھ سے حسد محسوس کیا۔ مجھے زندگی میں پہلی بار اندازہ ہوا کہ عزت مند اور عظیم مرد کیا ہوتا ہے ـــــ! گو یاور معاذ سے ہر لحاظ سے خوبصورت ہے مگر کتنا مکروہ اور قابل نفرت انسان ہے ـــــ؟"

جیدہ کے آنسو بہتے رہے ـــــ وہ رک رک کر بولتی رہی۔ رملی کا ہاتھ کانپتا رہا۔ اس کے ہونٹ پھڑکتے رہے۔ . . . . مگر وہ ہونٹ کاٹ کاٹ کر اپنے آنسو ضبط کرتی رہی۔

"رمو!" جیدہ اپنی بھیگی آواز میں یوں بولی جسطرح کوئی اپنی ہمدرد سہیلی کے گلے لگ جاتا ہے۔

"تو شاید نہیں جانتی جس مرد کا کردار نہیں وہ مرد نہیں۔ مرد کی شکل و صورت ثانوی چیز ہے جو بات مرد کو مرد بناتی ہے۔ وہ اس کا اونچا کردار ہے۔

"میں ساری رات روتی رہی۔ اور اللہ کے آگے فریاد کرتی رہی کہ اے کاش! میرا شوہر اندھا ہوتا ـــــ لولہ لنگڑا ہوتا۔ مفلوج ہوتا۔ مگر شریف آدمی ہوتا رزق حلال پہ یقین رکھتا۔ مجھے اپنی آبرو سمجھتا اور مجھے پریشان کرنے والے کا گلا گھونٹنے چلا آتا ـــــ"

جیدہ ہچکیاں لے لے کے رونے لگی۔

اب رملیٰ کی برداشت سے باہر ہوگیا۔ اس کا دل پھر ڈوبنے کو تیار ہو رہا تھا۔ موجو کھیلتا کھیلتا اس کے پاس آکر فون کی تار کھینچنے لگا۔

"رمو!"

جیدہ نے اچھی طرح رو کر کہا" میں پھر شاید تمھیں زندگی میں کبھی نہ مل سکوں۔ فون بھی نہیں کروں گی۔ کیونکہ مجھے لگ رہا ہے یا در یہ شہر چھوڑ جائیگا۔

" ویسے بھی وہ کافی عرصے سے امریکہ جاکر بسنے کے خواب دیکھ رہا ہے ـــــ مگر میری عبرتناک زندگی کو پیش نظر رکھنا۔ انہونی باتوں کے خواب دیکھنے والی لڑکیوں کا انجام بہت دردناک ہوتا ہے...... اور معاذ جیسے شوہر.....؟"

اچانک موجو نے تار زور سے کھینچ لی۔ ٹیلی فون کٹ گیا۔ اور جیدہ کی آواز ڈوب گئی رملیٰ کچھ اور سننا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اس میں کچھ اور سننے کی تاب بھی نہیں تھی۔ اس کے اندر عجیب سے طوفان اٹھ رہے تھے۔

بڑی مشکل سے اٹھی اور اپنے آپ کو گھسیٹتی ہوئی آکر بستر پر دھم سے گر گئی۔ دل قابو میں نہیں آرہا تھا۔ اور آنکھیں چھلکنے کو بے قرار تھیں ندامت کے ساتھ ساتھ احساس شکر گذاری اسے ادھ مؤا کیے دے رہا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ پیٹ پر رکھ لیا۔ اور دوسرا آنکھوں پر ـــــ

اسی وقت بے جی اندر آگئیں۔ بڑے تردد سے آکے اس کے سرہانے کھڑی ہوگئیں۔

رملیٰ نے سایہ سا محسوس کر کے جھٹ ہاتھ اٹھا لیا۔ اور بے جی کو دیکھ کر ڈر گئی۔

"کیا بات ہے دوہٹی ـــــ"

وہ گھوم کر سامنے آگئیں۔

"کچھ نہیں بے جی......" رملیٰ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"آج تو جیدہ نے بڑی لمبی بات کی۔ تو اتنی دیر نہیں بیٹھ سکتی۔ تو کیوں بیٹھ کر سنتی رہی۔"

"بس بے جی ـــــ" رملیٰ دوبارہ لیٹ گئی۔

"اس نے بات ہی ایسی شروع کر دی تھی"۔ یہ کہہ کر وہ خود گھبرا گئی۔

"کیا بات شروع کر دی تھی۔؟" بے جی کے لہجے میں اصرار تھا۔

"وہ جی...... بس بے جی۔ رملیٰ نے جلدی سے بات بنائی۔ بڑی بدنصیب ہے یہ جیدہ! آج اس نے مجھے اپنی شادی کی ساری کہانی بتائی ہے۔ اس کا شوہر بڑا کمینہ آدمی ہے۔ بچاری چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔ بس کیا بتاؤں بے جی آپ کو۔ اس وقت میرا دل بہت برا ہو رہا ہے۔ اس نے

مجھے بھی بہت رلایا۔"

"ہاں ـــــ جس دن میں نے اس کے شوہر کو دیکھا تھا۔ وہ مجھے اور طرح کا لگا تھا۔ بالکل اور طرح کا ـــــ مگر ڈر کے مارے۔ بولی نہیں کہ تم نوجوان لوگ جانے کیا کہہ دو ـــــ بچاری کو اپنے گھر بلا کے تسلی دینا تھی۔"

نہیں بے جی ـــــ یہ لوگ اس قابل نہیں کہ ان سے ملا جائے۔ پھر بولی۔

ہمیں کیا ضرورت ہے میاں بیوی کے جھگڑے میں پڑیں۔ اس کے نصیب ـــــ

"ہاں بچاری کے نصیب ـــــ ؟ ماں باپ سب کچھ دیتے ہیں۔ لڑکی کو نصیب نہیں دے سکتے۔۔۔۔۔ چ چ چ ۔۔۔۔

بے جی افسوس کرتے ہوئے جانے کو مڑیں۔ مگر رک کر بولیں "تیرا رنگ بالکل ہلدی کی طرح زرد ہو رہا ہے۔ تجھے گرم دودھ کی ایک پیالی لا دوں۔؟"

"لا دیں بے جی ـــــ"

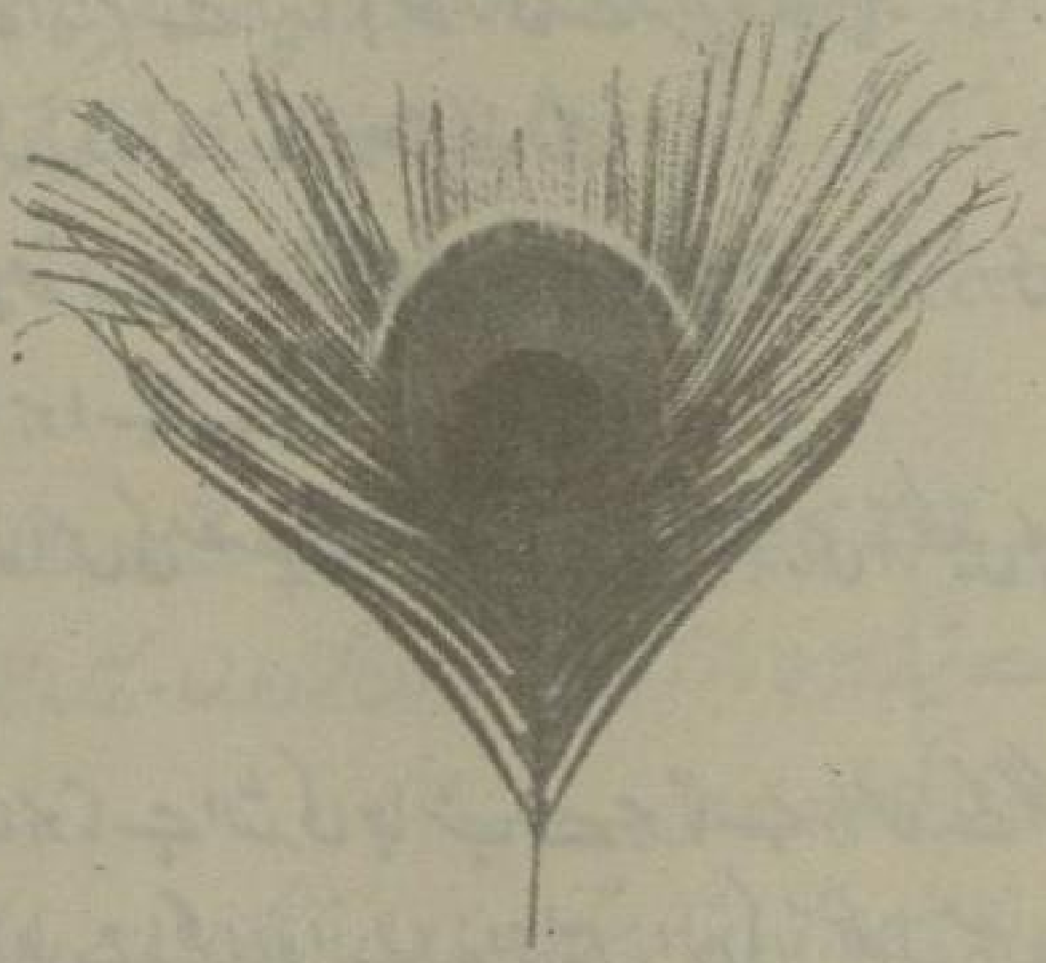
رملی تنہا رہنا چاہتی تھی۔ بالکل تنہا۔!

بے جی دودھ گرم کر کے لائیں اور پیالہ اس کے پاس رکھ گئیں۔ تھوڑی دیر بعد رملی بستر سے اٹھی۔ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی الماری کے پاس گئی۔ دھڑکتے دل سے الماری کھولی ـــــ سامنے ہی وہ سرخ پھولوں والا دوپٹہ پڑا تھا۔ دوپٹے کا گولہ بنا ہوا تھا۔

تو جیدہ کی ہر بات کی تصدیق ہو گئی۔

معاذ نے اس سے کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ معاذ کو صرف یہ پتہ چلا تھا کہ ٹیلی فون سن کے رملی ہمیشہ بے ہوش ہو جاتی ہے ـــــ

آج رملی کو اتنی شرم آئی۔ اتنی شرم آئی کہ اس کا دل چاہا۔ وہ زمین کے اندر جا کے چھپ جائے۔



کبھی احساس سو جاتا ہے. کبھی دل سو جاتا ہے. سونے جاگنے کی کیفیت ہمیشہ زندگی پر طاری رہتی ہے۔ پے در پے عجیب و غریب حالات رونما ہونے لگیں تو انسان اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیتا ہے۔ رملی کے ذہن نے مزید سوچنے سے انکار کر دیا۔ اس لیے وہ دم سادھے یوں پڑی رہی جسطرح وہ صدیوں کی بیمار ہے۔ اور اس گھر میں کتنا اچھا دستور تھا۔ بے جی روایتی ساس نہیں تھیں، بہت سی نندیں، دیورانیاں اور جیٹھانیاں وقت بے وقت دخل اندازی نہیں کرتی تھیں۔ کوئی اس کے گم صم موڈ اور ہر دم روتی آنکھوں کا راز جاننے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ دن اور رات معمول کے مطابق بیت رہے تھے۔

اور رملی گزرتے دن رات کا کوئی سرا پکڑ کے ساتھ چلنے کے بارے میں ہی سوچتی رہ جاتی۔ اس روز صبح ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو وہ دم سادھے لیٹی رہی۔ ٹیلی فون کا خوف جاتا رہا تھا۔ کالی گھٹائیں جو قسمت کے آسمان پر نمودار ہوئی تھیں اپنے آپ چھٹ گئی تھیں اور ہر خوف اپنے آپ دور ہو گیا تھا۔ ہاں اب ضمیر کی خلش بے چین رکھتی تھی۔

بے جی نے فون اٹھایا۔ تھوڑی سی بات کی ——— اور پھر آ کر اس کے سرہانے کھڑی ہو گئیں۔ رملی اپنا منہ نرم تکیوں میں چھپائے لیٹی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اسے احساس ہوا کوئی سرہانے کھڑا ہے۔ تکیے ہٹا کے جلدی سے دیکھا تو بے جی تھیں۔

بے جی چپ تھیں اور ان کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔

رملی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

بے جی نے آرام سے اپنا ہاتھ رملیٰ کے سر پر رکھ دیا۔
رملیٰ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔
اس نے ہاتھ بڑھا کر بے جی کا کانپتا ہوا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور ڈری سہمی آواز میں پوچھا۔
"اب کیا ہوا ہے بے جی ——"؟
بے جی نے اس کی مضطرب آنکھوں میں اپنی بوڑھی آنکھیں پھنسا دیں اور ولیوں والے انداز میں بولیں۔
"جو کچھ بھی ہوتا ہے اللہ کی جانب سے ہوتا ہے۔ اس کے حکم کے بغیر تو پتہ بھی نہیں ہل سکتا"
رملیٰ اسی طرح پاگلوں والے انداز میں ان کی آنکھوں میں دیکھتی رہی اور بات سمجھنے کی کوشش کرتی رہی۔
وہ دوسری طرف سے آکے رملیٰ کے ساتھ اس کے پلنگ پر بیٹھ گئیں۔ اور کہنے لگیں۔
زندگی اور موت کا مالک وہی ہے۔ وہی فیصلے صادر کرتا ہے اور انسانوں کو اس کے فیصلوں کے آگے سر جھکانا پڑتا ہے۔ یہی بندگی ہے اور یہی کچھ اس دنیا میں دن رات ہوتا رہتا ہے۔
رملیٰ نے سانس روک لی۔
پُتر...... بے جی نے آہستہ سے رملیٰ کو اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔
"ابھی تیری بڑی بہن کا فون آیا تھا۔ تیری امی کا انتقال ہو گیا ہے....."
"امی ——" رملیٰ نے ایک چیخ ماری اور بے جی سے لپٹ گئی۔
کئی دنوں سے جی کیسا اجڑا اجڑا تھا۔ دنیا کیسی بری بری لگ رہی تھی، ذہن کتنا پژمردہ تھا۔ جیسے ابھی کچھ اور ہونے والا ہے۔ وہ اپنی ہی تپش میں جلتی رہی —— اپنے آپ جزا و سزا کا حساب کرتی رہی۔ امی جان کی طرف دھیان گیا ہی نہیں......
امی جان نے اس روز کتنی حسرت سے کہا تھا۔
"رملیٰ میں تم سے کوئی ضروری باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ بیٹی اگر تمہارے پاس وقت ہو تو رک جاؤ ——"
مگر اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ اپنی ماں کی بات سننے کا وقت نہیں تھا۔ ماں کچھ کہنا چاہتی تھی۔ وہ ماں کی پیاری بیٹی تھی۔ ماں اس کے آگے دل کے ورق کھولنا چاہتی تھی۔ پتہ نہیں ماں جاتے ہوئے کیا کہنا چاہتی تھی —— مگر اس دن وہ خود طوفانوں سے گزر رہی تھی۔ اس نے ماں کی پروا نہیں کی تھی۔ غور سے اپنی ماں کا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ ماں کے ٹوٹے ہوئے لہجے پر غور نہیں کیا تھا۔ ماں کی بجھی آنکھیں صاف کہہ رہی تھیں۔ ذرا کی ذرا رک کر مجھے غور سے دیکھ

لو! پھر میں نہیں ہوں گی۔ ضعیف مائیں خزاں زدہ زرد پتے کی طرح ہوتی ہیں۔ شاخ کے ساتھ لگا رہے تب بھی کانپتا رہتا ہے ——— نظریں اس پر جمائے رکھو تو بھی گرتے وقت پتہ نہیں لگنے دیتا ——— ڈھیر سارے دکھ ——— ڈھیر ساری محرومیاں ——— ڈھیر سارے پچھتاوے رملی کی چیخوں سے نکلنے لگے۔

"پتر ———" بے جی نے اسے پیار سے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ میں معاذ کو فون کر دوں۔ ہمیں جلدی پہنچنا چاہیئے۔ رونے کو تو عمر پڑی ہے۔ اٹھ میری بچی تیار ہو جا ———"

رملی کو کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ مگر دھندلائی آنکھوں سے وہ کھڑی ہو گئی . . . . .

اور پھر اپنی آنکھوں سے وہ سب دیکھا۔ جس کا کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ پتہ نہیں کچھو باجی کو دیکھ کر رملی کے ضبط کے بند کیوں ٹوٹ گئے۔ دونوں بہنیں گلے لگ کر کتنی دیر تک روتی رہیں۔

آج رملی کو سمجھ آئی کہ غم کیا ہوتا ہے۔ اور ہجوم غم میں کسی غمگسار کی ضرورت کیوں محسوس ہوتی ہے۔ اور پھر جب بھری دنیا میں ماں بھی اٹھ کے چل دیتی ہے۔ تو تنہائی کا احساس کس طرح گھائل کر کے رکھ دیتا ہے۔

پتہ نہیں کس طرح گھڑیاں جلدی جلدی بیت گئیں۔ اور پھر جب سب لوگ امی جان کو ان کی آخری منزل پہ چھوڑ کر آ گئے ——— تو سارے گھر نے اداسیوں کی چادر اوڑھ لی۔ ایسے میں جب سارے گھر والے رو رو کر بیدم ہو رہے تھے۔ شان بھائی گھر کے اندر داخل ہوئے اور انہوں نے روتی ہوئی کسریٰ باجی کو اشارے سے بلایا۔ رملی نے اپنی سوجی ہوئی آنکھیں شان بھائی کے چہرے پر گاڑ دیں۔ ان کے چہرے پر سفاکی اور سختی تھی۔ جیسے کوئی انتہائی ناخوشگوار فرض ادا کر کے آئے ہوں۔ کسریٰ باجی ان کے اشارے پر یوں بھاگ کر گئیں۔ جیسے ان کے اشارے کی غلام ہوں۔ شان بھائی نے انہیں کچھ کہا۔ اور کچھو باجی جو رو رو کر بے حال ہو رہی تھیں۔ آنکھیں صاف کر کے باورچی خانے کے اندر چلی گئیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ چائے کا ٹرے پکڑے باہر نکلیں۔ اور اس کمرے میں چلی گئیں جہاں شان بھائی بیٹھے تھے۔ رملی کو جانے کیوں اختلاج ہونے لگا۔ عورتوں کے ہجوم سے اٹھ کر وہ بھی اندر آ گئی۔ اندر آ کر دیکھا شان بھائی بڑی شان سے نیم دراز تھے اور باقاعدہ سگریٹ پی رہے تھے۔ اور کچھو باجی پیالی میں چائے بنا کر دے رہی تھیں۔ رملی نے انہیں غور سے دیکھا اور پھر مروت کے مارے سلام کر دیا۔ انہوں نے اشارے سے سلام کا جواب دیا۔ اور کچھ بھی نہیں کہا ——— نہ امی جان کا افسوس کیا نہ تسلی کے دو بول کہے۔ بلکہ جلدی سے چائے کی پیالی پکڑ لی۔ اور پینے لگے۔ رملی دل پکڑ کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ اور بڑی حسرت سے کچھو باجی کی مرجھائی ہوئی شکل دیکھنے لگی۔

چائے پینے کے بعد شان بھائی ایک دم سے کھڑے ہوگئے۔ اور بولے۔
"کسری میرا سوٹ کیس بند کر دو، میں واپس جا رہا ہوں۔"
"ابھی سے ——"؟ کچھو باجی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔
"کیوں اب کیا رہ گیا ہے ——"؟ انہوں نے اسطرح پوچھا جیسے کہہ رہے ہوں ۔ تمھاری ماں کو دفنانے کے بعد دنیا میں کون سا کام رہ گیا ہے۔ اور میرا یہی احسان کیا کم ہے!
"ابھی تو ساری برادری بیٹھی ہے۔" کچھو باجی نے آہستہ سے کہا۔
"تو میں کیا کروں ——"؟ انہوں نے رعونت سے کہا۔ تمھاری برادری کو تو ابھی پلاؤ کا انتظار ہو گا۔ مگر میں اب اس بک بک سے گھبرا گیا ہوں۔ کل رات سے جاگ رہا ہوں۔ گھر جا کے آرام کروں گا۔"
"بس آج کی رات ٹھہر جاؤ شان ——" کچھو باجی نے لجاجت سے کہا۔ "کل صبح بے شک چلے جانا۔"
"آج رات ٹھہر کر میں کیا کر لوں گا۔" انہوں نے غصے سے کہا۔ "میں الٹی سیدھی رسموں کا قائل نہیں ہوں۔"
"لیکن سوئم پر آپ کا ہونا بہت ضروری ہے۔"
"سوئم تو پرسوں ہے۔ پرسوں دیکھا جائیگا۔"
شان بھائی کھڑے ہوگئے اور خود ہی اپنا سوٹ کیس اٹھا کے کپڑے درست کرنے لگے۔
کچھو باجی نے ان کے ہاتھ سے سوٹ کیس لے لیا۔ اور کپڑے ٹھیک کر کے لگانے لگیں۔
رملی یہ منظر نہ دیکھ سکی۔ اٹھ کر ایک دم باہر آگئی۔ اسی وقت معاذ گھر کے اندر داخل ہوا۔ اس نے اباجی کو سہارا دے رکھا تھا۔ انہیں لا کے ان کے کمرے میں لٹا دیا۔ اور جس وقت ان کے کمرے سے باہر نکلا تو شان بھائی اپنا سوٹ کیس اٹھا کے باہر جا رہے تھے۔ معاذ نے آگے بڑھ کر پوچھا ——
"یار اتنی جلدی جا رہے ہو ——"؟
مگر شان بھائی نے کوئی جواب نہ دیا۔ رعونت سے گردن اٹھائی اور چلے گئے۔
رملی کو شان بھائی کے اس انداز پر بے حد غصہ آیا —— پتہ نہیں اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں۔ جیسا بھی ہے معاذ اس کا شوہر ہے۔ اور انہیں اس کے ساتھ عزت سے پیش آنا چاہیئے۔ پتہ نہیں کس بات کا غرور ہے انہیں ——؟
شان بھائی کے جانے کے بعد کچھو باجی پھر آکر عورتوں میں بیٹھ گئیں اور زار و قطار

رونے لگیں۔

سب عورتیں آگے بڑھ کر انہیں تسلی دینے لگیں —— ان کی صورت دیکھ کر رملی نے بھی دوبارہ رونا شروع کر دیا —— اب پورے ہجوم میں صرف کھو باجی اور رملی رو رہی تھیں اور ساری رشتہ دار عورتیں بلائیں لے لے کر انہیں چپ کرا رہی تھیں۔ روتے روتے رملی کو خیال آیا۔ ماں کا دکھ تو اپنی جگہ ہے اور اس دکھ کو عذر دے کر وہ دونوں اپنے اپنے دکھوں کو رو رہی تھیں۔ ماں تو انہیں رونے کا بہانہ دے گئی تھی۔ اب کون جانے کہ کس کس زخم کے ٹانکے کھل گئے تھے۔ اک ذرا درد کی ہوا چلتی ہے تو محرومیوں کے کئی دریچے وا ہو جاتے ہیں۔ عورتیں اپنے دکھ اپنی جھولیوں میں بھر کے یونہی بوجھل بوجھل پھرتی رہتی ہیں۔ پھر اک دن . . . . کوئی سا بہانہ بنا کے اپنے اپنے آنسو بہا دیتی ہیں۔ کون کسی کے لیے روتا ہے —؟ ہر کوئی اپنے لیے روتا ہے۔ ہر کوئی رونے کا بہانہ ڈھونڈتا ہے۔ ہر کوئی آنکھوں میں ندیاں چھپائے پھرتا ہے۔

تھوڑی دیر بعد رملی اٹھ کے کھو باجی کے پاس جا بیٹھی اور جب دونوں بہنوں کی نظریں ملیں تو رملی ایک دم کھو باجی سے لپٹ گئی۔ اور دونوں بہنیں پھر چیخ چیخ کر رونے لگیں۔ دیکھنے والے تو صرف یہ جانتے تھے کہ زخم تازہ ہے۔ مگر وہ دونوں ایک دوسرے کا درد جان رہی تھیں۔

روتے روتے رملی نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ معاذ ہر ایک کو بڑی محبت سے اندر لا کر بٹھا رہا تھا۔ کسی کو پانی پلا رہا تھا۔ کسی کو تکیہ لگا کے دے رہا تھا۔

رملی روتی روتی ٹھٹھک گئی۔ اور غور سے معاذ کا چہرہ دیکھنے لگی۔ آج پہلی بار اسے معاذ کا چہرہ بالکل بدصورت نہیں لگا تھا۔ وہ کتنا اچھا لگ رہا تھا اسے —— ہمدردی اور محبت کی تصویر بنا ہوا۔ ہر ایک سے جھک جھک کے انکساری سے مل رہا تھا۔ ہر ایک کو تسلی دے رہا تھا۔ سارے گھر کو اپنے بازوؤں میں لے لینا چاہتا تھا۔ اور اسی طرح بے جی بھی محبت اور مروّت کی تصویر بنی ہوئی سب بہنوں کو باری باری پیار کر رہی تھیں۔ رملی کے آنسو اس کے رخساروں پر ٹھٹھک گئے۔ اور وہ سوچنے لگی۔ جینے کے لیے انسانی ہمدردی درکار ہے یا حسن یوسف کی ضرورت ہے ——؟

اس بات کی سمجھ اسے سوئم کے روز آئی۔ کیونکہ وہ دیکھ رہی تھی کہ شان بھائی کے جانے کے بعد کھو باجی کی حالت نیم بسمل کی سی ہو گئی تھی۔ ہر رشتے دار استفسار کر رہا تھا کہ تیرا شوہر اتنی جلدی کیوں چلا گیا ——"؟ اور ہر رشتے دار کے آگے وہ بچاری کوئی عذر تراش کے رکھ دیتی۔ کسی کو کہتی ان کی طبیعت بہت خراب تھی۔ کسی سے کہتی کل سے انہیں شدید بخار ہے —— کسی سے کہتی اشد ضروری میٹنگ تھی۔ مگر وہ یہ بات کسی کو نہ بتا سکی کہ اس کا خوبصورت شوہر یہاں ایک پل ٹھہرنے کا روادار نہیں تھا۔ اور پتہ نہیں وہ اسے کسطرح منت سماجت کر کے ساتھ لائی تھی۔

دو دن کھپو باجی شان بھائی کو چپکے چپکے فون کر کے اصرار کرتی رہیں کہ وہ سوئم کے روز ضرور آجائیں۔ پھر آخر وقت تک راہ دیکھتی رہیں۔ مگر وہ نہیں آئے۔ باہر عورتوں کے درمیان بیٹھی بظاہر وہ گٹھلیوں پر کلمہ طیبہ پڑھ رہی تھیں۔ مگر نظریں باہر والے دروازے پر لگی تھیں۔ کسی موٹر کی آواز آتی تو منتظر ہو بیٹھتیں کہ جیسے ابھی کوئی آکے بتائے گا شان بھائی آگئے ——— مگر شان بھائی نہیں آئے۔ پھر گٹھلیوں کے ساتھ ساتھ ان کے آنسو سفید چادر پر گرنے لگتے۔ اور وہ سوچتیں۔ یہ کیسا رشتہ ہے خدایا! کہ دنیاداری کی خاطر بھی شوہر بیوی کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ بعض عورتیں ایسے میں کچوکے لگانے سے باز نہیں آتیں۔ اور جو کوئی منہ پھیر کے پوچھ لیتی ———

"اے تیرا شوہر آج بھی نہیں آیا ———"

تو وہ بھیگی پلکیں جھکا کر پھر من گھڑت کہانیاں انھیں سنانے لگتیں۔ کہ چھٹی نہیں مل سکی۔ دفتر میں ایک ضروری میٹنگ تھی وغیرہ وغیرہ ———

تب رملی نے سوچا ساری نیک عورتیں تمام عمر اپنے شوہروں پر پردے ڈالتی رہتی ہیں۔ پتہ نہیں کیوں ——— ؟ میکے آکر صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتیں کہ آپ نے جو شوہر مجھے ڈھونڈ کر دیا تھا وہ نہ میرے میکے آنا پسند کرتا ہے اور نہ میکے کے رشتہ داروں سے ملنا پسند کرتا ہے۔ مگر آپ کا دیا ہوا تحفہ ہے۔ اس لیے میں نے کلیجے سے لگا کے رکھا ہوا ہے۔

اسی رات شان بھائی کا فون آگیا۔ انہوں نے کسریٰ باجی کو حکم دیا کہ وہ علی الصبح پنڈی کے لیے روانہ ہو جائیں۔ کسریٰ باجی نے بہت کہا۔ مگر انہوں نے ایک نہ مانی۔ پتہ نہیں انہوں نے فون پر اور کیا کہا کہ کسریٰ باجی اپنا سامان سمیٹنے لگیں۔ دوسری صبح جاتے ہوئے وہ بلک بلک کر رو رہی تھیں۔ وہ یہاں سوا مہینہ رہنا چاہتی تھیں۔ ایک بڑا صندوق کپڑوں کا بھر کر لائی تھیں۔ مگر انہیں اب ماں کے گھر رہنے کی اجازت نہ تھی ——— انہیں رونے اور دل کی بھڑاس نکالنے کی اجازت نہ تھی۔ اس لیے وہ چلی گئیں اور جاتے جاتے رملی کی آنکھیں بھی کھول گئیں۔

تھوڑی دیر بعد بے جی اور معاذ نے گھر جانے کی اجازت چاہی تو رملی بے اختیار بولی۔

"آج میں بھی گھر چلوں گی بے جی۔ کل پھر آجاؤں گی۔"

ابھی تم رہو دو دن ——— بے جی نے پیار سے کہا۔ تمھارے سارے رشتہ دار یہیں ہیں۔

"نہیں بے جی میرا جی کچھ اچھا نہیں۔ یہاں تو رات کو ایک پل بھی نیند نہیں آتی۔ آج گھر جا کے اطمینان سے سو جاؤں گی۔ کل صبح آجاؤں گی۔ اور پھر معوذ بھی آپ کو تنگ کرتا ہوگا۔"

پہلے دن ہی بے جی معوذ کو اپنے ساتھ لے گئی تھیں۔ یہ کہہ کر کہ بچہ یہاں تمھیں تنگ کرے گا۔ میں اسے رکھ لوں گی ———"

معاذ چپ چاپ کھڑا ساس اور بہو کا مکالمہ سنتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد رملی بھی آکے

موٹر میں بیٹھ گئی۔

جس وقت رملیٰ اپنے بیڈ روم میں داخل ہوئی۔ اس کے ذہن پر کچھو باجی کا اداس مرجھایا ہوا اور رنجیدہ چہرہ تھا۔ لڑکیاں کتنی مجبور ہوتی ہیں وہ دل میں سوچ رہی تھی۔ اور اب اسے سمجھ آرہی تھی کہ شوہر کا گھر اتنی جلدی چھوڑ دینا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ اور اولاد کتنی بڑی مجبوری ہوتی ہے۔

اور جب معاذ اس کے کمرے میں آیا۔ تو بے اختیار بولی۔

"یہ جو شان بھائی ہیں نا؟ بڑے عجیب آدمی ہیں"۔ معاذ نے حیران ہوکر رملیٰ کیطرف دیکھا۔ تو جو کچھ شان بھائی نے ان دنوں کیا تھا۔ رملیٰ نے سب کہہ سنایا۔ غالبًا پہلی مرتبہ وہ معاذ سے بیویوں والے انداز میں کوئی ذاتی بات کہہ رہی تھی۔

اور معاذ برابر اسکا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

ساری بات سنا کر آخر میں بولی۔

"آخر اتنا غرور کیوں ہے شان بھائی کو اپنے آپ پر —— مرد کا خوبصورت ہونا ہی تو ایک خوبی نہیں ——"

معاذ ذرا سا مسکرایا۔

رملیٰ اپنے ہی فقرے سے چونک گئی۔ کب —— کس وقت —— کس نے یہ فقرہ اس کے ذہن میں ڈالا تھا ——؟ یہ فقرہ شاید اندر سے اُگا تھا اور اس فقرے کو اندر اُگانے کے لیے وہ کتنے مرحلوں سے گزری تھی۔ رملیٰ نے خود ہی شرمندہ ہوکر سر جھکا لیا۔

سر جھکایا تو معاذ کے رویے پر غور کرنے لگی ——

معاذ تب سے خاموش تھا مگر اور ہی طرح خاموش تھا!

کتنی باتوں کا احساس جاگا۔ وہ سر جھکا کے آنسو بہانے لگی۔ اسی وقت بے جی موجو کو تھامے ہوئے اندر آئیں۔

"ہائے وو ہٹی تو پھر رو رہی ہے"۔ انھوں نے قریب آکے اسے چمکارا۔ "رات کے وقت نہیں روتے مرنے والوں کو تکلیف ہوتی ہے"۔

("جو جیتے جی مر گئے ہوں بے جی —— وہ رات کے وقت کیا کریں —— کہ رات ہی تو ادراک بنکر آتی ہے"۔)

رملیٰ سسکیاں لینے لگی۔ معاذ اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

بے جی اس کے پاس بیٹھ گئیں۔

"میں جانتی ہوں ماں کی کمی کبھی پوری نہیں ہو سکتی۔ ماں کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔ مگر بیٹا اب ان کے بغیر جینا سیکھ۔ اللہ بخشے بہت نیک تھی تیری ماں —— پڑھ پڑھ کر اسے ثواب پہنچایا کرو۔ اولاد کی طرف سے یہی تحفہ وہاں کام آتا ہے۔ آنسو بہا کر اپنے آپ کو بیمار کر لو گی۔ اور انہیں تکلیف پہنچاؤ گی۔"

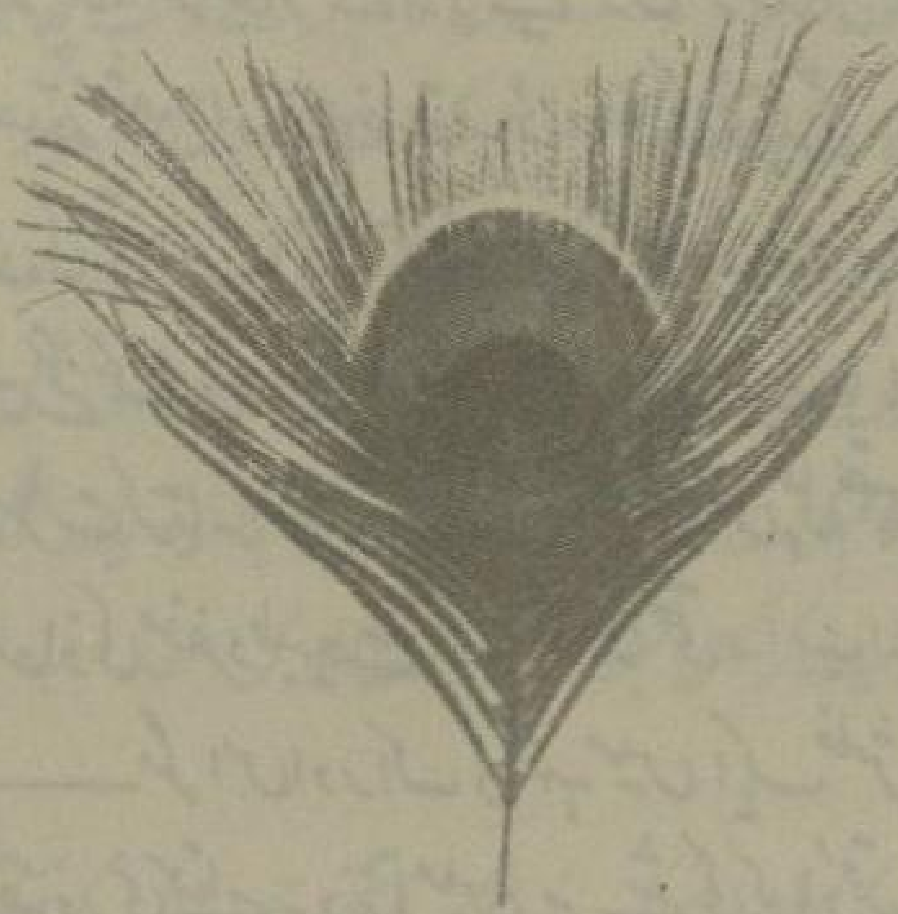
روتے روتے رملی نے اپنا چہرہ اٹھایا۔ اور پھٹ پڑی۔

"بے جی آپ میری ماں بن جائیے۔ بے جی آپ میری ماں بن جائیے۔"

"میں تیری ماں ہی ہوں پگلی۔" بے جی نے اسے سینے سے لگا لیا۔

"نہیں بے جی آپ میری غلطیاں معاف کرنے والی ماں بن جائیے۔ میں نے آپ کو کبھی نہیں بتایا کہ میں کیا کیا غلطیاں کرتی ہوں۔ کیا کیا بے ہودگیاں کرتی ہوں۔ اب میری ماں نہیں رہی۔ اب کون مجھے معاف کرے گا۔ آپ . . . . . آپ میری ماں بن کے میری ہر غلطی کو معاف کر دیا کریں۔"

"معافیاں بتا کر نہیں دی جاتیں بیٹی —— بزرگوں کا کام چھوٹوں کو معاف کرنا ہے۔ اور بزرگ چپ چاپ یہ سب کرتے رہتے ہیں۔ آج کے بعد تو میری بیٹی ہی ہے۔" یہ کہہ کر بے جی نے رملی کو گلے سے لگا لیا۔



رملیٰ نے دھیرے سے دروازہ کھولا اور آ کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ معاذ بڑے انہماک سے اپنا کام کر رہا تھا اور دھیمی موسیقی کمرے میں زندگی کا احساس دلا رہی تھی۔

رملیٰ کو دیکھا تو معاذ نے پنسل ہاتھ سے رکھ دی اور دوسرا ہاتھ بڑھا کے موسیقی بند کر دی۔

رملیٰ عام طور پر کام کے دوران معاذ کی سٹڈی میں نہیں آیا کرتی تھی۔ آج اس کو یوں آتے دیکھا تو معاذ فکر مند سا ہو گیا۔

رملیٰ آ تو گئی ـــــ مگر آ کر ٹھٹھک گئی۔ اس کا ارادہ بھی اندر آنے کا نہیں تھا۔ پتہ نہیں کون سی طاقت اسے کھینچ کر اندر لے آئی تھی۔ کتنے دنوں سے یہ ہو رہا تھا۔ وہ رات گئے تک بستر پر لیٹی ہلکی ہلکی موسیقی کی آوازیں سنتی رہتی اور کروٹیں بدلتی رہتی ـــــ زندگی کے ورق اتنی جلدی پلٹ رہے تھے۔ کہ ایک پل بھی سوچنے کی مہلت نہیں ملی تھی۔ اب جب زندگی میں ایک بار پھر ٹھہراؤ آ گیا تھا تو اچانک اسے اندازہ ہوا۔ انجانے میں جیون کی راہیں بدل گئی تھیں۔ گو ساتھی نہیں بدلے تھے۔ جب رملیٰ کو بے ہوشی کے دورے پڑنے شروع ہوئے تھے۔ معاذ نے اپنا بستر سٹڈی میں لگا لیا تھا۔ وہیں سے راتوں کو اٹھ اٹھ کے رملیٰ کو دیکھا کرتا تھا۔ یوں تو وہ ہمیشہ سے رات گئے تک اپنی سٹڈی میں بیٹھ کر کام کرنے کا عادی تھا۔ مگر وہ اپنی راتیں بھی وہیں بسر کرنے لگے گا۔ رملیٰ نے کبھی سوچا بھی نہ تھا ـــــ

جن دنوں امی جان فوت ہوئیں۔ وہ ماڈل ٹاؤن آتی جاتی رہی۔ اباجی شدید بیمار رہے۔ عجیب طرح زندگی کے ورق بکھرے رہے ـــــ

چاروں طرف سوائے پریشانیوں کے کچھ نہ تھا۔ اس لیے اسے معاذ کے رویے

پر غور کرنے کا موقع ہی نہ ملا۔ مگر معاذ کے رویے میں کوئی غیر معمولی تبدیلی آتی تو وہ غور بھی کرتی۔ وہ ہمیشہ کی طرح مستعد مشفق اور نرم خو تھا۔ امی جان کی فوتیدگی پر اس نے اس کے میکے والوں کی جس طرح دلدہی کی تھی اور اباجی کو جسطرح سہارا دیا تھا۔ سارا زمانہ عش عش کر رہا تھا۔ روز ایک ڈاکٹر لیکر جاتا۔ رات گئے تک وہاں بیٹھا رہتا۔ جب رملی میکے جانا چاہتی۔ فوراً لیکر پہنچ جاتا۔ اس کی بہنوں کی بے حد عزت کرتا۔ اب تو رملی کی آنکھیں کھل چکی تھیں۔ اب وہ انسانوں کا فرق جان چکی تھی۔ اب وہ معاذ کی منفرد طبیعت کو سمجھ رہی تھی۔ اب اسے پتہ چل رہا تھا کہ مرد مرد میں بھی فرق ہوتا ہے۔ —— مگر اس ادراک کی تہہ میں ایک خلش بھی تھی۔ آخر کچھ جاننے کے لیے کچھ لٹنا کیوں ضروری ہوتا ہے۔ دنیا میں ہر شے کی کوئی قیمت کیوں ہے —— ؟

کئی راتوں سے وہ سکون سے نہیں سو سکی تھی۔ اس کی زندگی میں جو تبدیلی آ گئی تھی اس کا بری طرح سے احساس ہو رہا تھا۔ کئی راتوں سے اس کا دل چار ہا تھا۔ وہ معاذ کے کمرے میں جائے۔ جھانک کر دیکھے وہ کیا کر رہا ہے۔ اس کے اس رویے کی وجہ جانے —— ؟ مگر ہر بار شرم اس کے قدم پکڑ لیتی۔ وہ تو اپنے آپ کبھی اس کے کمرے میں نہیں جایا کرتی تھی۔ اب وہ کیا کہے گا !

اور پھر کس برتے پر جائے —— ؟

لیکن آج جانے کس جذبے کے تحت اٹھی —— اور ایک دم دروازہ کھول کے اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ معاذ نے جب موسیقی بند کر کے استفسارانہ انداز میں اس کی جانب دیکھا تو اسکے اوسان خطا ہو گئے۔ جو کچھ سوچ کر آئی تھی ذہن سے نکل گیا۔

تھوڑی دیر معاذ اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ جب وہ کچھ نہیں بولی۔ تو پھر خود ہی پوچھا۔

خیریت —— ؟

جی —— رملی شرمندہ سی ہو گئی۔

"بہت دیر ہو گئی آپ کو کام کرتے ہوئے۔ چائے یا کافی کی ضرورت ہو تو لا دوں۔"

معاذ زور سے ہنس پڑا۔

بہت دن ہو گئے مجھے اسطرح کام کرتے ہوئے۔ تم نے پہلے کبھی چائے یا کافی کا نہیں پوچھا تھا۔" ؟

رملی اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔ معاذ نے بالکل سادگی سے یہ بات پوچھی تھی۔ مگر رملی کو نہ جانے کیوں یہ سب طنز لگا۔

اسے چپ دیکھکر معاذ خود ہی بولا۔

"نہیں رملی! تمہارا شکریہ —— میں کام کرتے وقت کچھ بھی کھانا پینا پسند نہیں کرتا۔"
کس قدر کھردرا انداز تھا شکریہ ادا کرنے کا۔ اس انداز میں نری غیریت تھی۔ رملی دکھ کے اندھیرے میں اترتی گئی۔ مگر نہ جانے کیوں وہیں کھڑی رہی ——
وہاں کھڑے ہونے کا کوئی جواز نہ تھا۔ اور جو بات کہنے آئی تھی۔ باوجود کوشش کے کہی نہ جا رہی تھی۔ معاذ سر جھکا کے کام کرنے لگا اور وہ کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ اس کمرے میں ہمیشہ ایک دیوان پڑا رہتا تھا۔ جس پر لیٹ کر کبھی کبھار معاذ مطالعہ کرتا تھا۔ اب اسی دیوان پر معاذ نے اپنا بستر لگا رکھا تھا۔
رملی اپنے آپ کو ملامت کرنے لگی۔ اتنی ہمت کر کے آ تو گئی تھی۔ مگر آگے بات نہیں چلائی جا رہی تھی۔ اگر ان دو سالوں میں معاذ سے کھل کر بولنے اور لڑنے کی عادت پڑ جاتی تو کم از کم اس وقت لڑ کر ہی دل کی بھڑاس نکال لیتی۔ مگر اسے تو لڑنے کا ڈھنگ بھی نہیں آتا تھا۔ اور لڑتی بھی تو کیسے؟ معاذ تو لڑائی کا موقع ہی نہ دیتا تھا۔
کافی دیر بعد جب معاذ نے سر اٹھایا تو وہ وہیں دروازے پر جمی کھڑی تھی۔ معاذ کے کچھ پوچھنے سے پہلے بولنا چاہا ——
"آپ . . . آپ . . . وہ ہکلائی . . . . . آپ اب اس کمرے میں سویا کریں گے؟"
"ہاں ——" معاذ نے سر جھکا لیا۔ "آج کل کام بہت زیادہ ہوتا ہے"۔
"پہلے بھی جب کام زیادہ ہوتا تھا۔ آپ کام ختم کر کے ادھر آ جاتے تھے۔"
معاذ نے اپنی تیز نظریں رملی کے چہرے پر گاڑ دیں اور یک ٹک اسے دیکھنے لگا وہ ہونٹ کاٹنے لگی۔
معاذ تھوڑی دیر تک اسے اس انداز میں دیکھتا رہا۔ اسے اس چہرے میں کوئی تبدیلی سی محسوس ہوئی۔ ہنس کر بولا۔
"پہلے مجھے بہت سی باتوں کا پتہ نہیں تھا۔"
رملی کا دل دھڑکنے لگا۔ معاذ سر جھکا کے پھر سے لکیریں کھینچنے لگا۔ رملی دہلیز پکڑے کھڑی رہ گئی۔
"آپ . . . "۔ تھوڑی دیر بعد وہ ہمت کر کے بولی۔ "آپ . . . مجھ سے ابھی تک خفا ہیں۔"
"نہیں ——" معاذ نے اپنا سر پھر اٹھایا۔ خفا نہیں ہوں رملی۔ تمہاری عمر کی لڑکیوں سے ایسی غلطیاں ہو ہی جاتی ہیں۔ ابھی تمہاری عمر کیا ہے —— ؟ رفتہ رفتہ زندگی کو سمجھ جاؤ گی۔ میں

تمھیں زندگی کو سمجھنے کا وقت دینا چاہتا ہوں۔ میں جلد باز آدمی نہیں ہوں۔ مگر —— وہ ذرا رکا۔ پھر گویا ہوا۔ "یہ جان کر کہ تم مجھے پسند نہیں کرتی ہو۔ میں تمھارے قریب نہیں آنا چاہتا۔ خواہ مخواہ تمھیں پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ جتنا تنگ کیا وہ لاعلمی میں کیا ——"؛

رملی کے گلے میں پھر ایک گولا سا اٹک گیا۔ اس نے بے اختیار ہو کر کچھ کہنا چاہا۔ مگر کچھ بھی نہ کہہ سکی۔

اگر گلے میں گرداب بن جائے تو آنکھوں میں بے اختیار پانی امنڈ آتا ہے۔ یہ انسان کی بے بسی کی انتہا ہوتی ہے۔ وہ دروازہ پکڑے کھڑی رہی ——

کہنا چاہتی تھی ——

"مجھے عقل کی لاٹھی تھما کے خود انجان بننا چاہتے ہو۔ بے نیاز بننے کی کوشش کر رہے ہو۔"

"(بے نیاز اور انجان تو تو بھی بنی رہی رملی ——)

مگر اس کے ہاتھ لرزتے رہے۔ رنگ اڑتا رہا۔ دل دھڑکتا رہا۔ اور وہ دروازہ پکڑ کے کھڑی رہی ——

دو صورتیں اس کے سامنے تھیں۔ آگے بڑھ کے میز کے اوپر بیٹھ جاتی۔ اس کے گھنے بالوں والا جھکا ہوا سر بالوں سے پکڑ کے اٹھا دیتی۔ اور بے اختیار اسے اپنے کلیجے سے لگا لیتی۔ اور کہتی —— محبت کرنے کے انداز مجھے نہیں آتے تھے۔

انسانوں کی شناخت مجھے نہیں تھی۔

اور بعض دفعہ بینائی درست کرنے کے لیے ایک آپریشن کی ضرورت ہوتی ہے۔

یا پھر آگے بڑھ کے —— اپنا سر اس کے قدموں پر رکھ دیتی۔ اور کہتی ——

عورت کی زبان نہیں ہوتی ——

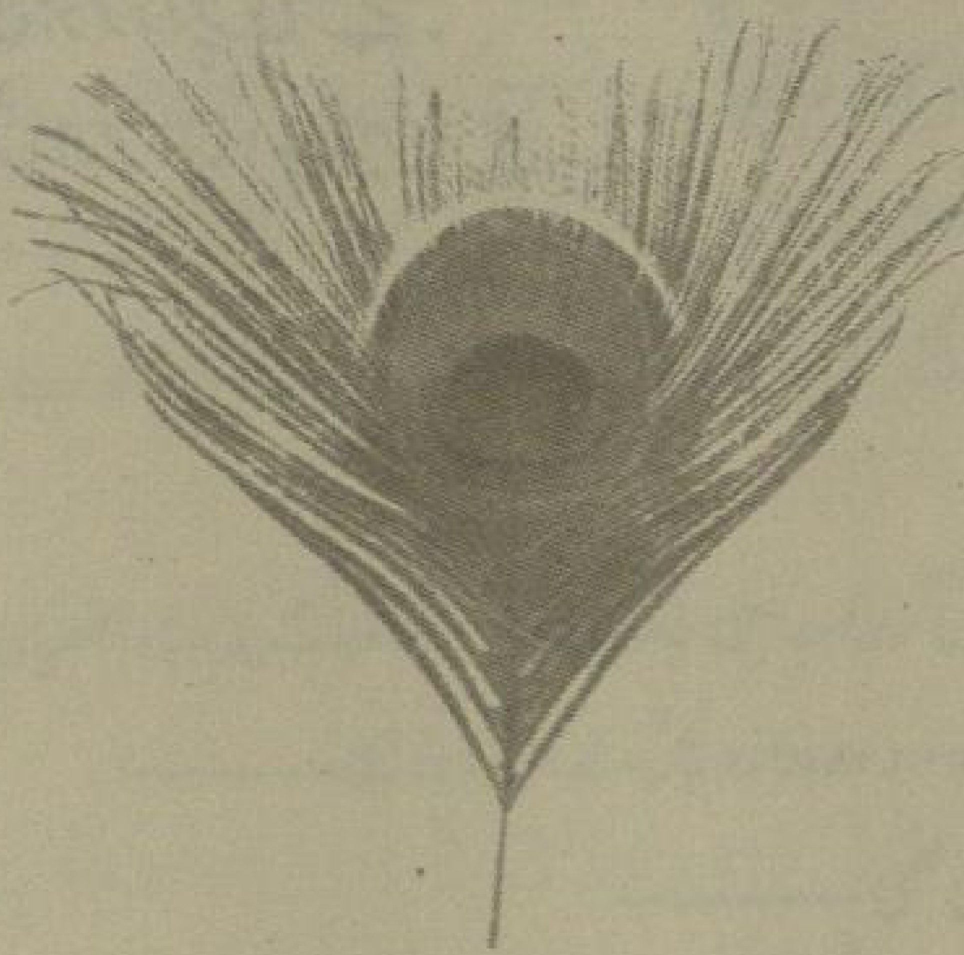
عورت کسی زبان میں اظہارِ محبت نہیں کر سکتی ——

عورت ساری زندگی جس مرد کے لیے مرتی جیتی رہتی ہے —— ٹوٹتی پھوٹتی رہتی ہے —— زمانے کے ستم سہتی ہے —— اس سے ساری زندگی یہ نہیں کہہ سکتی کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے۔ عورت کے محبت کرنے کے انداز مبہم ہوتے ہیں . . . . .

آنسوؤں کی رم جھم میں مسکراتے رہنا اور بھری بہار میں اپنا دل چیر کے رکھ دینا۔ عورت کی محبت کے ادنیٰ سے انداز ہیں۔

یہی تو اس کی ریت ہے۔

بہت دکھی ہو تو رو پڑتی ہے ۔
بہت خوش ہو تو اپنا آپ پیش کرتی ہے ۔



"تم تیار ہو وہٹی ــــــ؟"
بے جی نے آ کے رملی کے کمرے میں جھانکا۔
"جی بے جی ــــــ"
رملی موجو کے کپڑوں کی ٹوکری اٹھا کر باہر آ گئی۔ بے جی نے سارا سامان برآمدے میں رکھ چھوڑا تھا۔ اسی وقت موٹر پورچ میں کھڑی کر کے معاذ باہر نکل آیا اور نوکر کی مدد سے سامان ڈکی میں رکھنے لگا۔
آج رملی بے جی اور معاذ کے ساتھ پہلی بار ان کے گاؤں جا رہی تھی۔ اس نے بے جی سے ان کے گاؤں کے بہت قصے سن رکھے تھے۔ ایک آدھ بار معاذ بھی بے جی کے ساتھ گاؤں گیا تھا۔ مگر رملی کو نہ تو ان کے ساتھ جانے کا شوق تھا اور نہ گاؤں دیکھنے کا ــــــ
پچھلے ہفتے بے جی نے رملی کو بتایا کہ ان کا ایک ہی بھائی ہے اور اس کے بیٹے کی شادی پر انہوں نے گاؤں جانا ہے۔ تو رملی بھی تیار ہو گئی۔ کہنے لگی۔ "بے جی مجھے آپ کے گاؤں جانے کا بہت شوق ہے۔ پلیز مجھے بھی ساتھ لے چلیں ــــــ"
معاذ نے سنا تو اس سے آ کر کہنے لگا۔
"رملی تم گاؤں میں رہ لو گی؟"
رملی نے بڑی شفقت سے نظر اٹھائی اور مسکرا کر بولی۔ "کیوں نہ رہ لوں گی ــــ گاؤں میں کیا ہوتا ہے؟"
"گاؤں میں شہری سہولتیں نہیں ہوتیں۔"
"مگر وہاں بے جی اور آپ تو ہوں گے ــــــ؟"

کہنے کو تو رملی نے کہہ دیا۔ مگر ایک دم اس کا منہ سرخ ہو گیا۔ پھر جلدی سے بولی۔
"ہم کون سا ساری عمر رہنے کے لیے جا رہے ہیں۔ چند دنوں کی تو بات ہے۔ ——"

اس کے بعد معاذ نے کچھ نہیں کہا۔ باہر نکل گیا۔ رملی کا دل چاہتا رہا۔ وہ پہلے کیطرح کوئی شوخ سا فقرہ کہے۔ پہلے معاذ کو رملی کے ساتھ سفر پر جانیکا بہت شوق تھا۔ سفر میں بہت خوش باش اور ہلکا پھلکا ہوتا تھا۔ جبکہ عام مرد سفر میں چڑچڑے اور تھکے تھکے سے لگتے ہیں۔ ایک سفر اس نے پنڈی کا معاذ کے ساتھ کیا تھا اور اس کی طبیعت کی جولانیاں دیکھی تھیں۔ اب وہ چاہتی تھی۔ اس کے ساتھ جانے کا سن کے معاذ پہلے کیطرح خوشی سے پھولا نہ سمائے کبھی ادھر سے آ کے اسے چھیڑے کبھی ادھر سے آ کے کوئی شوخ سا فقرہ کہے۔ اور نہیں اس سے اتنا ہی پوچھ لے کہ اب تم اتنی لگن سے میرے ساتھ کیوں جا رہی ہو۔ مگر معاذ نے کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ جیسے وہ اس کی ہر خوشی کے آگے بس سر ہی جھکانا جانتا ہے۔

معاذ نے سارا سامان لگا دیا۔ بے جی موجو کو لیکر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ رملی معاذ کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اور دن کے ٹھیک گیارہ بجے وہ لوگ گھر سے روانہ ہوئے۔

راستہ خاموشی سے کٹتا رہا۔ کسی وقت بے جی اپنی زمینوں کے بارے میں معاذ سے کوئی بات کر لیتیں یا موجو چیخنے چلانے لگتا۔ کبھی اسے پکڑ کے رملی اپنی گود میں بٹھا لیتی۔ اور جب وہ سٹیئرنگ کو چھیڑ چھیڑ کے معاذ کو تنگ کرنے لگتا۔ تو پھر اسے بے جی کو پکڑا دیتی ——

تھوڑی دیر کے بعد موجو نے بری طرح چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ جب وہ بہت زیادہ مچلنے لگا تو رملی نے اسے گود میں بٹھا لیا۔ محسوس کیا تو اس کے کپڑے گیلے ہو رہے تھے۔ اس لیئے معاذ کی طرف چہرہ کر کے بولی۔

"کسی مناسب جگہ جہاں پانی بھی ہو روکیے گا۔ اسی نے چھی کر دی ہے۔ اور جب تک اسے دھوؤنگی نہیں اسے چین نہیں آئے گا ——"

معاذ نے صرف سر ہلایا اور موٹر چلتی رہی۔

پھر ایک جگہ معاذ نے موٹر آہستہ کر دی اور سڑک کے کچے کنارے پر موٹر کھڑی کر کے بولا۔

"وہ سامنے نلکا ہے۔ جاؤ معوذ کو لے جاؤ اور صاف کر لاؤ ——"

رملی نے مچلتے ہوئے معوذ کو پکڑا اور موٹر کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ قدم بڑھائے پھر ایک دم جھجک گئی۔ موٹر کے کچھ فاصلے پر بہت سے لوگ کھڑے تھے۔ اور جو دور دور تھے وہ بھی موٹر میں سے ایک خوبصورت عورت کو نکلتے دیکھ کر قریب کھسک آئے تھے۔

دھوتیوں والے، شلواروں والے۔ صافے باندھے ہوئے، بے باک منہ پھٹ اور اجڈ قسم کے لوگ جن کی آنکھیں ہمہ وقت ان کے اندر کے جذبے اگلتی رہتی ہیں۔ پڑھے لکھے لوگوں کی طرح وہ اپنے باطن کا جانور چھپانے میں ماہر نہیں ہوتے۔ اس لیے سڑکوں پر کھڑے ہو کر مختلف انداز میں اظہار تمنا کرتے رہتے ہیں۔

ایک نے رملی کو اسطرف آتے دیکھا تو دونوں ہاتھوں سے . . . . . دل کو تھام لیا۔

دوسرا بولا "یار ذرا سگریٹ تو دینا۔ بڑی طلب ہو رہی ہے۔"

تیسرے نے نگاہیں تو رملی کے چہرے پر رکھیں۔ مگر زور سے بولا۔

"رات والی فلم دیکھی۔ بھئی بڑی ظالم شے ہے۔"

پھر سب ٹھٹھا لگا کے ہنسنے لگے۔

رملی قریب سے گذری۔ تو ایک آدمی خواہ مخواہ دوسرے سے بغلگیر ہو گیا۔ اور ہنس کر بولا۔ کلیجے میں ٹھنڈ ڈال دی ہے"

رملی نے قدم بڑھائے . . . . . .

پھر ایک بولا۔ "ہٹ جا رستے سے . . . ."

دوسرے نے کہا ———

"میں صدقے جانواں سارا راستہ ہی تیرا ہے۔"

رملی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے بڑی بے بسی سے مڑ کر اپنی موٹر کی جانب دیکھا۔

معاذ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

ان بے ہودہ اور بدتمیز لوگوں کے ہجوم میں سے گذر کر نل تک جانا اس کے لیے مشکل ہو گیا تھا۔ ہر عورت کسی کی ماں کسی کی بہن کسی کی بیوی ہوتی ہے اور ہر مرد کے گھر کوئی ماں کوئی بہن کوئی بیٹی ہوتی ہے۔ پھر بھی جب ان کو سر راہ کوئی عورت نظر آ جاتی ہے تو اسے نظروں ہی نظروں میں کھا جانا چاہتے ہیں۔ جیسے وہ نہ کسی کی عزت ہے۔ نہ کسی کی لاج ——— رملی نے بڑے کرب سے سوچا ——— اس کا ایک ایک قدم من من کا ہو رہا تھا۔ اس پر موجو سخت بیقرار تھا۔ اور بار بار اس کی گود سے پھسل رہا تھا۔

اسی وقت جیسے رملی کی بے بسی کو بھانپ کر معاذ بل کھا کے موٹر سے نکلا۔ اس کے ہاتھ میں تولیہ پکڑا ہوا تھا۔ جو بے جی نے اسے تھمایا تھا۔ لپک کر رملی کی طرف بڑھا۔ معاذ کو آتا دیکھ کر سب مرد جو کھڑے اسے نظروں سے پی رہے تھے۔ اِدھر اُدھر ہو گئے۔ بلکہ دبک گئے۔ معاذ تیز تیز

قدم اٹھاتا اس کے برابر آگیا۔ رملی کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ چلچلاتی دھوپ میں ننگے سر جا رہی تھی اور اچانک ایک ٹھنڈا میٹھا سائبان اس کے سر پر آگیا ہے۔ معاذ نے ابھی تک کالی عینک لگائی ہوئی تھی۔ گرمی کی وجہ سے اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ وہ کالا کلوٹا آدمی جسے اس نے کبھی قابل التفات نہ جانا تھا۔ اس کے ساتھ قدم ملا کے چلنے لگا۔ تو زمانے کی ہوسناک نگاہیں پیچھے ہٹ گئیں۔ معاذ کے چہرے پر سختی تھی۔ اس کے قدموں میں وزن تھا۔ وہ اس کے پہلو میں ایسے چل رہا تھا۔ جیسے کسی عورت کا مالک چلتا ہے۔ سارے مالکانہ غرور کے ساتھ کہ دیکھو یہ میری عزت ہے۔ اور میں اس کی حفاظت کرنا خوب جانتا ہوں۔

رملی بے خوف ہوگئی۔

شوہر آسمان ہوتا ہے بیوی زمین ہوتی ہے۔ ہر زمین کا ایک آسمان ہوتا ہے۔ اور کوئی زمین آسمان کے بغیر نہیں ہے۔ زمین و آسمان کا جنم جنم کا ناتا ہے۔ زمین و آسمان کا نام ساتھ ساتھ آتا ہے۔ زمین جب نرم اور بھری بھری ہو جاتی ہے تو آسمان اس پر جھک آتا ہے۔ کیا آسمان کی حقیقت سے انکار کیا جا سکتا ہے ——؟

رملی نے معوذ کے کپڑے اتار کر اسے کھڑا کر دیا تو معاذ دوسری طرف سے آکر ہینڈ پمپ چلانے لگا۔ اس وقت وہ صرف ایک باپ تھا۔ ایک عورت کا شوہر تھا۔ اس کے چہرے سے بالکل یہ ظاہر نہ ہو رہا تھا کہ وہ ایک ذہین و فطین بہت بڑا افسر ہے اور کئی لوگ دن میں اسے کئی بار سلام کرتے ہیں۔

رملی نے معوذ کی ٹانگیں اچھی طرح دھو کر اسے تولیے میں لپیٹا اور معاذ کی طرف بڑھا دیا۔ معاذ نے لپک کر اسے پکڑ لیا۔ اور پھر اس کے گیلے گیلے منہ پر بے اختیار پیار کر لیا۔ عجیب چیز ہے یہ بچہ بھی ——

انسانوں کو انسان بنائے رکھنے کا ایک سبب ——!

معاذ موجو کو لیکر موٹر کی طرف چلا گیا۔ اور رملی نے بہتر سمجھا کہ اس کا گندہ نیپکن دھو کر ہی جائے۔ اس لیے وہ ایک ہاتھ سے نل چلاتی رہی اور دوسرے ہاتھ سے دھوتی رہی —— اور عجیب بات یہ ہوئی کہ کسی بھی واہیات مرد نے ادھر ادھر سے آکر نہ اسے جھانکا نہ اس پر آوازہ کسا —— چند قدم اس کے ساتھ چل کر معاذ انہیں بتا گیا تھا کہ اس عورت کا میں کون ہوں ——؟

ایک دم رملی کے دل میں پرانے درد جمع ہونے لگے۔

ٹھیک ہی تو ہوا تھا اس کے ساتھ —— اگر بیوی شوہر کو شوہر نہ جانے تو ہر بدنیت قریب آنے کی کوشش کرتا ہے۔ کسی کی عزت کی حفاظت کوئی اور کیوں کرے ——؟ اور عورت اتنی

ہلکی کیوں ہو جائے کہ جو بھی چاہے ہاتھ بڑھا کر اٹھالے ——

رملی واپس آکر موٹر میں بیٹھ گئی۔

اس کے دل پر انجانی اداسیوں کا مینہ برسنے لگا۔ اداسیوں میں پچھتاوے بھی شامل تھے۔ چار گھنٹے کی مسلسل ڈرائیونگ کے بعد "حبیب نگر" کی حدود شروع ہوگئیں۔ ہر طرف لہلہاتے کھیت اور کچی پگڈنڈیاں دیکھ کر رملی کی طبیعت ایک دم بشاش ہوگئی۔ سامنے ایک بورڈ پر بڑے بڑے حروف میں لکھا تھا۔ "حبیب نگر"۔

"بے جی ——" رملی نے ایک دم سر موڑ کر پوچھا۔

"اس گاؤں کا نام بہت خوبصورت ہے۔ کس نے رکھا تھا یہ نام ——؟"

بے جی صرف مسکرائیں۔ مگر جواب معاذ نے دیا۔ بڑی نرم آواز میں بولا۔

"یہ نام ہمارے والد بزرگوار نے رکھا تھا ——"

اس نے ایک کچا موڑ کاٹا تو ساری دھول اڑ کے موٹر کا طواف کرنے لگی۔ ذرا آگے موڑ نکال کے وہ پھر بولا۔ "ہمارے والد صاحب بڑے رومانٹک آدمی تھے۔ یہ گاؤں انہوں نے خود آباد کیا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے تو یہ نرا جنگل تھا۔ تمہیں معلوم ہے۔ بے جی کا نام حبیبہ ہے ——؟"

معاذ نے رملی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اچھا اچھا ——" رملی کو جیسے ساری بات سمجھ میں آگئی۔ بے جی نے شرما کر سر جھکا لیا۔

"ہمارے اباجی نے شادی کے بعد یہ گاؤں آباد کیا۔ اور اس کا نام "حبیب نگر" رکھ کر بے جی کو تحفے میں دے دیا تھا۔"

رملی نے مڑ کر دیکھا۔ بے جی کا چہرہ ایک دم بجھ گیا تھا۔ ماضی کی یادوں نے شاید ان پر یلغار کر دی تھی۔ وہ بڑی حسرت سے موٹر سے باہر دیکھ رہی تھیں۔ ان کی بجھی آنکھوں میں ننھے ننھے ستارے ٹمٹما رہے تھے —— معوذ دودھ پی کے ان کی گود میں سو گیا تھا۔ پھر ایک بوجھل سی خاموشی چھاگئی۔ جسے توڑنے کی کسی نے بھی کوشش نہیں کی۔

اسی وقت آسمان پر اچانک کالے کالے اور مٹیالے بادل نمودار ہوئے۔ سورج پردے میں آگیا۔ اور سارا ماحول شرمیلا شرمیلا ہوگیا۔ عین دوپہر کے وقت سورج کے چھپ جانے سے سارا ماحول اچانک شرمیلا شرمیلا ہو جائے تو سرکش تمنائیں جاگ اٹھتی ہیں اندر کی آرزو بیدار ہوتی ہے۔

اب موٹر کھیتوں کے بیچوں بیچ کچی سڑک پر جا رہی تھی۔ اس لیے دھچکے زیادہ لگ رہے تھے۔

رملی نے ماحول کو محسوس کر کے چہرہ گھما کے معاذ کی طرف دیکھا۔ وہ اسی طرح کالی عینک لگائے موٹر چلا رہا تھا۔ جیسے وہ کوئی فولادی آدمی ہے۔ اور اس کے دل میں جذبات نہیں بس ایک کمپیوٹر فٹ ہو چکا ہے۔

رملی پلکیں جھپکے بغیر معاذ کا چہرہ دیکھتی رہی۔ پہلے وہ جان بوجھ کر معاذ کے چہرے پر نظر بھی نہ ٹکاتی تھی۔ مگر اب ——— جب اس نے یاور کا چہرہ غور سے دیکھ لیا تھا۔ اور شان بھائی کے اندر جھانک لیا تھا۔ دن میں کئی بار معاذ کے چہرے کو غور سے دیکھا کرتی تھی۔ غور سے دیکھتی اور سوچتی۔ آخر کیا تھا اس چہرے میں جو وہ ہمیشہ اس چہرے سے نفرت کرتی رہی۔ یہ ضرور ہے کہ معاذ کا رنگ کالا تھا۔ مگر اب صبح و شام اس کو دیکھ دیکھ کر وہ اتنی عادی ہو گئی تھی کہ معاذ کا رنگ اتنا کالا نہیں لگتا تھا۔ وہ سوچتی دنیا میں ایک حبشیوں کی قوم بھی ہے۔ کالا رنگ بھی تو خدا نے ہی بنایا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ معاذ کے چہرے پر چیچک کے داغ تھے۔ اب شادی شدہ زندگی گزارنے کے بعد۔ ذہنی اور جسمانی آسودگی نے اس کا چہرہ بھر دیا تھا۔ اب وہ کٹوریاں اتنی نمایاں محسوس بھی نہیں ہوتی تھیں۔ اس کی آنکھیں رملی کو ہمیشہ وحشت زدہ لگا کرتی تھیں۔ مگر اس نے ان آنکھوں کو کبھی غور سے دیکھا ہی نہ تھا۔ معاذ کے پورے چہرے پر اس کی آنکھیں ہی تو بہت خوبصورت تھیں ——— اس کی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ وہ ان آنکھوں سے باتیں کرنے کا فن بھی جانتا تھا۔ بڑی متحرک، بڑی نوکدار ——— دل میں چھید کر دینے والی آنکھیں تھیں۔ ہونٹ موٹے تھے۔ مگر دانت بہت خوبصورت تھے۔ اوپر والے ذرا سے ابھرے ہوئے۔ ہنستا تو ایک دم اپنا سا لگتا۔ مضبوط اور بھرا بھرا سا جسم تھا۔ اور اسے ایک دم یاور کی اس دن کی جسارت یاد آ گئی۔ اف جب یاور نے اسے پکڑا تھا تو کیسے لجلجے اور زنانے سے اس کے ہاتھ محسوس ہوئے تھے۔ ایک دم اسے ابکائی سی آ گئی۔ اور بے اختیار اس نے معاذ کے ہاتھوں کی طرف دیکھا جو اس وقت اسٹیرنگ پر تھے۔

"کیا برائی تھی ان ہاتھوں میں ——— بس ذرا کالے تھے نا؛ مگر محبت کی گرمی سے چُور تھے۔"

پھر اسے اچانک پنڈی کا وہ سفر یاد آ گیا۔ جب معاذ اسے کسریٰ باجی کے ہاں چھوڑنے جا رہا تھا۔ جس وقت وہ لوگ جہلم کی حدود میں پہاڑیوں کے قریب سے گذر رہے تھے۔ تو شام گہری ہو گئی تھی۔ سڑک خالی ہوئی تو معاذ نے آرام سے اپنا بازو رملی کے کندھے پر رکھ دیا۔ رملی کو بہت برا لگا۔ تڑپ کر بولی۔

"یہ کیا کر رہے ہیں آپ ———؟ کوئی دیکھ لے گا تو کیا کہے گا ———؟"

"کون دیکھے گا اس سڑک پر ——؟"

"دیکھیں نا کیسے خفیہ موڑ ہیں یہاں، اچانک کوئی موٹر یا ٹرک سامنے سے نکل کر آسکتے ہیں۔ تو آجائے ٹرک یا موٹر —— لوگ یہی کہیں گے۔ کوئی پاگل آدمی ہے۔ ایک خوبصورت لڑکی کو بھگائے لیے جارہا ہے۔ اور سرِ راہ رنگ رلیاں منا رہا ہے۔"

"یہ سوچنا کوئی اچھی بات ہے۔" رملیٰ نے برا مان کر کہا۔

"میرے اوپر یہ الزام لگے۔ مجھے تو بہت اچھا لگتا ہے۔" پھر وہ والہانہ انداز میں بولا "بھلا دنیا میں کوئی شخص اس بات پر یقین کر سکتا ہے کہ کوئی شوہر اپنی بیوی سے اس حد تک عشق کرتا ہے۔ مگر میں نے تو سارا عشق ہی اپنی بیوی کے لیے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔"

رملیٰ نے بے دلی سے اس کا بازو پکڑا اور کندھے سے ہٹا دیا۔

"وہ دیکھیں ایک ٹرک آرہا ہے۔"

معاذ زور سے ہنسنے لگا۔

"لڑکیاں واقعی اتنی ڈرپوک ہوتی ہیں۔؟"

پھر مڑ کر دیوانوں کی طرح اسکا چہرہ دیکھنے لگا۔

"سامنے دیکھکر چلایئے۔ یہ بڑے خطرناک موڑ ہیں۔"

"میں بھی اس وقت بڑے خطرناک موڑ پر ہوں۔"

معاذ نے پہاڑوں کا ایک نازک موڑ کاٹا۔ پھر اس کی ڈری سہمی صورت کو شام کی تاریکی میں غور سے دیکھ کر بولا۔

"پتہ ہے میرا جی اس وقت کیا چاہ رہا ہے؟

تمہیں بازو سے پکڑ کر کمر پر مشک کی طرح لادلوں اور دوڑ کر اس اونچے پہاڑ پر چڑھ جاؤں۔ پھر —— وہ تھوڑا سا رکا —— شرارت سے رملیٰ کی طرف دیکھا اور مستی میں کہنے لگا۔" پھر تمہیں بوٹی بوٹی کر کے کھا جاؤں......"

رملیٰ سر سے لیکر پاؤں تک لرز گئی۔ اسے معاذ کی صورت اور بھی بھیانک نظر آنے لگی۔ نیم تاریک ماحول میں وہ کوئی آدم خور جانور لگا جو حسین لڑکیوں کی گردن پر منہ رکھ کر لہو پی جاتا ہے۔

وہ تھرا گئی۔

اور پھر بقیہ سارا راستہ اس سے بات ہی نہیں کی۔

آج اس پورے سفر میں معاذ نے رملیٰ کی طرف دیکھا بھی نہیں تھا۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ آج ان کے ساتھ بے جی بھی تھیں۔ مگر معاذ تو بہت ہی اظہار محبت کرنے والا شوہر تھا۔ کیسا کھردرا

بنا بیٹھا تھا۔ نہ ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ نہ بازو کندھے پہ رکھا۔ نہ ساتھ جڑ کر بیٹھا ——— آسمان پر سیاہ کالے بادل یوں لہرا رہے تھے جیسے سبز فصلوں نے اچانک کالی اوڑھنی اوڑھ لی ہے۔ ہوا سرد ہو گئی۔ اور نشے سے لڑکھڑانے لگی ——— راستے کشادہ مگر کچے تھے ——— حد نظر تک کھلا آسمان نظر آ رہا تھا۔ فضا پر اسرار ہو گئی تھی۔ . . . . گاؤں کی فضا شہر کی فضا سے بالکل مختلف لگی۔ پتہ نہیں اس فضا میں کیسا طلسم تھا۔ کہ رملی کو اپنا آپ ایک دم بدلا ہوا سا محسوس ہوا ———

رملی کی آنکھوں میں بہت سا کڑوا پانی جمع ہو گیا۔

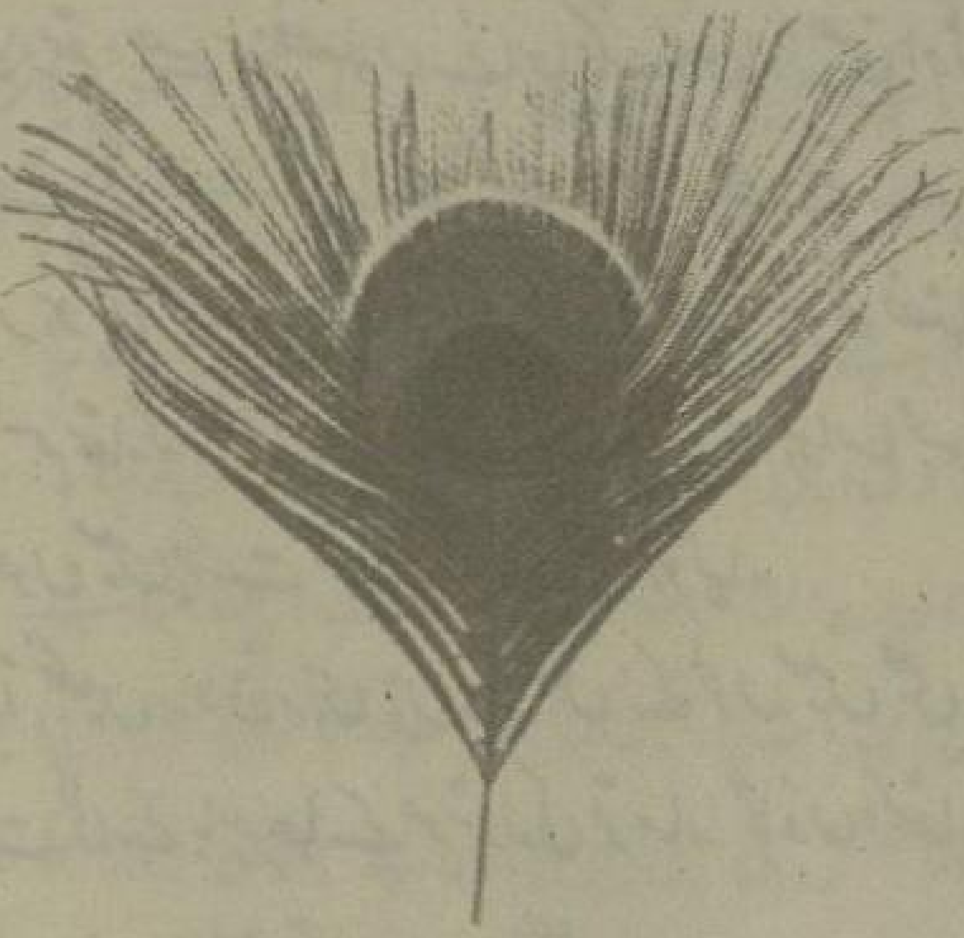
بدنصیب آنکھیں روتی رہی ہیں۔ وصل کے لمحوں میں بھی ——— جدائی کی گھڑیوں میں بھی ——— جس وقت گلی کے باہر جا کے موٹر رکی تو سارا گاؤں اکٹھا ہو گیا۔

"سلام جی ——— سلام جی ———"

چھوٹے بڑے دوڑ دوڑ کے معاذ کو سلام کرنے لگے۔ کوئی سامان اتارنے کو دوڑا۔

کوئی گھر میں خبر کرنے کو لپکا ———

اور بے جی کے قدم تو گاؤں کے لوگوں نے اسطرح چھوئے جیسے گاؤں میں کوئی پیر فقیر آ جاتا ہے۔



رات تک سارے گاؤں کو بے جی کے آنے کی خبر مل گئی تھی۔ اس لیے گاؤں کی عورتیں کام کاج سے فارغ ہو کر بے جی کے پاس جمع ہونے لگیں۔ بہت سی عورتوں کو بے جی کی بہو اور پوتا دیکھنے کا شوق کھینچ لایا تھا۔ اور واقعی وہ رملیٰ کو دیکھ کر بہت خوش ہو رہی تھیں۔

آتے ہی بے جی نے رملیٰ سے کہہ دیا تھا کہ وہ کوئی زرق برق جوڑا پہن کر سنگھار کر لے کیونکہ گاؤں کی عورتیں اسے دولہن کے روپ میں پہلی مرتبہ دیکھیں گی۔ رملیٰ نے بھی جھٹ بے جی کا کہا مان کے ایک خوبصورت جوڑا پہن کے زیورات پہن لیے تھے۔ جو بھی رملیٰ کو دیکھتا وہ بے جی کو مبارک باد دیتا کہ ان کی بہو تو چاند کا ٹکڑا ہے۔ آج رملیٰ کو ان گاؤں کی سیدھی سادی عورتوں کی تعریف بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اور اس کا دل چاہ رہا تھا۔ اس سولہ سنگھار کے عالم میں معاذ بھی اسے دیکھے ـــــ اسے دیکھے اور پھر اس پر دیوانگی چھا جائے اس کی آنکھوں میں مستی کے سارے رنگ لہرائیں۔ مگر معاذ تو سرِ شام ہی چار خانوں والا تہہ بند باندھ کے کھلے بازوؤں کا کرتا پہن کے کچھ مردوں کے ساتھ باہر مردانے میں نکل گیا تھا۔

بے جی بڑی محبت سے ہر عورت کا حال پوچھتیں۔ ہر ایک سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں۔

اتنے میں ایک نوجوان اور خوبصورت سی عورت آ گئی۔ اس نے ایک پیاری سی بچی اٹھا رکھی تھی۔

بے جی اسے دیکھ کر کھل اٹھیں۔

"آؤ آؤ حفصہ آؤ ـــــ میری بیٹی کیسی ہو تم ـــــ؟"

حفصہ قریب آگئی۔ اپنی بچی کو گود سے اتارا اور پھر بے جی کے سینے سے لگ گئی۔
بے جی نے اسے پیار کیا۔ اس کی بچی کو چوما۔ گھر بار کی خیریت دریافت کی۔ پھر وہ وہیں بے جی کے ساتھ جڑ کر بیٹھ گئی۔ رملیٰ نے غور سے دیکھا۔ حفصہ ان گاؤں کی عورتوں میں بالکل مختلف اور تعلیم یافتہ نظر آ رہی تھی۔ اس کے حسن میں ایک حزن تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک ملال تھا۔ رملیٰ کو محسوس ہوا کسی زمانے میں وہ بالکل ایسی ہی شکل بنا کر رہا کرتی تھی۔ شاید اسے بھی کوئی دکھ ہے۔ رملیٰ نے سوچا۔
پھر اس کا دل چاہا بڑھ کر اس سے دوستی کر لے۔
اسی وقت بے جی نے حفصہ کی طرف چہرہ کر کے پوچھا۔
"اب تیرا جی ٹھیک ہے پتر۔ اب تو پڑھائی کا غم نہیں ستاتا۔"
حفصہ نے چہرہ جھکا لیا۔
بے جی نے پھر کہنا شروع کر دیا۔
"کیا کرنا تھا اتنا زیادہ پڑھ کے ـــــ آخر تو عورت کو گھر داری کرنا ہوتی ہے۔ اور بچے پالنے ہوتے ہیں۔ یہی عورت کے اصلی کام ہیں۔"
"مگر بے جی ـــــ" اس عورت نے چہرہ اٹھایا۔ وہ رو رہی تھی۔
"بس ڈاکٹر بننے میں میرے دو سال رہ گئے تھے۔ میں نے بہت محنت کی تھی۔ میری زندگی کی آرزو تھی کہ میں ڈاکٹر بنوں اور انسانیت کے کام آؤں ـــــ"
"پتر انسانی بھلائی کے لیے تو آدمی کئی کام کر سکتا ہے اور ہر عمر میں کر سکتا ہے۔"
"لیکن کیا حرج تھا بے جی اگر مجھے دو سال کی اور مہلت دے دی جاتی۔"
بے جی ہنسنے لگیں۔
"یہ بچپن کے نکاح بڑے واہیات ہوتے ہیں"۔ حفصہ روتی ہوئی بولی۔ مراد نے صاف کہہ دیا۔ اگر میں نے پڑھائی نہ چھوڑی تو وہ نکاح توڑ دے گا۔ یہ ظلم نہیں بے جی ـــــ؟"
"اب اس طرح نہ سوچا کر ـــــ" بے جی بولیں۔ "اب تو ایک بچی والی ہو گئی ہے خوش رہا کر۔
"انسان کی ہر خواہش انسان کے اپنے اختیار میں نہیں ہوتی۔ تو ایسا کرنا اپنی لڑکی کو ڈاکٹر بنا لینا۔"
"ہاں ـــــ" وہ تڑپ کر بولی۔ "اپنی بیٹی کے لیے تو مراد ابھی سے کہتے ہیں۔ اسے اعلیٰ تعلیم دلواؤں گا۔"
"بے جی کیا ہم کسی کی بیٹیاں نہیں ہوتیں ـــــ؟"

"سب ایسے ہی چلتا ہے۔" بے جی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کے کہا۔ "کسی زمانے میں مجھے بھی بہت خواہش تھی۔ ڈاکٹری پاس کرنے کی، مگر میں تو سکول کی شکل ہی نہ دیکھ سکی تھی۔ لیکن بعد میں میں نے اپنا یہ شوق اپنی بیٹی کی صورت میں پورا کر لیا۔ اب اپنی بیٹی کو ڈاکٹر کے روپ میں دیکھ کر اتنا ہی جی خوش ہوتا ہے۔ جب تیری بیٹی بڑی ہو گی تو دیکھنا تیرے شوہر کے خیالات کتنے بدل چکے ہوں گے۔"

"ہاں میں جانتی ہوں۔۔۔۔۔" یہ کہہ کر حفصہ پھر رونے لگی۔ "میں کوئی ناچ گانے کی تربیت تو نہیں لینا چاہتی تھی بے جی ــــــ کوئی برا کام تو نہیں کرنا چاہتی تھی۔ صرف علم ہی حاصل کرنا چاہتی تھی نا؛ کیا علم کسی کو نقصان دیتا ہے۔"؟

"پتر حالات کے ساتھ سمجھوتہ کر لینے کا نام ہی علم ہے۔ ایک ایسی خواہش جو پوری نہ ہو سکی اس کی خلش میں اپنی خوشیاں ختم کر دینا اور اپنے گھر کو جہنم بنائے رکھنا علم کی توہین ہے۔ ایک علم وہ بھی ہے۔ جو انسان روزمرہ کی زندگی میں، ہر روز حاصل کرتا ہے۔ دنیا میں اور بھی کروڑوں لوگ ہیں۔ جن کی دلی حسرتیں پوری نہ ہو سکیں مگر وہ بڑے کامیاب انسان بن کر ابھرے ــــــ"

حفصہ دوپٹے سے اپنے بہتے ہوئے آنسو پونچھنے لگی۔ بے جی نے اس کی بیٹی زبیدہ کو پکڑ کے اپنے گھٹنوں پر بٹھا لیا۔ اسے چمکارا اور بولیں۔

"چپ کر جاؤ۔ دیکھو تمھاری بیٹی تمھیں دیکھ کر بسور رہی ہے۔ اپنی ذہنی کیفیت اپنی بچی اور شوہر پر ظاہر کر کے تم انھیں خوش نہیں رکھ سکتیں۔ خوش رہا کرو۔ وہ لوگ بڑے بدنصیب ہوتے ہیں۔ جو جوانی تو ذرا ذرا سی بات کے لیے روتے ہوئے گذار دیتے ہیں۔ اور بڑھاپے میں جوانی کی تمنا کرتے ہیں۔"

"مریم تیرا کیا حال ہے؟ کیا تیری بیٹی کی سگائی ہو گئی۔؟"

انہوں نے دور بیٹھی ہوئی عورت کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"جی آپ کی دعا سے ہو گئی بے جی ــــــ"؟

"کب رخصتی ہے ــــ؟"

"جی اگلے ساون میں ــــــ"

"اچھا اللہ مبارک کرے۔ شادی سے پہلے میرے پاس شہر آنا۔"

"آؤں گی جی"۔ وہ خوش ہو کر بولی۔

"زینب تیری ساس کو آرام ہے؟"

"کہاں جی ــــــ" زینب بسور کر بولی۔ "اسی طرح وخت ڈالا ہوا ہے اس نے۔"؟

" تجھے کہا نہیں تھا۔ اسے لیکر شہر آجاؤ۔ میں ہسپتال میں داخل کرادوں گی "۔

" اب جی یہ تو مردوں کے کام ہیں "۔

" صبح وحید سے بات کروں گی "۔

" بالی تو کیوں اتنی زرد ہو رہی ہے "۔

انہوں نے ایک عورت سے پوچھا جو چادر میں اپنا آپ چھپائے بیٹھی تھی۔

عورت نے جواب نہیں دیا بس شرما کر سر گھٹنوں پر رکھ لیا۔

" کیا بات ہے ــــ ؟" بے جی نے ساتھ بیٹھی عورت کو اشارہ کیا۔

جی یہ پھر ــــ دوسرے جی سے ہے ــــ ..."

" ہائے زینب... " بے جی نے ہمدردی سے کہا۔ " یہ ساتواں بچہ ہے "۔

" جی ــــ " وہی عورت بولی۔

" زینب تیری صحت تباہ ہو گئی ہے۔ نہ وہ رنگ روپ رہا اور نہ طاقت۔ پچھلی بار جب میں آئی تھی۔ میں نے تجھے کہا تھا نا کہ شہر آنا میں تیرا آپریشن کرادوں گی "۔

" جی سلطان مانتا ہی نہیں "۔ زینب نے سر اٹھا کر بڑے کرب سے کہا۔

" ہائے ایک تو ان مردوں کو ان کی انا مارے ڈالتی ہے۔ چھوٹے کی کیا عمر ہے ــــ "

" جی دس مہینے کا ہے "

" بس تو اب تو میرے ساتھ جائیگی۔ دیکھتی ہوں سلطان کیا کرلے گا۔ تیرے اندر طاقت نہ رہی تو ان سات بچوں کو کیسے پالے گی ؟ "

اسی طرح بے جی رفتہ رفتہ سب عورتوں سے ان کے نجی معاملات پوچھ پوچھ کر ان کو مشورے دیتی رہیں۔ اور ہمدردی کا اظہار کرتی رہیں۔

تھوڑی دیر بعد عورتوں نے جانے کی اجازت چاہی تو بے جی نے کہا۔

" عورت کو اتنا زیادہ علم حاصل کرنے کی کیا ضرورت ہے پتر۔ عورت کے پاس عقل ہوتی ہے اسے عقل کے ساتھ اپنی زندگی بسر کرنی چاہیئے۔ زیادہ علم تکلیف دیتا ہے۔

" میری بات یاد رکھو۔ عورت عقل ہے اور مرد علم ہے۔ مرد زندگی کے سارے فیصلے اپنے علم کے زور پر کرتا ہے۔ اور عورت اپنی ساری زندگی عقل کے ساتھ گذارتی ہے۔

" علم اور عقل ملکر ازدواجی زندگی کو خوشگوار بناتے ہیں۔ جہاں علم کام نہیں کرتا وہاں عقل کام کرتی ہے۔ اپنی عقل سے عورت بدترین اور بگڑے ہوئے مرد کو بھی راہِ راست پر لے آتی ہے۔ مجھے تم پر فخر ہے کہ تم ایک عقل مند عورت ہو۔ شاباش ــــ خوش خوش رہا کرو۔ اور مستقبل کے بارے میں اچھی اچھی باتیں سوچا کرو ــــ "

حفصہ اٹھ کر چلی گئی تو کچھ اور عورتیں قریب آگئیں۔ باتیں کرتے کرتے بے جی نے ایک دم نظر اٹھا کر رملی کی طرف دیکھا۔ وہ جمائیاں لے رہی تھی۔ بولیں۔

"وہٹی پتر تو اب جا —— سو جا جا کے —— لمبا سفر کر کے آئی ہے۔ تھک گئی ہو گی۔"

رملی نے ادھر ادھر دیکھا تو وہ کہنے لگیں۔

"موجو تو میرے کمرے میں سو گیا ہے۔ تو اوپر چلی جا —— شاید تمہارے بستر انہوں نے چھت پر لگا دیئے ہیں۔"

درحقیقت رملی بہت تھک گئی تھی۔ مگر بے جی کی دلچسپ باتیں سننے کے لیے بیٹھی ہوئی تھی۔ پھر اس کو یہ آس بھی تھی کہ معاذ ابھی اندر آئے گا۔ اور اسے سولہ سنگھار میں دیکھ کر خوش ہو گا۔

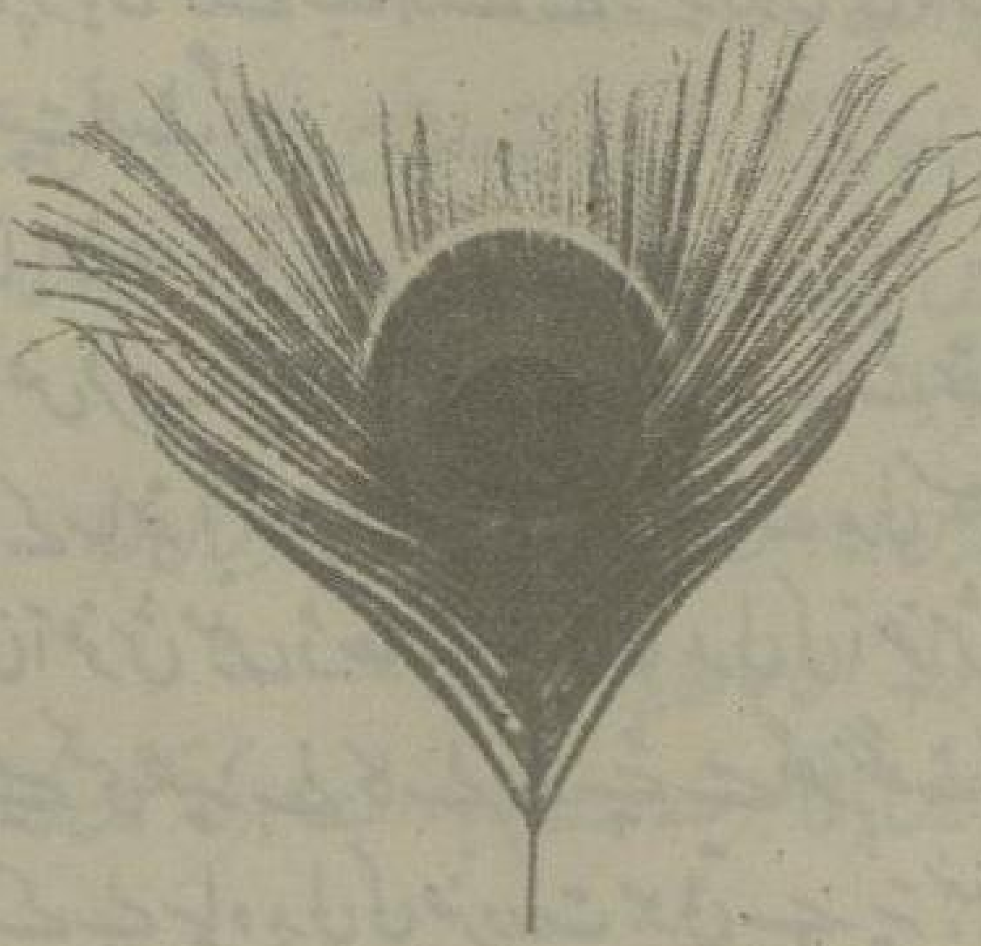
لیکن وہ شاید باہر اسطرح مصروف ہو گیا تھا۔ جسطرح بے جی اندر عورتوں میں گھری بیٹھی تھیں۔

رملی سب کو خدا حافظ کہہ کر آ گئی۔

سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بے جی کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے . . .

"عورت عقل ہے اور مرد علم ہے۔ عورت کے پاس عقل ہوتی ہے اسے عقل کے ساتھ اپنی زندگی بسر کرنی چاہیئے . . . . . "

بے جی کسی مکتب میں نہیں پڑھی تھیں۔ پرانے وقتوں کی گھریلو پڑھی لکھی خاتون تھیں مگر بے جی کے پاس اتنا علم کہاں سے آیا تھا۔ شاید علم کا دوسرا نام تجربہ ہے۔ تجربہ ہمیشہ علم میں اضافہ کرتا ہے۔ شاید تجربے کے بغیر یہ زندگی اندھیرا کنواں ہے۔



رملیٰ چھت پر آ گئی۔ اوپر موٹے رنگین پایوں والے دو پلنگ لگے ہوئے تھے۔ جن پر کھڈی کے بنے ہوئے خوبصورت کھیس بچھے ہوئے تھے۔ اور یہ دیکھکر رملیٰ کو سخت حیرت ہوئی کہ معاذ نہ جانے کب آ کر گہری نیند سو گیا تھا۔

کسی گاؤں کی کچی منڈیروں والی چھت پر رملیٰ کے سونے کا یہ پہلا موقع تھا۔ اس نے چھت پر کھڑے ہو کر چاروں طرف دیکھا۔ آسمان پر تیرھویں کا چاند چمک رہا تھا۔ کھلا آسمان اس قدر خوبصورت ہوتا ہے۔ اور کھلے آسمان پر چاند کی یہ شان ہوتی ہے۔ بڑے شہر میں رہنے والی رملیٰ نے پہلی مرتبہ محسوس کیا۔ جگمگاتے چاند کی اوٹ سے آسمان کو دیکھا تو دور ونزدیک کالی کالی بدلیاں ڈھیر کی صورت پڑی تھیں۔ جن میں سے شریر ستارے داغوں کی مانند چمک رہے تھے۔ اس وقت اس نے سوئے ہوئے معاذ کو غور سے دیکھا۔ سفید وائل کے کڑکڑاتے کرتے اور چارخانے والے تہہ بند میں وہ بے سدھ سو رہا تھا۔ اس نے اوپر آ کر رملیٰ کو بلایا نہیں تھا۔ کھلی ہوا اور چاندنی نے اسے گدگدایا نہیں تھا۔ وہ رات کو کبھی بیگانہ بن کے سونے کا عادی نہیں تھا۔ رملیٰ کا دل چاہا وہ آرام سے جا کر معاذ کے بستر پر بیٹھ جائے اور ٹھنڈی ہوا کے ساتھ مل کے اس کے گھنے خوبصورت بالوں کو منتشر کر دے۔

مگر وہ جلدی سے اپنے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اور تکیہ اٹھا کے اپنے گھٹنوں پر رکھ لیا۔ چاند کی روشنی اتنی واضح تھی کہ اس نے تکیے پر کڑھا ہوا شعر بھی صاف پڑھ لیا۔ لکھا تھا ———

تجھ پہ اے تکیے میں کیا تکیہ کروں
مجھ کو تکیہ ہے خدا کی ذات پر

ارد گرد خوب چڑیاں طوطے بنے ہوئے تھے۔ تکیہ وزنی بھی کافی تھا۔ تھوڑی دیر وہ تکیے پر ہاتھ پھیرتی رہی پھر چت لیٹ گئی۔

چاند چلتا چلتا بادلوں میں آگیا۔

نہیں یہ تو محض فریب نظر تھا۔ چاند اپنی جگہ پر ساکت تھا۔ سیاہ بدلیاں ادھر ادھر تیر رہی تھیں۔ اس کے ساتھ اٹکھیلیاں کر رہی تھیں۔ ایک بدلی مستی بھری ادا کے ساتھ آگے بڑھی اور چاند کو اپنی آغوش میں ڈھک لیا۔ کالی بدلی کی آغوش میں دبکا ہوا چاند بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔ جیسے کسی حسینہ نے کالے دوپٹے سے گھونگھٹ کاڑھ لیا ہو۔ شاید چاند کو روپ کی برسات کے لیے سیاہ بدلی کی ضرورت ہوتی ہے۔ پتہ نہیں موتیا کی خوشبو کہاں سے آکے اس کے پاس ٹھہر گئی تھی۔ گاؤں کی کچی منڈیریں سرگوشیاں سننے کی تمنا میں سانس روکے کھڑی تھیں۔ دور سے مینڈکوں کے ٹرانے کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ کبھی کبھی کسی جانور کی آوازان آوازوں کے ساتھ مل کر ماحول کو بہت قدرتی اور بہت پراسرار بنا رہی تھی۔

گاؤں کی ایک اپنی خوشبو ہوتی ہے۔ جو آدھی رات کو کچے اور خوابیدہ گھروں سے نکل کر سارے عالم میں پھیل جاتی ہے۔ یہ خوشبو زندگی سے قریب ہوتی ہے۔ اس لیے زندگی کو بھڑکا دیتی ہے اس خوشبو میں زندگی کے سارے اسرار پوشیدہ ہوتے ہیں۔ کھلے آسمان تلے لیٹی ہوئی رملی نے اپنے دل میں ایک عجیب سا درد محسوس کیا اور مڑ کر معاذ کی طرف دیکھا جو اس کی طرف پیٹھ موڑے بے سدھ سو رہا تھا۔ اس کے گھنے بالوں کی گنجلک ٹوکری اس کی گردن تک ڈھلک آئی تھی۔ اور وہ اپنے بالوں کی گپھا میں گم —— جانے کن بادلوں میں تیر رہا تھا۔ رملی کے دل میں اس کی گردن پر انگلیاں پھیرنے کی شدید تمنا جاگی ان بالوں میں اپنا تنفس گم کر دینے اور پھر زندگی بھر نہ ڈھونڈنے کو دل چاہا۔

رملی کا دل چاہا وہ اسے جھنجوڑ کر جگا دے۔ اور پھر اس سے کہے میں نے چاند کو جی بھر کر دیکھ لیا ہے۔ اس میں بھی داغ ہے۔ اس میں کیا ہے کہ لوگ اس پر مرتے ہیں۔ اور ان کو چاند کا داغ نظر نہیں آتا۔

میں نے تمہارے چہرے کے داغ بھی جی بھر کے دیکھے ہیں اور ان کے اندر جو روشنی ہے۔ وہ بھی مجھے نظر آگئی ہے۔ پھر کیوں مجھ سے منہ موڑے سو رہے ہو ——؟

یہ سوچتے ہی رملی کے جی سے ہوک اٹھی اور وہ زار و قطار رونے لگی۔ اور روتے روتے اسے بھول گیا کہ وہ کھلی چھت پر لیٹی ہے۔ . . . .

اس کی ہچکیاں سن کر معاذ ایک دم جاگ گیا۔ پھر پریشان ہو کر اٹھ کھڑا ہوا اٹھکر اس طرف آیا اور بولا۔

"رمو تمہیں کیا ہوا ہے جان ——"
رملی بہت کچھ کہنا چاہتی تھی. مگراس کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔
"کچھ تو بتاؤ تمہیں کیا ہوا ہے رمو——"؟ بے جی کو بلا لاؤں ——"؟
معاذ اور بھی گھبرا گیا۔
"نہیں مجھے کچھ نہیں ہوا" رملی نے ہچکیوں کے درمیان کہا. . . . . "یونہی. . . یونہی
پھر وہ بات بنا کر بولی. "امی جان یاد آگئی تھیں ——"
معاذ نے گلاس میں پانی بھر کے اسے پلایا۔ اسے صبر کی تلقین کی اور پھر آ کر اپنے بستر پر لیٹ گیا۔

لیٹ کر بھی اس سے اچھی اچھی باتیں کرتا رہا۔ اور پھر تھوڑی دیر بعد سو گیا۔ رملی نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ پھر گہری نیند میں اتر گیا تھا۔

رملی نے آنکھیں خشک کر کے اس کے پلنگ پر نظر ڈالی. اس کی لمبی لمبی سانسیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ وہ واقعی دوبارہ سو گیا تھا —— اب اس کا چہرہ رملی کی طرف تھا اور چاند کی شفاف روشنی میں اس کا چہرہ صاف نظر آرہا تھا. رملی اس کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی تب اس کی سمجھ میں آیا کہ چہرہ ایک عارضی پڑاؤ ہوتا ہے. جب لوگ دل میں جانے کے راستے تلاش کر لیتے ہیں تو چہروں پر سے یوں گذر جاتے ہیں جسطرح کسی سڑک پر سڑک کے نام کا بورڈ پڑھ کے آدمی آگے نکل جائے۔ ایک جہان چہرے سے آگے بھی ہے۔

اس کا دل چاہا —— وہ معاذ کا گریبان پکڑ کے کہے ——
ایک بار پھر اسی والہانہ پن سے میرے ساتھ محبت کرو۔
مجھے قتل کر دو۔
مجھے مار ڈالو۔
مگر بے اعتنائی کی چھری سے ذبح نہ کرو۔
بے اعتنائی عورت کو مار ڈالتی ہے۔
وہ جگ ہنسائی سے نہیں ڈرتی. بے اعتنائی سے ڈرتی ہے۔

اس نے اپنی شادی کی پہلے سال کی اک اک رات کو قریب بلایا اور پھر یادداشت کی خوردبین لگا کے اس کا ایک ایک پل دیکھا۔ اسے مرد کی محبت کی ادا سمجھ میں آ گئی۔ پھر اس کے نیر بہنے لگے۔ مگر اس مرتبہ اس نے اپنے دوپٹے کا پلو اپنے منہ میں رکھ لیا کہ آواز باہر نہ جا سکے۔
اس کا ایک ایک آنسو کہہ رہا تھا۔

او کالے بدصورت آدمی ــــــ

تو میری پہچان بن گیا ہے۔

میری جان بن گیا ہے ــــــ

اور سبھی انجان بن گیا ہے ــــ

جب سے میں نے تیرے اندر کا حسن دیکھا ہے۔ مجھے میرے نفس کی بدصورتی نظر آگئی ہے۔

ایک بار آ ــــ مجھے توڑ پھوڑ دے ــــ

میری راتیں مجھے لوٹا دے ــــ میری باتیں مجھے سونپ دے ــــ میرے لمحے مجھے دیدے ــــ

لمحوں کے بغیر میں گونگی ہو گئی ہوں۔ کچھ بھی نہیں کہہ سکتی۔ محبت میں اظہار کے لیے گویائی کی نہیں لمحوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جن لمحوں کو میں نے اپنی ناقدری تلے روندا ــــ ان لمحوں کا ایک سرا مجھے پکڑا دے۔

اب مجھے پتہ چلا ہے کہ محبوب کو آنکھیں بند کر کے محسوس کرنا چاہیئے۔ محبوب کو سانس روک کر سونگھنا چاہیئے۔ نفس نفس میں اتارنا چاہیئے۔ محبت میں شناخت کی گھڑیاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرتیں۔

محبت ہمیشہ آنکھیں بند کر کے کرنی چاہیئے ــــ

کھلی آنکھیں دھوکا کھا جاتی ہیں۔ بند آنکھوں سے روشنی کے جھرنے پھوٹتے ہیں۔

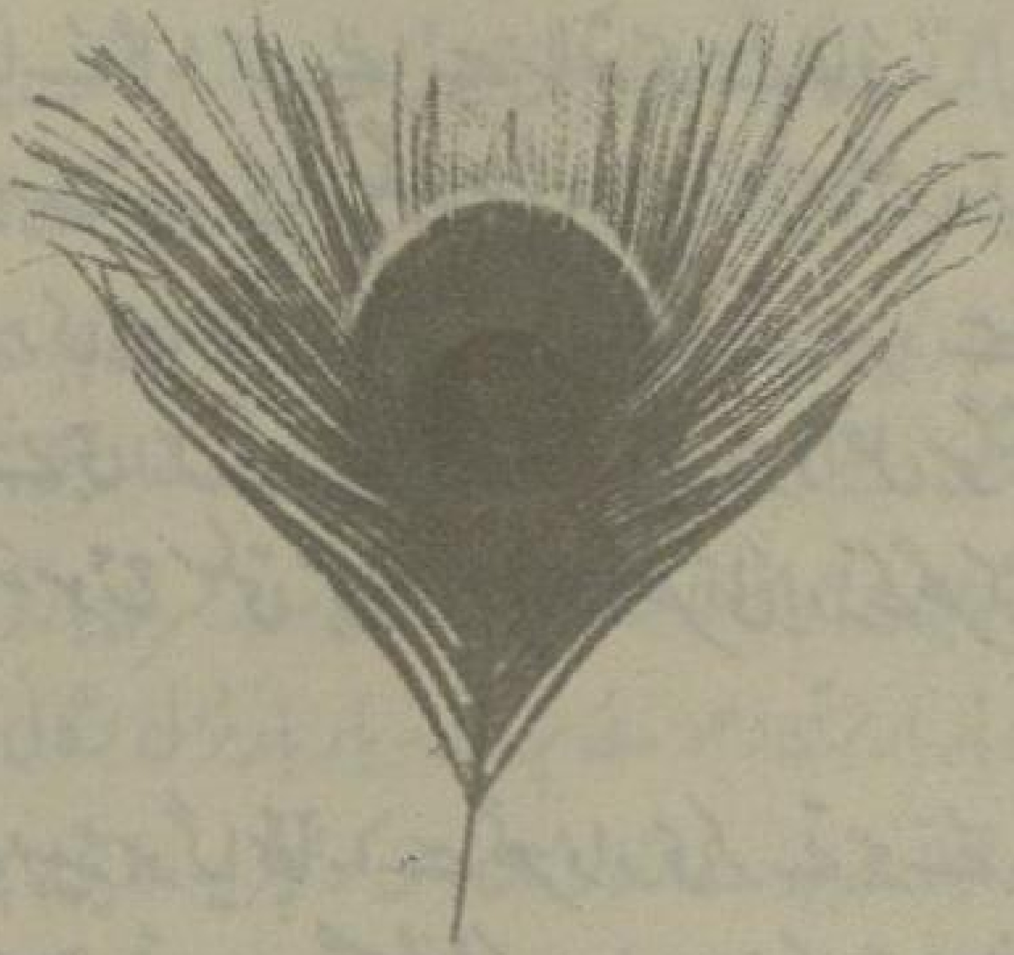
اور میں کیا جانتی تھی۔ محبت کا چہرہ سب سے حسین چہرہ ہے ــــ

میں چہروں میں محبت تلاش کرتی رہی ــــ

لیکن محبت کا چہرہ نہ پہچانا ــــ

افوہ ــــ

محبت کا ذرا سا لفظ ادا کرنا کتنا مشکل لگ رہا تھا۔ یہ تولہ بھر زبان جو زندگی بھر لایعنی بکواس کرتی ہے۔ ایک ننھے سے لفظ کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی۔ اس سے ایک ذرا سا لفظ محبت نہ ادا ہو رہا تھا ــــ جس کی ادائیگی رواں رواں کر رہا تھا۔



معاذ صرف تین دن کی چھٹی لے کر آیا تھا۔ اور ان تین دنوں میں اس نے گاؤں کے بہت سے بکھیڑے نمٹائے تھے۔ صبح ان لوگوں نے واپس جانا تھا۔ مگر بے جی نے آکر کہا ــــــ

"میں ابھی تم لوگوں کے ساتھ نہ جا سکوں گی۔"

"کیوں بے جی ــــ؟" رملیٰ پریشان سی ہو گئی۔

"پتر یہاں میری عدم موجودگی میں بہت سے کام خراب ہو گئے ہیں۔ پہلے میں ہر چھ ماہ کے بعد آکر یہاں کچھ دن رہا کرتی تھی۔ پچھلے دو تین سالوں سے میں شہر میں ہی مصروف ہو گئی ہوں۔ اب کچھ دن یہاں رہ کر سب کام ٹھیک کرنا چاہتی ہوں۔"

"بے جی آپ کتنے دن بعد آجائیں گی ــــ؟"

"پتر آجاؤں گی جب کام ختم ہو جائیں گے۔ تم معاذ کے ساتھ اپنے گھر جاؤ۔۔۔"

"مگر ہم وہاں اکیلے کیسے رہیں گے ــــــ؟"

بے جی ہنسنے لگیں۔

"ماشاءاللہ تم تین افراد ہو۔ اکیلے کیسے ہوئے؟"

"بے جی۔۔۔ میں تو۔۔۔ آپ کے بغیر رہنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔"

"پگلی! بے جی نے اسے سینے سے لگالیا۔ بڈھوں کے ساتھ اتنا دل نہیں لگاتے۔ وہ تیرا گھر ہے۔ اللہ اسے آباد رکھے۔ میں بھی آجاؤں گی۔"

"لیکن معوذ کیسے رہے گا۔ آپ کے بغیر بے جی ــــــ" رملیٰ نے آخری پتہ پھینکا۔

"اسے میں یہاں رکھ تو لوں۔ مگر مجھے شاید زیادہ دن لگ جائیں۔ پھر یہ اپنے باپ کے لیے اداس ہو جائے گا۔ اس لیے اسے ساتھ ہی لے جاؤ۔"

رملیٰ نے بہت زور لگایا۔ مگر بے جی وہیں گاؤں میں رک گئیں۔ رملیٰ جانتی تھی کہ گاؤں میں کچھ کام ضروری ہیں۔ مگر اپنے گھر میں بے جی کے بغیر رہنے کے خیال سے ہی رملیٰ کو ہول اٹھ رہے تھے۔ بے جی اس کی زندگی میں اس طرح داخل ہو گئیں تھیں کہ وہ ایک دن بھی ان کے بغیر رہنے کا نہ سوچ سکتی تھی۔ لیکن جب گھر آئی اور آ کے گھر کو سنبھالا تو سارے کس بل نکل گئے۔

پورا ایک مہینہ ہو گیا تھا۔ اسے گھر داری کرتے ہوئے۔ اس ایک مہینے میں اسے احساس ہوا۔ ذمہ داری کیا ہوتی ہے۔ صبح اُٹھ کر پہلے معاذ کے لیے ناشتہ بناتی اور اسے دفتر روانہ کر دیتی۔ اتنے میں معوذ اٹھ کر آ جاتا۔ اس کے ننھے ننھے کام کرتے ہوئے وہ سوچتی دوپہر کو کیا پکے گا۔ رات کے کھانے میں کیا ہونا چاہیئے۔

یوں تو وہ پچھلے کئی ماہ سے دیکھتی آ رہی تھی کہ بے جی کیا کچھ پکاتی ہیں اور کس طرح سے دیتی ہیں۔ لیکن جب سب کچھ کرنا پڑا تو اسے بہت مشکل لگا۔ مثلاً یہی کہ آج کیا پکے گا۔ وہی گوشت سبزی وہی دال بھاجی ——— جو انسان روزمرہ کھانے کے عادی ہیں مگر اس میں بھی ہر روز تنوع پیدا کرنا۔ بے جی اکثر کہا کرتیں ———

"اچھی گرہستن وہ ہوتی ہے۔ جو اسی گوشت سبزی کو ہر روز نئے سلیقے سے پیش کرے ایک ہی چیز ہر روز کھا کھا کر گھر کے مرد اکتا جاتے ہیں ———"

رملیٰ کو ہر روز سوچنا پڑتا کون سی چیز کسطرح پکائے۔ اس گھر میں ایک نوکرانی بھی تھی جو صبح و شام آتی تھی۔ برتن مانجھ دیتی یا آٹا گوندھ کے پھلکے بنا دیتی۔ باقی سارا کام بے جی خود کرتی تھیں۔ یہ کام رملیٰ کو کرنا پڑا تو اسے احساس ہوا بڑھاپے میں بے جی اتنا کام کیسے کر لیتی تھیں اور تو اور صبح اٹھ کر دودھ بھی بلو لیتی تھیں۔ کیونکہ انہوں نے شہر میں ایک بھینس رکھ چھوڑی تھی رملیٰ نے بہت کوشش کی مگر اسے دودھ بلونا نہ آیا۔ اس کام کے لیے وہ نوکرانی کا انتظار کیا کرتی۔ دوپہر کا کھانا معاذ کے دفتر جایا کرتا تھا۔ اس کے لیے خاص اہتمام کرنا پڑتا تھا۔ شام کی چائے وہ گھر آ کر پیتا تھا۔ اور رات کے کھانے پر کبھی کبھی کسی دوست کو بھی بٹھا لیتا تھا۔ ایک صرف کھانا پکانا ہی تو کام نہیں ہوتا۔ رملیٰ کو احساس ہونے لگا کہ ایک ہنستے بستے گھر کے پیچھے ایک مکمل عورت ہوتی ہے۔ مرد تو گھروں میں مہمانِ خصوصی کی مانند رہتے ہیں۔ دن چڑھے نکل گئے اور ایک خاص وقت پر واپس آ گئے۔ گھر کو صاف ستھرا رکھنا۔ چادریں اور تکیے کے غلاف بدلنا۔ باقاعدگی سے

ہر ہفتے دھوبی کو کپڑے دینا۔ سودا سلف منگوانا۔ آنے جانے والوں کی تواضع کرنا۔ تقریبات میں جانا بچوں کے ساتھ راتوں کو جاگنا۔ دن کو انہیں اسکول چھوڑنے جانا۔ ہر وقت چوکس رہنا۔ ہر وقت گھر کا دھیان رکھنا۔ ہر وقت یہ سوچنا گھر میں کوئی چیز ختم نہ ہو جائے۔ ہر وقت خدمت کے لیے تیار رہنا۔ کتنے جان جوکھم کام تھے۔ معاذ بہت دوست نواز آدمی تھا۔ گھر میں بہت لوگ آتے تھے۔ بے جی سارا دن تواضع کرتی نہ تھکتیں۔ جتنے مہمان آتے رہتے۔ چائے کے ساتھ نئی نئی چیزیں بھیجتی رہتیں۔ شروع شروع میں رملی کو بہت سی مشکلات پیش آئیں۔ دوسری بار ڈرائنگ روم میں چائے بھیجنا پڑتی تو وہ گھبرا جاتی۔ بار بار برتن دھونے پڑتے۔ بار بار ٹرالی لگانی پڑتی۔ بیچ میں مو جو آ کے تنگ کیا کرتا اور وہ جھلائے ہوئے انداز میں اس کو تھپڑ مار دیتی۔ پہلا ایک ہفتہ کٹھن تھا۔ اسے یوں لگتا وہ کسی امتحان میں پھنس گئی ہے۔ بے جی پتہ نہیں کسطرح ہر وقت سارے گھر کو صاف ستھرا رکھا کرتی تھیں۔ کئی بار بے جی نے اسے کہا تھا۔

وہ بیٹی: غسل خانے میں میلے کپڑوں کا ڈھیر مت لگایا کرو۔ بہت برے لگتے ہیں۔ ان کو سمیٹ کے ایک تھیلے میں ڈال کے رکھا کرو——"

تب اسے بہت عجیب لگتا تھا کہ اگر میلے کپڑے غسل خانے میں ڈھیر نہ ہوں گے تو کہاں ہوں گے۔

لیکن اب اسے اپنے آپ سمجھ آگئی تھی کہ گھر میں ہر چیز کی ایک جگہ ہوتی ہے۔ ہمہ وقت یہ خیال بھی رہتا کہ بے جی کے نہ ہونے سے معاذ کو کوئی واضح فرق نہ محسوس ہو۔ پہلے ہفتے تو اسے یہ سب کچھ بہت مصیبت لگا۔ کئی بار وہ اوندھے منہ بستر پر گر گئی اور رونے لگی۔ رفتہ رفتہ وہ ہر کام سے مانوس ہوتی گئی۔ رات اسطرح تھک ٹوٹ کر سوتی کہ بس صبح سویرے ہی آنکھ کھلتی۔ کبھی کبھی وہ سوچتی کہ شادی کے فوراً بعد اس نے بڑی عیش کی زندگی بسر کی ہے۔ اگر ابتدا میں ہی اس پر اتنی ذمہ داریاں پڑ جاتیں تو کسقدر گھبرا جاتی۔ اس وقت جب معاذ کو دیکھتے ہی اس پر نفرت کے بادل چھا جاتے تھے۔ اگر اسے گھر کے یہ سارے کام کرنے پڑتے تو اس کا کیا حال ہوتا——؟

بے جی نے اسے بے شمار ذمہ داریوں سے بچا لیا تھا۔ گھر میں شہزادیوں کی طرح رکھا تھا۔ اور تو اور بچے کی بہت ساری ذمہ داریاں بھی انہوں نے بانٹ لی تھیں۔ حتیٰ کہ وہ رات بھر آرام سے سوئی رہتی۔ اب احساس ہوتا کہ وہ تو ایک جنت میں رہتی تھی۔ اسقدر آرام میں اسے فضول قسم کی باتیں سوچنے کا موقع ملتا رہا۔ اور وہ ایک خیالی جنت آباد کرتی رہی۔ ظاہر ہے اگر کسی کے پاس اتنا فالتو وقت ہو گا تو وہ فضول باتیں سوچے گا۔ اگر شروع دن سے ہی اس پر اتنی ذمہ داریاں پڑ جاتیں تو اسے معاذ کے بارے میں اتنا زیادہ سوچنے کا موقع نہ ملتا۔

اب وہ اتنی مصروف رہتی کہ معاذ کی کوئی بات قابل اعتراض نہ لگتی۔ وہ گھر میں بھی ہوتا تو وہ کبھی اس کی شکل وصورت کے بارے میں نہ سوچتی۔ زندگی تو ہر قسم کے معمول کی عادی ہو جاتی ہے اور زندگی کو بہلانا کون سا مشکل ہے۔؟

اندر ہی اندر سے وہ تمنا کرتی کہ بے جی جلدی سے آجائیں اور سارے گھر کو سنبھال لیں۔ وہ پہلے کی طرح ہلکی پھلکی ہو جائے اب اسے اندازہ ہوتا کہ لوگ بزرگوں کو گھر کی برکت کیوں کہتے ہیں۔ اور گھر میں کسی بزرگ ہستی کے ہونے کے کیا فائدے ہیں ——؟ اور لوگ بے جی سے مل کر اسے خوش قسمت کیوں کہتے تھے ——؟

ایک دن اس نے باتوں باتوں میں معاذ سے کہا بھی کہ وہ بے جی کو بلا لے۔ تو وہ بڑے سکون سے بولا۔

"میں نے بے جی کو ان کی مرضی کے خلاف کبھی مجبور نہیں کیا۔ وہ جب جانا چاہیں انہیں بھیج دیتا ہوں اور جب تک خود بخود آنے پر آمادہ نہ ہوں میں بلاتا نہیں۔ جب ان کا دل چاہے گا وہ خود ہی آجائیں گی ——"

پھر رملی کو اپنے رویے پر خود ہی شرم بھی آئی تھی۔ وہ گھر کے کام کرنے کے لیے بے جی کو بلا رہی تھی۔ حالانکہ یہ ذمہ داریاں اس کی اپنی تھیں۔ اور جو سہولتیں اسے بے جی نے دے رکھی تھیں اور جتنا آرام اسے بے جی نے پہنچایا تھا۔ وہ کتنی عورتوں کے مقدر میں ہوتا ہے ——؟

اسے اپنے ماضی پہ شرم آنے لگی۔ اللہ نے اسے بے شمار نعمتیں دے رکھی تھیں سسرال میں پہنچکر اسے کسی تکلیف کا سامنا نہ کرنا پڑا تھا۔ ایک ذرا شوہر کی صورت اس کی پسندیدہ نہ تھی۔ تو اس نے کتنے غلط قدم اٹھائے ——؟

کیا اس دنیا میں سب کچھ مل جاتا ہے ——؟

نہیں ——

جو لوگ یہ سوچتے ہیں۔ وہ احمق ہیں۔ دنیا میں ہر خوشی اور ہر تمنا پوری نہیں ہوتی جو نصیبوں سے مل جاتا ہے اس کے ساتھ سمجھوتہ کر لینے کا نام ہی دنیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ بڑا منصف ہے وہ اپنی نوازشیں برابر بانٹ دیتا ہے۔ کسی کو کچھ دیتا ہے۔ کسی کو کچھ ——

مگر افسوس انسان کو دوسروں کی نعمت تو نظر آتی ہے۔ مگر اپنی صرف محرومی ہی نظر آتی ہے۔ رملی پر جب احساس ندامت حملہ کرتا تو وہ پھر تندہی سے گھر کے کاموں میں جت جاتی اپنے آپ کو اتنا زیادہ مصروف کر لیتی کہ ضمیر کے کچوکے اسے تنگ نہ کر سکیں۔

اس رات معاذ نے اپنے بہت سے دوستوں کو کھانے پر بلا لیا تھا۔ رملی نے

جلدی سے دو چار چیزیں اور بنالیں۔ جب لوگ کھانا کھا کر چلے گئے تو وہ برتن سمیٹنے لگی اس کے چہرے پر تھکن کے آثار تھے جنھیں معاذ نے پڑھ لیا تھا۔

اس کا چہرہ دیکھکر بولا۔

"آج کل بے جی یہاں نہیں۔ تمھارا کام تو بڑھ گیا ہوگا ۔؟"

"نہیں نہیں —— رملی جلدی سے بولی ۔ کام کا کیا ہے ۔یہ تو میرے گھر کا کام ہے"۔

معاذ نے اس کا چہرہ غور سے دیکھا۔

"تم تھکی ہوئی لگ رہی ہو۔ تمھارا چہرہ اتر گیا ہے ۔ آرام کیا کرو"۔

رملی اداسی سے مسکرائی تو وہ بولا۔

کل رات کا کھانا باہر کھائیں گے اور کوئی پکچر بھی دیکھنے چلیں گے ۔کیا خیال ہے ——؟

"تم تھوڑی سی تفریح بھی کیا کرو ——"

رملی برتن سمیٹنے لگی۔

اور برتنوں کے ساتھ ساتھ اپنی آنکھوں میں بھر بھر آنے والے نیر بھی سمیٹتی رہی ۔

معاذ کا رویہ اس کے ساتھ ہمیشہ سے مشفقانہ تھا۔ ہمیشہ اس کا خیال رکھتا۔ بڑی نرمی سے بات کرتا۔ بڑی محبت سے اس کا حال پوچھتا۔ یاور والے واقعے کے بعد اس نے ایک دن بھی تو اسے طعنہ نہیں دیا تھا۔ ایک بار بھی تو سختی سے نہیں بولا تھا۔ بہانے بہانے اس کی عیب جوئی نہیں کی تھی۔

کاش وہ اسے طعنے دے لیتا۔ برا بھلا کہہ لیتا۔ اٹھتے بیٹھتے اس کی انا کو مجروح کرتا۔ اس کے کیریکٹر پر بار بار حملے کرتا۔ تو رملی کے ضمیر کا بوجھ کچھ تو اتر جاتا۔

مگر وہ کتنے آرام سے کہہ رہا تھا۔

"تمھارا چہرہ اتر گیا ہے ——"؟

اس چہرے کا کیا ہے ——؟ رات اپنے بستر پر لیٹ کر رملی نے سوچا۔

یہ تو اترتا ہی رہا ——

پہلے نفرت کی سطح پر اترا۔ پھر جھوٹی محبتوں کے سمندر میں غرق ہوا ——

پھر تمھارے دل سے اترا —— آج کل پچھتاووں کی خندق میں اترا ہوا ہے۔

اس چہرے کا کیا پوچھتے ہو ——؟

اس نے کبھی دل کا ساتھ نہیں دیا۔ اس لیے یہ نہ سمجھو کہ یہ روزمرہ کام کی تھکاوٹ ہے۔

یہ تو روح کی تھکاوٹ ہے ——

ذہن کی تھکاوٹ ہے ——

چہرہ ایک چراغ کی مانند ہوتا ہے۔
اس میں خوشی کا تیل نہ ڈالو تو بجھ جاتا ہے۔



اس روز موجو صحن میں اپنی ٹرائی سائیکل چلا رہا تھا۔ اچھل کر گرا اور اس کا ایک اوپر والا دانت ٹوٹ گیا۔ رملی نے دوڑ کر اسے پکڑا۔ اور جب اس کا لہولہان چہرہ دیکھا تو چلا چلا کر رونے لگی۔ گھبرا کر اندر سے معاذ نکل آیا اس نے روتے ہوئے بچے کو بازوؤں میں لے لیا اور اندر لے گیا۔
رملی کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ دل بیٹھا جا رہا تھا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا۔ اپنے بچے کے منہ پر لگا ہوا لہو دیکھتی تو کلیجہ مسوس کر رہ جاتی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس وقت کیا کرے اسے شدت سے بے جی یاد آئیں۔ موجو بہت شیطان اور طرار بچہ تھا۔ جب سے اس نے چلنا سیکھا تھا۔ آئے دن اسی طرح چوٹیں لگوایا کرتا تھا۔ مگر بے جی جھٹ اسے سنبھال لیتی تھیں۔ پتہ نہیں کس طرح وہ اسے دوائی بھی لگا دیتیں اور چپ بھی کرا لیتی تھیں۔ رملی کو تو عام طور پر بعد میں پتہ لگا کرتا تھا۔ وہ تو ہمیشہ اپنے خیالوں کی جنت میں ہی سرگرداں رہتی تھی اس نے بچے کے پالنے کے دکھ نہیں اٹھائے تھے پہلے اسے پتہ ہی نہیں چل سکا تھا۔ جنم دینے کی تکلیف تو بس ایک ہی بار ہوتی ہے مگر بچے کو پالنا ایک کرب مسلسل ہے۔ جس سے عورت بار بار گذرتی ہے۔ اور اس کرب سے بار بار گذر کے ہی وہ جلدی بوڑھی ہو جاتی ہے۔ ایک بچے کی پیدائش کے بعد ہی —— اس پر سے روپ کا خمار اتر جاتا ہے۔ راتوں کو جاگ جاگ کر وہ اپنی خوبصورت آنکھوں کا کیف بچے پر لٹا دیتی ہے۔ نہ اسے اپنے رنگ روپ کا خیال رہتا ہے۔ نہ خوبصورت جسم کا —— شادی کیا ہوتی ہے۔ عورت کے نچھاور ہونے کا موسم شروع ہو جاتا ہے۔ پہلے اپنے شوہر کی پسند میں ڈھلتی ہے اور جو بچ جاتا ہے اس کو بچوں پر وار دیتی ہے۔ بے جی نے رملی کو اپنا آپ وارنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ بے جی ایک سخت گیر اور خود پسند ساس کے ہاتھوں سے نکلی تھیں۔ اس لیے وہ اپنی بہو کو اس آنچ سے دور ہی رکھنا چاہتی تھیں۔

اب گھر کا کام کرنے کے ساتھ ساتھ دن رات رملی کو موجو کا خیال رکھنا پڑتا۔ اس کے پیچھے پیچھے بھاگنا پڑتا کہ کہیں باہر نہ نکل جائے۔ بجلی کے کسی سوئچ میں انگلی نہ ڈال دے — چاقو سے اپنے ہاتھ نہ زخمی کرلے — اس عمر میں بچہ اس بگولے کی طرح ہوتا ہے جو کسی کے ہاتھ میں نہیں آتا۔ اور ان چند مہینوں میں ہی رملی کے ہوش اڑ گئے تھے۔

اور ابھی موجو کو لہولہان دیکھ کر وہ بے اختیار رونے لگی۔ معاذ نے اسکی طرف دیکھکر کہا۔

"تم تو چپ کرو رملی۔ میں موجو کو سنبھالوں یا تمھیں — جاؤ تھوڑا سا گرم پانی لاؤ اور روئی سے اس کا چہرہ صاف کرو۔ دیکھیں کہاں کہاں چوٹ لگی ہے۔"

رملی دوڑ کر نیم گرم پانی اور روئی لے آئی۔ مگر قریب آکر رک گئی۔ اس کے ہاتھ لرزنے لگے۔ کہنے لگی۔

"میں اپنے بچے کا خون صاف نہیں کرسکتی۔ مجھ سے یہ سب نہیں ہوتا۔ خدا کے لیے اسے ڈاکٹر کے پاس لے چلیں۔"

"لے چلتے ہیں" معاذ نے بہت آہستہ سے کہا۔ اور روئی گیلی کرکے اس کا چہرہ صاف کرنے لگا۔

کھڑے کھڑے رملی کو یوں محسوس ہوا۔ کوئی اس کے دل پر نشتر چلا رہا ہے۔ ہر بار جب معاذ روئی سے اس کا چہرہ صاف کرتا۔ رملی کے دل میں سوئی چبھ جاتی۔

اف ماں بچے کا یہ تعلق ہوتا ہے — رملی کے زار وقطار نیر بہتے رہے —

موجو کے چہرے سے بہت خون نکل رہا تھا۔ معاذ نے روئی سے صاف کرکے دیکھا تو اس کا ایک اوپر والا دانت ٹوٹ گیا تھا۔ ابھی چند ہفتے ہی تو ہوئے تھے۔ موجو کے اوپر والے سارے دانت نکل آئے تھے۔ اور وہ ہنستا ہوا بہت پیارا لگتا تھا۔ شاید میری نظر لگ گئی۔ رملی نے دل میں سوچا۔

اور ساتھ ہی اوپر والا ہونٹ بھی پھٹ گیا تھا۔ معاذ نے احتیاط سے اس کو اٹھایا اور بولا۔ "اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانا پڑے گا۔"

رملی بھی دوڑ کے اس کے پیچھے گئی۔ اور اگلی سیٹ پر بیٹھ کے موجو کو گود میں لے لیا۔ اور معاذ بڑے سکون سے موٹر چلانے لگا۔

معاذ نے عام شوہروں کی طرح غصے میں پھنکارتے ہوئے رملی کی بے پروائیوں کو بالکل نہیں کوسا۔ بلکہ رملی خود ہی لرزتی ہوئی شرمندہ سی آواز میں کہنے لگی۔

"سارا دن اس کا خیال رکھتی ہوں۔ بھاگ بھاگ کر پیچھے جاتی ہوں۔ پتہ نہیں کس

وقت باہر نکل جاتا ہے۔"
"کوئی بات نہیں"۔ معاذ نے بڑی ملائم آواز میں کہا۔ "بچوں کو چوٹ لگ ہی جاتی ہے۔ اس عمر میں بچے ایک پل چین سے نہیں بیٹھتے۔"
"مگر یہ تو کچھ ضرورت سے زیادہ ہی شوخ ہے۔"
"سب بچے ایسے ہوتے ہیں۔" معاذ پھر آہستہ سے بولا۔
"بس اسے تو بے جی ہی قابو کر سکتی ہیں۔"
رملی نے جان بوجھ کر بے جی کا ذکر چھیڑ دیا۔ تاکہ ان کو بلانے کی بات شروع کر سکے۔
معاذ تھوڑی دیر چپ رہا۔ پھر بولا۔
"تمہیں بے جی نے نہیں بتایا۔" میں بچپن میں بہت شریر ہوا کرتا تھا۔ ہر وقت مجھے چوٹیں لگتی تھیں۔ ایک بار کنوئیں میں بھی گر گیا تھا۔ ہر روز بے جی کے لیے کوئی نہ کوئی مصیبت کھڑی کر دیتا تھا۔"
رملی نے اثبات میں سر ہلایا۔
"بے جی مجھے سب کچھ بتاتی رہتی ہیں۔"
"اس لحاظ سے تو ہمارا موجو بڑا شریف بچہ ہے۔ دو سال میں یہ پہلی بڑی شرارت کی ہے اس نے ——"
رملی چپ رہی۔ کیوں کہ اسے تو موجو نے چند مہینوں میں ہی بیدم کر دیا تھا۔
پھر معاذ شرارت سے ہنس کر بولا۔
"طبیعت کا یہ سکون اور یہ تھوڑی سی شرافت غالباً اس نے تم سے لے لی ہے . . . !"
رملی کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ جانتی تھی۔ معاذ یہ سب کچھ خوش نیتی سے کہہ رہا ہے مگر اپنے آپ پر اسے شرم آئی۔ وہ طبعی شرافت کی وجہ سے لیے دیے میں نہ رہتی تھی۔ وہ تو اپنی نفرت کو چھپانے کی خاطر چپ چاپ رہتی تھی۔
ڈاکٹر کے کلینک میں پہنچے تو ڈاکٹر نے بتایا کہ اس کا اوپر والا ہونٹ پھٹ گیا ہے اور ایک ٹانکا لگانا پڑے گا۔
ابھی ڈاکٹر کے منہ سے یہ الفاظ ادا ہوئے تھے کہ رملی کو یوں محسوس ہوا۔ ڈاکٹر نے سوئی اٹھا کے اس کے دل میں کھبو دی ہے۔
رملی کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو گیا۔
معاذ نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ "رملو تم باہر جاؤ۔ اور جا کر موٹر میں بیٹھ جاؤ میں

موجو کی پٹی کروا کے آتا ہوں۔"

رملی کی پلکوں پر دوالتجائی آنسو لرز رہے تھے۔ کانپتی آواز میں ڈاکٹر سے پوچھنے لگی۔" ڈاکٹر صاحب ٹانکا لگانے سے میرے بچے کو تکلیف تو نہیں ہوگی؟"

"نہیں ہوگی بی بی —" ڈاکٹر ہنس کر بولا۔" ہم جانتے ہیں بچے کو کس طرح ٹانکا لگانا چاہیئے۔"

پھر جاتے جاتے مڑی اور اچانک بولی۔

" اس کا ہونٹ پہلے کی طرح ٹھیک ہو جائے گا نا؟ کہیں میرا بچہ بدصورت تو نہیں ہو جائے گا۔

ڈاکٹر ہنسنے لگا۔

"محترمہ آپ تسلی رکھیں۔ کچھ دنوں تک اس چوٹ کا نشان بھی نہیں رہیگا۔"

رملی باہر نکل آئی آکے موٹر میں بیٹھ گئی۔ موٹر میں بیٹھتے ہی اسے خیال آیا کہ اس نے ڈاکٹر سے کیسا بے ہودہ سوال پوچھ لیا تھا۔" کہیں میرا بچہ بدصورت تو نہیں ہو جائیگا —"

اسے معاذ کے سامنے یہ سوال نہیں پوچھنا چاہیئے تھا۔ آخر یہ بدصورتی کا احساس اس کے اندر سے ختم کیوں نہیں ہو جاتا۔ اور کیا دیکھنا باقی ہے —؟

بس منہ سے بے خیالی میں ایسے جملے نکل جاتے ہیں۔

اس نے بے اختیار موٹر کے آگے لگے ہوئے ننھے سے شیشے میں اپنا چہرہ دیکھا؟

"کیا تو پہلے جیسی ہے —"؟

پھر اس نے ارد گرد بازار میں آتے جاتے ہوئے لوگوں کو دیکھا۔

اس کی زندگی کا فلسفہ ہی بدل گیا تھا۔

کچھ دن پہلے وہ معاذ کے ساتھ اسی بازار میں آئی تھی اس روز انہیں موجو کے لیے نئے جوتوں کی ضرورت تھی۔

معاذ تھکا ہارا گھر آیا۔ تو رملی نے آہستہ سے بتا دیا کہ موجو کے سب جوتے ٹوٹ گئے گئے ہیں۔

تو معاذ نے فوراً کہا۔

"چلو بازار چل کر لے آتے ہیں۔"

"پہلے آپ چائے پی لیں۔ منہ ہاتھ دھولیں"۔ رملی نے جلدی سے کہا۔

"کہیں دو کانیں تو بند نہیں ہو جائیں گی۔"

نہیں۔ رملی بولی۔ دوکانیں تو آٹھ بجے تک کھلی رہتی ہیں۔

"ٹھیک ہے"۔ معاذ نے کہا۔ پھر ہاتھ منہ دھوکر کپڑے بدلے۔ چائے پی اور ان دونوں کو لیکر بازار آگیا۔

جوتوں کی دوکان کے اندر داخل ہوتے ہی سامنے قدِآدم آئینے پر رملی کی نظر ٹھہر گئی۔ اس نے اپنا سراپا دیکھا۔ اور اپنے آپ کو معاذ کے ساتھ اندر آتے ہوئے بھی دیکھا ——

وہ اپنا آپ دیکھکر حیران رہ گئی۔ وہ بالکل ایک عام سی عورت لگ رہی تھی۔ آنکھوں کے گرد حلقے تھے۔ رنگ میلا ہو رہا تھا۔ چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ بالوں میں وہ پہلے جیسی چمک نہ تھی۔

اس میں پہلے جیسا بانکپن نہ تھا۔ جسطرح ایک پھول شاخ سے لگا رہے تو خوب تر و تازہ نظر آتا ہے۔ شاخ سے توڑ کے گلدان میں لگا دیں تو اس کی رعنائی ماند پڑ جاتی ہے ——

کہاں گیا وہ روپ کا خزانہ ——؟

اس نے خاص طور پر غور کیا کہ وہ معاذ کے ساتھ چلتی ہوئی عجیب نہیں لگ رہی تھی اور معاذ بھی اب کچھ زیادہ برا نہیں لگتا تھا۔ پھر اس نے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ تو بہت سی عورتیں اپنے بچوں کو لیکر اپنے شوہروں کے ہمراہ آئی ہوئی تھیں۔ سب میاں بیوی بس ایسے ہی تھے۔ شاید جب بچے ہو جاتے ہیں۔ تو میاں بیوی ایک دوسرے کو نہیں دیکھتے۔ صرف بچوں کو دیکھتے ہیں۔ اور بچوں کو دیکھتے دیکھتے آرزوؤں اور خوابوں کی عمر گذر جاتی ہے۔

رملی کو اچانک محسوس ہوا کہ پچھلے صوفے پر بیٹھی ہوئی ایک سمارٹ سی عورت کو معاذ بار بار دیکھ رہا تھا۔

رملی نے بھی بطور خاص اسے دیکھا۔ کوئی خاص بات تو نہ تھی اس میں ——

مگر وہ اپنے شوہر سے باتیں کرنے میں اتنی مگن تھی کہ اسے ارد گرد کا ہوش نہ تھا۔ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے میں گم تھے۔ غالباً وہ بھی پہلے بچے کے لیے جوتے لینے آئے تھے بچہ پاس ہی جوتوں سے کھیل رہا تھا۔ اس کا شوہر بھی بہت کالا تھا مگر وہ دونوں ایک دوسرے میں مگن تھے۔ شاید معاذ یہی سب دیکھ رہا تھا۔ پھر رملی نے محسوس کیا۔ سب شوہر بیوی بات بات میں ایک دوسرے سے مشورے لے رہے تھے۔ جب کہ وہ بالکل خاموش تھی۔ اور رملی کو یہ محسوس کر کے تعجب ہوا کہ اسے معاذ کا اتنی محویت سے ارد گرد کی عورتوں کو دیکھنا بہت برا لگا۔ کچھ حسد کی سی کیفیت پیدا ہوئی۔ اسی وقت اس نے سوچا —— جب عورت

اپنے شوہر کے علاوہ کسی دوسرے مرد کو دلچسپی سے دیکھتی ہے —— تو شوہر کی کیا کیفیت ہوتی ہو گی؛

مرد تو اس قسم کے اقدام کو ایک لمحے کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ مرد عورت سے زیادہ حاسد، عورت سے زیادہ غصہ ور اور عورت سے زیادہ تنگ دل ہوتا ہے۔ بعض اوقات تو صرف شک کی بنا پر ہی عورت کو قتل کر دیتا ہے۔ یہ سوچ کر رملی کو جھرجھری آ گئی۔ اور ساتھ ہی شرم بھی ——

پتہ نہیں معاذ نے یہ سب کیسے برداشت کیا ہو گا ——؟

کیا معاذ فرشتہ ہے یا دیوانہ ——؟

اگر اس کی محبت بھری باتیں یاد کرتی تو وہ محض ایک دیوانہ سا لگتا —— اور اگر اس کے موجودہ رویے پر غور کرتی تو وہ ایک فرشتے کی مانند نظر آتا ——

مگر۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔۔ راہ میں کہیں شیشے کی ایک دیوار اچانک آ گئی تھی۔

بالکل ایسے جیسے کام کرتے کرتے اس کی خوبصورت آنکھوں کے آگے پانی کی ایک دیوار آ جاتی تھی۔ اور دور و نزدیک کی ہر شے دھندلا جاتی تھی۔

وہ سیٹ پر سر رکھے۔ منہ اوندھائے بیٹھی تھی کہ معاذ موجو کو کندھے سے لگائے آ گیا۔ معاذ نے موٹر کا دروازہ کھولا تو رملی نے چونک کر سر اٹھایا۔ اور پھر ہاتھ بڑھا کر موجو کو پکڑ لیا۔ موجو پر اسوقت غنودگی سی طاری تھی۔ رملی نے گھبرا کر پوچھا۔

"اسے کیا ہوا ہے ——؟"

معاذ نے اسٹیرنگ تھامنے سے پہلے رملی کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اس کی پلکوں کے آس پاس آنسوؤں کے خیمے لگے تھے۔ شاید وہ بے خیالی میں روتی رہی تھی۔ اور معاذ نے سمجھا کہ اپنے بچّے کے لیے روتی رہی ہے۔

"ڈاکٹر نے اسے ٹیکہ لگا دیا ہے۔ یہ تھوڑی دیر سکون سے سویا رہے گا۔ اب فکر کی کوئی بات نہیں ——" معاذ نے جواب دیا۔

موٹر چلی تو رملی نے موجو کو اپنے ساتھ بھینچ لیا۔

"رمو ——" تھوڑی دیر آگے چل کے معاذ نے کہا۔ "فرض کرو کہ تمہارا بیٹا بدصورت ہو جائے۔ تو پھر تم کیا کرو گی ——؟"

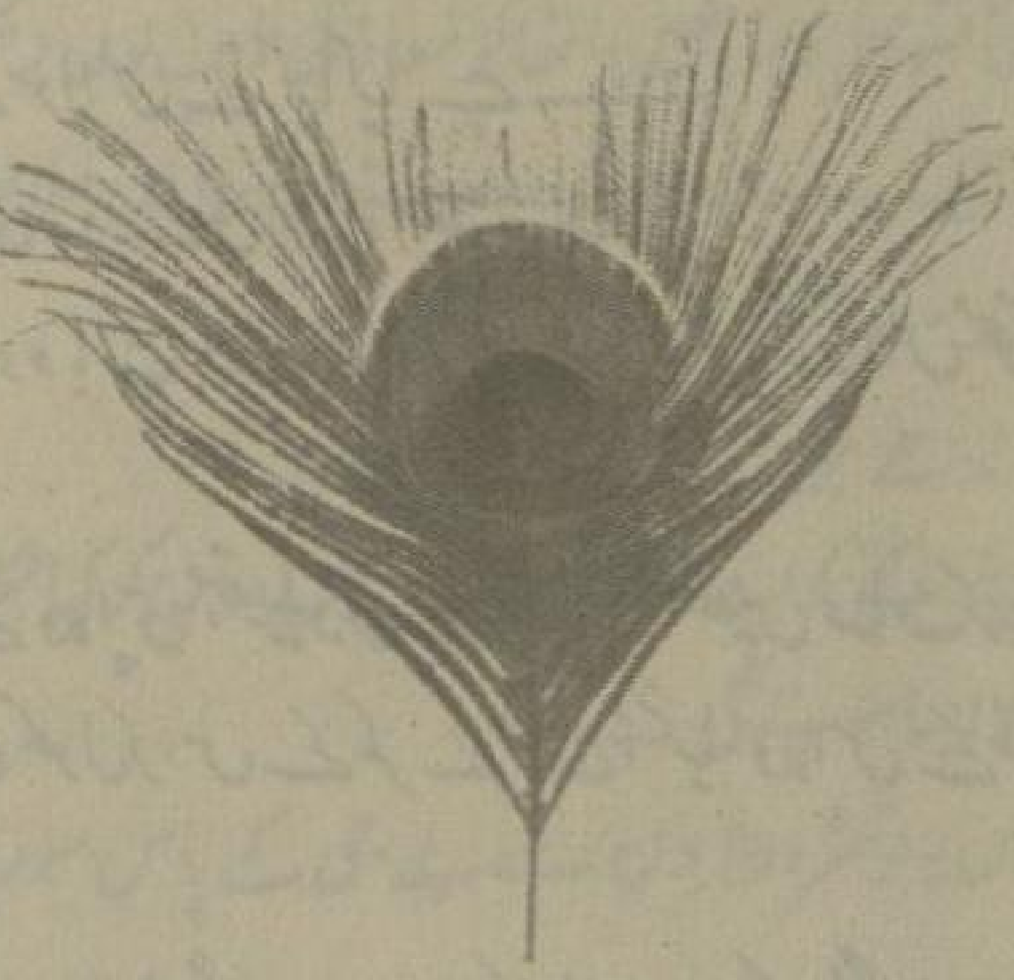
پھر اس نے ہنس کر گردن موڑی اور رملی کے زرد ہوتے ہوئے چہرے کو دیکھا۔ رملی نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور شرمندہ سی آواز میں بولی۔

"کچھ بھی نہیں ——
"کیا مائیں اپنے بدصورت بچوں سے محبت کرنا چھوڑ دیتی ہیں"؟ معاذ نے پھر پوچھا۔
رملیٰ جان بوجھ کر خاموش رہی۔ اسے افسوس ہوتے لگا کہ اس نے معاذ کے سامنے ڈاکٹر صاحب سے ایسا بودا سوال کیوں پوچھا۔
"ایک ماں ہی تو ہے جس کی محبت اس دنیا کی ایک بڑی سچائی ہے اور ماں ہی ہے۔ جو عیبوں سے بھرے مکروہ صورت بچے سے بھی ٹوٹ کر پیار کرتی ہے۔"
رملیٰ نے ڈرتے ڈرتے معاذ کا چہرہ دیکھا۔ اس کے چہرے پر بڑی سنجیدگی تھی۔ اس سنجیدگی سے رملیٰ کو ڈر آنے لگا۔ اسے معاذ ہنستا کھیلتا ہی اچھا لگتا تھا۔ سنجیدہ ہو کے جانے کیوں خوفناک لگنے لگتا تھا۔
"ماں کے علاوہ ——" رملیٰ نے ڈرتے جھجکتے رک رک کر کہنا شروع کیا۔ "اور رشتے بھی ہیں۔ جو سچی محبت کے مظہر ہوتے ہیں۔"
اب معاذ بالکل خاموش رہا۔ غالباً اسے کسی روایتی سوال کی ضرورت نہ تھی۔
اس لیے رملیٰ پھر اسی انداز میں اٹک اٹک کر بولنے لگی۔
جب کوئی انسان، کسی انسان کے اندر کا حسن یا نیکی دیکھ لیتا ہے۔ تو . . . . . تو . . . . . .
"پھر اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری ——"
"اصل میں محبت کرنے کے لیے پہلے محبت کو سمجھنا بہت ضروری ہے ہم بادی النظر میں جسے محبت کہہ لیتے ہیں۔ وہ محبت نہیں ہوتی . . . ."
"درحقیقت محبت کے لیے کوئی پیمانہ مقرر نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تو . . . یہ تو . . .
اپنے ہی انداز سے بوکھلا کر رملیٰ خاموش ہو گئی۔ جانے کیا کہنا چاہتی تھی۔ اور منہ سے کیا کچھ نکل رہا تھا۔ سیدھی سی بات تھی۔ وہ اگر کہہ سکتی تو کہہ دیتی کہ سچی محبت شکل و صورت سے ماوری ہوتی ہے۔ اور تم ٹھیک کہتے ہو۔ دنیا میں ماں ہی سچی محبت کی عظیم علامت ہے۔ مگر وہ اس کے علاوہ بھی کچھ کہنا چاہتی تھی۔ یہ کہنا چاہتی تھی کہ سچی محبت نیکی کی طرح دھیرے دھیرے قریب آتی ہے۔ مذہبی کتاب کی طرح اپنے ورق آہستہ آہستہ الٹتی ہے۔ جس طرح منہ اندھیرے دبے پاؤں چلنے والی ہوا کلیوں پر شبنم گرا جاتی ہے۔ اور طلوع ہوتے

سورج کے ساتھ ساتھ کلیاں غنچوں اور پھولوں میں بدلتی جاتی ہیں۔ اور جب محبت ادراک کے دروازوں پر دستک دیتی ہے۔ تو شکل وصورت کے سارے عیب دب جاتے ہیں۔ محبت اور کچھ نہیں ایک احساس ہے۔ نیکی کی طرح دل میں کسی لمحے اچانک پھوٹتا ہے ——

لیکن پھر اسے کچھ بھی کہنا نہیں آیا ——

اور گھر آگیا۔



رات موجو کو اپنے پاس پلنگ پر سلانے کے بعد رملی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اپنی ہی سوچوں میں ڈوبی ہتھیلی رخسار پر رکھے بیٹھی تھی کہ معاذ کپڑے بدل کر اس کے قریب سے گذر گیا۔ وہ اپنی اسٹڈی میں چلا گیا۔ اور اس نے حسب عادت بیچ والا دروازہ بند کر دیا۔ رملی بڑی دیر تک اس دروازے کو دیکھتی رہی۔ اور پھر سوچنے لگی ـــــ کہ انسانی محسوسات حیرت انگیز طور پر بدل جاتے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے جب معاذ اس کے قریب آیا کرتا تھا۔ تو اس کے جذبات نفرت کے مارے سکڑ جاتے تھے۔ اور وہ چاہتی تھی کسی طرح یہ آدمی دور چلا جائے۔ جا کر کسی دوسرے کمرے میں سو جائے اس سے بات تک نہ کرے۔ مگر آج جب وہ بدصورت آدمی بیگانگی سے اس کے قریب سے گزر کر دوسرے کمرے میں سونے کے لیے چلا گیا تھا تو اسے کتنا قلق ہوا تھا ایک چھری سی سینے میں اتر گئی تھی ـــــ

وہ اپنے آپ موازنہ کرنے لگی ـــــ ایک بدصورت مرد کو برداشت کرنا مشکل تھا یا اس کی سرد مہری کا مقابلہ کرنا مشکل ہے ـــــ؟

یقیناً یہ مشکل ترین صورتِ حال ہے۔ اس نے اپنے سے کہا۔ پتہ نہیں جو مشکل گذر جاتی ہے۔ وہ چھوٹی کیوں ہو جاتی ہے ـــــ ہر نئی مشکل پہلے سے بڑی کیوں لگتی ہے ـ؟

ایک ہی گھر میں رہنا۔ ایک ہی کمرے میں رہنا ـــــ مگر اتنے فاصلوں میں رہنا ـــــ؟ یہ فاصلے کس نے پیدا کیے رملی ـــــ؟

رملی بے اختیار رونے لگی۔ جب اس کے آنسو اجلے بستر کی سفید چادر پر بارش کی بوندوں کی طرح گرنے لگے۔ تو اسے اپنے آنسوؤں پر بھی غصہ آنے لگا۔ اس نے سوچا ـــــ اس پورے عرصے میں ایک ہی کام ہے۔ جو اس نے تواتر کے ساتھ کیا ہے۔ اور وہ ہے رونا ـــــ

اُف ——

رونے کے سوا اس نے کیا کیا ہے ——؟

اور یہ ساری رونے کی ہی نحوست ہے۔

اے کاش وہ بات بات میں نہ رویا کرتی۔ تو زندگی اس منحوس دوراہے پر نہ آکر کھڑی ہو جاتی۔

جلدی سے وہ اپنی ہتھیلیوں سے اپنی آنکھیں صاف کرنے لگی۔ اسی وقت نہ جانے کیسے معاذ دروازہ کھول کر اس کے کمرے میں آگیا اور اس کے قریب کھڑا ہو کر اسے غور سے دیکھنے لگا۔

رملی روتے روتے ڈر گئی اور اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"موجو تو ٹھیک ہے نا"؟ معاذ نے بڑے ملائم لہجے میں پوچھا۔

"جی بالکل ٹھیک ہے ——"

پھر معاذ نے بے اختیار آگے بڑھ کر موجو کے ماتھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ اس وقت بھی گہری نیند سو رہا تھا۔ جس وقت معاذ نے آگے بڑھ کر موجو کو چھوا اس کے اندر سے ایک گرم مگر جان لیوا مہک نکلی جو سیدھی رملی کے نتھنوں میں گئی ——

وہ بالکل اس کے قریب —— اس کے سانسوں کے آس پاس موجو پر جھکا ہوا تھا۔ اس کے نفیس اور بے شکن کپڑے اس کی آنکھوں کے بالکل آگے تھے۔ اس کی مخصوص خوشبو رملی کا گھیراؤ کر رہی تھی۔ اس وقت اچانک رملی کو یوں جان پڑا۔ جیسے خوشبو کی بھی زبان ہوتی ہے۔ خوشبو باتیں کرتی ہے۔ خوشبو ہنستی ہے۔ اور خوشبو ان کہی کہانیاں کہتی ہے۔

کبھی کبھی خوشبو کہتی ہے مجھ سے لپٹ جاؤ. . . . .

رملی کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

اسی وقت معاذ سیدھا ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اور بولا۔

"موجو تو اب بالکل ٹھیک ہے۔ یہ ساری رات سکون سے سویا رہے گا۔ اس کے اسطرح سونے سے ڈرنا نہیں اسے ڈاکٹر نے سونے کی دوائی دی ہے۔"

"جی اچھا ——" رملی نے آہستہ سے کہا۔

"تم بہت پریشان لگ رہی ہو۔ کیا بات ہے ——"

"کچھ نہیں —— کچھ نہیں کہتے کہتے۔ رملی کی آواز بھرا گئی۔

"تمہیں موجو کو ساتھ سلانے کی عادت نہیں ہے۔ اگر تم رات کو بے آرام ہوتی ہو تو اسے میں اپنے پاس سلا لیتا ہوں ——"

رملیٰ نے آنسو بھری آنکھیں اٹھا کر معاذ کی طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہو ـــــ اسے بھی ـــــ اسے بھی ـــــ اپنے پاس سلا لینا چاہتے ہو۔ میری راتیں بالکل ویران کرنا چاہتے ہو۔ ہر چیز مجھ سے لے لینا چاہتے ہو۔

مگر وہ رندھے ہوئے گلے کے ساتھ بولی۔

"بھلا اپنے بچّے کو اپنے ساتھ سلانے میں ماں کو کیا تکلیف ہو سکتی ہے۔ وہ کوئی بدنصیب ماں ہو گی۔ جو ایسا سوچے گی ـــــ"

"اصل میں یہ تو شروع دن سے بے جی کے پاس سو رہا ہے نا؟" ـــــ معاذ جانے کے لیے مڑا۔

"ہاں ـــــ" رملیٰ کھڑی ہو گئی۔ اور بولی۔ "بے جی کب آئیں گی۔ کب بلوائیں گے آپ انہیں ـــــ؟"

معاذ نے پلٹ کر اسے دیکھا ـــــ اور پوچھا ـــــ کیوں ـــــ"؟

"ویسے ہی میرا دل بے جی کے لیے بہت اداس ہو گیا ہے" اور یہ کہتے ہی رملیٰ کے آنسو پھر نکلنے لگے۔

"میں نے تم سے کہا تھا نا رملیٰ ـــــ" معاذ جاتے جاتے واپس آ گیا۔ "بے جی کسی کے کہنے سے نہیں آیا کرتیں۔ اپنی مرضی سے جاتی ہیں اور اپنی مرضی سے آ جاتی ہیں۔"

رملیٰ نے جلدی سے اپنے آنسو صاف کیے اور بولی۔

"آپ ایک بار مجھے جانے کی اجازت دیدیں۔ میں خود ان کو لے آؤں گی۔"

"اس طرح بے جی سمجھیں گی کہ شاید میں نے تمھیں کوئی تکلیف دے رکھی ہے ـــــ؟"

"تکلیف ـــــ؟" رملیٰ نے اپنی زخمی آنکھیں اٹھائیں اور اس کی آنکھوں میں گاڑ دیں ـــــ" نہیں ـــــ بے جی جانتی ہیں آپ ایسے نہیں ہیں میں انہیں صاف بتا دوں گی کہ جس دن سے میری شادی ہوئی ہے۔ میں ان کے ساتھ رہ رہی ہوں۔ میں ان سے مانوس ہو گئی ہوں۔ ان کے بغیر نہیں رہ سکتی ـــــ؟"

معاذ مسکرایا . . . . . .

"اس کا مطلب ہے بے جی بڑی خوش نصیب ہیں۔ ویسے تم بے جی سے ایسی باتیں نہ کہنا۔ اس دنیا میں ایک میری ماں ہی تو میری اپنی ہے۔ ایسی باتیں کر کے تم اسے بھی مجھ سے چھین لینا چاہتی ہو۔"

"معاذ . . . . ." رملیٰ کے ہونٹ پھڑک کر رہ گئے۔ اس نے ایک بڑا سا گھونٹ بھرا۔

(اذیت دینا تمہاری عادت نہ تھی۔ نہ جانے یہ ادا تم نے کہاں سے سیکھی)

"میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں ——"

"کہو۔"

معاذ واپس آ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"میں نے اس روز آپ سے کہا تھا کہ آپ مجھے جو بھی سزا دینا چاہیں دے لیں۔ مگر طلاق نہ دیں۔ یہ سب غلط تھا۔"

"کیا غلط تھا ——؟" معاذ کا رنگ ایک دم اڑ گیا۔

میں نے بڑے دعوے سے کہا تھا نا کہ جو سزا چاہیں دے لیں۔ ہے نا؟ ——

"ہاں ——"

"مگر یہ غلط تھا۔ آپ کی طرف سے میں کسی بھی سزا کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ جو سزا آپ مجھے دے رہے ہیں۔ وہ برداشت سے باہر ہے۔ آپ مجھے معاف نہیں کر سکتے"؟

"رملی ——" معاذ نے آہستہ سے اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔ معاف کرنے اور بھول جانے میں بڑا فرق ہے۔ میں تمہیں وثوق سے کہہ رہا ہوں کہ میں نے اسے تمہاری ایک نادانی سمجھ کر اسی روز معاف کر دیا تھا۔ جس روز میں دوپٹہ لے کر آیا تھا ——"

"اور آپ نے مجھے بتایا تک نہیں ——" وہ گلے بھرے انداز میں بولی۔

"کیا بتاتا ——"؟ کہ میں نے یہ کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ اب تم زندگی بھر میری احسان مند رہنا۔ نہیں رملی —— مجھے احسان مندی کے جذبات پسند نہیں۔ میں تمہیں اپنا شکر گزار کر کے اپنا مطیع نہیں کرنا چاہتا۔ رملی تم جانتی ہو احسان مندی اور محبت میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اور میں یہ بھی جانتا ہوں طبعاً تم معصوم اور نیک لڑکی ہو جو کچھ بھی تم سے ہوا۔ وہ نادانستہ طور پر ہوا۔ اسی لیے تو جوانی کو ایک بھول کہا گیا ہے —— میں نے اپنے آپ کو اس قابل بنایا کہ میں تمہیں معاف کر دوں۔ میں ایک روایتی شوہر بن کر نہ دکھاؤں۔ شاید ان ساری باتوں میں بے جی کی تربیت اور ان کے حکم کا بھی دخل ہے ——"؟

"جی ——؟"

رملی اس بری طرح چونکی جیسے اس نے کوئی دیو دیکھ لیا ہو۔

"کیا کہہ رہے ہیں آپ ——"؟

شاید مجھے یہ بات نہیں بتانا چاہیئے تھی۔ مگر اب میرے منہ سے نکل گئی ہے۔

تو صاف صاف بتا دیتا ہوں۔ جو کچھ میں نے کیا بے جی کے حکم سے کیا ہے ——— ۔۔۔۔"

رملی کا پورا جسم لرزنے لگا۔

"تو۔ ۔ ۔ تو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کا مطلب ہے اس پوری بات کا بے جی کو علم تھا؟"

"ہاں انہیں علم تھا ———"۔

"انہیں کیسے پتہ چلا ———؟"

"میں اس کی تفصیل نہیں بتانا چاہوں گا۔ لیکن نجات کا ایک راستہ مجھے بے جی نے سمجھایا تھا۔ وہ ایک زمانہ ہیں خاتون ہیں۔ تمھاری اچانک بیماری اور بار بار غشی کا بھید ان سے چھپا نہیں رہ سکتا تھا۔ اپنے طور پر بے جی بہت ہی با خبر خاتون ہیں۔ شاید تمہیں اس بات کا پتہ نہیں ہے۔ بے جی نے ٹھیک کہا تھا۔ صرف ایک انسان کے معاف کر دینے سے ایک پورا خاندان بچ سکتا ہے۔ اور ایک فرد کی عقلمندی سے ایک غلطی بر وقت درست کی جا سکتی ہے۔ تم جانتی ہو۔ میرے لیے بے جی کا حکم قرآن کا ورق ہے۔ ورنہ میں بھی دوسرے مردوں سے کچھ مختلف نہیں ہوں۔"

رملی کو ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔ ایک عجیب خوف کی لہر اس کے پورے جسم میں دوڑ گئی۔ اس نے بہت سہم کر، بہت ڈر کر معاذ کی جانب دیکھا۔

معاذ نے رملی کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو خوب اچھی طرح محسوس کیا پھر ایسے مسکرانے لگا جیسے کسی بچے کو پرچانے کے لیے مسکراتے ہیں۔

"رملی! میں تم سے نفرت نہیں کر سکتا۔ نفرت کے جراثیم میرے اندر نہیں ہیں۔ میں تم سے انتقام نہیں لے سکتا کیونکہ میں بے جی کا بیٹا ہوں اور بے جی نے میری فطرت میں سے ایسے سارے کانٹے چن چن کے نکالے ہیں۔ لیکن۔ ۔ ۔ ۔ لیکن۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان سب باتوں کے باوجود میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں فرشتہ نہیں ہوں۔ میں انسان ہوں اور انسان ہی رہنا چاہتا ہوں اور پھر انسان ہونے کے ساتھ میں ایک شوہر بھی ہوں۔ تم جانتی ہو نا؟ شوہر اونٹ کی طرح اپنا کینہ اپنے اندر رکھتا ہے۔ مگر مجھ میں اور روایتی شوہروں میں بس اتنا فرق ہے کہ میں اپنی کمزوریوں اور خامیوں کا اعتراف بھی کر لیتا ہوں۔ اعتراف کر لینے سے ضمیر کی کسک نہیں رہتی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شاید میرے اندر تھوڑا سا کینہ ہے یا غصہ ہے ——— یا رنج ہے۔ کچھ ہے۔ جسے میں باہر نکالنا چاہتا ہوں۔ تم مجھے تھوڑا سا وقت دو رملی ———

"مرد کو محض ایک جانور نہیں سمجھنا چاہیئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یا میں محض ایک جانور نہیں ہوں۔ محبتوں کے عمل محبتوں سے ہی زیب دیتے ہیں۔ اور پھر میں صاف دلی سے تمھارے

قریب آنا چاہتا ہوں۔

"اب جب کہ مجھے پتہ چل گیا ہے کہ میں تمہارے خوابوں کا شہزادہ نہیں ہوں۔ میں تمہیں موقع دینا چاہتا ہوں کسی نئے فیصلے کا —— کسی نئے جذبے کا ——

"آج تم محض میری شکر گذار ہو۔ لیکن قربتیں جذبوں کی تمنائی ہوتی ہیں۔ شاید میں جذباتی آدمی ہوں۔ بھوک کے بغیر کھانا نہیں کھاتا۔ اور بے وقت پانی بھی نہیں پیتا۔ میں تمہیں مناسب وقت دینا چاہتا ہوں۔ تم اپنے آپ کو سمجھو —— اپنے آپ کو تلاش کرو اور سوچو کہ تم کیا چاہتی ہو۔ ایسی صورت میں جب کہ ہم دونوں ہی ذہنی انتشار کا شکار ہیں۔ خلقِ خدا میں اضافہ کرنے سے کیا فائدہ ——"؟

رملی نے سر جھکا لیا۔ ایک ٹھنڈی سانس لی اور سر کو ہاتھوں سے تھام لیا۔ اب وہ کیا کچھ سمجھنے کے قابل ہو گئی تھی۔ مگر کہنے کے قابل نہ ہوئی تھی اور کہتی بھی تو کس منہ سے؟

معاذ کھڑا ہو گیا —— پھر اس کے قریب آیا۔ اس کے پاس بیٹھ گیا۔ جھک کر اس کا ٹھنڈا اخ ہاتھ اپنے دونوں گرم ہاتھوں میں تھام لیا۔

اسی وقت رملی کو یوں لگا جیسے فیوز تاروں میں بجلی کی لہر دوڑ گئی ہو۔ پہلے بھی بارہا اس نے رملی کا ہاتھ پکڑا تھا۔ مگر اس کے ہاتھ میں آتے ہی رملی کا ہاتھ مردہ ہو جاتا تھا۔ آج رواں رواں سوالی بن گیا۔

"رمو! میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ وہ بڑے پیار سے بولا اور یہ محض ایک عارضی دور ہے۔ یہ بھی گذر جائیگا۔ تم خوش خوش رہا کرو۔ . . . .

"اور ہاں ——" اسی طرح اس کا ہاتھ پکڑے پکڑے بولا "کتنے دن ہوئے تم اباجی کی خبر لینے نہیں گئیں ——؟"

"ایک ہفتہ ہی تو ہوا ہے ——؟" رملی بسور کر بولی۔

نہیں ہمیں ہر دوسرے تیسرے روز جانا چاہیئے۔ پہلا سال تنہائی کا ان کے لیے بہت اذیت ناک ہوگا۔ تم مجھے یاد دلا دیا کرو۔ میں بعض اوقات کام کی زیادتی کی وجہ سے بھول جاتا ہوں۔ اچھا کل شام کو چلیں گے۔ اور کھانا ان کے ساتھ کھائیں گے۔ . . . "

رملی نے صرف سر ہلا دیا۔

معاذ نے رملی کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اور کھڑا ہو گیا ——

"اچھا رمو —— شب بخیر —— اس نے ایک جمائی لی اور چلا گیا ——"

وہ تو رملی کا ہاتھ چھوڑ کر جا چکا تھا۔ مگر رملی کے ہاتھ پر اس کی ہتھیلی کی گرفت

رہ گئی تھی۔

ابھی تک ایک گرم حلقہ تھا جس نے اس کے ہاتھ کو گھیرے میں لیا ہوا تھا۔ ابھی تک ایک مجروح سی تمنا اس ہاتھ پر بیٹھی تھی۔

پھر ایک اجنبی سی خواہش نے دل کو گدگدایا........ پھر کسی شناسا درد نے دل میں چٹکی لی ——

عجیب ہے یہ عورت ذات بھی۔ سارا دن ذرہ ذرہ چن کر اپنے آپ کو جوڑتی رہتی ہے اور رات کو ریت کی طرح بکھر جانا چاہتی ہے۔

اپنی اس تبدیلی پر رملی کو بہت تعجب ہوا۔

معاذ کے چلے جانے سے اس کا دل اداس ہو گیا تھا۔

آج اس کا دل بے اختیار چاہ رہا تھا۔ وہ معاذ کو روک لے —— مگر جو کچھ معاذ نے کہا تھا۔ اسے سننے کے بعد وہ پتھر کی طرح بوجھل بنکر بیٹھی رہ گئی۔ اور اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکی —— مڑ کر دائیں جانب دیکھا —— تو ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اپنی ہی صورت نظر آگئی —— وہ اپنے آپ کو یوں دیکھنے لگی جیسے پہلی مرتبہ دیکھ رہی ہو۔ اپنے چہرے کا اک اک نقش اجنبی لگ رہا تھا۔ پتہ نہیں اپنا آپ کہاں رکھ کر بھول گئی تھی۔

کیا اس حسن پر مجھے ناز تھا ——؟ جسے وہ نظر انداز کر کے چلا گیا ہے؟

اس نے اپنے آپ سے پوچھا ——

حسن تو اک سوزِ مسلسل ہے۔ حسن تو ایک کرب ہے —— حسن تو ایک ناسور ہے۔ حسن تو ایک سزا ہے۔

پتہ نہیں لوگ حسن کی تمنا کیوں کرتے ہیں۔

شمع کتنی روشن ہوتی ہے۔ مگر اس کا جگر ہمیشہ جلتا رہتا ہے۔ لوگ اس کے جلنے کو زندگی کی علامت کہتے ہیں —— خود جل کے دوسروں کو روشنی دینا کسقدر مشکل کام ہے۔

حسن کے نصیب میں عام طور پر آنسو آتے ہیں ——
حسن کو اپنا خراج ہمیشہ آنسوؤں سے ادا کرنا پڑتا ہے ——
حسن کو اپنی قیمت اپنی کسی محرومی کی صورت میں ادا کرنی پڑتی ہے ——

وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

اپنا سارا سراپا آئینے میں دیکھا اور سوچا ——

باری تعالیٰ ــــ مجھے اتنا حسن نہ دیتا، مگر اچھے نصیب دے دیتا ــــ کتنی خوش رہتی ہیں یہ عام سی شکلوں کی لڑکیاں ــــ

اچھی صورت کا سب سے بڑا عیب ہی یہ ہے کہ دیکھنے والے اسے منزل سے بھٹکا دیتے ہیں۔

اس نے بتی بجھائی اور آکر اپنے بستر پر لیٹ گئی۔

لیٹتے ہی اسے معاذ کا خیال آیا۔ کل تک جس کے خیال سے اسے گھن آتی تھی۔ آج اس کا خیال دربان بنا احساس کے ہر دروازے پر کھڑا تھا۔ تب اس نے سوچا ــــ

مرد کی خوبصورتی کیا ہوتی ہے بھلا ــــ؟

اس کے پورے وجود پر جیسے آوازوں کی بارش ہونے لگی۔

"خوبصورت مرد وہ ہوتا ہے۔ جو عورت کی بڑی سے بڑی خطا معاف کر دیتا ہے۔"

"خوبصورت مرد وہ ہوتا ہے جو عورت کو روٹی کپڑا اور پناہ دیتا ہے۔"

"خوبصورت مرد وہ ہوتا ہے جو روٹی کپڑا اور پناہ دے کر احسان نہیں کرتا۔ بلکہ خود مشکور نظر آتا ہے۔"

"خوبصورت مرد وہ ہوتا ہے۔ جو وحشت کے گھوڑے پر سوار ہو کر عورت کی انا کی دھجیاں نہیں اڑا دیتا ــــ"

"خوبصورت مرد وہ ہوتا ہے۔ جو مانگے بنا عورت کو محبت دیتا ہے۔"

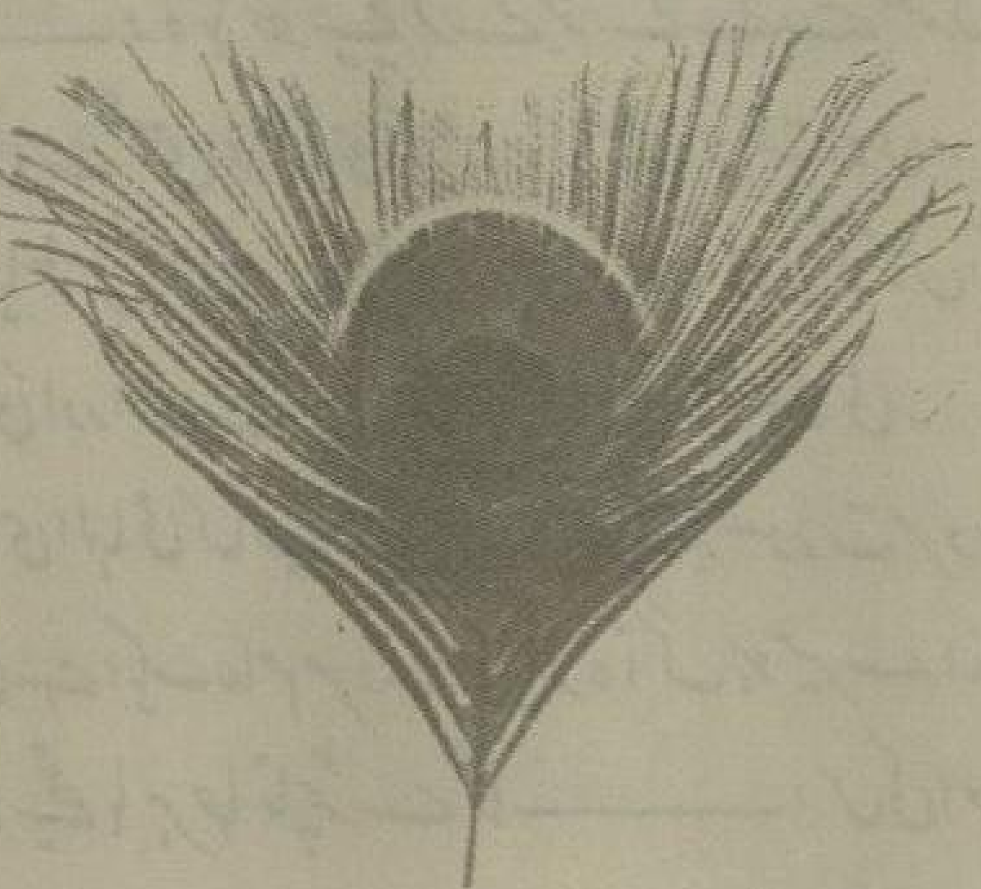
"خوبصورت مرد وہ ہوتا ہے جو عورت کو نفسانی خواہشات کا محض آلہ نہیں سمجھتا۔"

"خوبصورت مرد وہ ہوتا ہے جو عورت کی نیند کو اپنے نفس پر ترجیح دیتا ہے۔"

"خوبصورت مرد وہ ہوتا ہے جو عورت کو موتیا کا پھول سمجھتا ہے۔ موتیا کا پھول گرم سانس کی گرمی نہیں سہہ سکتا۔ وہ عورت کو اپنے مزاج کی تپش سے جلا کر راکھ نہیں کر دیتا۔"

خوبصورت مرد ــــ؟

افوہ! رملہ نے سر کو تکیے پر ادھر اُدھر دے مارا۔



ایک شام کام ختم کر کے رملیٰ نے معوذ کو کھانا کھلایا پھر اسے کمرے میں سلا کے ٹی وی دیکھنے بیٹھ گئی۔ کوئی بہت ہی دلچسپ پروگرام ہو رہا تھا پروگرام دیکھتے دیکھتے اسے یوں محسوس ہوا خوشبوؤں کے معطر جھونکے کسی خاص سمت سے آ رہے ہیں۔ کافی دیر بعد وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آئی تو دیکھا۔ معاذ آئینے کے آگے کھڑا تیار ہو رہا تھا۔ اسے خوشبوئیں استعمال کرنے کی عادت تھی اور غالباً وہ خوشبوؤں کی زبان جانتا تھا۔ اس وقت اس نے ایسی خوشبو لگا رکھی تھی جو رات کی تنہائی میں آواز بنکر ہر جذبے کو جگا دیتی ہے۔ رملیٰ حیران سی جا کر اس کے پاس کھڑی ہو گئی۔ اور اسے دیکھنے لگی۔ معاذ نے کتھئی رنگ کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ اندر سفید سلک کی قمیض تھی۔ اور اسی رنگ کی پرنٹڈ ٹائی باندھی ہوئی تھی۔ معاذ بہت اسمارٹ لگ رہا تھا۔ اگر اس کے پورے سراپے پر نظر ڈالو تو وہ ایک دم خوش لباس مرد نظر آتا تھا۔ تب رملیٰ کی سمجھ میں آیا کہ مرد کی وجاہت اس کے پورے سراپے میں ہوتی ہے۔ صورت اس کے لیے ثانوی شے ہے مگر اس کی صورت پر ایک گرم گرم آنچ تھی جسے رملیٰ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی۔

"کہاں جا رہے ہیں آپ ——؟" رملیٰ ضبط نہ کر سکی اور ایک دم پوچھ لیا۔

معاذ نے قرینے سے اپنے گھنے بال جمائے۔ پھر اسپرے کیا۔ ایک کریم لیکر اپنے چہرے پر لگائی۔ مڑ کر رملیٰ کو دیکھا اور اپنے صحت مند ہاتھ ایک دوسرے کے ساتھ ملتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اور بولا۔

"میں جھوٹا آدمی نہیں ہوں اور جھوٹ کو چھپانے کے لیے رنگ برنگے بہانے

بھی نہیں تراشتا ——— وہ ہاتھ نیچے کرکے جوتے کے تسمے کھول کر دوبارہ پھول بنانے لگا۔
اور نہ میں نے کبھی دعویٰ کیا ہے کہ میں فرشتہ ہوں . . . . . .
"بدنصیبی یا خوش نصیبی ہے میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میں ایک بدصورت آدمی ہوں۔"
رملی لرز گئی اور اس نے اپنی شرمندہ سی نگاہ جھکالی۔
"ایسا تو کسی الہامی کتاب میں نہیں لکھا کہ بدصورت مرد جذبات واحساسات سے عاری ہوتے ہیں۔ ممکن ہے ایک عام مرد سے زیادہ آگ ہو میرے اندر . . . . .
"کبھی کبھی مجھے باہر جانا پڑے گا ——— اس کی اجازت میں تم سے ضرور لوں گا۔" . . . . .
"اور تم جانتی ہو۔ تم اس کی اجازت مجھے ضرور دو گی۔"
پہلے تو میں تمھارے جذبات سے آگاہ نہیں تھا۔ اس لیے انجانے میں تمھیں تنگ کرتا رہا۔ خیر اس کا ایک فائدہ بھی ہوا۔ ماشاءاللہ ہمارا ایک بچہ ہے۔ اب دنیا کی نظر میں ہم دونوں کامیاب میاں بیوی ہیں۔ میں اور تم بہت سے الزامات سے بری ہو گئے ہیں۔
"اور میں کیا کر سکتا ہوں تمھارے لیے رملی ———؟
"میں جان گیا تھا تمھیں میرا قرب ناپسند ہے۔ پہلے بھی تم اپنی چیخیں اپنے گلے میں دبا کر میرے ساتھ بسر کرتی رہی ہو۔ میں تمھیں آزاد کر دیتا۔ مگر تم نے طلاق کو ناپسند کیا ہے۔ تمھارے اس جذبے کی میں قدر کرتا ہوں۔ ایک اور مجبوری بھی ہے۔ میری ماں تم سے بہت پیار کرتی ہے۔ تمھارا باپ آجکل بہت دکھی ہے۔ تم منتشر اور کھوئی کھوئی رہتی ہو تم سے ابھی تک فیصلہ نہیں ہو سکا ——— تم بہت معصوم ہو ——— میں چاہتا ہوں میں ہی بدترین آدمی بن جاؤں تاکہ تمھارے پاس میرے ساتھ نفرت کرنے کا جواز ہو۔"
اس نے ایک بار پھر شیشہ دیکھا۔ سر سے پاؤں تک ———
پھر رملی کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ اور بولا۔
"تمھیں حیرت ہو گی کہ مجھ جیسا بدصورت انسان بھی بار بار شیشہ دیکھتا ہے۔"
یہ کہتے وقت وہ ذرا بھی احساس کمتری میں مبتلا نظر نہیں آرہا تھا۔ بلکہ عجیب سا وقار تھا اس کے چہرے پر ———
"بات یہ ہے کہ باہر کی عورت مرد کے ہر قسم کے وقار کو بحال کر دیتی ہے۔ اس کی انا کو ساتویں آسمان پر پہنچا دیتی ہے۔ اسے جھوٹی تعریف کے اتنے ہار پہنا دیتی ہے کہ اسے اپنا اصل چہرہ نظر ہی نہیں آتا ——— جھوٹ بول بول کر ایک رات میں اسے اتنا سیراب

کرتی ہے کہ صبح تک وہ ایک نیا مرد بن جاتا ہے۔ دنیا میں زندہ رہنے کے لیے ہر انسان کو خوش فہمیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے مجھ جیسے مرد بھی دکھاوے کا بناؤ سنگھار کر لیتے ہیں۔"

"اچھا خدا حافظ ——"

اس نے چلتے چلتے کہا۔

"ممکن ہے میں صبح آؤں ..... یا ذرا لیٹ آؤں —— کچھ کہہ نہیں سکتا تم اطمینان سے سو جانا۔ گیٹ پر چوکیدار موجود ہے۔"

اور وہ باہر نکل گیا۔

رملی کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ پتھر کی طرح راہ گذر میں پڑی رہ گئی ہے۔ اور وہ اسے ٹھوکر لگا کے چلا بھی گیا ہے۔

تو گویا آج رات معاذ ایک دوسری عورت کے ساتھ گذارے گا۔ کون ہوگی یہ دوسری عورت —— کیا اس سے زیادہ خوبصورت ہوگی ——؟

چھی چھی —— ہوگی کوئی پیشہ ور طوائف —— گندی عورت —— ذلیل!

اور اس گندی عورت کے ساتھ ساری رات وہ اچھی اچھی باتیں کریگا اور وہ سب کہے گا جو رملی سے کہتا رہا ہے ——

چھی —— کتنا واہیات ہوتا ہے یہ مرد —— جھوٹا اور کمینہ!

مگر مجھے پروا کیوں ہو ——؟

میں کیا جانتی ہوں اس کو —— مجھے اپنا کارنامہ سنا کر چلا گیا ہے —— جیسے میں جل ہی تو جاؤں گی۔ جلتی ہے میری جوتی ——؟

اور وہ کون سی حسن پریاں ہوتی ہیں۔ کمینی اور گھٹیا عورتیں .....

وہ اٹھ کر بے ارادہ باہر چلی گئی —— ادھر ادھر گھوم پھر کر پھر اندر آ گئی۔ بے اختیار آئینے کے آگے کھڑی ہو گئی —— بڑی حسرت سے اپنی صورت دیکھنے لگی۔ یوں لگا آج یہ صورت اجڑ گئی ہے۔

روپ کا پنچھی اڑ گیا ہے ——

اونہہ ——

اس نے زور سے پاؤں فرش پر مارا ——

آخر مجھے اس کی پرواکیوں ہو۔ ؟ کیوں کروں میں اس کی پروا ——— مجھے بتانا چاہتا ہے کہ دنیا میں مجھ سے بھی زیادہ حسین عورتیں ہیں۔ اور اسے میری ذرا بھی پروا نہیں ہے ——— ؟

وہ ..... وہ میرے قابل ہی نہیں تھا۔ خواہ مخواہ میں نے اسے سر پر چڑھانے کی کوشش کی ——— منتیں کیں۔ معافیاں مانگیں۔ بھلا ایسے بدنیت انسان سے معافی مانگنے کی کیا ضرورت تھی۔

جو معاف کر دیتے ہیں۔ وہ کوئی بدلے لیتے ہیں۔ بدلہ لینا کیا اچھے انسانوں کا کام ہے۔

اونہہ .....

میں اسے فرشتہ سمجھ بیٹھی تھی۔ کیا فرشتے ایسے ہوتے ہیں۔ سب مرد ہرجائی ہوتے ہیں اور تمہارا اپنے بارے میں کیا خیال ہے رملی ——— ؟

آئینے نے پوچھا ———

تم نے کیا کیا ——— تمہیں کچھ یاد ہے ؟

ایک کراہ کے ساتھ رملی شیشے کے آگے سے ہٹ گئی۔ اور پھر معاذ کی اسٹڈی میں چلی گئی یونہی ایک ایک کاغذ کو اٹھا کر دیکھتی رہی۔ ان پرزوں کو دیکھنے کا کیا فائدہ ہے رملی اصل بات تو وہ تجھے بتا گیا ہے۔ ہاں اس بات کا تو غصہ ہے۔ بھلا اصل بات بتانے کی کیا ضرورت تھی۔ اور بھی مرد بددیانتیاں کرتے ہوں گے تو کیا اپنی بیویوں کو بتا کر جاتے ہوں گے ——— ؟ بتا کر جانے کا مطلب تو یہ ہے کہ بیوی اس آگ میں مسلسل جلتی رہے۔ اچھا اب وہ مجھے جلا جلا کر مارنا چاہتا ہے ——— مگر میں کیوں جلوں ——— ؟ میں ہرگز نہیں جلوں گی۔ جلتی تو وہ بیویاں ہیں جو اپنے شوہر پر مرتی ہیں۔ میں کیوں مروں گی ایسے خبیث انسان پر ——— اچھا ہے میں نے تو اسے کبھی پسند ہی نہیں کیا ———

غصے سے بل کھا کر وہ اسٹڈی سے باہر نکل آئی۔

بھلا مجھے پرواکیوں ہو ——— ؟ جہاں مرضی ہو جائے ——— میں نے پہلے بھی اس کے دن رات کا حساب رکھا ہے جو آج پرواکروں۔ پتہ نہیں پہلے کہاں کہاں جاتا ہوگا ——— کیا بھروسہ ایسے مردوں کا ——— بیویوں کے سامنے اپنی پارسائی کے قصے سناتے ہیں اور کرتوت یہ ہیں ——— اونہہ ———

آکر اپنے بستر پر بیٹھ گئی۔

تھوڑی دیر بستر پر بیٹھی رہی ——— پھر لیٹ گئی ——— سیدھی چت ——— چھت

پر نظریں جمائیں تو تکیے میں سے معاذ کی خوشبو نکل آئی اور آکر احساس سے لپٹ گئی ——
کیا فائدہ ایسے گھٹیا آدمی کے بارے میں سوچنے سے ——
اب وہ کسی گندی عورت کی خوشامد کر رہا ہو گا۔ اس کی جھوٹی تعریف کر رہا ہو گا۔
وہ کم بختیں تو پیسے کی پیر ہوتی ہیں۔ پیسے ہتھیانے کے لیے کوئی کتیا اس کی جھوٹی خوشامد کر رہی ہو گی۔ ہر روز سینکڑوں بے وقوف آتے ہیں ان کے پاس —— کتنوں کو بھگتاتی ہیں وہ چڑیلیں —— اور مرد تو روز اول سے بے وقوف بننا چاہتا ہے . . . . .
بیوی کے ہاتھوں نہیں دوسری عورتوں کے ہاتھوں —— میں طوائف نہیں ہوں۔ میں جھوٹ نہیں بول سکتی، ہاں . . . . بس . . . نہیں . . . نہیں . . .
پھر اس نے جھلا کر کروٹ بدل لی ——
تو تکیے میں سے دوسرا جھونکا نکل آیا۔ پتہ نہیں معاذ کی خوشبو تکیوں میں کیوں بس گئی تھی۔

جب وہ اس کے دل میں نہیں بس سکا تھا تو تکیوں میں کیوں بس گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اسے اپنے شادی کی کچھ ابتدائی راتیں بھی یاد آ گئیں۔ معاذ قریب آکر بیٹھتا تو یوں لگتا آگ کا ایک الاؤ قریب آ گیا ہے۔ پتہ نہیں اس میں اتنی تپش کیوں تھی؟ یہ تپش عشق کی علامت تھی بے خودی کی یا اس کے گرم جذبوں کی ——

اس کے ہاتھ بہت گرم اور بہت بے تاب ہوتے تھے۔ ہاں کئی بار اس نے سوچا تھا۔ معاذ کی ابتدائی پرورش چونکہ گاؤں میں ہوئی تھی۔ اس لیے وہ شہری مردوں کی نسبت بہت توانا اور مضبوط تھا۔ اس کے ہاتھ تو لوہے کے ہاتھ لگتے تھے۔ معاذ کی سانسوں میں سے ہمیشہ ایک ہیجان انگیز مہک نکلا کرتی تھی۔ اس مہک کو کسی بچے کی سانس کی مہک سے تشبیہہ نہیں دی جا سکتی۔ مگر نہ جانے اس کی سانسوں میں سچائی کیوں بولتی تھی۔

وہ جب سو رہا ہوتا تب بھی اس کی خوشبودار، سچ بولتی ہوئی سانسوں کی پھوار رملی کو بے چین کر دیتی —— وہ گھبرا کر آنکھیں کھول دیتی۔ مگر آنکھیں کھولتے ہی اس کی نظر اس کے بدصورت چہرے پر جا پڑتی اور وہ ٹوٹ پھوٹ جانے کی کیفیت ایک دم زائل ہو جاتی۔ پھر وہ دل مسوس کر ایک دم کروٹ بدل لیتی۔ اٹھتے بیٹھتے ہوئے —— چلتے پھرتے ہوئے . . . . معاذ ایک فولادی آدمی لگتا تھا۔ چھا جانے والا ——
ابھی ابھی . . . . . تو اسے ان سب باتوں کی سمجھ آئی تھی . . . . ابھی . . . ابھی . . . . تو اسے پتہ چلا تھا کہ مرد کی اصل کیا ہے ——

اور اس نے اپنی اصلیت دکھا بھی دی تھی۔
اچھا ہے وہ اور زیادہ نہیں جھکی تھی۔ اس کے آگے سر نہیں پٹکا تھا۔ وہ اس قابل تھا ہی نہیں۔

اوہ ——

اس نے سر کو ادھر ادھر جھٹکا۔ وہ مسلسل معاذ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

اگر مجھے اس کی پروا نہیں —— مجھے اس کے اس طرح چلے جانے کا قلق نہیں —— میں اسے ذرا بھی پسند نہیں کرتی تو مسلسل اس کے بارے میں کیوں سوچے جا رہی ہوں۔؟ ——

مجھے واقعی اس کی پروا نہیں کرنی چاہیئے ——

بلا سے وہ جہاں بھی جائے۔ گندگی میں منہ مارے یا غلاظت سونگھتا پھرے —— لعنت بھیجو اس کے ہر خیال پر ——

مگر اس نے کیا جرم کیا ہے ——؟ رملی کے ضمیر نے کچوکا لگایا۔

تمہی نے ہر طریقے سے اسے بتایا ہے کہ تم اسے ناپسند کرتی ہو۔ کوئی مرد اپنی باہر کی کارروائیاں اپنی بیوی کو نہیں بتاتا۔ دیکھو —— معاذ کتنا مختلف مرد ہے ——؟ وہ یہ سب ضرورت سے مجبور ہو کر کر رہا ہے —— اگر طبعاً عیاش ہوتا تو کیا تمہیں بتا کر جاتا......

نہیں بتایا تو اس نے اس لیے ہے کہ میں اذیت میں مبتلا رہوں ——

تو تم کیوں ہوتی ہو اذیت میں مبتلا —— لعنت بھیجو اس کے ہر خیال پر اور سکون سے سو جاؤ ——

سو جاؤں ——

ہاں ہاں سو جاؤ اور یوں سمجھو جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ——

مگر نیند بھی تو آئے ——

نیند کہاں چلی گئی آج ——

پتہ نہیں وہ کہاں بیٹھا ہوگا ——؟ کیسی عورت ہوگی وہ کمینی ——

اونہہ۔ . . . اسے ایک دم ہسپتال کا زمانہ یاد آ گیا۔ جب نرس آ کر اسے معاذ کی دیوانگی کے بارے میں بتایا کرتی تھی۔ اور وہ چاہتی تھی نرس سے کہہ دے۔ تم لے لو میرے شوہر کو...!

نہیں رملی! اپنا شوہر کسی کو سونپا نہیں جا سکتا۔ اپنا شوہر تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔

یہ بڑی دکھن کا کام ہے ——
حالانکہ تجھے اس کی پروا نہیں —— تو اس سے ہمیشہ نفرت کرتی رہی ہے
مگر یہ جو شوہر بیوی کا رشتہ ہے نا ! بس —— ہے بڑا ذلیل رشتہ ——
اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔ دور رہ کر قریب ہوتے ہیں —— قریب ہوں تو دوریاں ہی دوریاں ہوتی ہیں۔

اف میں کیا کروں ——؟

کیا تو نے کبھی اسے اپنا شوہر سمجھا ——؟

اب تو سمجھنے لگی تھی ——؟

تو اس کے لیے کیا کیا تو نے —— اپنی انا تک تو بھینٹ نہیں چڑھائی اسے منانے کے لیے کیا کیا ——؟

کیا کرتی میں —— میں ایک عورت ہوں۔ اور اس سے زیادہ کیا کرسکتی ہوں ——؟

ہاں تو سب کر سکتی ہے —— وہ سب جو اس وقت ایک عورت معاذ کے ساتھ کر رہی ہوگی ——

تو نے سنا نہیں شاعر کہتا ہے ——

مینوں کنجری بننا عیب نئیں
مینوں نچ کے ڈھول مناؤن دے

اپنے ساجن کو پرچانا عیب نہیں ——

نہیں میں یہ سب نہیں کر سکتی —— اس نے دوسری طرف کروٹ بدل لی۔

گھڑی پر نظر چلی گئی۔ دو بج رہے تھے اور وہ ابھی تک جاگ رہی تھی اور مسلسل اس کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ جبکی اسے پروا نہیں تھی۔

اب نہیں سوچوں گی اس کے بارے میں —— اس نے ہاتھ بڑھا کے بتی گل کر دی۔ اور آنکھیں موندلیں۔

وہ تو کہیں صبح اپنا مکروہ چہرہ لیکر آئیگا ——

تو پھر میں کس کے بارے میں سوچوں ——

اندھیرا ہوتے ہی اچانک اسے شان بھائی یاد آگئے۔ شان بھائی دیکھنے میں کتنے شاندار مرد تھے۔ مگر ان کا باطن کتنا بدصورت تھا۔ اف پھوپا جی بچاری . . . . . ایسے بدطینت آدمی کے

ساتھ گذارہ کر رہی ہیں۔

خوبصورت تو ——

وہ لرز گئی ——

یا ور بھی تھا۔ مگر اندر سے کتنا گھناؤنا —— ؟

تھو —— یاور گندہ آدمی تھا جسطرح طوائف گندی ہوتی ہے۔

اور رملیٰ دنیا میں اچھا کون ہے —— ؟

کون ہے اچھا —— !

اپنے خیالی تخت سے نیچے اتر آؤ۔ اتنی ٹھوکریں کھائیں اور زندگی کا قرینہ نہ دیکھا۔

اچھا یا برا اپنا دل ہوتا ہے رملیٰ ——

اور جو دل کے قریب بیٹھے ہوں ان کو دل کی گلیوں میں تلاش کر لیتے ہیں۔ اچھائیاں تلاش کرنے سے ملتی ہیں —— انسانوں کو کھوجنا پڑتا ہے۔ دفینے بڑی محنت سے تلاش کئے جاتے ہیں۔

اور اچھائی کا بیج پہلے اپنے من میں پھوٹتا ہے ——

محبت وہ سورج ہے جسکی شعاع پہلے اپنے تن سے نکلتی ہے ——

اور معاذ تم تو اتنے اچھے تھے۔

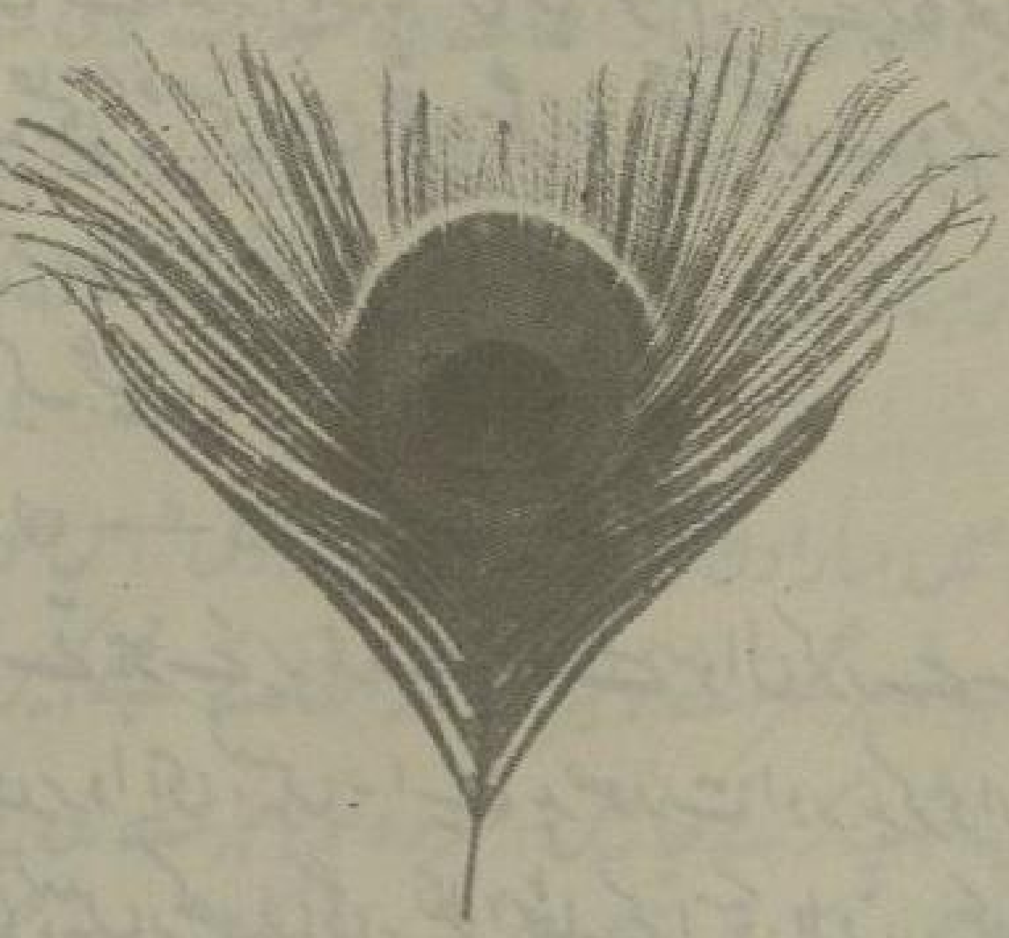
بے جی کے پیارے بیٹے تھے ——

تمہاری سانسوں میں سے آسمانی خوشبو آتی تھی ——

اور معاذ اب تو میں ہر رات اس خوشبو میں جھولا جھولتی سو جاتی تھی ——

اچھے معاذ تم نے اتنی گندی حرکت کیوں کی —— ؟

رملیٰ تکیے کو سینے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔



ابھی پلک لگی تھی۔ ابھی موجو کے رونے سے آنکھ کھل گئی۔ ایک دم اٹھ بیٹھی۔ باورچی خانے میں گئی۔ بوتل بنا کے اس کے منہ کے ساتھ لگا دی۔ جسے موجو نے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ اور دروازہ کھول کر باہر نکلی تو ساتھ والے کمرے میں معاذ سو رہا تھا۔ یہ کب آیا ——؟ اس نے فوراً دیوار گیر کلاک کیطرف دیکھا۔ صبح کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ شاید صبح ہونے سے پہلے آگیا۔ اس نے غور سے سوئے ہوئے معاذ کو دیکھا۔ اب اس نے کپڑے بھی بدلے ہوئے تھے۔ رات کا کرتا اور پاجاما پہن رکھا تھا۔

یہ کپڑے کس وقت بدل لیے ——؟ رملی کو حیرت ہونے لگی۔ صبح تین بجے تک تو وہ کروٹیں بدلتی رہی تھی اور کراہتی رہی تھی۔ ذرا کی ذرا ایسا سوئی کہ کسی کے آنے جانے کی سدھ نہ رہی۔

کیسا بے سدھ سو رہا ہے ——؟

رملی کو غصہ آنے لگا۔ جیسے بے دم ہو کے آیا ہو۔ اس کا دل چاہا کہ معاذ کو بالوں سے پکڑ کر جگا دے۔ اسکا گریبان پھاڑ ڈالے —— اور اس کے منہ پر خوب تھپڑ لگائے۔

گھبرا کر وہ صحن میں نکل گئی۔۔۔۔۔

نومولود سی صبح طلوع ہو رہی تھی۔۔۔۔ دن کا آغاز ہو رہا تھا۔ ہر نظارہ کروٹ لیکر جوان ہو رہا تھا۔

باہر بالکل نیا موسم تھا۔

جسطرح اس کے اندر ایک بالکل نیا موسم جنم لے چکا تھا۔
وہ تمام شب جلتی کڑھتی رہی تھی۔ مگر اب تھکی تھکی بے دم نہیں تھی۔ بلکہ اس کے اندر عجیب سا ولولہ اور جذبہ جنم لے رہا تھا۔
اب معاذ پر ایک عجیب سا غصہ آرہا تھا۔
مگر یہ سب کیوں ــــ یہ سب کیوں ــــــ
دور، دور چہچہاتے ہوئے پرندے اس سے سوال کر رہے تھے۔
مجھے تو اس کی پرواہ ہی نہیں۔ ایسے بدصورت اور بدکردار آدمی سے میرا کیا ناتا؟ میں اس سے کوئی واسطہ ہی نہیں رکھوں گی۔ نظر اٹھا کے اسکی طرف دیکھوں گی بھی نہیں ــ بات بھی نہیں کروں گی۔ اسے بتا دوں گی۔ اگر وہ میری سیج پر انگارے بچھا سکتا ہے تو میں بھی اس کے بغیر رہ سکتی ہوں۔
بھلا مجھے کیوں پرواہو ــــــ
جلتی کڑھتی وہ پھر اندر آگئی۔
معاذ اوندھا لیٹا ہوا تھا۔ اس کا دل چاہا، وہ پکڑ کے اسے سیدھا کر دے۔ شاید اسطرح سویا سویا تھک گیا ہوگا۔
(مگر میں کیوں اس کی اتنی پرواکر رہی ہوں)
رملی کا دل چاہا اس کے قریب بیٹھ جائے۔ اس کا چہرہ اپنی طرف موڑ لے اور پھر اس کا سر پکڑ کے اپنے زانو پر رکھ لے اور کہے اب دیکھتی ہوں میرا حلقہ توڑ کے تم کہاں جا سکتے ہو ــــــ
(افوہ! اسے پھر غصہ آیا ایسے گندے آدمی کے لیے وہ کیسی اچھی اچھی باتیں سوچ رہی تھی۔)
اسی وقت اچانک اسے بے جی کی باتیں یاد آگئیں ــــــ
ایک روز ایک خاتون بے جی کے پاس رونا رونے آئی تھی کہ اسکا شوہر رات کو بہت دیر سے آتا ہے۔
تو بے جی نے کہا تھا۔
"دیر سے آنے کی وجہ اس سے دریافت نہ کیا کرو۔ اپنے آپ سے پوچھو ــــــ عورت وہی اچھی ہوتی ہے جو رات کو اپنے شوہر کو پرچالے۔ یہ ٹھیک ہے کہ تم نے گھر کو بہت سجا بنا کر رکھا ہے۔ بچوں کا بھی دھیان رکھتی ہو۔ گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ مرد جتنا زیادہ

کما کر لاتا ہے۔ اتنے زیادہ اس کے ناز اٹھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ زیادہ کمانے والے مرد اور بے تحاشا آسائشیں مہیا کرنے والے شوہر اپنی بیویوں سے بے پناہ توقعات رکھتے ہیں۔ زمانے کے مطابق رہنا ہی ضروری نہیں اپنے شوہر کی توقعات اور مطالبات کو سمجھنا بھی بہت ضروری ہے۔"

"بے جی میں سارا دن کی تھکی ہاری ہوتی ہوں" اس عورت نے لبسور کر کہا۔ میرا دل چاہتا ہے شام کو جب شوہر گھر آئے تو میرے ناز اٹھائے۔ مجھے کہیں لیکر جائے۔ سینما دکھائے۔ دوستوں کے ہاں گپ شپ کرنے جائیں۔ مگر وہ تو باہر سے ہی اپنا موڈ خراب کر کے گھر آتا ہے پھر ذرا سی بات پر آگ بگولہ ہو کر باہر نکل جاتا ہے اور کہیں رات گئے آتا ہے ——"

"اپنی رات اپنے شوہر کو دو ——" بے جی نے آہستہ سے کہا۔

"دن کے کام کم کر دو۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ صاف ستھرا خوبصورت گھر مرد کو آسودگی دیتا ہے۔ مگر مرد کو زندگی میں ایک تھکی ہوئی عورت کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ وہ خود بہت تھکا ہوا ہوتا ہے۔ اس لیے باہر کی عورتوں کی طرف دوڑتا ہے۔ تم رات کو اس کو ایک تازہ دم، خوش مزاج اور خوش لباس عورت کی طرح ملا کرو۔ زندگی کے معمول سے ہٹ کر باتیں کیا کرو ایک رات میں اسے تازہ دم اور ہلکا پھلکا کر دیا کرو۔ پھر وہ اپنی جنت اپنے بیڈ روم میں آباد کرنے لگ جائیگا۔"

"عورتیں زندگی کی دوڑ میں مردوں سے پہلے تھک جاتی ہیں۔ اس لیے مرد باہر کا رخ کرتے ہیں ——"

"مگر میں تھکی ہوئی عورت نہیں ہوں۔ رملی نے سوچا ——"

"تو ایک بیزار عورت ہے۔ اور بے زار عورت کے قرب سے مرد بھاگ جاتا ہے۔"

رملی پھر باہر نکل گئی۔ اور جا کر باورچی خانے کا کام کرنے لگی۔ پتہ نہیں بے جی یہاں ہوتیں تو اس صورت حال کا کیا اثر لیتیں۔ آج اس نے شکر کیا کہ بے جی یہاں نہیں تھیں۔ کیونکہ ان کی موجودگی میں تو معاذ کبھی رات کو باہر رہنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ تب اسے احساس ہوا کہ گھر میں ایک بزرگ کا ہونا کتنا ضروری ہے۔ ایسا بزرگ جسکا احترام شوہر کرتا ہو۔

بزرگ گھر کا حجاب ہوتے ہیں ——

گھر کا پردہ رکھ لیتے ہیں ——

ہمارے لوگ کتنے بھی کمینے ہو جائیں۔ بزرگ کے سامنے نگاہ جھکا لیتے ہیں۔

اگر بے جی یہاں ہوتیں تو معاذ کو کبھی کہیں جانے کی جرأت نہ ہوتی۔ رات کو

سونے سے پہلے معاذ بے جی کے پاس ضرور بیٹھتا تھا۔ کبھی ان کی ٹانگیں دبا دیتا۔ سر دبا دیتا وہ خواہ منع کرتی رہیں۔ مگر معاذ سونے سے پہلے اپنی ماں کے کمرے میں ضرور جایا کرتا تھا۔
عام بیویوں کی طرح رملی کو اس بات سے غصہ نہیں آتا تھا۔ نہ ہی حسد محسوس ہوتا تھا۔ ہاں اسے یہ بات عجیب ضرور لگتی تھی۔ اس لیے کہ اس کے بھائی ایسا نہیں کرتے تھے۔ بلکہ امی جان تو ان کی صورت دیکھنے کو ترستی بلکتی چلی گئیں۔

رملی کو ہر قدم پر احساس ہو رہا تھا کہ معاذ عام مردوں سے مختلف ہے۔ اس میں خاص آدمیوں والی باتیں تھیں۔ جن باتوں کی اس نے قدر نہ کی۔ بلکہ اپنے سلوک کی وجہ سے وہ اسے بھی عام آدمیوں کی صف میں دھکیل رہی تھی۔

یوں تو رملی باورچی خانے میں کام کر رہی تھی۔ مگر ذہن برابر معاذ کی جانب لگا ہوا تھا ـــــــ

کھڑے کھڑے اسے اپنے آپ پر غصہ آیا۔ کہ یہ میاں بیوی کا رشتہ بھی کیسا ذلیل رشتہ ہے ـــــ توڑنا چاہو تو ٹوٹتا نہیں ـــــ قریب آنا چاہو تو فاصلے پٹتے نہیں ـــــ ایسے فاصلے جو نظر نہیں آتے مگر جو زندگی کو گھٹا کر رکھ دیتے ہیں۔

خفگی بھی ہے اور خفگی کے اندر اندر ایک آس کا دیا بھی جل رہا ہے ـــــــ
آس یکجا ہو جانے کی ـــــ پھر قریب ہو جانے کی ـــــ ایک دوسرے کا ہو جانے کی ـــــ عارضی نفرتوں میں ـــــ غصے کی سرخ آندھیوں میں ـــــ برابر یہ خیال ذہن میں چپکا رہتا ہے۔

جس طرح پہلے وہ معاذ کی بالکل پروا نہیں کرتی تھی۔ اسی طرح اسے اب بھی پروا نہیں کرنی چاہیے۔

اب کیا ہو گیا ہے ـــــ؟
وہ اپنے آپ سے پوچھتی ـــــ کہ اب کیا ہو گیا ہے ـــــ؟

اس نے ایک بار باہر آ کر جھانکا ـــــ معاذ اٹھ کر غسل خانے میں چلا گیا تھا۔
وہ بھی آ کر اسکا ناشتہ بنانے لگی۔ ناشتہ بناتے ہوئے اس نے سوچا ـــــ وہ بھلا ایسے آدمی کا ناشتہ کیوں بنا رہی ہے جو ایک غیر عورت کے ساتھ رات گذار کر آیا ہے۔ صاف صاف کہہ دے کہ آج سے میں تمھارا کوئی کام نہیں کروں گی۔ جاؤ اسی عورت کے پاس چلے جاؤ ـــــ

یہ سوچتے ہی اس کے کلیجے میں برچھی سی لگی۔ ہائے اپنا شوہر کسی کے حوالے کر دینا کتنا مشکل کام ہے۔ اس وقت اس نے شوہر اور بچے میں موازنہ کیا۔ بچہ زیادہ عزیز ہوتا

ہے یا شوہر ——

پتہ نہیں —— اسکا دل ایک دم گھبرانے لگا۔ بچے میں تو جان اٹکی رہتی ہے مگر شوہر کیوں اپنی ذات سے اس قدر قریب لگتا ہے۔ بیٹا ہو تو لاشعور میں ہوتا ہے کہ شادی کے بعد الگ ہو جائیگا۔ بیٹی ہو تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بھی چھوڑ کر چلی جائے گی —— مگر شوہر ——

شوہر کے بارے میں تو دن بدن یہی جی میں آتا ہے۔ اور قریب ہو گا اور قریب ہو گا ——

بس ایک دن ہم دونوں رہ جائیں گے ——

بھلا شوہر کسی کے حوالے کیا جا سکتا ہے —— ؟

ناشتہ بنا کے اس نے میز پر رکھا تو معاذ حسب معمول تیار ہو کر آ گیا۔ اسی طرح ایک خوش لباس خوشبودار آدمی بن کے وہ میز پر آ بیٹھا۔ رملی نے نظر اٹھا کے دیکھا مگر سلام بالکل نہیں کیا۔ اس کے اندر سے اس کی مخصوص خوش بو کی لپٹیں نکل رہی تھیں۔ وہ کیسا صحت مند اور مطمئن لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آسودگی کے لال ڈورے تھے۔ رملی کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کی راجدھانی میں سے ایک علاقہ آج دشمن کی تحویل میں چلا گیا ہے۔ اسکا یہ تاثر اس کے چہرے پر ابھرا ——

پیشانی پر بے شمار شکنیں لیکر سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

معاذ نے جب نیپکن بچھایا تو رملی نے معمول کے مطابق ڈبل روٹی اور انڈہ اس کے آگے بڑھایا ——

اور پھر اسے خود معلوم ہوا پلیٹ میز پر رکھنے کی بجائے جیسے اس نے پٹک دی تھی۔ اس ادا پر معاذ نے نظریں اٹھا کر باقاعدہ اسے دیکھا۔

پھر مسکرا کر بولا ——

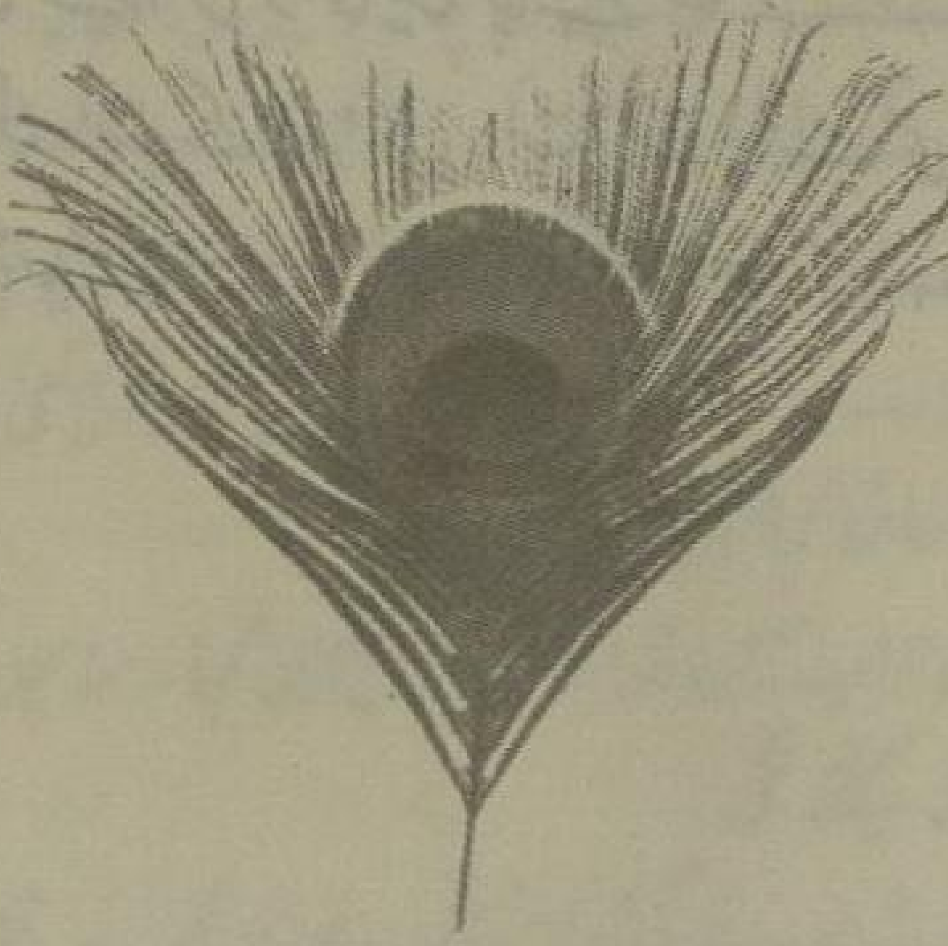
"آج چائے نہیں بناؤ گی —— ؟"

روز تو رملی خود چائے بنا کر دیتی تھی۔ جلدی سے چائے بنانے لگی۔ پھر وہی ہوا پیالی اسے پکڑاتے وقت غصے سے چھلکا دی۔ معاذ زیر لب مسکرایا۔ مگر اس نے کچھ نہیں کہا۔ رملی تنی تنی سی بیٹھی رہی۔ وہ پوچھتا ہی نہ تھا کہ بھئی تمھیں کیا ہوا ہے۔ تو وہ بھلا کسطرح اپنے غصے کا اظہار کرتی۔

بڑے سکون سے ناشتہ کر کے معاذ کھڑا ہو گیا۔

روزانہ تو جاتے وقت اس سے دو چار باتیں کرتا تھا۔
مگر آج اس نے کوئی بات نہیں کی۔ یہ نہیں کہ اس کا موڈ خراب تھا۔ بلکہ اس کا موڈ تو بڑا شگفتہ نظر آرہا تھا۔ بس ایسے —— جیسے وہ رملی کو نظرانداز کر رہا ہو۔ اس نے رملی سے بہتر کوئی صورت دیکھ لی ہو —— اور وہ صورت دل میں اتر گئی ہو ——
اس نے خدا حافظ کہا اور باہر نکل گیا۔
آج رملی نے جواب میں خدا حافظ بالکل نہیں کہا۔ منہ پھلائے کھڑی رہی۔ اور آہستہ آہستہ میز پر سے برتن سمیٹنے لگی۔
کار اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور پھر کار گھر سے نکل گئی۔ اس وقت رملی کو چھاجوں رونا آیا ——
جیسے آج اس نے پہلی بار معاذ کو کھو دیا ہو ——؟
پگلی تو نے اسے پایا ہی کب تھا وہ تیرا فریب نظر تھا ——
کیا اپنانے کے ڈھنگ ایسے ہوتے ہیں ——؟
اور آج جو تو نے اس کے ساتھ سلوک کیا ہے۔ اس کے بعد وہ تیری کیا پرواکرے گا؟
شوہر کے ساتھ بے اعتنائی برتی جائے تو وہ اور بھی دور چلا جاتا ہے۔ اس کے سامنے بہت سے راستے ہوتے ہیں۔ ایک نہ سہی دوسرا سہی —— شوہر صبر نہیں کرتا۔ انتظار نہیں کرتا۔ وقت ضائع نہیں کرتا —— اس کی زندگی روزمرہ کی زندگی ہوتی ہے۔ اس کی زندگی میں کل نہیں ہوتا —— وہ آج —— بھرپور انداز میں اپنی مسرتوں کے ساتھ جینا چاہتا ہے۔ ہر آج اسکا اپنا آج ہوتا ہے ——
تو کس کل کے انتظار میں ہے ——؟
تیرا کل نہ آیا تو کیا ہوگا ——؟
شوہر کے ساتھ رہنے کے لیے تھوڑی سی بے عزتی کی بھی ضرورت ہوتی ہے —— بہت سی باتوں کو نظرانداز کرنا پڑتا ہے —— بار بار اپنے آپ کو زمین سے اٹھانا پڑتا ہے۔
اور تیرا شوہر تو اتنا اچھا تھا۔ اس نے ایک بار بھی تمھیں زمین پر نہیں گرایا تھا۔ آج تیری زندگی میں پہلی بار آیا ہے —— اس آج کا فیصلہ آج ہی کر لے —— یوں تن کر رہے گی تو وہ تجھے کبھی نہیں منائیگا۔ اور تو کس مان پر اکڑتی ہے —— تو تو خود عیبوں بھری ہے —— لدی ہوئی شاخ کی طرح پیا کے آگے جھک جا ——

آج تجھے اس کو منا لینا چاہیے تھا ـــــــ
کل کی رات کے بعد ایسی رات نہ آنی چاہیے تھی ـــــــ
آنکھیں کھول ـــــ اب اور کیا گنوانا چاہتی ہے ـــــ؟



کئی دنوں تک رملیٰ کا موڈ معاذ کے ساتھ بگڑا رہا۔ نہ اس کے ساتھ سیدھے منہ بات کرتی نہ ڈھنگ سے اس کی کسی بات کا جواب دیتی۔ اس کا ہر کام منہ پھلا کے کرتی جیسے احسان کر رہی ہو ـــــ کئی بار اس کے سامنے اس نے موجو کو تھپڑ بھی مارا۔ مگر معاذ پر کسی بات کا اثر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح پرسکون اور مطمئن تھا۔ جھٹ موجو کو پکڑ کے سینے سے لگا لیتا۔ اور سہلانے لگتا۔ کبھی پلٹ کر یہ نہ کہتا۔ رملیٰ تم نے بے قصور بچے کو کیوں مار دیا ہے۔ کس کے بدلے لے رہی ہو۔

گھر کا ہر کام معمول کے مطابق جاری تھا۔ مگر رملیٰ کبھی کبھی گڑبڑ کر دیتی۔ اس کا دل چاہتا معاذ کو کوئی بات بری لگے۔ وہ رملیٰ کے ساتھ الجھ پڑے۔ پھر رملیٰ کو بھی اپنے دل کا غصہ نکالنے کا موقع مل جائے۔ رملیٰ کے اندر بہت گھٹن رہی۔ وہ اس گھٹن کو کسی بہانے نکالنا چاہتی تھی۔ وہ معاذ کے ساتھ لڑنا چاہتی تھی بالکل بیویوں والے انداز میں ـــــ

ایک بار معاذ نے کہا تھا کہ تم لڑ جھگڑ کے اپنی بات منوایا کرو۔ جب بیویاں چیختی چلاتی ہیں اور شوہروں کو برا بھلا کہتی ہیں۔ تو دراصل وہ اپنے استحقاق کو اور مضبوط کرتی ہیں۔ لڑنا جھگڑنا بیویوں کا اظہار محبت ہوتا ہے ـــــ

"اچھا میں لڑ جھگڑ کر اظہار محبت کروں ـــــ"؟

"خود ہی اپنے دل سے پوچھتی۔ ایسے گندے آدمی کے ساتھ جواب باہر رہنے لگا ہے۔"

اس کو گندہ آدمی کس نے بنایا ـــــ؟

"کس نے اس کے اعتماد کو مجروح کیا ـــــ"؟

"کس نے اسے بدصورتی کا احساس دلایا ——"؟

"کون اس سے کھنچا کھنچا رہتا ہے ——"؟

اب میں عورت ذات ہو کر اس کے آگے جھکوں اور اپنے منہ سے کہوں ....

اور لڑ جھگڑ کے اس کو بتاؤں کہ میں اس کی پروا کرتی ہوں ——

اور لڑنے جھگڑنے پر تم تلی بیٹھی ہو .....

رملی کا دل چاہتا وہ معاذ کا گریبان پھاڑ ڈالے ایک زوردار لڑائی کرے یہ جو مطلع ابر آلود سا تھا۔ کئی دنوں سے زمین کے آسمان پر کالی کالی گھٹائیں تلی کھڑی تھیں۔ ان سے رملی بوجھل ہو گئی تھی، وہ چاہتی تھی یہ گھٹائیں کھل کے برس جائیں۔ مطلع پھر صاف ہو جائے۔ ساری کدورت اپنے آپ نکل جائے۔

تب اسے احساس ہوتا۔ ازدواجی زندگی میں کبھی کبھار لڑنا کتنا صحت مند عمل ہے بلکہ نفرت کا غصہ آخر نکال لینا چاہیے۔ دل میں زہر لیکر پھرنا اور لوگوں کو ہنس ہنس کر دکھانا اچھا فعل نہیں اور اگر میاں بیوی اپنا زہر نہ نکالتے رہیں تو یہ رشتہ کتنا زہریلا ہو جائے۔

رملی اپنا زہر نکالنا چاہتی تھی۔ بیویوں والے انداز میں معاذ سے لڑنا چاہتی تھی اونچی اونچی بول کے "چیخ چلا" کے اپنی تقدیر کو کوس کے اپنے آپ کو ٹھنڈا کرنا چاہتی تھی۔ دل کے اندر آگ سی لگی ہوئی تھی۔

اور یہ ظالم موقع ہی نہ دے رہا تھا۔

کیسا مطمئن تھا۔ جیسے اسے اب رملی سے کوئی شکوہ نہیں؟

کیوں شکوہ نہیں ——؟

رملی کا دل گھبرا اٹھتا۔ جب گلے شکوے کی حاجت نہیں رہتی۔ تب دلوں سے محبت اٹھ جاتی ہے۔

کیا واقعی اب معاذ کو رملی کی پروا نہیں ہے؟ اسی پروا کو جاننے کے لیے وہ ایک بھرپور انداز میں اس سے لڑنا چاہتی تھی۔ اور وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی بے حسی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

لڑائی کر کے اسے اپنی طرف کھینچنا چاہتی تھی۔

اب وہ معاذ کی ہر بات پر شک کرنے لگی تھی۔ پہلے بھی کئی بار اسے دفتر میں دیر ہو جاتی تھی۔ تب وہ اس تاخیر پر بہت خوش ہوتی تھی۔ معاذ تھکا ہارا گھر کے اندر داخل ہوتا تو رملی سے کسی روایتی جملے کی تمنا کرتا۔

یعنی ——

اتنی دیر کہاں لگادی ——؟

"کہاں رہ گئے تھے —— میں انتظار کر کر کے تھک گئی تھی۔ آپ کو معلوم نہیں تھا آج میں نے اپنی امی جان کے ہاں جانا تھا۔

مگر رملی تو کچھ بھی نہیں کہتی تھی۔ بس ایک سرد سی نگاہ اس پہ ڈال کے منہ بند کرلیتی تب وہ خود ہی کہنے لگتا۔

"آج دفتر میں ایک غیر ملکی ٹیم آگئی تھی ——"

"یا مہینے کے اختتام پر کام ذرا بڑھ جاتا ہے ——"

"یا آج اتنا زیادہ کام کرنا پڑا کہ میں تھک گیا ہوں۔"

وہ کہتا رہتا اور رملی سنتی رہتی۔ لیکن اب جب معاذ کو دفتر میں دیر ہو جاتی رملی کا دل گھبرانے لگتا۔ سو طرح کے وسوسے ستاتے۔ بار بار گھڑی کو دیکھتی —— بار بار دروازے کی طرف دیکھتی۔ کوئی موٹر سڑک سے گذر جاتی تو اس کا دل دھڑک اٹھتا۔ شام ہوتی تو اسے بیکلی کی بیماری لگ جاتی۔ اسکا دل چاہتا کہ معاذ جلدی سے گھر آجائے اور جس روز وہ جلدی سے گھر نہیں آتا تھا اس روز وہ کھولتی رہتی.........

اب تو کبھی کبھی معاذ راتوں کو بھی دیر سے آنے لگا تھا۔ وہ کھانا سامنے رکھے انتظار میں بیٹھی رہتی...... موجو سو جاتا۔ سارے گھر پر سناٹا چھا جاتا۔ نوکر چاکر سب اپنے کوارٹروں میں چلے جاتے.......... سارے گھر سے اسے وحشت ہونے لگتی۔ بے جی یہاں تھیں۔ تو وہ سارا دن ان کے ساتھ باتیں کرتی رہتی تھی۔ اسے کبھی معاذ کے ساتھ بے شمار باتیں کرنے کا خیال نہیں آتا تھا۔ اب بے جی بھی نہیں تھیں۔ تو رات کو اس کا دل گھبرانے لگتا کسی سے بے شمار باتیں کرنے کی تمنا دل میں جاگ اٹھتی۔ معاذ بھی تو اب زیادہ باتیں نہیں کرتا تھا۔ اگر وقت پر گھر آجاتا تو تھوڑی دیر موجو کے ساتھ کھیلتا رہتا۔ پھر کھانا کھا کے اسٹیڈی میں چلا جاتا۔ یا بس کوئی ادھر ادھر کی بات اس سے کرلیتا۔ مگر گھر میں ہوتا تو گھر بھرا بھرا لگتا۔ اسے بھی تسلی سی رہتی ——

لیکن جس روز وہ رات کو دیر سے آتا رملی کی جان پر بن جاتی۔ سوچتی پتہ نہیں کہاں چلا گیا ہو گا ——؟

پتہ نہیں کس کے پاس چلا گیا ہو گا ——؟

پتہ نہیں کیا کر رہا ہو گا ——؟

پھر اپنے آپ سے کہتی ــــــ تجھے اسکا اتنا فکر کیوں ہے ــــ؟ جہاں
بھی جائے ــــــ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔
ایسے بدصورت آدمی کے لیے تو اتنی پریشان کیوں ہوتی ہے ــ؟
مگر وہ میرا خاوند ہے ــــــ۔
اور یہی تعلق کیا کم ہے ــــــ؟
تو اس کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ خاوند خاوند ہی ہوتا ہے۔ بدصورت ہو یا خوبصورت
اس کے ساتھ ایک ظالم سا تعلق ہوتا ہے۔
جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ــــــ
اس کی عدم موجودگی میں بڑے بڑے منصوبے بناتی کہ اب وہ آیگا تو خوب
لڑے گی۔ یہ کہے گی ــــ وہ کہے گی ــــــ
کھولتی رہتی۔ فقرے ترتیب دیتی رہتی۔
لیکن جب وہ آجاتا اور مسکرا کر اسکی طرف دیکھتا۔ پھر بڑی شفقت سے پاس بیٹھ
جاتا اور ہنس کر کہتا۔
"آئی ایم ساری جان ــــــ آج واقعی دیر ہوگئی تھی۔ کچھ پرانے دوست مل
گئے تھے۔ وہ زبردستی ہوٹل میں لے گئے۔
"پھر وہاں باتوں باتوں میں اتنی دیر ہوگئی کہ ــــــ"؟
تو وہ بس اسے دیکھتی رہ جاتی۔
ٹھنڈی آہ بھر کر چپ کر جاتی۔
وہ پوچھتا ــــــ
"تم نے کھانا کھالیا ہے۔"
"نہیں ــــــ" وہ آہستہ سے کہتی۔
"اوہو رمو جان! تم میرے انتظار میں بھوکی نہ رہا کرو۔ پلیز کھانا کھالیا کرو
افوہ ــــــ اٹھو جلدی سے کھانا کھاؤ۔ لاؤ میں سالن گرم کر کے لادوں۔"
"وہ جلدی سے کھڑا ہو جاتا۔"
تب رملی کو غصہ آنے لگتا۔ پتہ نہیں وہ اس کے سامنے اتنی بودی کیوں ثابت
ہوتی تھی۔ صاف صاف کہہ دیتی کہ اسطرح باتیں نہ بناؤ سیدھے بتاؤ اتنی دیر
کہاں لگا کے آئے ہو ــــــ؟

مگر اسے لڑنے کا سلیقہ نہیں آتا تھا۔ معاذ دو چار ادھر ادھر کی باتیں کر کے اٹھ کر چلا جاتا۔ اور وہ جلتی کڑھتی وہیں بیٹھی رہ جاتی۔

کئی دنوں سے اس کا موڈ بگڑا ہوا تھا۔ اس نے منہ پھلا رکھا تھا۔ مگر معاذ کو نظر ہی نہیں آتا تھا۔

کسی روز پوچھ ہی لیتا کہ بھئی تمہیں کیا ہوا ہے ——؟ پوچھنے کی بجائے اس نے زیادہ تر باہر رہنا شروع کر دیا تھا۔

زندگی میں کتنے دکھ ہیں۔ رملیٰ سوچا کرتی۔ جب اس کی شادی ہوئی تھی تو وہ اپنے آپ کو دنیا کی بدقسمت ترین عورت سمجھنے لگی تھی۔ کیونکہ اسکا شوہر بدصورت تھا اور اسے ساری دنیا ہی بدصورت نظر آ رہی تھی۔ مگر اب جب اس کی آنکھیں کھل گئی تھیں تو وہ سوچ رہی تھی۔ زندگی صرف ایک مسئلے کا نام نہیں —— کتنی عجیب بات ہے —— کہ شوہر بدصورت بھی اور پروا بھی نہ کرتا ہو۔ اپنا زیادہ وقت باہر کے لوگوں میں گذارنا شروع کر دے اور کتنی بڑی بدقسمتی ہے۔ ایک دن آرام سے اپنی بیوی کی نفی کر دے ——؟

کیا کہیں ایسا ہوا ہے ——؟

بیوی بھی ایسی جو چاندی کے تاروں سے گندھی ہوئی ہو ——؟

تب رملیٰ کو اس محاورے کا مطلب سمجھ میں آتا —— وہ جو کہتے ہیں "سہاگن وہی جسے پیا چاہے"۔ عورت کا حسن صورت خاک میں مل جاتا ہے۔ اگر شوہر اسے نہ چاہے وہ معاذ کے دل میں اپنی پرانی چاہت جگانا چاہتی تھی۔ مگر اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔ کہاں پر تیر خطا ہو گیا۔ کہاں پر نشانہ چوک گیا ——

گذرے وقت کو ہاتھ جوڑ کے بلاتی تھی۔ اور وہ وقت پاس نہیں آتا تھا۔ پھر وہ اپنے ہی دل کو کوستی —— اور کہتی تو پہلے جیسا ہو جا —— تو دل صاف انکار کر دیتا۔ شاید اس کے دل کو بدصورت آدمی بھا گیا تھا۔ اور کیسی بدنصیبی تھی کہ اب اس بدصورت آدمی کو وہ نظر ہی نہ آتی تھی۔ گھر میں پڑی ایک فالتو چیز کی طرح وہ اسے دیکھ کر اور کبھی جھاڑ پونچھ کر گذر جاتا تھا۔

پچھلے دو چار ہفتوں سے کبھی کبھی ایک عورت معاذ کو فون کر دیتی تھی۔ معاذ کو پہلے بھی کئی عورتوں کے فون آتے تھے۔ کبھی بے جی اٹھا لیتیں اور کبھی رملیٰ۔ کاروبار کے سلسلے میں —— یا دفتری معلومات کے لیے کئی عورتیں فون کر لیتی تھیں۔ مگر رملیٰ کو کبھی برا محسوس نہیں ہوتا تھا۔ اب اگر کسی عورت کا فون آتا تو وہ کرید کرید کر اس کا نام اور اتہ پتہ پوچھتی۔ اور یہ بھی

پوچھتی کہ اسے معاذ سے کیا کام ہے۔ رملی چھپ چھپ کے معاذ کے فون بھی سنا کرتی وہ کس کو فون کرتا ہے اور کس کے ساتھ کیا بات کرتا ہے —— وہ اس کے کپڑے لٹکاتے ہوئے اس کی جیبیں ٹٹولا کرتی۔ اس کی عدم موجودگی میں اس کی دفتر کی میز پر جاکر تمام کاغذات الٹ پلٹ کر کے دیکھا کرتی۔ اسے کبھی کہیں سے معاذ کی کسی رومانوی کارروائی کا سراغ نہیں ملا تھا۔ اس کے باوجود وہ ہر وقت سلگتی رہتی۔ تڑپتی رہتی ....

اسے یوں محسوس ہوتا جیسے اس نے اپنی مٹھی میں ایک جگنو پکڑا ہوا تھا ایک دن غلطی سے مٹھی کھول بیٹھی اور وہ جگنو اڑ گیا —— اب اس ننھی سی روشنی کو وہ دیوانہ وار ڈھونڈتی پھرتی تھی۔

ایک دن معاذ کو دوپہر کا کھانا کھلاتے ہوئے بڑے لاچار سے انداز میں رملی ایک دم بولی۔

"یہ رخسانہ کون ہے ——"؟

پوچھنے کے بعد رملی کو حیرت ہوئی۔ اس کا انداز بالکل بیویوں والا تھا۔ وہی لب ولہجہ —— وہی کاٹ ——

معاذ نے نوالہ منہ میں ڈالا۔ اور نظر اٹھا کے دیکھا ——

تو جلدی سے بولی۔

"اکثر آپ کو فون کرتی ہے اور آپ کے معمولات کے بارے میں پوچھتی رہتی ہے۔"

"ہے ایک عورت ......"

معاذ نے دوسرا نوالہ توڑتے ہوئے جواب میں کہا۔

"کیسی عورت ہے ——"؟

یہ پوچھتے ہوئے رملی کا لہجہ غصّے سے کچھ اور تن گیا۔

معاذ نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا اور جواب دیئے بغیر نوالہ منہ میں ڈال لیا۔

"اس عورت کو آپ کب سے جانتے ہیں"؟

اب رملی باقاعدہ لڑنے پر آمادہ نظر آتی تھی۔

"کیسے لایعنی سوال کر رہی ہو"۔ معاذ بولا —— "کاروباری دنیا میں ہزاروں عورتوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ اگر کوئی فون کرتا ہے تو ظاہر ہے اپنے کام کے لیے کرتا ہے ——"؟

"وہ آپ کو بہت پوچھتی ہے"۔

معاذ مسکرانے لگا "تم اتنا فکر کیوں کرتی ہو۔ تمہارا شوہر ایک بدصورت آدمی ہے

اس میں بھلا کون دلچسپی لے سکتا ہے" معاذ کے لہجے میں طنز تھا۔ مگر رملی کے اندر اپنی ہی آگ لگی ہوئی تھی۔ اس لیے اس کی بات سمجھے بغیر بولی۔

"کیا یہ بہت خوبصورت عورت ہے ——؟"

معاذ نے نظریں جھکا لیں اور منہ ہی منہ میں مسکرانے لگا۔ مسکراتا جاتا اور کھانا کھاتا جاتا۔ اس کے اسطرح بے نیازی کے ساتھ کھانا کھانے پر رملی کو بے تحاشا غصہ آ رہا تھا معاذ کا لب ولہجہ ترش نہیں ہو رہا تھا اس لیے وہ اپنے لب ولہجہ کی تلخی اس پر ظاہر نہ کر سکتی تھی۔

معاذ نے اطمینان سے کھانا کھایا۔ نیپکن سے ہاتھ صاف کیے۔ پھر پلیٹیں ایک طرف سرکا دیں۔ اور کہنیاں میز پر ٹکا کر رملی کی آنکھوں کی سیدھ میں دیکھتا ہوا بولا۔

"کیا عورت کی صرف یہی خوبی ہے کہ وہ خوبصورت ہو ——؟"

رملی نے اس کی آنکھوں کی تاب نہ لا کر نظریں جھکا لیں —— اس کا رنگ زرد ہو گیا۔ شرمندگی کی ایک لہر دل سے اٹھی اور دماغ تک گئی۔ اسے یوں لگا جیسے معاذ نے اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا ہو۔

رملی اپنے لمبے ناخنوں سے میز کا کونا کریدنے لگی۔ معاذ نے ایک کینو اٹھایا اور اسے چھیل کر کھانے لگا۔

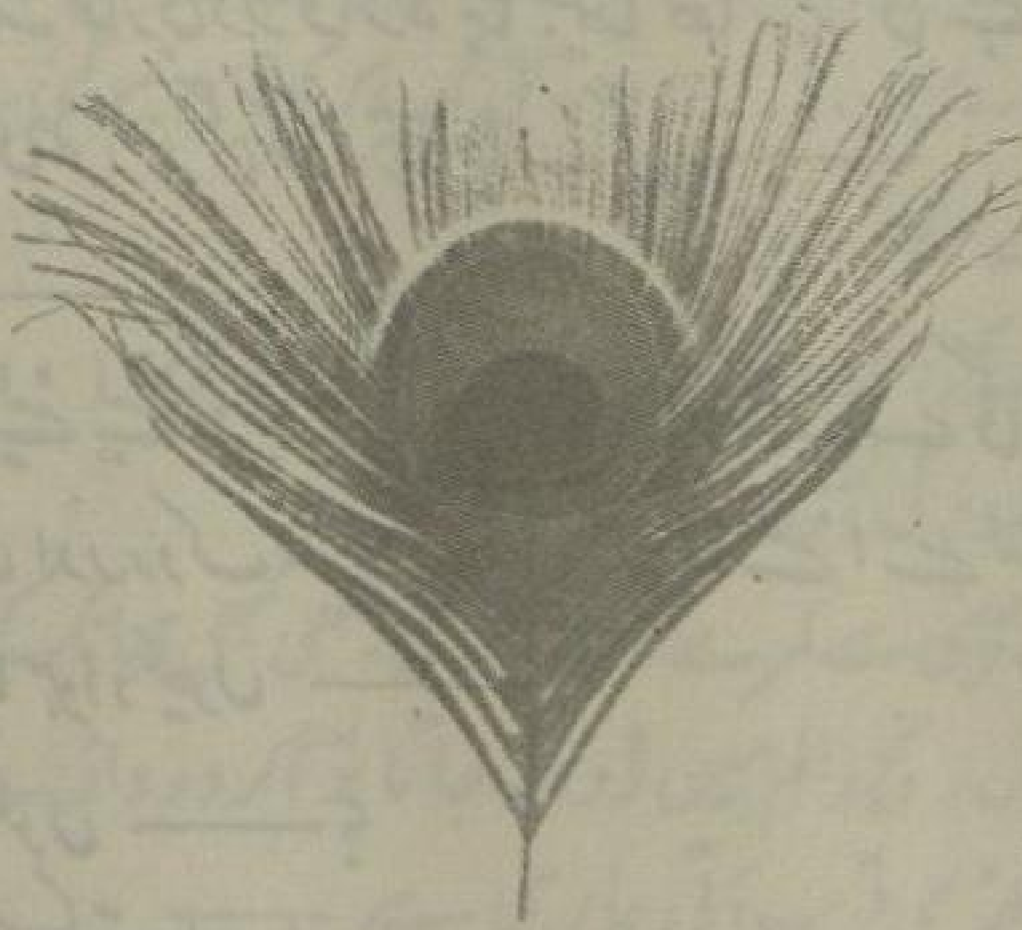
"تم عورتوں کا خیال ہے کہ مرد صرف خوبصورت عورت پر مرتا ہے تم لوگ سوچتی ہو کہ صرف چہرے مرد کی کمزوری ہوتے ہیں ——! اور بس ——"

رملی سن ہو گئی۔

اس نے آرام سے سارا کینو کھایا۔ ہاتھ صاف کیے پھر کھڑا ہو گیا اور اپنے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر، اور بڑے انداز سے مسکرا کر بولا ——

"رمو جان! خوبصورت وہ عورت ہوتی ہے جسے اپنانے کا ڈھنگ آتا ہے ——"

اور پھر باہر نکل گیا۔



بہت دنوں کے بعد آج پھر معاذ آئینے کے آگے کھڑا تیار ہو رہا تھا۔
مرد کی تیاری اس کے ارادے کی مظہر ہوتی ہے۔۔رملی اپنا دل پکڑ کے باہر نکل گئی۔اور جاکر بے جی کے کمرے میں ان کے بستر پر سیدھی چت لیٹ گئی۔ دکھ کی اس بھٹی سے وہ ایک بار پہلے بھی نکل چکی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ اس نے اپنا دل ٹھنڈا کرلیا تھا اور سوچ لیا تھا کہ اب اس کے اندر حسد اور محرومی کی آندھیاں نہیں اٹھیں گی۔مگر ایسا نہیں تھا ——

اس کا دل کوئی چٹکیوں سے مسل رہا تھا اور وہ مسلسل سوچے جا رہی تھی۔کہ زندگی کے معاملے بھی عجیب ہیں۔اور پھر زندگی کے پلو میں افسوس کی کوئی نہ کوئی گرہ تو لگی رہتی ہے —— کبھی یہ دل تاسف سے خالی نہ ہوا —— کبھی پچھتاوے —— کبھی افسوس ——

یہ دونوں سائے آگے پیچھے چلتے ہیں۔ ان کے سحر سے زندگی نکلتی ہے یا نہیں ——

اس کا دل چاہا اس آنچل کو آگ لگا دے۔جس میں اتنی گرہیں ہیں۔ ایک گرہ کھولتی ہے تو دوسری پڑ جاتی ہے۔

پچھلے کتنے دنوں سے زندگی کتنی ویران اور بیکل رہی ——

اور اپنی بیکلی کسی سے کہہ بھی نہ سکی ——

بس دلوں کی اداسیاں دلوں کی محرم ہوتی ہیں۔

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کا دل مسلسل اداسیوں کی تہہ میں کیوں دبا جا رہا ہے۔

اس نے شروع میں اپنے شوہر کی پروا نہیں کی تھی —— اب وہ بھی

اس کی پروا نہیں کر رہا — جس طرح اس نے چور دروازے بنا لیے تھے —
اسی طرح آج وہ بھی ایک خارجی دروازہ بنا بیٹھا تھا۔ چڑھی ہے یہ آندھی اتر جائے
گی — نہ بھی اتری تو زندگی گذر ہی جائے گی —

مگر نہیں —

اس نے لیٹے لیٹے سوچا یوں زندگی نہیں گذرے گی۔ اپنے سامنے اپنے
شوہر کو جاتا ہوا دیکھوں اور روک نہ سکوں۔ اپنے سامنے اسے لٹتا ہوا دیکھوں —
اسے ٹوٹتا پھوٹتا اور بکھرتا ہوا دیکھوں —

اور کچھ کر نہ سکوں —؟

مگر میں کیا کر سکتی ہوں ؟

تو سب کر سکتی ہے —؟

کس طرح سے کروں —؟

بس ذرا عقل کی ضرورت ہے۔

کہاں سے لاؤں عقل . . . . کہاں سے لاؤں عقل —؟

عقل کا پودا دکھ کے بیج سے نکلتا ہے اور کرب کی ہوا اس کی نمو کرتی ہے۔ آندھیاں
اسے پروان چڑھاتی ہیں اور اسے محرومیوں کی چھایا کی ضرورت ہوتی ہے۔ اتنی دیر سے
گنجلک راستوں سے گذری چلی آرہی ہے۔ تار تار دامن کو بار بار جھاڑ رہی ہے —

اور ابھی پوچھتی ہے۔ عقل کہاں سے آئے گی —؟

رملی ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"بیوی بن جاؤ —"

"تو کیا میں بیوی نہیں ہوں۔"

"بیویاں ایسی نہیں ہوتیں — اتنی کھردری . . . . . اتنی دور . . . .
اتنی اجنبی . . . . . اتنی گم صم . . . . ."

"میں شرعاً اس کی بیوی ہوں۔ اس کو اس بات کا خیال ہونا چاہیئے۔"

"مرد کو محبوبہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو دن رات اس سے کہہ سکے —
میں تم پر مرتی ہوں۔ تم مجھے اچھے لگتے ہو۔ میں تمھارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ تم میرے لیے
دنیا کے خوبصورت ترین مرد ہو —"

"اف توبہ — یہ فلموں والے جملے بھلا کوئی شریف زادی کہہ سکتی ہے۔"

"تو پھر شریف زادی فلموں کی ہیروئن کی طرح بار بار روتی کیوں ہے۔؟"
میں.... میں...... رملی گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں پھر
کڑوا کڑوا پانی جمع ہونے لگا۔

پھر دل کے آس پاس ٹھنڈی برف گرنے لگی۔

"آج تم روؤ گی نہیں......"

رملی بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگی۔ کبھی کبھی جھانک کر تیار ہوتے ہوئے معاذ
کو دیکھ لیتی اور جب دل رنج والم میں ڈوب جاتا تو آ کر دروازے کا پٹ تھام کر کھڑی ہو جاتی۔

فیصلے کی گھڑی قریب آتی جا رہی ہے ——

تو میں کیا کروں ——؟

جو بھی کرنا ہے آج ہی کرنا ہے ——

تو میں کیا کروں ——

سہاگن بن جاؤں ——.....

کس طرح..... کس طرح...... رملی نے اپنی پیشانی دروازے
کے ساتھ ٹکرا دی۔

اس کے پاس جاؤ اسے منا کے لاؤ —— اس سے کہہ دو۔ میں تمہاری تعریف
کر سکتی ہوں میں تمہیں ساری رات خوشامد کا جھولا جھلا سکتی ہوں میں تمہیں اپنے بازوؤں میں پناہ
دے سکتی ہوں۔ میں تم پر سے پل پل نثار کر سکتی ہوں ——

"لیکن میرے بن کے رہو —— مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ ایک بیوی کے لیے دنیا
کی سب سے بڑی اذیت کیا ہے ——"؟

نہیں...... نہیں...... میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتی۔ ان میں سے تو ایک لفظ بھی
ادا نہیں کر سکتی۔

میں اتنی بہادر نہیں ہوں کہ یہ سب باتیں کہہ سکوں ——؟

"یہ سب باتیں زبان سے کہنے کی نہیں ہیں......"

تو پھر ——

رملی نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا ——

تو پھر ——

سارے دروازے اور کھڑکیاں زور زور سے قہقہے لگانے لگے۔ تو اتنی ہی

نادان ہے اتنی ہی بے وقوف ہے ـــــ احمق ہے یا بدنصیب ـــــ

خدایا میری مدد کر!

رملی دل پکڑ کر پھر بستر پر بیٹھ گئی . . . . . .

پل پل گذر رہا ہے ـــــ چم چم کرتی رات تیرے ٹھٹھے اڑا رہی ہے رات بھر جاگے گی . دل جلائے گی ـــــ سولی پہ لٹکے گی . ایک انا کا ناگ نہیں مارا جاتا ـــــ

پر میں کیا کروں ـــــ

جاؤ اس کا بازو تھام لو ـــــ روک لو اپنے ساجن کو ـــــ اس کے راستے میں پھولوں کی طرح بچھ جاؤ ـــــ

دروازے دھڑ دھڑ بجنے لگے ـــــ وہ گھبرا کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی ـــــ

حلیمی اور انکساری عورت کے زیور ہیں . میاں بیوی کے بیچ کوئی انا کی دلدل نہیں ہوتی . آج اس کے گلے میں بانہیں ڈال دو ـــــ کھڑکی نے پتے کی بات کہی ـــــ

میں ـــــ

ہاں تم ـــــ . آج میں کی ندی پار کر لو . اور اس سے کہہ دو مجھے تمھارے باطن کا حسن نظر آ گیا ہے ـــــ

میں . . . . یعنی میں . . . .

اتنی گر جاؤں ـــــ ؟

یہ گرنا نہیں ہے . ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا نے کہا . محبوب کے قدموں میں رہنا گرنا نہیں ہے ـــــ

اس کے دل میں جگہ پانا ہے ـــــ

مگر میں نے کیا برا کیا ہے ـــــ ؟ مجھے کس بات کی سزا مل رہی ہے .

اسے سزا کیوں کہتی ہو . اگر سہہ سکتی ہو تو اسے ایک رویہ جانو ـــــ ایسا رویہ جو تم نے پہلے پہل اپنے شوہر کے ساتھ اختیار کیا تھا .

اس سے کہہ دو تم نے جو مجھے سکھانا تھا . سکھا دیا ـــــ

میں نے جو ٹھوکر کھانا تھی کھا لی ـــــ

آؤ ـــــ اب مل کر چلیں ـــــ اس طرح کہ میں تمھارا سایا بن کے پیچھے رہوں .

اف توبہ ـــــ

اس آدمی سے ـــــ

اور کیا اس آدمی کے بغیر رہ سکتی ہے تو ——— ذرا غور سے دیکھ اس آدمی کو رملی چل کے آئی۔ کوریڈور میں کھڑے ہو کر دیکھا۔ معاذ بج درجے کے کھڑا اپنا جائزہ لے رہا تھا۔

اگر یہ بدصورت آدمی ہے۔ تو پھر اسے دنیا کے میلے میں گنوا دے۔ یہ اپنے پلو میں افسوس کی گرہ کیوں لگائے پھرتی ہے۔

نہیں ———

رملی پھر تڑپ اٹھی۔ اسے گنوانے کے خیال سے دل میں ہوک سی اٹھتی ہے۔ اور دم گھٹنے لگتا ہے۔

پھر اعتراف کر لے ———

کس بات کا ———؟

محبت کا——— . . . .

محبت . . . . . . ؟

ہاں یہی محبت ہے۔ اسی خلش کا نام محبت ہے۔ اسی دکھن کو تعلق کہتے ہیں اسی روگ کو رفاقت کہتے ہیں ——— اور یہ محبت عجیب ہے۔ کسی وقت بس اپنے آپ چپ چاپ ہو جاتی ہے۔

دیکھو نا کتنا بدصورت آدمی ہے۔ مگر تمہارے دل میں گھر کیے بیٹھا ہے۔ تم تو اس کے چہرے کی طرف دیکھنے کی روادار نہیں تھیں۔ آج اس کے بازوؤں میں مچلنے کو بے تاب نظر آتی ہو۔

محبت کی زبان نہیں ہوتی ———

اور اظہار محبت کے لیے کسی زبان کی ضرورت نہیں ہوتی۔

سوال یہ ہے کہ تو خاک بن کر راہوں میں بچھ سکتی ہے ——— یا نہیں ———؟

رملی نے لپک کر کمرے کا دروازہ کھولا اور باہر نکل گئی۔ معاذ نے اپنے اوپر اتنی خوشبوئیں چھڑک لی تھیں کہ لپٹیں باہر تک آ رہی تھیں وہ چپ چاپ چلتی ہوئی معاذ کے قریب گئی اور وہاں جا کر کھڑی ہو گئی۔ معاذ نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا ——— اور پھر اپنا آپ درست کرنے لگ گیا۔ اف اس کے انداز میں کتنی بیباکی اور کتنی سفاکی تھی۔ مرد کا یہ روپ بھی ہوتا ہے یہ سوچ کر رملی تھرا گئی۔

اس نے پلنگ پر سوئے ہوئے موجو کو دیکھا۔ وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ اور پھر ایک قہر کی رات اس کے دروازے پر دستک دے رہی تھی۔

رملی نے بڑھ کر اپنے کپڑوں کی الماری کھولی۔ ایک خوبصورت سا سوٹ نکالا اور غسل خانے میں چلی گئی۔ بڑی سرعت سے کپڑے بدل کر باہر نکلی تو دیکھا معاذ اپنی جیب سے کچھ کاغذات نکال کے انہیں اپنی اسٹڈی میں رکھنے جا رہا تھا۔ گویا وہ اب بالکل تیار تھا اور باہر جانے والا تھا۔

رملی آئینے کے آگے کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنے بال کھول دیئے اور کنگھی سے انہیں سلجھا کے شانوں پر ڈال لیا۔ پھر معاذ کی خوشبو اٹھا کے اپنے اوپر چھڑک لی ——

ایک گہری سوچ نے اس کے پپوٹے بوجھل کر دیئے تھے مگر پھر بھی وہ ایک فیصلہ کن انداز میں معاذ کے پیچھے اسٹڈی میں چلی گئی۔

معاذ فائل میں اپنے کاغذ لگا رہا تھا۔ اس نے نظر اٹھا کر رملی کی طرف دیکھا اور پھر بے پروائی سے اپنا کام کرنے لگ گیا۔ رملی دروازے میں کھڑی رہی۔ معاذ نے اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ رملی کے دل میں غصے کی ایک لہر اٹھی ——

اس نے کمرے کے اندر قدم رکھ لیے اور اپنے پیچھے دروازہ بند کر لیا۔ معاذ نے کام ختم کر کے پھر رملی کی طرف دیکھا۔ رملی نہ جانے کن جذبوں سے تلی کھڑی تھی۔ مگر معاذ نے اس کی طرف دیکھ کر زیادہ غور کرنا مناسب نہ سمجھا —— بلکہ اپنے ہاتھوں کے کف لنک ٹھیک کرنے لگا۔ رملی کو امید تھی وہ اس سے اس کے آنے کی وجہ دریافت کریگا۔ پھر دروازہ بند کرنے کی وجہ معلوم کرنا چاہے گا۔ مگر وہ تو رملی کو نظر انداز کیے اپنے اوپر خوشبوئیں چھڑکے بڑا بے نیاز بنا کھڑا تھا ——

رملی بھی اسے دیکھتی رہی۔ بالآخر وہ گھبرا کے رملی کی آنکھوں میں دیکھنے لگا ——
اس کی آنکھیں جذبوں سے خالی تھیں اور اسکی کالی رنگت میں کوئی جلتا ہوا پیغام نہ تھا ——
رملی اس کے چہرے کو غور سے دیکھتی رہی پھر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی قریب آ گئی۔ قریب آ کے بڑے آرام سے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کے سفید کوٹ کے دونوں کالر پکڑ لیے . . . .

ساحل پر سکون سے پہلے ایک طغیانی آتی ہے۔
لہریں اچھل اچھل کر آپے سے باہر ہو جاتی ہیں۔ غصے سے جھاگ جھاگ ہو جاتی ہیں۔
طیش میں آ کر سمندر کے منہ پر زور زور سے تھپڑ مارنے لگتی ہیں ——
چھینٹے شور مچاتے ہیں ——

لہریں اور سمندر آپس میں گتھم گتھا ہو جاتے ہیں۔

بس ایک پل کا ہوتا ہے یہ منظر ——

پھر دوسرے پہروں میں ایک خاموش سمجھوتہ ہو جاتا ہے۔ لہریں سمندر کے سینے سے لپٹ جاتی ہیں۔ لوٹ پوٹ ہو جاتی ہیں۔ سما جاتی ہیں۔ اسطرح کہ دوئی کا شائبہ تک نہیں رہتا۔ دونوں ایک ہو جاتے ہیں۔ سمندر باہیں پھیلا دیتا ہے۔ اور لہر سر ٹیک دیتی ہے۔

محبت کا یہی چلن رہا ہے۔

طغیانی کے بعد سکون ——

اور دکھ کے بعد سکھ ——

رملی کی جب آنکھ کھلی تو اس نے شرماتے شرماتے نظر اٹھائی، معاذ اپنی مست آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

رملی نے پہلی بار ان آنکھوں کی خوبصورتی کو محسوس کیا۔ سیاہ کالی آنکھیں —— مڑی ہوئی پلکیں —— اور ان آنکھوں میں بے پناہ شرارت —— اس کے ساتھ جیت لینے والا سارا غرور ——

وہ آنکھیں کہہ رہی تھیں تم بہت چالاک عورت ہو —— اپنے حقوق کی حفاظت کرنا جان گئی ہو۔

رملی نے شرما کر اپنا رخسار معاذ کے ہاتھ پر رکھ دیا —— جو انگارے کی طرح تپ رہا تھا ——

افوہ! ——

رملی نے گہری سانس لی۔ زندگی تو ان آنکھوں کے ساتھ بھی گذر سکتی تھی۔ ان انگارہ صفت ہاتھوں کے ساتھ بھی گذر سکتی تھی ——

مگر اس لمحے کے بغیر نہیں ——

یہ لمحہ جس میں ہار کر میں خوبصورت ہوئی اور معاذ جیت کر خوبصورت ہوا۔



آج رملیٰ نے نیا جنم لیا تھا۔ آج کی صبح رملیٰ کے گھر میں نئی طلوع ہوئی تھی اس صبح کو اس نے اپنی ادراک کی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ زندگی کے سارے اندھیرے آپ ہی آپ دور ہو گئے تھے۔ رملیٰ ایک نئے نویلے نشے سے مدہوش ہو کر بستر سے نکل آئی۔ مٹیالے رنگ کی صبح میں رنگ برنگی چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ گویا اسے بدھائی دے رہی تھیں۔

سہاگن مبارک ہو ——

صبح مبارک ہو ——

دولہا مبارک ہو ——

تو جنم جنم رہے شاد کام —— تیری نظر اتارے آسمان ——

رملیٰ ایک دم کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کا دل چاہا مسکراتی گنگناتی چڑیوں کو لپک کر پکڑلے پھر ایک ایک کو چوم کر رہا کر دے۔

اس نے لمبی سی انگڑائی لی تو بدن کا ایک ایک عضو مسکرایا۔

پھر وہ باورچی خانے میں چلی گئی۔ آج معاذ کا ناشتہ بناتے ہوئے عجیب طرح کی لذت محسوس ہوئی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ کھانے کی چیزوں میں وہ اپنا دل پروس رہی ہے۔ ہائے قرب کا نشہ کیسا دو آتشہ ہوتا ہے۔

معاذ تیار ہو کر میز پر آگیا تو وہ ناشتہ لگانے لگی۔ مارے شرم کے معاذ کی طرف دیکھنے کا حوصلہ نہ ہوا وہ تو محض اسے ایک شرمیلی اور کم گو لڑکی سمجھتا تھا وہ کیا جانتا تھا کہ یہ چپ چاپ سی لڑکی جذبوں کا سمندر ہے اور محبت کی اتھاہ کو جان چکی ہے۔

شرمائے شرمائے انداز میں اس کے آگے مکھن انڈا توس رکھتی چلی گئی مگر کبھی کبھی کن اکھیوں سے اس کو بھی دیکھ لیتی۔

اف آج معاذ کسقدر خوبصورت لگ رہا تھا۔

اس نے پستے کے رنگ کا دھاری دار سوٹ پہنا ہوا تھا۔ اندر گلابی سلک کی قمیض تھی آج اس نے ٹائی نہیں لگائی تھی۔ تھوڑا سا گریبان کھلا تھا۔ جس میں سے اس کے بال نظر آرہے تھے۔ اس کے ہاتھ صاف ستھرے اور چکنے تھے۔ ناخن قرینے سے کٹے ہوئے۔ سانولہ چہرہ چمک رہا تھا۔

پتہ نہیں خوشی کے مارے ——— یا گذری ہوئی شب کی ابھی روشنی تھی اس پر ——— رملی اسے بار بار دیکھتی اور سوچتی ——— یہی وہ شخص ہے جو اسے پہلی رات انتہائی مکروہ صورت آدمی لگا تھا۔ جسے دیکھتے ہی ابکائیاں آنے لگی تھیں۔ مگر اب اتنا اچھا کیوں لگ رہا ہے۔ وہی چہرہ ہے۔ وہی نقوش ——— چہرے پر چھوٹی چھوٹی کٹوریاں بھی وہی ———

لیکن اب اسے انسانوں کی شناخت ہو گئی تھی۔ لوگ شکل وصورت سے نہیں انسانوں سے پیار کرتے ہیں۔ محبت کی دنیا میں شکل وصورت ثانوی درجہ اختیار کر لیتی ہے۔

رملی ٹھوڑی پر ہاتھ جمائے اسے ایسے پیار سے دیکھ رہی تھی کہ معاذ چونک اٹھا پھر مسکرا کر اسکی طرف دیکھا اور کہنے لگا۔

"کیا میں بہت خوبصورت ہو گیا ہوں رمو ———"

رملی نے شرما کر نظریں جھکا لیں۔

"اسطرح دیوانہ وار مجھے کیوں دیکھ رہی ہو ———؟"

"پلیز کسی غلط فہمی میں نہ مبتلا کر دینا۔ مجھے تو ابھی تک رات کی باتوں کا یقین نہیں آرہا۔"

"آپ کو ایسی باتیں نہیں کرنی چاہیئے"۔ رملی نے شرمائے ہوئے انداز میں کہا ———

"اور کچھ باتیں کرنے کی نہیں بس محسوس کرنے کی ہوتی ہیں"۔

معاذ ہنسنے لگا۔

"آج دفتر جانے کو جی نہیں چاہ رہا ——— شاید یہ پہلا موقع ہے"۔ معاذ نے کھڑے ہو کر کہا۔

"نہ جائیں ———" ایک دم رملی کے منہ سے نکل گیا۔

ہرگز نہ جاتا مگر میں نے خود ہی آج ایک میٹنگ بلوائی ہے۔ دفتر میں ——— نہیں جاؤں گا تو وہ لوگ کیا کہیں گے۔

"اچھا پھر کوشش کر کے جلدی آجایئے گا ———؟"

ہاں یہ ہو سکتا ہے۔ معاذ نے بریف کیس اٹھاتے ہوئے کہا ———

"ویسے کیا کوئی خاص بات آج بھی ہے ———؟" یہ کہہ کر معاذ نے شرارت سے رملی کی طرف دیکھا۔ مگر رملی نے ہنس کر منہ پھیر لیا۔

"خدا حافظ ——" رملی نے آہستہ سے کہا۔ پھر دہلیز میں بیٹھ گئی۔ اور دور تک اسکی موٹر کو جاتا ہوا دیکھتی رہی۔

تھوڑی دیر بیٹھی کل رات کی باتیں دُہراتی رہی۔ پھر ایک دم کھڑی ہو گئی۔ آج ہر کام جلدی جلدی ختم کرنا تھا۔ رات کے لیے کوئی خاص کھانا پکانا تھا۔ آج اس نے اپنے ساجن کو منا لیا تھا اور اب اسے پرچانا چاہتی تھی۔ اس لیے کھڑی ہو گئی۔ جلدی سے سارے گھر کی صفائی کروائی۔ خاص طور پر سٹڈی کو صاف کر کے نئے طور پر سجایا۔ موجو کو نہلا دھلا کر کپڑے بدل لیے۔ دوپہر کا کھانا بڑا پر تکلف سا پکا کے معاذ کو دفتر میں بھیج دیا اور پھر تیار ہونے کے لیے غسل خانے میں چلی گئی۔ آج اس نے اپنے لیے ایک خوبصورت سرخ رنگ کا جوڑا چنا جس کے دوپٹے پر جال بنا ہوا تھا۔ پچھلے دنوں اسے اپنے جہیز اور بری کے کپڑے پہننے سے نفرت ہو گئی تھی۔ مگر آج وہ معاذ کے استقبال میں دولہن کی طرح تیار ہونا چاہتی تھی۔ نہلانے کے بعد اس نے اپنے لمبے لمبے بالوں کو سکھایا اور شیشے کے آگے کھڑے ہو کر خوب اچھا سا میک اپ کیا۔ آئینے میں اپنے آپ کو دیکھ کر وہ خود شرمائی۔ جب سے اس کی شادی ہوئی تھی۔ وہ اسطرح بن ٹھن کے کبھی نہ رہتی تھی۔ آج معاذ دیکھے گا تو جھوم جائیگا۔

اپنے اوپر بہت سی خوشبوئیں چھڑک کر وہ برآمدے میں نکل آئی —— آتے ہی ٹھٹھک گئی۔ جیسے زمین نے اس کے قدم پکڑ لیے ہوں۔ نہ آگے جا سکی نہ پیچھے ہٹ سکی۔

بے جی ٹیکسی سے نیچے اتر رہی تھیں۔ اور ملازم ان کا سامان اتار رہا تھا۔

یہ ضرور ہے کہ پچھلے چھ مہینوں میں اس نے بے جی کی بہت تمنا کی تھی۔ بے جی کے جانے سے اس کی زندگی میں ایک خلا سا ہو گیا تھا۔ وہ بار بار ان کی خواہش کرتی ——

مگر آج —— اچانک بے جی کو دیکھ کر اس کا رنگ اڑ گیا۔ ساری تمنائیں زمین بوس ہو گئیں۔ نہ جانے اس وقت بے جی کا اچانک چلے آنا اس کو برا کیوں لگا ——

آج —— آج محض آج۔ اگر بے جی نہ آتیں۔ رات ہی تو اس نے معرکہ سر کیا تھا۔ اپنے معاذ کو جیت لیا تھا۔ آج کا سارا دن وہ اس کے ساتھ گذارنا چاہتی تھی۔ بے جی کے لیے اس کے دل میں ذرا سا حسد ابھرا —— اسے معلوم تھا معاذ بے جی کی زیادہ عزت کرتا ہے ان کو زیادہ وقت دیتا ہے۔ اور اتنے دنوں بعد وہ آئی ہیں تو پھر زیادہ تر ان کے ساتھ ہی رہے گا ——

ان سب باتوں نے رملی پر یوں اچانک حملہ کر دیا کہ وہ برآمدے میں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ نہ حسب عادت آگے بڑھ کر بے جی کی پیشوائی کی نہ ان کے ہاتھ سے سامان پکڑا۔

بے جی دھیرے دھیرے چلتی ہوئی اس کے قریب آگئیں۔

اور بڑی حیرت سے بولیں۔

"دوہٹی! کیا حال ہے تمھارا ــــــــــ"

تب رملی ایک دم چونک اٹھی۔ آگے بڑھ کر بے جی کے گلے سے لگ گئی اور کافی دیر گلے سے چمٹی رہی۔

پھر کہنے لگی ــــــــ

"بے جی اسطرح اچانک آکے آپ نے مجھے حیران کر دیا ہے۔ سچ سچ خوشی کے مارے میرے منہ سے بات بھی نہیں نکل رہی۔"

"لیکن آنا تو مجھے اسی طرح تھا دوہٹی۔ میں نے معاذ سے کہلوا دیا تھا کہ اس ہفتے کسی دن آ جاؤں گی۔"

"اچھا! انہوں نے مجھے نہیں بتایا تھا۔ ویسے بہت اچھا ہوا آپ آ گئیں ــــ ہم سب آپ کے لیے بہت اداس تھے۔"

"موجو کہاں ہے ــــ؟" بے جی نے ادھر ادھر دیکھکر پوچھا۔

"پچھواڑے نوکروں کے بچوں کے ساتھ کھیل رہا ہو گا۔ بلا لاؤں ــــــ"

"نہیں وہ خود ہی آ جائے گا۔" بے جی ٹانگیں اوپر کر کے تخت پر بیٹھ گئیں۔ اور ان کے چہرے پر تھکاوٹ کے آثار نمودار ہوئے۔

رملی نے بے جی کا سارا سامان اٹھا کر ان کے کمرے میں لگا دیا۔ اور پھر بولی۔ "آپ کے لیے گرم گرم چائے بنا لاؤں۔"

بے جی چپ رہیں۔

وہ باورچی خانے میں چلی گئی۔ چائے کا پانی چولہے پر رکھ کر اس نے اپنے خوبصورت کپڑوں کی طرف دیکھا۔ آج وہ ایک خاص انداز سے معاذ کا استقبال کرنا چاہتی تھی۔ جسطرح محبت کرنے والی بیویاں اپنے ساجنوں کی راہ تکا کرتی ہیں۔ آج اس کے جی میں بہت اچھی اچھی باتیں تھیں۔ آج وہ صرف معاذ کے پاس بیٹھنا چاہتی تھی۔ اور آج ہی تو تقدیر کے دروازے اس پر کھلے تھے۔

اور بے جی تو خود اس کی ہمدرد تھیں۔ بے جی نے ہی تو یہ سارا موقع دیا تھا۔ افوہ ــ بے جی کو تو ہر بات کا پتہ تھا۔ پتہ نہیں اب کیا ہو گا ــــ؟

اپنے خیالوں سے الجھتی رملی نے چائے بنائی اور ٹرالی پہ رکھ کے لے آئی۔ بے جی باہر تخت پر نہیں تھیں۔ جانے کہاں اٹھ کر چلی گئی تھیں۔ رملی اپنے کمرے میں آ گئی۔ دیکھا تو بے جی ہر ایک کمرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ غسل خانے تک دیکھے۔ شاید موجو کو ڈھونڈ رہی ہوں گی۔

"موجو تو باہر ہے بے جی ــــــ"

اتنے میں موجو خود ہی دوڑتا ہوا آیا اور آ کے بے جی کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ بے

جی اس کے لیے بے شمار کھلونے اور گاؤں کی سوغاتیں لائی تھیں۔ کھول کھول کر دینے لگیں۔ ایک پوٹلی میں ستو تھے، ایک میں شکر اور ایک میں گڑ ـــــ رملیٰ نے جلدی جلدی یہ چیزیں پکڑیں اور اندر جاکر خالی کنستروں میں ڈال دیں۔ بے جی جو چیز بھی دیتیں اسے احتیاط سے پکڑ لیتی۔ پھر اندر جاکر رکھ آتی۔

بے جی چائے پی کر لیٹ گئیں۔ رملیٰ جلدی سے ان کی پائنتی کی طرف جا بیٹھی۔

"کیا تم کہیں جا رہی تھیں وہٹی ـــــ؟"

بے جی نے رملیٰ کا سنگھار دیکھ کر پوچھا ـــــ

"نہیں بے جی" رملیٰ شرما گئی "یونہی ـــــ بس ـــــ شام کو کوئی آجاتا ہے۔ تو تیار ہو جاتی ہوں"۔

"کوئی بات نہیں" بے جی نے کہا ـــــ "اگر تم دونوں کا کہیں جانے کا پروگرام ہو تو ضرور چلے جانا۔"

رملیٰ بے جی کے قریب کھسک آئی اور ان کے پاؤں اٹھا کے اپنی گود میں رکھ لیے اور دبانے لگی۔

"بے جی آپ کی وہ سہیلی آئی تھی مسز بیگ ـــــ؟"

"اچھا ـــــ" کیا کہتی تھی۔

"حج پر جا رہی تھی۔ آپ سے ملنے آئی تھی۔"

"اب تو جا چکی ہو گی۔"

"جی ہاں کہتی تھی وہاں جاکر خط لکھوں گی۔"

وہ ہیں نا مسز مسعود ان کے ہاں پوتا ہوا ہے۔ انہوں نے بڑا شاندار عقیقہ کیا تھا۔ آپ تو یہاں تھیں نہیں۔

میں ہو آئی تھی۔"

"بہت اچھا۔" بے جی نے کہا۔

"اور بے جی وہ جو سامنے فلیٹ میں ایک خاتون رہتی ہے، وہ ہمیشہ آپ کا پوچھنے آیا کرتی تھی۔"

پھر رملیٰ نے رفتہ رفتہ بے جی کو سارے محلے کی چیدہ چیدہ خبریں سنا دیں۔ کہ ان کی عدم موجودگی میں کیا کچھ ہوتا رہا۔

بے جی چپ چاپ سنتی رہیں، کبھی کبھی بس ہوں ہاں کر دیتیں۔ رملیٰ نے محسوس کیا بے جی کے چہرے پہ بہت سنجیدگی تھی، ایسی سنجیدگی اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس لیے دل ہی دل میں ڈر رہی تھی اور اللہ سے دعائیں بھی مانگ رہی تھی کہ اب کوئی اور افتاد نہ پڑ

جائے اس نے تو اپنی انا کو کچل کے اپنے ساجن کو منا لیا تھا۔ اس نے تو سر جھکا کے جینے کا ایک انداز اپنا لیا تھا۔ پتہ نہیں بے جی کیوں اتنی خاموش اور سنجیدہ تھیں۔ ان کو تو سارے واقعے کا علم ہے۔

کہیں...... کہیں..... پھر اسے جھرجھری آجاتی اور وہ بے جی کے سوکھے پاؤں اپنے نرم نرم ہاتھوں سے دبانے لگتی...... پھر ادھر ادھر کی باتیں کرتی —— اپنے کپڑوں کو دیکھنے لگتی —— اور اپنے چہرے کا دھیان کرتی جسے اس نے معاذ کے لیے سجایا تھا۔

حقیقی معنوں میں اسے بتانا چاہتی تھی کہ وہی اس کے من مندر کا دیوتا ہے —— کہ اوپر سے بے جی آگئیں ——

پتہ نہیں اب بے جی کیا کریں گی ——

پتہ نہیں اب معاذ کے آنے تک کیا ہو گا ——

وہ ابھی بیٹھی اپنے آپ سے الجھ رہی تھی کہ بے جی نے اس کی گود میں پاؤں یوں کھینچے جیسے چھڑائے ہوں۔ اس پر رملیٰ ایک دم چونک اٹھی۔ بے جی کی طرف حیرت سے دیکھا ان کے چہرے پر کرختگی تھی۔

رملیٰ بے بسی کے عالم میں رونے لگی۔

"بے جی اگر مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہو تو پلیز معاف کر دیں۔"

بے جی تھوڑی دیر چپ بیٹھی اس کے چہرے کو دیکھتی رہیں۔ پھر اپنا ہاتھ اس کے زانو پر رکھا۔ زانو کو تھپتھپایا اور بولیں۔

پتر! چپ کر جا —— کیوں روتی ہے۔ اب تیرے رونے کا وقت گذر چکا ہے۔ میں تو جب سے آئی ہوں۔ حیران ہو رہی ہوں۔ تجھے شاید معلوم نہیں میں جان بوجھ کر تجھے تنہا اپنے گھر میں چھوڑ کر گئی تھی۔ کیونکہ جب سے تو آئی تھی اس گھر کی کوئی ذمہ داری قبول نہیں کر رہی تھی۔ اور یہ سب میرا قصور تھا۔ میں تجھے کچھ کرنے کا موقع نہیں دے رہی تھی۔ پھر میں جان بوجھ کر کچھ عرصے کے لیے گاؤں رک گئی۔ تاکہ تجھ پر ذمہ داریوں کا بوجھ پڑے اور تجھے پتہ چلے کہ شادی کیا ہوتی ہے —— آج تمھارا گھر دیکھ کر میں بہت خوش ہوئی ہوں۔ سب کمرے چم چم کر رہے ہیں۔ میلے کپڑے جا بجا ڈھیر نہیں۔ باورچی خانے سے بو نہیں آ رہی —— بچہ بھی صاف ستھرا ہے۔ بارے محلے سے تم ملتی رہی ہو —— ادھر ادھر کی خبر بھی رکھتی ہو اور یقیناً تم نے معاذ کا دل بھی جیت لیا ہو گا۔"

اس فقرے پر رملی نے اپنا سر بے حد جھکا لیا۔
کچھ شرمندگی کے مارے ـــــــــ
اور کچھ فطری شرم کے مارے۔
بے جی نے اپنا ہاتھ رملی کے سر پر رکھدیا۔ اور بولیں۔
زندگی تو سب کی ایک ہی جیسی ہوتی ہے۔ کوئی عقلمندی سے اسے جنت بنالیتا ہے اور کوئی بے وقوفی سے اسے دوزخ بنالیتا ہے۔ اللہ نے جتنی نعمتیں دے رکھی ہوں ان کی قدر کرنی چاہیئے ۔۔۔۔۔۔۔ اور اللہ کی طرف سے جو نہیں ملا اس کا بھی گلہ نہیں کرنا چاہیئے۔
۔۔۔۔۔ پتر مجھے یہ دیکھکر اب خوشی ہوئی کہ تو سیانی ہو گئی ہے۔ جب تیری شادی ہوئی تھی اور ہم تجھے اس گھر میں لے کے آئے تھے۔ تو سب لوگ آ آ کے مجھے مبارکباد دیتے تھے اور کہتے تھے۔ ماشاءاللہ آپ کی بہو تو چاند کا ٹکڑا ہے۔ تیری حقیقت اس وقت تھی بھی چاند کے ٹکڑے جیسی ـــــ جس طرح پتھر کا ٹکڑا بے حس اور فضول ہوتا ہے ۔۔۔۔۔ لیکن جب اسی پتھر کے ٹکڑے کو تراش خراش کے اس کی مورتی بنالی جائے تو کس قدر خوبصورت ہوتا ہے ـــــ یہ فطرت کا عمل ہے اس کے بغیر انسان ادھورے ہیں۔ ہم چاہیں تو اپنے آپ کو خوبصورت بنالیں۔ چاہیں تو بدصورتوں میں شامل ہو جائیں۔ آج میں تجھے جس حالت میں دیکھ رہی ہوں تو دل سے دعا نکل رہی ہے۔
آج تو میری نظر میں دنیا کی خوبصورت ترین عورت ہے۔ وہ عورت جو اپنے شوہر کو اپنا گرویدہ کرلے۔ گھر کو جنت کی طرح رکھے اور بچوں کے ساتھ جان مارتی رہے۔ بلا شبہ خوبصورت عورت ہوتی ہے۔
شدّت جذبات سے رملی کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ ایک دم زمین پر بیٹھ گئی۔ اور بے اختیار اس نے اپنا سر بے جی کے پاؤں پر رکھدیا ـــــ اس وقت ہنستا ہوا معاذ موجو کی انگلی پکڑے گھر میں یوں داخل ہوا جیسے گھپ بادلوں کی گپھا چیر کر اچانک سورج نکل آئے اور ہر شے کی اصل نظر آنے لگے۔

خوبصورت جاپان کا......
سحر انگیز سفرنامہ

بشریٰ رحمٰن کے سخن ساز قلم سے

"ٹُک ٹُک دیدم ٹوکیو....."

جھلکیاں

...... ہم نے نظر اُٹھا کر دیکھا ـــــ خاتون بڑی کش مکش میں تھی اور ہم اپنی ہی سوچوں میں مگن تقریباً اس کے ساتھ بھاگتے چلے آ رہے تھے ـــــ ہم جب غیر ملکیوں سے ملتے ہیں تو مسکہ ضرور لگاتے ہیں۔ اس لیے ہم نے کہا:

"آپ کو معلوم ہے ہمارے پاکستان میں جاپانی عورت کو احترام اور پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے ـــــ؟"

"اچھا ـــــ؟" اس نے حیران ہو کر ہماری طرف دیکھا اور بولی "کیوں بھلا ـــــ؟"

ہم نے کہا "جاپانی عورت اور پاکستانی عورت میں بہت سی جہتیں، عادتیں اور اقدار مشترک ہوتی ہیں۔"

ہنس کر بولی "مثلاً ـــــ"

ہم نے کہا:

"مثلاً یہ کہ جاپانی عورت اپنے شوہر کی تابعدار اور وفا شعار ہوتی ہے۔ شوہر کے آگے اونچی آواز میں بولتی نہیں۔ گھر والوں کے ساتھ شفقت اور محبت کا برتاؤ کرتی ہے۔ گھر کے سارے کام دلچسپی سے کرتی ہے...... شوہر کے والدین اور عزیز و اقارب کا خیال رکھتی ہے...... بچوں کی نگہداشت بڑی لگن سے کرتی ہے۔ گھر میں مہمانوں کی خوب تواضع کرتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ....."

ہم نے داد طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھا

اُس کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ وہ بولی تو اُس کی آواز میں لرزش اور خجالت تھی:

"آپ پرانے زمانے کی جاپانی عورت کی بات کر رہی ہیں۔"

"نئے زمانے کی جاپانی عورتیں کیسی ہیں؟"

"بہت مختلف ...." اس کے لہجے میں طنز تھا "جنگ سے پہلے جاپانی عورتیں ایسی ہی مشفق اور تابعدار ہوا کرتی تھیں جیسی آپ نے بیان کی ہیں لیکن موجودہ نسل کی لڑکیاں اور طرح کی ہیں... یہاں بھی "وومنز لب" کا نعرہ پہنچ گیا ہے۔ عورتیں یہاں بھی ہر قسم کی آزادی چاہتی ہیں۔ آپ کچھ دن یہاں رہیں گی تو آپ کو پتہ چل جائے گا۔"

ہمیں اپنی لاعلمی پر بہت افسوس ہوا۔

"کیا پاکستان میں سب عورتیں ایسی ہوتی ہیں جیسی آپ نے بتائی ہیں ـــــ؟" سڑک مڑتے ہی اس نے سوال کر ڈالا۔

صحیح جواب تو یہ تھا کہ ـــــ "اگر ایسی نہ ہوں تو کہاں جائیں؟"

مگر ہم نے بڑا سا گھونٹ نگل کے کہا:

"ہاں..... زیادہ تر ایسی ہی ہوتی ہیں۔"

پھر اپنے چہرے کے تاثرات چھپانے کو اِدھر اُدھر دیکھا۔

سکرٹوں میں ملبوس.... لمبے لمبے اوور کوٹ پہنے.... ننگی ٹانگوں کے ساتھ.... خوبصورت تازہ دم.... خوش پوش.... تیز رفتار.... پستہ قد جاپانی لڑکیاں.... مسکراتی.... اٹھکیلیاں کرتی سڑکوں پر آ جا رہی تھیں ـــــ تیز گام ـــــ رواں دواں ـــــ مستعد، مگن، مہکتی ہوئی.....

اپنی تمام تر مغربیت کے باوجود ابھی تک ان کے چہروں پر مشرق کا تقدس ہے.... ان کے آداب میں نسوانیت ہی نسوانیت ہے۔

اُن کے رکھ رکھاؤ میں ماں کا قرینہ ہے ـــــ

اُن کی گفتگو میں مٹھاس ہے ـــــ

شرم چھوڑ دی ہے، حیا ان کے پاس ہے ـــــ

اے جاپان کی معصوم و مصفا لڑکیو!

اللہ تم پر فضل کرے ـــــ

امریکہ تم پر رحم کرے ـــــ

مجھے یہ ڈر ہے کہ یہ دہر کی کڑکتی دھوپ
تیری نگاہ کی معصومیت نہ کم کر دے

وطن دوست لمیٹڈ

۸-سی۔ احمد بلاک۔ نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور